www.Paksociety.com
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
جنوری 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
www.Paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 41 • شمارہ 01 • جنوری 2012 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

انشائیہ

قانون

جون ایلیا

"تم باہر تو جا رہے ہو مگر تمہیں کسی نے اغوا کر لیا تو......؟"

"ہوں...... میں باہر تو جا رہا ہوں مگر مجھے کسی نے اغوا کر لیا تو...... مجھے کسی نے اغوا کر لیا تو......"

"مگر تم مجھے اغوا کر کے باہر لے جا رہے ہو۔"

"میں اغوا ہو کر باہر جا رہا ہوں...... نہیں مقدس صحیفوں کی قسم! کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہے ہو؟"

"تو پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں...... مگر ہم دونوں کو اغوا کر لیا گیا تو......؟"

"ہاں یہ تو ہے۔ اگر ہم دونوں کو اغوا کر لیا گیا تو...... تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ باہر تو جانا ہی ہوگا، ہم اندر کب تک رہ سکتے ہیں؟ باہر ہی تو ساری زندگی ہے۔ باہر ہی تو سب کچھ ہے۔ ہمارے نام بھی تو ہمارے باہر ہی ہیں۔ ہماری پہچان بھی تو باہر ہی ہے اور یہ کہ تم بھی تو میرے باہر ہی ہو...... اور میں بھی تو تمہارے باہر ہی ہوں...... اور میرے اور تمہارے سانس بھی تو باہر ہی ہیں۔"

"میرے بھائی! آخر ان بستیوں کو ہو کیا گیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو نہ جانے کہاں سے یہاں آ گئے ہیں؟ بہت سے لوگوں نے اسی بستی میں ہوش سنبھالا ہے، کوئی بتائے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں......؟"

"یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ باہر سے آئے ہیں؟ کہیں یہ لوگ ہمارے اور تمہارے اندر سے تو نہیں نکل آئے؟"

"ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے برآمد ہوئے ہوں...... اور ایک دوسرے کو خود ہی اغوا کر لیتے ہوں۔ مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر کبھی کبھی ہوتا تھا مگر اب تو یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ گلیاں، یہ نکڑ، یہ راستے، یہ شاہراہیں اور یہ بستیاں اتنی مہلک اور مہیب کیوں ہو گئی ہیں؟ ہم نے تو ان بستیوں کو بڑے چاؤ سے بسایا تھا، ہم نے تو اپنے مسکنوں کو اجاڑ کر ان بستیوں کو اپنا مسکن بنایا تھا...... تو پھر یہ بستیاں ہمارے حق میں، ہم میں سے ایک دوسرے کے حق میں اتنی نامہربان کیوں ہو گئی ہیں؟ میرا نام زید ہے، میں اردو بولتا ہوں اور میں اس بستی میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے ایک دوست کا نام مہتاب منگریو ہے، وہ سندھی بولتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرے ایک اور دوست کا نام عثمان بلوچ ہے، وہ بلوچی زبان بولتا ہے۔ اردو بھی جانتا ہے، وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرا اپنا ایک آدمی ہے، اس کا نام نذیر لغاری ہے، وہ بابا فرید کے شہر کا رہنے والا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ اور میرا ایک یار ہے افتخار جالب، جو پنجابی اور اردو میں لکھتا ہے۔ اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔"

"مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پہلے اگر ایسا ہوتا بھی تھا تو بہت کم ہوتا تھا۔"

"سننا چاہتے ہو......؟ یہ قانون کی شکست ہے۔ یہ قانون کی بے حرمتی ہے اور یہ قانون کی معزولی ہے۔"

"ہیں...... قانون کو کس نے معزول کیا؟ قانون کی کس نے بے حرمتی کی؟"

"قانون کو کس نے معزول کیا، قانون کی کس نے بے حرمتی کی...... میرے بھائی! کیا تم یہ بات بھی نہیں جانتے؟ یہ بات تو کریم سبزی فروش بھی جانتا ہے اور یہ بات تو خلیفہ مجید کے اکھاڑے کے پٹھے بھی جانتے ہیں...... اور یہ بات تو نتو جیب تراش بھی جانتا ہے۔ کیا میں اس سے آگے بھی کچھ کہوں؟ یہ بات تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو حکومت کی گدی پر بیٹھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قانون بنایا اور اب جو فرق پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ عام آدمیوں نے بھی قانون سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ جب تک قانون بنانے والے قانون کا احترام نہیں کریں گے تو بستیوں اور شہروں کے عام لوگ بھی اس کا احترام نہیں کریں گے۔ حکمرانوں سے کہو کہ وہ عام آدمیوں سے یہ سمجھوتا کریں کہ جو قانون ہم نے بنایا ہے، ہم بھی اس کا احترام کریں گے اور تم بھی اس کا احترام کرو گے اور نہیں...... اور اگر نہیں تو نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر عام آدمی کو قانون کا پابند بنایا گیا تو پھر خاص آدمیوں کو بھی اس قانون کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر قانون کی دوطرفہ رعایت نہیں کی گئی اور اس کی حرمت کو برقرار نہیں رکھا گیا تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے درندے ہی آ کر آباد ہوں گے۔"

کے خط

عزیز قارئین!
تسلیمات

جنوری 2012ء کا جگمگاتا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ سب سے پہلے تو تمام قارئین کو سالِ نو کی مبارک باد قبول ہو۔ وقت کبھی کسی کے روکے سے نہیں رکتا اپنی سبک رفتاری سے جاری رہتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں وقت آگے جارہا ہے، حالات پیچھے کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں جو سہولتیں میسر آنے کے بجائے دن بہ دن ان میں کٹوتی ہورہی ہے۔ گیس، بجلی، پانی، تعلیم...... سب اس کی مثالیں ہیں۔ جانے ترقیِ معکوس کا عمل کب اور کہاں رکے گا اور ہم آگے بڑھنا شروع کریں گے۔ عالمی حالات اور واقعات کا رخ ہمارے خلاف جارہا ہے...... کے بعد دیگرے آزمائشیں مسلط ہورہی ہیں۔ ہمیں سال کا آخری زخم نیٹو کے ہاتھوں لگا جس پر حکومتِ وقت نے بجا طور پر کچھ دلیرانہ اقدامات کیے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے حکمران ہر معاملے میں اسی ثابت قدمی اور نیک نیتی کا مظاہرہ کریں۔ مغرب کی کاسہ لیسی سے کچھ بھلا نہیں ہوگا۔ مغرب سے طوفانوں کی صدائیں آرہی ہیں۔ وال اسٹریٹ تحریک تیزی سے پھیلتی جارہی ہے۔ اس ڈوبتے ہوئے ٹائی ٹینک پر سوار رہنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنی چھوٹی سی نیا کو خود پار لگانے کی سچی کوششیں کریں۔ دیکھتے ہیں نئے سال کا سورج ہمارے لیے کیا سوغات لاتا ہے۔ امید پہ دنیا قائم ہے۔ بقول شاعر ''آنے والی خوشیوں کا احساس ہو ہے...... ہر انسان کے پاس یہی اک آس تو ہے'' لہٰذا ہم بھی شادمانیوں کی امید لیے قدم بڑھاتے ہیں اپنی سندر محفل کی جانب......!

✠ **محمد نعمان پیارے**، ایس اے ٹنگ، جلبہ سے چلے آرہے ہیں ''ایک تو رات پاکستان کا سری لنکا کے خلاف دوسرا ون ڈے ہارنے کے بعد دل بجھا ہوا تھا، اوپر سے اپنا چار ماہ بعد لکھا گیا تبصرہ بلیک لسٹ میں پا کر طبیعت اور بوجھل ہوگئی۔ خیر گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں......! گو کہ نہ ہی سسپنس ڈائجسٹ میدانِ جنگ ہے اور نہ ہی ہم شہسوار......! مگر پھر بھی......! ہم کہاں رکنے والے ہیں۔ (شاباش...... ہے جذبۂ جنوں تو ہمت نہ ہار) ڈاکٹر انکل یہ کیا......؟ آپ نے ٹائٹل پر حسینہ کے نام پر اگر شاہ چوتی بچی ہی کی تصویر بنا ڈالی۔ انشائیے میں جون ایلیا خوابوں پر بحث و مباحثہ کررہے تھے۔ ''صرف اور صرف، اچھے خواب۔'' ہے ناں! تمام دوستوں کی من پسند محفل میں بلیک کیٹ صاحب طویل غیر حاضری کے بعد موجود تھیں۔ ویلکم جی......! ویسے کالی بلی یہ ضروری نہیں کہ احمق صرف مردوں میں ہوں، ماشاء اللہ......! عورتوں میں بھی یہ نعمت کثیر تعداد میں موجود ہے، بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ حکیم سید صاحب! سسپنس ملنے کی خوشی کس کو نہیں ہوتی؟ بس کسی کو ہماری طرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قدرت اللہ خان صاحب! بلیک لسٹ ہونے کا دکھ تو بلیک لسٹ ہونے والا ہی جانتے...... دل لگا کے۔ خواجہ مدنی صاحب! ہیروئن جس ہیرو کا انتظار کررہی تھی کہیں وہ آپ تو نہیں تھے؟ ہائے اللہ! کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، خوشبو لگا کے......! احسان سحر جی! بہت بہت مبارک ہو! گلے لگا کے......! راجا ثاقب نواز جی! آپ کے خیالات تو بہت نیک ہیں مگر کیا کریں یہاں پر عوام ناہی اس مخلوق کا خیال کس کو ہے۔ یہاں وہاں سر پٹخنے سے کیا ہوگا۔ (کس کا...... اپنا یا دوسروں کا؟) کاشف زبیر صاحب کی کرشمۂ قدرت کافی اچھی داستان تھی، انسان کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتا، جس کے پاس دولت ہے وہ ہردم اس کو بڑھانے کے چکر میں ہی رہتا ہے۔ سیلی اور جوزن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئے اور اپنا مکان وڑمن بچانے میں کامیاب رہے۔ واقعی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ سلیم انور صاحب کی اغوا ایکسچینج ایک دلچسپ کاوش تھی۔ کہانی نے آخر میں بہت ہی عجیب موڑ لیا۔ لیونا نے جم کو اغوا کے نام پر اچھا سر پر اکڑ دیا مگر اغوا کا ڈراما جم کے لیے خطرناک بھی تو ہوسکتا تھا خیر یہ تو کہانی ہے۔ تنویر ریاض کی آخری امید بہت اچھی کہانی تھی۔ فیلپ نے جو کچھ سوچ رکھا تھا نتیجہ اس کے برعکس نکلا اور اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ ملک صفدر حیات کی فتنہ گر انسانی ذہن کی فتنہ گری کی مکمل قلعی کھولتی نظر آئی۔ نواب علی جیسے فتنہ گر کردار ہر دور میں ہمارے آس پاس موجود رہتے ہیں اور ہمیں ان سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ چور کو پڑ گئے مور، چند چوروں کی ایک عبرت ناک داستان تھی۔ ممدو اپنے حرص و طمع کی وجہ سے انجام کو پہنچا کیونکہ اس کو جیرے اور دوسرے لوگوں کے قتل کی سزا تو ملنا تھی۔ منظر امام صاحب کی رہنمائی بہت ہی زبردست اور دلنشیں مسکراتی تحریر تھی مگر سبق آموز! واقعی اب تو بھکاریوں نے بھی تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں۔ رہنمائی بھی ان کے نت نئے طریقوں سے بچنے کے لیے لکھی گئی تھی، دل لگا کے......! ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی جلاد مسیحا ایک دردناک کہانی تھی۔ انازی کے حالات فی الحال تو سنبھلتے ہوئے نظر نہیں آرہے گو کہ شاہی بادشاہ کی واپسی بھی ہوئی تھی مگر فی الحال تو وہی ہوگا جو مصنف صاحب چاہیں گے، دل لگا کے...... مریم کے خان کی اپنے دام میں بہت ہی لاجواب کاوش تھی۔ ولیم عرف یوسف اپنے ہی دام میں خود آگیا، اسی لیے اس کو رمضان مبارک۔ خوشبو لگا کے......!'' (واہ کیا خوب تبصرہ لکھا دماغ لگا کے)

✠ **سردار ظفر اقبال وڑائچ**، جودھ پور کیرووالا، ضلع خانیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''طویل غیر حاضری کے بعد آج پھر اپنی محفل یاراں میں موجود ہوں۔ بلیک کیٹ، آپ کو کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ آپ کا اندازِ بیاں پسند آیا۔ سعدیہ بخاری آپ نے بھی بہت اچھا انداز اپنایا۔ انجم رشید، آپ نے بہت کنجوسی کی ہے، سعدیہ بخاری جتنا خط تو لکھتیں۔ حکیم سید محمد رضا شاہ صاحب، لکھتے تو ماشاء اللہ آپ بھی بہت اچھا ہیں، گڈ تبصرہ۔ میرے ضلع سے محمد قدرت اللہ نیازی صاحب، ویلڈن! آپ کا تبصرہ تو کیا کہنے۔ ہمایوں سعید راج صاحب، سرورق تو اس دفعہ بھی کچھ خاص نہیں ہے مگر کیا کریں ہم نے سرورق نہیں، اندر جو مواد ہے اس کو دیکھنا، پرکھنا اور پڑھنا ہوتا ہے کیا خیال ہے آپ کا؟ ظاہری چیز پہ تو نہیں جایا جاتا نا! بائی داوے! آپ نے بھی دل لگا کے لکھا اور خوب لکھا۔ خواجہ مدنی صاحب آپ کا تبصرہ Excellent تھا۔ حسنین بلوچ صاحب، کیسے ہیں آپ؟ آپ جیل میں بیٹھ کر خط لکھتے ہیں، وجہ؟ آپ کا تبصرہ شاندار لگا۔ ایسے لگا جیسے آپ نے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہو۔ راجا ثابت نواز ثاقب صاحب! آپ تو کافی

پرانے لکھاری ہیں، تبصرہ نگار ہیں۔ آپ نے تو ہمیشہ اچھا لکھا ہے۔ راجا جی! یہ پرانے لوگ کدھر گئے ہیں؟ یاران کو واپس بلاؤ، محفل بالکل پھیکی پھیکی ہے۔ اکثر لوگ مجھے نہیں جانتے ہوں گے۔ چاہے شرط لگا لو مجھ سے، اب اگلے ماہ کے تبصرے دیکھ لینا۔ بشریٰ افضل آف بہاولپور، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری صاحبہ، ایک لمبی فہرست بنتی ہے جو لوگ محفل کو چھوڑ گئے ہیں۔ ان تمام لوگوں سے التماس ہے کہ واپس آجائیں۔ تنسیر عباس بابر صاحب، کیسے ہیں آپ؟ اسی طرح ادریس احمد خان، محمد جاوید طوری، محمد نعمان پیارے، قاضی محمد قیصر شہزاد صاحب، اپنی حاضری کو یقینی بنائیے، آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ جون ایلیا کی جنتِ ارضی پڑھی۔ اس میں ایک بات لکھی ہے کہ جو جاندار خواب دیکھتے ہیں حکیم، فلسفی یا شاعر کہلاتے ہیں اگر انسانوں کے علاوہ دوسرے جاندار بھی خواب دیکھتے تو وہ بھی حکیم، فلسفی یا شاعر ہوتے! بہت گہری بات ہے۔ کرشمۂ قدرت، آخری امید، رہنمائی، چور کو پڑ گئے مور اور کشکول پڑھی۔ باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہیں، جو پڑھی ہیں ان پر بھی تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ میں نے یہ خط صرف اس لیے لکھا تھا کہ شمولیت ہوجائے اور جو دوست غیر حاضر ہیں وہ واپس بلا یا جائے۔ ہم تو ہیں امن کے پیامبر، امن کے سپاہی اور جاتے جاتے آپ سب کو نیا سال مبارک ہو، خدا سب لوگوں کو خوشیاں ہی خوشیاں دے...... محمود و ختم کرے، آمین۔''

✠ **ہمایوں سعید راج**، اوکاڑہ سے تبصرہ کررہے ہیں ''اب چونکہ ہم نے سدھرنے کا سالانہ فیصلہ کرلیا ہے، سرورق پر موجود نامحرم عورت کو بالکل بھی نہیں دیکھا...... نگاہ بائے سوچوں میں گم تھی۔ آٹھ عدد چوڑیاں کلائی پر اور دو عدد کانوں پر جگمگا رہی تھی۔ (اللہ رے یہ بے نیازی......) اگر ...... والی باجی! ویلکم بیک۔ اور آپ پلیز اصل نام کے ساتھ آئیے۔ اشرف المخلوقات کو کسی جانور کے نام سے مخاطب کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا...... احسان سحر، لشین کے لیے خصوصی دعاؤں میں مصروف نظر آئے۔ احسان میاں! اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس عمر میں چھوٹی موٹی بیماریاں کہاں چھوڑتی ہیں۔ خواجہ صاحب کی ماما سے پوچھ کچھ مجھے اچھی نہ لگی تو ماما کو کیا اچھی لگے گی۔ حسنین صاحب! جب آپ کا ذہن کئی سال پیچھے چلا گیا تو ...... آپ کو سیدھے لیٹ کر پرانی یادوں میں کھوجانا چاہیے تھا۔ مگر آپ تو سرپٹ محفل کی جانب بھاگے جارہے ہیں۔ طاہر الدین بیگ، آپ کا نام دیکھ کے نصاب میں شامل افسانے کا ایک کردار مرزا طاہر بیگ یاد آجاتا ہے۔ جسے کی لمبی چھوڑنے کے سوا کچھ بھی آتا ہی نہیں۔ کاظمی صاحب اس دفعہ شارقہ صاحبہ کی سادگی سے متاثر ہوئے۔ رضا صاحب کا تبصرہ بالکل بھی گریٹ نہیں تھا۔ ریاض صاحب، شکر ہے کہ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ شمارہ میرے خوبصورت ہاتھوں میں جگمگا رہا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی جنگ آزما مغلیہ سلطنت کے بانی بابر اور شیبانی خان کے گرد گھومتی رہی۔ انہی صفحات پر ہم پہلے بھی یہ سب ملاحظہ کرچکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب برائے مہربانی اکبر اور جودھا بائی کی کہانی سامنے لائیں تاکہ ہم تقابلی جائزہ لینے کے قابل ہوسکیں۔ جنت حقیقی طور پر غیر متاثر کن رہی۔ بے پناہ سسپنس کی حامل کشکول دل پر گہرا اثر چھوڑ رہی ہے۔ لیاقت نے ایک بار پھر اپنے مالکوں کی جان بچا کے نمک کا حق ادا کیا۔ شیخ حامد کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں سیٹھ عثمان ان کے ہاں جانے پر راضی ہوگیا۔ ایڈونچر سے بھرپور اپنے دام میں بے حد پسند آئی۔ ولیم بجا طور پر امریکی نمائندہ ثابت ہوا۔ جن کی رگ رگ بس تکبر، انا اور خود پرستی خون کی طرح محوِ گردش ہوتی ہے۔ کہانی کے اینڈ نے بے اختیار مسکرانے پر مجبور کیا۔ منظر امام کی معاشرتی حقائق کو اجاگر کرتی کہانی حسبِ معمول پسند آئی۔ خیر ہمیں پہلے ہی پتا لگ گیا تھا کہ یہ سب کچھ ایک پلان کے تحت ہورہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی جلاد مسیحا بھی گہرے اثرات چھوڑنے میں کامیاب رہی۔ ہوس میں اندھا انسان اپنی تسکین کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ ملک صاحب ایک دفعہ پھر ایک بوڑھے عاشق کی کہانی سمیت حاضر تھے۔ ملک صاحب کی تفتیش کا سادہ اور پراثر انداز ہی انہیں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ وہ کسی بھی لمحے غفلت نہیں برتتے، ماحول کا تفصیلی جائزہ اور تفتیش کا پراعتماد انداز یہ سب انہیں آئیڈیل پولیس آفیسر بناتے ہیں۔ چور کو پڑ گئے مور میں ان چوروں سے زیادہ بھوری کی موت نے افسردہ کیا۔ شمع خانم کی اچھی کاوش تھی۔ اغوا ایکسچینج کا انجام حیران کن تھا۔ کاشف زبیر کی کرشمۂ قدرت ایک بار پھر شمارے کی خاص الخاص کہانی ثابت ہوئی۔ بے شک اللہ جو بھی کرتا ہے انسان کی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ سیلی اور جوزن کی بے تحاشا محبت نے متاثر کیا۔ محفل شعر و سخن میں عمران حیدر، شہباز احمد اور قدرت اللہ کا انتخاب پسند آیا۔''

✠ **ڈاکٹر وسیم خالق گہیاں**، گجرات سے محفل میں آئے ہیں ''میں 1999ء سے ماہنامہ سسپنس کا مستقل قاری ہوں ویسے مجھے آپ کی قارئین سے والہانہ محبت سے انکار نہیں پھر بھی میں یہ خط لکھ کر یہ دیکھوں گا کہ آپ اس کو شامل کرکے مجھے کتنی خوشی دے سکتے ہو؟ کیونکہ جب ماہنامہ جنوری میرے ہاتھوں میں آئے گا تو اس وقت ماہ دسمبر ہوگا اور 21 دسمبر میری یومِ پیدائش ہے اور اس سالگرہ کے موقع پر آپ میرا خط شامل کرکے مجھے گفٹ، حقیقی خوشی کی صورت میں دو گے، اتنا تو ہمارا حق بنتا ہے نا۔ اس بار ماہنامہ سسپنس پہلی بار بنا انتظار کروائے جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل گرل شاید اس لیے انگوٹھا منہ میں دبائے حیرت کا بت بنی نظر آئی کہ اس کا پیا پردیس سے عید کے موقع پر گھر نہیں آیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ جنتِ ارضی کا ایک ایک لفظ موتیوں سے پرویا تھا جس پر تبصرہ کرنے سے بندۂ ناچیز قاصر ہے۔ آپ کے خط میں سب سے پہلے مدیرہ آنٹی کو عید کے موقع پر دل موہ لینے والی باتوں کے ساتھ اپنے ہی پاس محسوس کیا پھر محفلِ یاراں کا رخ کیا جہاں بلیک کیٹ کو مسندِ صدارت پر فائز دیکھا، مبارک ہو بہنا۔ اتنا عرصہ غائب رہنا اچھی بات نہیں۔ بلیک لسٹ میں جہاں تنسیر عباس اور طاہرہ یاسمین کو پاکر افسوس ہوا وہیں ماہا ایمان کی دونوں جگہ غیر موجودگی افسردہ کرگئی۔ سب سے پہلے ناصر ملک کی گزشتہ سے پیوستہ جنت پڑھ کر اپنی ادھوری پیاس کو بجھانے میں کامیاب رہے۔ اس کے بعد انازی پڑھی جہاں پر فیکا پتر شاہی بادشاہ کے توسط سے سی ڈیز حاصل کرنے کے باوجود بھی اپنی زندگی میں خوشیوں کا پھل...... ڈھونڈیں گے تو مل جائے گا کے مقولے پر عمل پیرا ہوکر نور کی تلاش میں مصروف نظر آیا۔ اس کے بعد انوار صدیقی پر اپنی آنکھیں جما دیں جو اپنے کشکول میں میڈم روبی کے حسن کو نکالنے سے تو باز رہے مگر لیاقت حسین کی پراسرار شخصیت میں الجھانے میں پھر بھی کامیاب رہے۔ جلاد مسیحا میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اپنے ہی ہم پیشہ ڈاکٹر رحیم داد کی درندگی کو بے نقاب کرتے نظر آئے۔ فتنہ گر ملک صفدر حیات کی ایک بہترین کہانی تھی، جس

اپنے دام میں اور ناممکن چوری اچھی تحریریں تھیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سے درخواست ہے کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے بعد کے حالات اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے دور کے حالات پر بھی لکھیں۔ عمران حیدر بلوچ کی شرارتیں اور ان کا تبصرہ پسند آئے۔ ندیم ابراہیم، دبئی کی سائنسی معلومات زبردست تھیں۔ شہباز منا اور شعیب اور عدنان صدیقی کے شعر اچھے لگے۔"

✠ **طاہرہ یاسمین، ضلع سرگودھا** سے تبصرہ کر رہی ہیں "اس ماہ کا شمارہ 15 کی شام کو ملا۔ اپنا خط بلیک لسٹ پر پایا۔ اس دفعہ میرا شعر میرے نام سے چھپا خوشی ہوئی (معیاری شعر ایک [illegible] جاتا ہے) اس [illegible] بالکل گرل بالکل بھی اچھی نہیں لگی تو تبصرہ کیا کرنا اس پر۔ محفل میں بلیک کیٹ جی خوش آمدید، اینڈ مبارکاں [illegible] آپ کا تبصرہ بہت دلچسپ [illegible] اللہ نیازی، حکیم [illegible] آپ کا تبصرہ نمبرون تھا۔ خواجہ مدنی بھائی جان آپ کا شکریہ کہ آپ [illegible] کا پوچھا۔ اللہ کا کرم ہے اب تم تمام قارئین سے اپیل کرتی ہوں مدیرہ جی سمیت کہ میری والدہ کی صحت کے لیے دعا کریں (اللہ آپ کی والدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین) اور اگر کسی بہن بھائی کو اس مرض کے علاج کے بارے میں کوئی معلومات ہو تو کوئی نسخہ لکھ دیں۔ گھٹنوں میں ان کو جوڑوں کا درد ہے۔ احسان سحر تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عمران حیدر بلوچ جیل سرگودھا، خدا آپ کو جلدی رہائی دے۔ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص آپ کا تبصرہ شاندار تھا۔ رضا دی گریٹ، سرگودھا نے لکھا کہ طاہرہ ہر دفعہ خط شائع ہونے کا کمشن لگاتی ہے تو مدیرہ جی کیا واقعی آپ کو بھی میری باتوں سے یہی لگتا ہے کہ آپ کو کمشن لگاتی ہوں؟ (بالکل نہیں اگر ایسا ہوتا تو خط شائع نہ ہوتا) سید شکیل حسین کاظمی، بھئی محفل کی رونق میں اضافہ تو بھی دوستوں کے خطوں سے ہوتا ہے میں کیا اور آپ کیا یہ سب دوستوں کی ایک دوسرے سے محبت ہی تو ہے جو محفل سجتی ہے۔ حاجی عبدالحکیم، ندا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ کی جیون ساتھی، خدا کے فضل و کرم سے تندرست ہو گئی ہیں۔ آپ محفل سے کنارہ نہیں کر سکتے نہ ہم آپ کو ایسا کرنے دیں گے۔ آغا فرید احمد خان، شمر آپ نے مجھے لکھا کہ خدا کا خوف کرو پچھلے دس سال سے خود کو 25 سال کا بتا رہی ہو۔ خدا کا خوف تو آپ کریں اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے جبکہ میں نے تو اس قسم کی کبھی کوئی بات نہیں لکھی۔ شعروں میں نمبرون شعر تھا قدرت اللہ خان نیازی کا اور پھر خواجہ مدنی اور عمران حیدر بلوچ کے اشعار بہت پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی کشکول، بہت شاندار۔ پھر پڑھی اناڑی پھر کرشمۂ قدرت، بہت اچھی تھی۔ سلی اور جوزن کو اپنی محنت کا ثمر مل گیا۔ آخری امید بھی بس گزارے لائق تھی۔ بوبی نے قلیپ کے ساتھ دھوکا کیا حالانکہ قلیپ نے بوبی کی مدد کی تھی۔ جلاد مسیحا بھی بہت پر اثر تحریر تھی۔ بے چاری نوراں جیسی ہزاروں لڑکیاں مدحیم داد جیسے سفاک لوگوں کی بھینٹ چڑھتی ہیں، ایسے مسیحا سے تو موت اچھی۔ جنت کی پہلی قسط زیر مطالعہ ہے۔"

✠ **جنید نواز، بہاولپور** سے محفل میں تشریف لائے ہیں "خط لکھنے کی پہلی مرتبہ جسارت کر رہا ہوں امید کامل ہے خوش آمدید کہیں گے (خوش آمدید) رسالہ 15 نومبر کو ہی مل گیا اور ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ماہا ایمان جیسی ہیروئن اپنے ہینگر کے خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔ واہ واہ کرا فکل، آپ نے کمال کر دیا۔ اس کے بعد جون ایلیا کے انشائیہ پر پہنچے۔ انکل نے بہت خوبصورت بات کی ہے کہ خواب دیکھنے کی صلاحیت انسان میں ہے، باقی کسی چیز میں نہیں، واقعی اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات پر برتری دی ہے۔ اس کے بعد محفل دوستاں میں پہنچے تو بلیک کیٹ کو کرسی صدارت پر پایا، ارے یہ بلیک کیٹ، انسانوں کی محفل میں اور وہ بھی کرسی صدارت پر؟ چلو، بلیک کیٹ کو ہماری طرف سے مبارکباد! محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ بھی بہت اچھا لگا۔ اسلم رشید صاحب، آپ اپنی چاروں آنکھیں کھلی رکھا کریں۔ ہمایوں سعید براج، پچھلے ماہ آپ غیر حاضر تھے، خیریت تو تھی؟ خواجہ مدنی صاحب، خیر تو ہے ہیروئن کو بہت یاد کرتے ہو تو بلیک کیٹ سے بات کریں؟ راجا ثاقب لودھی شاقب، میں آپ سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ سید شکیل حسین کاظمی، سنف نازک کی اتنی خوشامد نہ کرو۔ ماہا ایمان اور دلنشین جیسی کہاں گم ہو جاتی ہیں؟ سعدیہ بخاری کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ طاہرہ یاسمین، محمد نعمان پیارے، اور یس احمد خان اور ایم ڈبل اے کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ مدیرہ جی! کیا ہم اپنے خط کو بذریعہ ای میل بھیج سکتے ہیں؟ (جی ضرور) محفل شعر و سخن میں حسنین عباس بلوچ کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جنت پڑھی، بہت اچھی لگی۔ خاص کر سندھو سائیں اور پروفیسر وسیم بزدار کے کردار بہت اچھے لگے۔ بلیک کیٹ کہتی ہیں کہ کہانی کا پلاٹ کمزور ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اناڑی میں فیکا پتر کو بہت ساری کامیابیوں کے باوجود شکست ملی۔ ان کامیابیوں کا سہرا شاہی بادشاہ کے سر ہے اور مسکین شاہ کے راز اب کھلنے والے ہیں۔ کشکول میں میڈم روبی ایکشن میں دکھائی دی۔ افضل خان کی زندگی اب داؤ پر لگی ہوئی ہے امید ہے بچ جائے گا۔ لیاقت حسین اور سراج کے رول بہت اچھے ہیں۔ مختصر کہانیوں میں جلاد مسیحا اور راہنمائی کے علاوہ باقی کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ رضوانہ ساجد کی اسلامی معلومات پر مبنی تحریر بہت اچھی لگی۔"

✠ **جعفر حسین، بھوآنہ، چنیوٹ** تشریف لائے ہیں۔ "اس دفعہ خلاف معمول سسپنس 13 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق کی حسینہ کو ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے کیونکہ مغل شہزادیوں جیسا بانکپن، یونانیوں جیسا ملکوتی حسن اور مصریوں جیسا قیامت خیز سراپا، آنکھوں کی تشنگی کو دو آتشہ کر رہا تھا۔ جون ایلیا مرحوم کی جنت ارضی میں طلاقتی انداز اختیار کر کے بادی النظر میں بین السطور ہم تک یہ پیغام پہنچایا گیا کہ اپنے جائز حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اداریے میں بڑی خوبصورتی سے 2,3 موضوعات کو سمیٹا گیا۔ ہماری عدلیہ آزاد تو ہو گئی ہے مگر اس کے ثمرات عام آدمی اور ماتحت عدلیہ تک نہیں پہنچے جہاں آج بھی 22 لاکھ مقدمات پنڈنگ ہیں۔ کاروکاری، ونی اور لڑکیوں کو جائیداد میں حصہ نہ دینے کے خلاف قانون قومی اسمبلی سے پچھلے دنوں منظور تو ہو چکا ہے۔ دیکھیں اب اس پر عمل درآمد کب اور کہاں تک ہوتا ہے کیونکہ اس ملک کا المیہ یہی ہے کہ وڈیرا شاہی اور طبقۂ اشرافیہ قانون کو گھر کی باندی سمجھتے ہیں۔ محفل اس دفعہ کچھ گرما گرم نظر آئی۔ بلیک کیٹ کا تبصرہ ان کی تنقید برائے تنقید سے قطع نظر شاندار رہا۔ ماہا کا نام استعمال کرنا شاید محفل میں فیشن سمبل بن گیا ہے۔ طاہر بیگ صاحب پچھلے دنوں 91ء کا سسپنس نظر سے گزرا۔ اس میں شاید آپ کا ہی خط تھا۔ راج صاحب لگتا ہے کہ آسیہ تو آپ کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہوئی ہاں البتہ اب کسی اور کا جادو آپ کے سر چڑھ کر ضرور بول رہا ہے۔ اس دفعہ محفل میں سے ٹیکسلا کی کمی غائب تھیں۔ محفل میں اس دفعہ زیادہ تر پرانے بابے اور بیبیاں

نظر آئیں۔ شاید پوتے پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں کی شادیوں کے بعد اب راوی ان کے لیے چین ہی چین لکھتا ہے (اولڈ از گولڈ...... یہی محبت ہے) مختصر کہانیوں میں تقدیر اور تدبیر کے گرد گھومتی کرشمۂ قدرت انسانی محدود سوچ اور خدا کی بے پناہ اور بے پایاں رحمتوں کو نمایاں کر رہی تھی۔ اغوا ایکسچینج کے نام اور انداز تحریر نے کہانی کے شروع میں ہی سارا سسپنس ختم کر دیا۔ چور کو پڑ گئے مور ایک لو آموز مصنف کی اچھی کاوش تھی۔ اختتام تھوڑا مایوس کن تھا۔ انہیں اپنا مطالعہ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ فقیروں اور لٹیروں کے نت نئے ہتھکنڈوں کے پس منظر میں لکھی گئی منظر امام صاحب کی راہنمائی اوسط درجے کی تحریر تھی۔ اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے معزز پیشے کو بدنام کر کے کسی کی مجبوری کا سودا کرنے والے ڈاکٹر کی روداد جلاد مسیحا نے کافی متاثر کیا۔ ایک مشہور جانور کی ٹیڑھی دم کے مصداق ولیم کی داستان "اپنے دام میں" سب سے بہترین تحریر رہی۔ خاص طور پر اینڈ نے کافی محظوظ کیا۔ آخری امید ایک معیاری تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں مرزا طاہر الدین بیگ صاحب اور محمد عزیز صاحب کا انتخاب پسند آیا۔ ابتدائی صفحات کی تاریخی کہانی میں ظہیر الدین بابر کی داستان حیات بہت پسند آئی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ نادر شاہ، محمود غزنوی، احمد شاہ ابدالی اور ظہیر الدین بابر کو ہماری نصابی کتب میں مورخین اور مصنفین نے ہمیشہ ہیرو بنا کر ہی پیش کیا۔ کشکول انوار صدیقی صاحب کی باقی تحریروں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں تحیر، محیر العقول واقعات اور کائنات کے ان دیکھے، انجانے اسراروں کی جہاں کھوج ہے وہیں پر پلاٹ کا حقیقت پسندی اور زمینی حقائق کے مطابق ہم آہنگ ہونا بھی ہے۔ ملک صفدر حیات اس بار کسی میں کسی پر [illegible] راج رساں کی طرح منصوبہ بندی اور کارروائی کرتے نظر آئے۔ پچھلے ایک دو سالوں سے ملک صاحب کی کہانیوں اور [illegible] کا نظر آنا شروع ہو گیا ہے۔ حضرت جرتیج کے بارے میں پہلی دفعہ پڑھا اور جانا، اللہ کے برگزیدہ بندوں اور انبیا کرام کے [illegible] رضوانہ ساجد بااشبہ تحسین کی مستحق ہیں۔ ناصر ملک کی جنت شاندار تھی۔ سسپنس کے آخری صفحات کا توشہ [illegible] کے ناصر صاحب نے مصطفین کو کاپی کرنے کی کوشش کی مگر بیک وقت ہی ناکام ہے تاہم ان کی کاوش قابل [illegible]"

✠ **این ایس آر مدثر، بلدیہ ٹاؤن، کراچی** سے تبصرہ کر رہے ہیں "سب سے پہلے تو تمام قارئین دوستوں کو اسلامی ہجری سال 1433ھ اور عیسوی سال 2012ء مبارک ہو۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ نئے سال میں ترقی اور کامیابیاں نصیب فرمائے۔ حجاج کرام کو بے حد مبارکباد کہ وہ خوش نصیب ٹھہرے۔ سب سے پہلے جنگ آزما پڑھی۔ ظہیر الدین بابر اور اس کی بہن خانزادہ کے گرد گھومتی کہانی پہلے بھی انہی صفحات پر پڑھ چکے ہیں۔ بابر کا جواب بہت پسند آیا کہ باغ دلکشا میں ہاتھی کی تصویر بہت اچھی تھی۔ عائشہ نے بھی کچھ کم جواب نہیں دیا۔ غفار رسول صاحب سے فرمائش ہے، تاریخ میں سید منصور حلاج یا حجاج بن یوسف کے بارے میں لکھیے، نوازش ہو گی۔ (آپ کی رائے نوٹ کر لی ہے) کاشف زبیر کی کرشمۂ قدرت اپنے اندر ایک سبق سموئے ہوئی تھی کہ کسی حال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ سلیم انور کی اغوا ایکسچینج خاصا سسپنس لیے ہوئے تھی، لیزا نے منفرد انداز اختیار کیا شادی کی سالگرہ کا۔ شمع خانم کی چور کو پڑ گئے مور میں جیرا اور شرفو، ممدو کو مور پڑ گئے، بھوری نصیب نہ ہو سکی۔ رہنمائی منظر امام کی تخلیق ہمارے معاشرے میں ضعیف الاعتقادی عام ہے۔ متاثر کن تحریر تھی پر انجام اداس کر گیا۔ مریم کے خان کی اپنے دام میں۔ ولیم کا رویہ عبدالہادی اور مراد سے علیحدگی کا سبب بنا، ولیم کی چالاکی اسے لے ڈوبی۔ ناممکن چوری، میں وک نے واقعی میں کمال کر دکھایا۔ میلوری اسے اتنی بڑی رقم ایویں نہیں دے رہا تھا۔ مختصراً میں فرید کو سزا ملی بدنامی کی۔ کشکول ٹھیک جا رہی ہے۔ اب افضل خان کو ٹھکانے لگانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اناڑی میں نواب رفیق ابھی تک نور کو بازیاب نہیں کرا سکے۔ شامی کی واپسی خوش آئند ہے۔ ناصر ملک کی جنت متاثر نہیں کر سکی غالباً ناصر ملک محی الدین نواب کی کاپی کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں پروفیسر کو خبطی ہی کہوں گا کہ انسانوں سے نفرت کرتا ہے، الگ جنت بناتا ہے اور پھر انہی سے مدد طلب کرتا ہے۔ محفل شعر و سخن میں ادریس احمد خان کا شعر شاندار تھا۔ سویدا ر صاحب، فیض صاحب نے کیا شعر کہا ہے لاجواب۔ قدرت اللہ نیازی کا شعر بھی خوب، پر دل کو کہیے کہ اتنا اعتبار نہ کرے۔ اطہر حسین کراچی کا انتخاب بھی اچھا تھا مجموعی طور پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا اور لاہور کے قیدی دوستوں کے درمیان مقابلہ بیت بازی ہو رہا ہو۔ کترنیں بھی شاندار رہیں۔ نئے سال میں نئے لکھاریوں کے لیے پیام تھا کہ وہ بھی لکھیں۔"

✠ **بابر عباس، کھاریاں** سے تشریف لا رہے ہیں "اگرچہ میں سسپنس کا پرانا قاری ہوں مگر محفل میں جگہ نہ ملنے کے مسئلے سے اکثر دوچار ہو جاتا ہوں...... کوئی بات نہیں گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ میرے لیے سسپنس ایسا ہی ہے جیسے میرے فیملی ممبرز...... تمام اہالیانِ وطن کو نئے اسلامی سال کی مبارکباد اور جنوری کا آغاز بھی مبارک ہو۔ اس بار تمام کہانیوں کا معیار بہت اعلیٰ رہا۔ میں جب تک سسپنس میں چھپی تمام کہانیاں پڑھ نہ لوں چین نہیں آتا۔ میری دعا ہے کہ آپ کا ادارہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ اپنا معیار برقرار رکھے۔ محفل میں شریک کتنے ہی ساتھیوں نے مجھ سے رابطے کی کوشش کی لہٰذا اس نمبر پر رابطہ کر لیں۔ 0300-9526991۔ مصروفیت کے باعث طویل خط لکھنے سے قاصر ہوں۔ کہانیوں پر باقاعدہ تبصرہ بھی نہ کر سکا مگر مجموعی طور پر مجھے پرچہ بے حد پسند آیا۔ اگلی ملاقات پر تفصیلی بات ہو گی۔" (ہمیں آپ کی تفصیلی رائے کا انتظار رہے گا)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

خواجہ مدنی، چوک طاہر پیر۔ انعمہ رشید، تونسہ شریف۔ راشد حبیب تابش، چھب، ضلع اٹک۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، نور نگہ میانوالی۔ یوسف مرزا، ملتان۔ سعدیہ بخاری، اٹک۔ عمران حیدر بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ عامر رسول سموٹ، راولپنڈی۔ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ محمد فیضان غنی، ہری پور (ہزارہ)

جنگ آزما

ڈاکٹر ساجد امجد

سمرقند ایک تاریخی مقام... کہ جس کے دامن میں بے شمار واقعات نے جنم لیا... کتنے ہی یادگار چہروں نے اس کی شان بڑھائی... جس کے ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم ہوتی رہی... تاریخ کے اوراق اس شہر زرنگار کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتے۔ ایک بارہ سالہ بچہ... امیر تیمور کا پوتا، ظہیر الدین بابر... جس کا باپ اچانک اقتدار کی مسند سے ہٹا تو وہ ایک بھرپور جوان کی سج دھج سے مرد مجاہد کے روپ میں میدان میں اتر آیا... ایک اور تاریخی کردار خانزادہ، جس نے اپنے بھائی بابر کو اولاد کی طرح چاہا۔ تاریخ نے بہن کی قربانی اور بھائی کی اس محبت کو ایک دلسوز فسانے میں ڈھال دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جدائی کے مقام پر وہ نم آنکھوں سے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ پلٹ کر دیکھنے کا قائل ہرگز نہ تھا مگر... کسے خبر تھی کہ وہ پیچھے رہ جانے والی دھول کو نہیں بلکہ بہن کی اس محبت کو تلاشنے کی کوشش کر رہا تھا جو انتہائی نرمی سے ریت کے مانند اس کی بند مٹھی سے پھسلتی جا رہی تھی مگر وہ اپنے بلکتے جذبوں پر بادشاہت کا پردہ ڈالے آگے بڑھ جانے پر مجبور تھا۔ تاریخ کی یہ کتاب جب جب کھولی جائے گی... ماضی کے یہ اوراق اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات
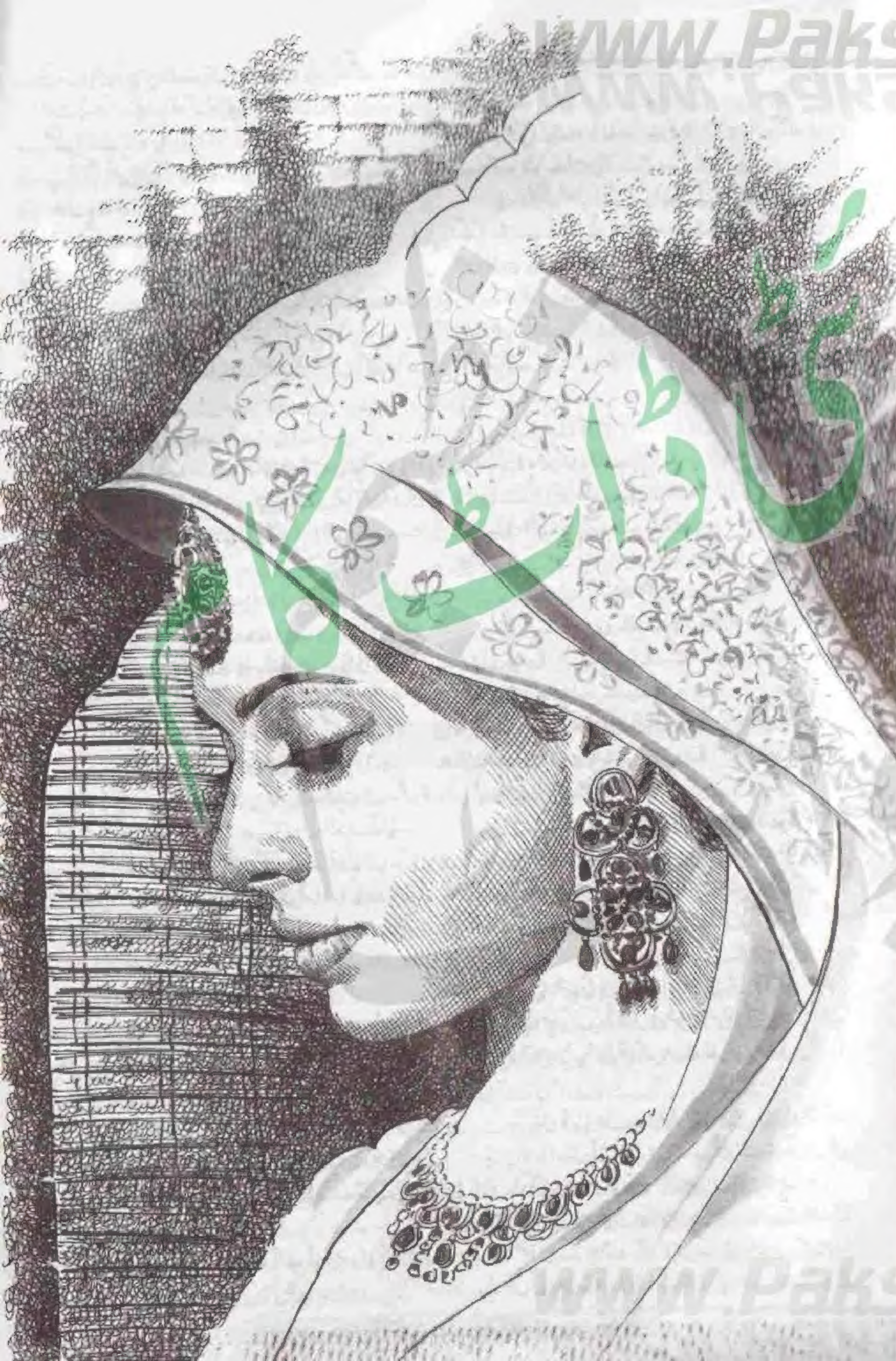
بابر دیوانِ خانے میں بیٹھا کسی کتاب کے قلمی نسخے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ میر خدام نے اس کی مصروفیت میں خلل ڈالا۔

''حکمران، آپ کی مصروفیت میں خلل ڈالنے کی معافی چاہتا ہوں۔''

''جلدی کہو کیا کہنا ہے۔''

''آپ کی والدہ محترمہ ملاقات کی منتظر ہیں۔''

''کیا کہا تو نے؟'' بابر نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا وہ آگئیں؟''

''جی ہاں، ملکۂ عالیہ اور حضور کی ہمشیرہ بھی ساتھ ہیں۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔''

بہن اور والدہ کو دیکھے ہوئے چھ مہینے سے بھی زیادہ ہوگئے تھے۔ عائشہ بیگم کا تو اسے خیال بھی نہیں تھا لیکن وہ نچلی منزل کے کشادہ دیوان خانے میں پہنچا تو عائشہ ہی سب سے پہلے اس کے سامنے آئی۔

عائشہ بیگم نے اپنا سوکھا ہاتھ اس کے شانوں کی طرف بڑھاتے ہوئے فتح کی مبارک باد دی۔ بابر نے ایک غلط انداز نظر اس کے ابھرے ہوئے پیٹ پر ڈالی۔ اس کا مطلب ہے ولادت کا وقت قریب ہے۔

اس کی والدہ بہت تھکی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

''ہمشیرہ خانزادہ نظر نہیں آئیں؟''

''اس کے پاؤں زمین پر کہاں ٹک رہے ہیں۔ محل کا ایک ایک کمرا دیکھتی پھر رہی ہے۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

''ہاں انہوں نے تکلیفیں بھی تو بہت اٹھائی ہیں۔'' بابر نے کہا اور عائشہ نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی کیفیت نگار خانم سے چھپی نہ رہ سکی۔

''تکلیف تو عائشہ بیگم کو اٹھانی پڑی ہے۔ اس حال میں اس کا سفر کرنا کتنا مشکل تھا۔''

''یہ تو ویسے بھی سفر کی عادی نہیں ہیں اور اب تو...... خیر اب مشکلات ختم ہوگئی ہیں۔''

خانزادہ محل کو ادھر ادھر سے جھانک کر آئی تو بابر کو دیوان خانے میں پایا۔ بابر نے اس کی طرف دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کی بڑی بہن اچانک بہت بڑی ہوگئی ہے۔ اس نے واقعی کسی بزرگ کی طرح بابر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''برادرِ عزیز۔ ہمیں آج آپ کی بہادری پر فخر ہو رہا ہے۔''

''ہمشیرہ محترمہ، ہمیں بھی خوشی ہے کہ ہم آپ کے لیے کچھ کر سکے۔''

''ابھی کہاں، ابھی تو آپ کو دادا حضور امیر تیمور کی طرح فتوحات کے ڈھیر لگانے ہیں۔''

بابر کو خوشی ہوئی کہ کم از کم ایک ہستی تو ایسی ہے جو اس کے کارناموں کی شائق ہے ورنہ عائشہ بیگم تو اس کی جنگی مصروفیات سے ہمیشہ شاکی رہی ہیں۔

سمرقند قریب قریب ایک سو چالیس برس بابر کے اجداد کا پایہ تخت رہا پھر ایک اجنبی ازبک دشمن اس پر قابض ہوگیا۔ ایک عظیم کاوش کے بعد یہ لٹا پٹا شہر پھر اسے واپس مل گیا تھا۔

برف باری کا موسم تھا۔ سردیاں عروج کو پہنچیں تو عائشہ بیگم کا بوجھ بھی ہلکا ہوا۔ اس نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام بابر نے فخر النسا رکھا۔ یہ بابر کی پہلی بیٹی تھی لیکن زندگی نے اس کے ساتھ وفا نہیں کی۔ کچھ دن بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

☆☆☆

بابر نے سردیوں کے موسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی نواحی قلعے فتح کر لیے تھے۔ کئی قلعے ایسے بھی تھے جو ازبک خود ہی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

گرمی کا آغاز ہوا تو شیبانی خاں کی قسمت چمک اٹھی۔ اس نے قراکول پر قبضہ کیا۔ ربوس پر قابض ہوا اور لوگوں کا قتل عام کرتا پھر رہا تھا۔

بابر کو یقین ہونے لگا کہ اب شیبانی خاں سمرقند کی طرف ضرور آئے گا۔ وقت آنے سے پہلے اس سے مقابلے کی تیاری کر لینی چاہیے۔ اسے یہ بھی اطلاعات مل چکی تھیں کہ شیبانی خاں نے فرصت کا فائدہ اٹھا کر قابلِ رشک لشکر جمع کر لیا ہے۔

اور پھر شیبانی خاں، بخارا اور دبوسیہ میں حفاظتی فوج اور معتبر حاکم مامور کر کے آندھی کی طرح سمرقند کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اتنا اعلانیہ آرہا تھا کہ راستے میں بابر کو خط بھی بھیجتا آیا۔

''میں آرہا ہوں۔ بہادر ایک دوسرے کی طاقت میدانِ کارزار میں آزماتے ہیں۔ بند قلعے کے اندر تو کوئی بھی پناہ لے سکتا ہے۔ ہمت ہے تو کھلے میدان میں مقابلہ کرو۔''

بابر نے ہمسایوں اور عزیزوں سے مدد مانگی جو اپنی اپنی سلطنتوں کے بادشاہ تھے۔ اس کے چچا سلطان حسین مرزا نے اس کی استدعا کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بیٹے بدیع

الزماں نے بھی توجہ نہیں دی البتہ جہانگیر مرزا نے دو سو آدمی بھیج دیے۔ ایک اور جگہ سے چار پانچ سو آدمی آگئے۔ بمشکل ایک ہزار آدمیوں کا اضافہ ہوسکا۔ شیبانی جیسے طاقتور سے مقابلہ کرنے کے لیے یہ تعداد بہت کم تھی۔ خصوصاً کھلے میدان میں جیسی کہ شیبانی خاں کی فرمائش تھی۔

عائشہ بیگم، بابر کی مصروفیات سے بے پروا اپنے دالان میں پڑی رہتی تھی البتہ خانزادہ، بھائی کی دلجوئی میں لگی ہوئی تھی۔ اس کا تو یہاں تک اصرار تھا کہ وہ مردانہ لباس پہن کر جنگ میں شامل ہوگی۔ بابر کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھنا ناممکن تھا البتہ اس نے یہ اجازت دے دی تھی کہ اس کے جانے کے بعد وہ محل پر متعین حفاظتی دستے کی نگرانی کرتی رہے گی۔

بابر کو قتلق نگار خانم اور خانزادہ بیگم نے دعاؤں کی چھاؤں میں رخصت کیا۔ وہ اپنے لشکر کو لے کر سمرقند سے نکلا اور ''باغِ نو'' پر پڑاؤ ڈالا۔ پھر اسے یہ جگہ عسکری اعتبار سے مناسب معلوم نہیں ہوئی۔ دوسرا پڑاؤ اس نے مقام ''پل'' پر کیا۔ یہ جگہ اسے مناسب معلوم ہوئی۔ حفاظت کے لیے خندق کھودی اور شاخوں کی باڑھ لگا دی۔

دوسری جانب سے شیبانی بھی آیا اور بابر سے ایک فرسنگ کی مسافت پر چھاؤنی ڈال کر بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کو جنگ کرنے کی کوئی جلدی نہیں۔ دونوں فوجوں نے ایک دوسرے سے معمولی جھڑپوں پر اکتفا کیا۔ ایک روز دشمن بہت آگے بڑھ آیا اور فریقین میں خوب لڑائی ہوئی مگر کسی کا پلڑا بھاری نہ تھا۔

خانزادہ کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کی فتح کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ رات رات بھر نیلے محل میں ایک سایہ ادھر سے ادھر ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ خانزادہ تھی جو محل کی حفاظت کر رہی تھی۔

ایک رات شیبانی خاں نے شب خون مارنے کی بھی کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ خندقیں بابر کی حفاظت کر رہی تھیں۔ اس کے امرا خاص طور پر قاسم بیگ خندقوں سے نکل کر حملہ کرنے کے حق میں نہیں تھے بلکہ وہ ابھی کمک آنے کے انتظار میں تھے اور بابر کو جلدی نہ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

شہاب الدین نجومی نے ایک رات دبِ اکبر کے آٹھ ستارے آسمان پر ایک ہی قطار میں دیکھے۔ وہ بھاگا بھاگا بابر کے پاس پہنچا۔

''ذرا ان آٹھ ستاروں کو تو ملاحظہ کیجیے۔''

''دیکھ رہا ہوں۔'' بابر نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہے ان ستاروں میں؟''

''حکمران! ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ یہ ستارے آپ کو ظفریاب کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے اس وقت حملہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر کی تو یہ ستارے ازبکوں کی طرف چلے جائیں گے۔ پھر ان کی فتح لازمی ہوگی۔''

یہ نجومی دراصل شیبانی کا جاسوس تھا جو کچھ دن پہلے ہی بابر کے دربار میں آیا تھا۔ اس وقت بھی شیبانی خان نے ایک جاسوس کو درویش کے بھیس میں شہاب الدین کے پاس بھیجا تھا اور یہ پیغام دیا تھا کہ بابر کو حملہ کرنے پر اکسائے۔ شہاب الدین نے یہ فرض ادا کر دیا۔

بابر نے اسی رات اپنے سپہ سالاروں کو طلب کر کے فوراً لڑائی کی تیاری کا حکم دیا۔ قاسم بیگ پھر اسے روکتا رہ گیا لیکن بابر نے نجومی کی بات کا اعتبار کیا۔

بابر نے دوسرے ہی دن دشمن پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ شیبانی کا لشکر بھی تیار ہوا اور صفیں باندھ لیں۔ بابر کی فوج نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ پہلی صفیں دشمن کے قلب میں گھس گئیں۔ اس کے بڑے بڑے تجربہ کار سپاہی چیخنے چلانے لگے کہ پسپائی اختیار کر لی جائے لیکن شیبانی خاں نے بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور عقب سے ٹوٹ پڑا۔ اب تو ازبکوں کی ایسی ہمت بندھی کہ آگے سے بھی اور پیچھے سے بھی چڑھ آئے اور بابر کی صفوں کو الٹ کر رکھ دیا۔

نیلے محل میں خبریں آنے لگیں کہ بابر نے پسپائی اختیار کی۔

بابر کے تمام تجربہ کار سپاہی مارے گئے۔ وہ خود دریائے کوہک کی طرف بھاگا۔ اس وقت اس کے ساتھ پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے۔ اس نے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور دشمن سے دور نکل گیا۔

خانزادہ کی تسلی کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کا عزیز از جان بھائی زندہ بچ کے سمرقند آگیا ہے اور اب نیلے محل میں ہے۔ شہر کے دروازے بند ہیں۔ شہر کے لوگ بڑی پامردی سے اپنا دفاع کر رہے ہیں۔ بعض اوقات وہ شہر سے نکل کر بھی ازبکوں پر حملے کرتے ہیں۔ یہ تو بابر سمجھتا تھا کہ یہ غیر تربیت یافتہ لوگ ایک تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کب تک کریں گے۔

خانزادہ سمجھ رہی تھی شیبانی خاں دروازوں سے سر ٹکرا کر واپس چلا جائے گا لیکن دو تین دن بعد اس نے محاصرہ کر لیا۔ وہ شاید خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بڑا حملہ کرے۔

اسے معلوم تھا کہ سمرقندی کب تک محاصرہ برداشت کریں گے۔ بابر خود ہی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔

فصل کاٹنے کا موسم آ گیا تھا مگر محاصرے کے سبب شہر کے لوگ فصل کاٹنے کے لیے نہ جا سکے اور نہ باہر سے غلہ شہر میں آ سکتا تھا۔ یہ فصل شیبانی کے آدمی کاٹ رہے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محصور بھوک کے مرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ کتے اور گدھے تک کاٹ کر کھانے لگے۔

آدمی تو بھوک کے مر رہے تھے، گھوڑے بھی بھوک سے مرنے لگے۔ گھاس کی ایک پتی بھی ان کے کھانے کے لیے نہیں بچی تھی۔ ناچار سمرقند کے لوگوں کے حوصلے جواب دے گئے۔ آہستہ آہستہ شہر خالی ہونے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کمک کے لیے خراسان، قندوز اور مغلستان کے بادشاہوں کے نام خطوط لکھے لیکن کسی جگہ سے کوئی کمک نہیں آئی۔ اسی دوران اوزدن حسن جو جہانگیر مرزا کی بغاوت میں احمد تنبل کے ساتھ مل کر اندجان پر قبضہ کرنے کا گناہ گار تھا اور بعد میں آخشی کا حاکم بن کر بابر کے مقابلے پر آیا تھا، دس پندرہ آدمیوں کے ساتھ شیبانی کا ایلچی بن کر آیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس سے ملاقات کے لیے بھی تیار نہ ہوتا لیکن وہ تو خود چاہتا تھا کہ صلح کا کوئی راستہ نکل آئے۔

اوزدن حسن نے صرف ایک شرط اس کے سامنے رکھی اور اسے سمرقند سے نکلنے کے لیے محفوظ راستہ دینے کا اقرار کیا۔ شرط سنتے ہی بابر اتنی زور سے چیخا کہ محل کے در و دیوار لرز اٹھے۔

''یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اوزدن حسن اگر تو ایلچی کی حیثیت سے نہ آیا ہوتا تو میں تیری گردن اڑانے میں دیر نہ کرتا۔''

اس کی للکار سنتے ہی اس کے ساتھ کے آدمیوں نے تلواریں بے نیام کر لیں لیکن اوزدن حسن نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

''ایک جان بچانے کے لیے تم کتنی جانوں کا خون بہاؤ گے۔''

''یہ سوچنا میرا کام ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اپنے مالک سے کہنا یہ شرط مجھے منظور نہیں۔''

اوزدن حسن چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

خانزادہ، اس کی ماں اور نانی محل کی نچلی منزل میں تھیں لیکن بابر اتنی زور سے دہاڑا تھا کہ آواز نیچے تک گئی تھی۔ وہ جیسے ہی نیچے آیا اس کی ماں نے اس کے چیخنے کا سبب پوچھا۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ خانزادہ بھی وہاں موجود ہے۔

''اس بدبخت نے شرط رکھی ہے کہ میں ہمشیرۂ محترمہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں تو وہ ہمیں سمرقند سے زندہ جانے کی اجازت دے دے گا۔''

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ کسی کے پاس کوئی مشورہ نہیں تھا۔ وہی مثال صادق آ رہی تھی۔ ''زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے۔''

بالآخر بابر ہی کو بولنا پڑا۔ ''میں آلِ تیمور کی ایسی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس کا محاصرہ توڑ کر باہر نکلوں گا۔ دیکھتا ہوں وہ زنخا مجھے کیسے روکتا ہے؟''

''ایسے موقعوں پر جذبات سے نہیں ہوش سے کام لیا جاتا ہے۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

''ہاں میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ مجھے سمرقند سے زیادہ اپنے خاندان کی عزت عزیز ہے۔ اس نے ہمیں ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اپنی ہمشیرہ خانزادہ کو بھینٹ چڑھا کر اپنی رہائی نہیں چاہیے۔''

''میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ تم اس کی شرط مان لو۔ تمہیں صاف انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ابھی اسے باتوں میں لگا کے رکھتا تھا۔ شاید کوئی کمک آ جائے۔ شاید کوئی اور سبیل نکل آئے۔ اب تو وہ غصے سے پاگل ہو رہا ہوگا۔ اب تک محاصرہ کیے ہوئے تھا اب حملہ کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔''

''میں کس کا انتظار کروں۔ کون آئے گا۔ آپ کے بھائیوں میں سے بھی کوئی نہیں آیا۔ بس آپ لوگ تیاری کریں، میں دو ایک روز میں کسی بھی اندھیری رات میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔''

خانزادہ خاموش تھی۔ وہ تو بس یہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے بھائی کی زندگی خطرے میں ہے۔

وہ رات کو سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں گیا تو خانزادہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ کچھ دنوں سے عائشہ بیگم سے اس کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ اکیلا ہی سو رہا تھا۔

''آئیے ہمشیرہ آئیے۔ فرمائیے آپ مجھے کیا سمجھانے آئی ہیں۔''

''میرا ایک ہی بھائی ہے۔ مجھے اپنے بھائی کی زندگی درکار ہے۔ اپنی ماں عزیز ہیں، جواب بھاگتے بھاگتے تھک چکی ہیں۔''

''کچھ نہیں ہوتا آپ کے بھائی کو۔ یاد ہے آپ کو آپ اب تک میرے بہادر بھائی کہہ کر مجھے مخاطب کرتی رہی ہیں۔''

''میں اب بھی یہی کہہ کر مخاطب کروں گی لیکن بعض اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ بہادر سے بہادر آدمی کو ان سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔''

''کیا آپ یہ کہنے آئی ہیں کہ میں آپ کو اس بھیڑیے کے حوالے کر دوں؟''

''میرے بہادر بھائی۔ میری عمر پچیس سال ہو گئی ہے اور میں ابھی تک کنواری ہوں۔ آپ کو میری شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا ہے۔ شیبانی ہی سہی۔ ہو سکتا ہے اس شادی کے بعد یہ دشمنی دوستی میں بدل جائے۔ اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو میں اپنی نظروں میں سرخرو تو ہو جاؤں گی کہ میں اپنے بھائی پر قربان ہو گئی۔''

''نہیں ہمشیرہ نہیں۔ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

خانزادہ نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ ''بھائی میں نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ میرے بھائی کی آنکھوں میں آنسو ہوں۔ میں پانچ سال کی تھی جب آپ کو گود میں لیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک آپ کو بہلاتی رہی ہوں۔ آپ کا رونا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں مجھے شیبانی کے پاس جانے دیں۔ میں روئی بھی تو یہ سوچ کر خوش ہو جاؤں گی کہ میرا بھائی راج کر رہا ہے۔ میں شیبانی کو مجبور کر دوں گی کہ وہ آپ کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔''

دونوں بہن بھائی دیر تک باتیں کرتے رہے اور روتے رہے لیکن کوئی حل نہ نکل سکا۔ بابر کسی قیمت پر صلح کی اس شرط کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

شیبانی خاں تک یہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ بابر اس کی شرط ماننے کو تیار نہیں۔ اس نے اسی رات باب فیروزہ کی طرف سے سخت حملہ کیا۔ بابر کے تیراندازوں نے اس کا منہ پھیر دیا لیکن یہ حملہ اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ اب شیبانی، بابر کو سبق سکھانے کا ارادہ کر چکا ہے۔ وہ ایسے حملے اور بھی کرے گا۔ یہی ہوا بھی۔ اگلی رات اس کے فوجیوں نے تین دروازوں پر بہ یک وقت حملہ کر دیا۔ شہر کے مفلوک الحال شہریوں نے بابر کے ساتھ مل کر ان حملوں کو ناکام بنا دیا لیکن جو بھوک سے نہیں مرے تھے وہ شیبانی کے تیروں سے مر گئے۔ صبح ہوئی تو تینوں دروازوں پر شہریوں کی بے شمار لاشیں پڑی تھیں۔ اب اندیشہ یہ تھا کہ ان لاشوں سے جو تعفن اٹھے گا اس سے بیماریاں پھیلیں گی۔ ان لاشوں کو جلد از جلد دفنانے کا انتظام کیا جائے۔ بڑے بڑے کنواں نما گڑھے کھودے گئے اور انہیں ان لاشوں سے پاٹ دیا گیا۔ شہریوں میں سخت خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اب بابر کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ بعض شہری ان مصائب کا ذمے دار بابر کو ہی سمجھ رہے تھے کہ اگر وہ شیبانی سے صلح کر لیتا تو انہیں ان مصائب سے نہ گزرنا پڑتا۔ اسے اپنی بہن کی زندگی عزیز ہے اور دوسرے لوگ کتے بلیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ دوپہر تک بے شمار لوگ شہر سے نکل کر شیبانی کی پناہ میں چلے گئے حتیٰ کہ بابر کے محافظ دستے کا سردار بھی نکل گیا۔ اب دور نہیں تھا کہ تنگ آ کر شہری خود آگے بڑھ کر شہر کے دروازے کھول دیں اور شیبانی اندر چلا آئے۔ اگر ایسا ہو گیا تو نہ اس کی جان محفوظ ہوگی نہ عزت و آبرو کی ضمانت ہوگی۔

''ہم آج رات محاصرہ توڑ کر نکل جائیں گے۔'' بابر نے چیخ کر کہا۔

''آپ جائیں گے کہاں۔ جہانگیر مرزا اندجان میں آپ کو داخل نہیں ہونے دے گا۔'' قاسم بیگ نے کہا۔

''ہم نے اس سے عہد لیا تھا کہ اگر سمرقند پر ہمارا قبضہ ہو گیا تو اندجان اس کا۔ ناکامی کی صورت میں ہم واپس آئیں گے۔''

''وہ اپنے عہد پر قائم رہ سکتا تھا لیکن احمد تنبل پھر اس کے ساتھ مل گیا ہے۔''

''خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔''

''خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔''

خانزادہ بیگم یہ سب گفتگو سن رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بابر اپنی ساری دلیری کے باوجود محاصرہ توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اس کی فوجی طاقت ناکافی ہے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ خود کو دشمن کے حوالے کر کے اپنے بھائی کو موت سے بچا لے گی۔ زندگی رہی تو وہ اپنے بھائی سے بعد میں مل لے گی۔ یوں بھی اگر میرے بھائی کو کچھ ہو گیا تو میری زندگی کس کام کی۔

''ہمشیرۂ محترمہ، ہم آج رات کے آخری پہر میں جب شیبانی کا لشکر نیند سے بے حال ہو رہا ہوگا، شیخ زادہ دروازے سے باہر نکلیں گے۔ آپ تیاری فرمائیں۔''

بابر نے خانزادہ کو اطلاع دی جیسے اسے شک ہو کہ اسی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ خانزادہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اپنے بھائی کے سینے پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔ بابر اس وقت بھی کچھ نہیں سمجھا کہ وہ اسے الوداع کہہ رہی ہے۔ اس کے ساتھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

خانزادہ بیگم نے جو ارادہ کر لیا تھا، اب اس پر اسے

عمل کر رہا تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر [illegible] زیب تن کیا جیسا کہ وہ گشت لگاتے ہوئے اکثر پہن لیا کرتی تھی۔ سر پر ایک اونی ٹوپی پہنی اور محل کے خفیہ راستے سے باہر نکل گئی۔ وہ باب فیروزہ کی طرف جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شیبانی خاں اسی دروازے کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ باہر [illegible] یہی سمجھا ہوگا کہ کوئی بھولا بھٹکا سپاہی ہے۔

دروازے کے قریب پہرے [illegible] بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

"دروازہ کھولو۔ مجھے حکمران بابر کا پیغام لے کر باہر جانا ہے۔"

"کون ہو تم۔"

"قاصد۔"

"آقا بابر کا کوئی فرمان؟"

"یہ دیکھو۔" اس نے ایک پرچہ آگے کر دیا۔ اس پرچے پر خانزادہ نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا۔ "یہ ہمارا قاصد ہے اسے باہر جانے دو۔"

دروازہ کھل گیا۔ خانزادہ باہر نکل گئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید پرچم تھا جسے بلند کر کے وہ لشکر کی طرف بڑھنے لگی۔ سپاہی دور سے دیکھ رہے تھے کہ کوئی باب [illegible] سے نکلا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سفید پرچم ہے۔ فوراً شیبانی کو خبر کی گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"بابر نے آخر گھٹنے ٹیک ہی دیے۔ اب خاندان تیمور کی عزت میرے پاؤں کے نیچے۔ اب بابر کا بدلہ [illegible] بہن سے لوں گا۔ اس سے شادی ضرور کروں گا۔ [illegible] کر رکھوں گا۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ پھر اس نے خبر لانے والوں کو ہدایت کی کہ قاصد کو نہایت احترام سے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

جلد ہی قاصد کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

"کیا پیغام لائے ہو۔ بابر سے صلح یا اس کی موت؟"

خانزادہ نے اپنی ٹوپی سر سے اتار دی۔ اس کے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے۔ شیبانی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم...... تم تو لڑکی ہو۔ اب بابر قاصد کے نام پر لڑکیاں بھیجنے لگا ہے۔"

"میں خانزادہ ہوں۔ بابر کی بہن، میں تمہاری شرط پوری کرنے آئی ہوں۔"

شیبانی اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ اس نے جسے ایک بار دور سے دیکھا تھا۔ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہوگی۔ شیبانی کی آنکھیں اس کے سراپا ٹٹول رہی تھیں۔ اس نے اب تک جتنی بیویاں کی تھیں، خانزادہ ان سب سے خوبصورت تھی۔

"میں تمہاری شرط پوری کرنے کے لیے خود آ گئی ہوں۔ کیا اب بھی تم میرے بھائی کو بہ حفاظت نہیں نکلنے دو گے؟"

"[illegible] اپنے وعدے [illegible]۔"

"میں نکاح کے لیے تیار [illegible]۔"

"صبح ہوتے ہی یہ فرض بھی انجام [illegible] جائے گا۔"

"لیکن میری شرط؟"

"جب تم آ ہی گئی ہو تو تمہاری ہر شرط مانی جائے گی۔"

"میں ایک قیدی بھائی کی قیدی بہن ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میرے بدنصیب بھائی کو سمرقند سے جانے دیا جائے۔ وہ اپنے لیے جو راستہ تلاش کرے آئندہ آپ اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔"

"میں ابھی اپنے سپاہیوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ بابر کو جانے دیں۔ حالات آئندہ کا [illegible] کرتے ہیں اس کا میں وعدہ [illegible]"

"[illegible] میرے بھائی [illegible] کبھی [illegible] گے۔"

"اب تم آ گئی ہو۔ خود دیکھ لو گی میں کیا کرتا ہوں۔"

یہ ایک گول مول جواب تھا کہ خانزادہ مطمئن نہیں ہوئی تھی لیکن اسے اپنے بھائی کی زندگی عزیز تھی۔ اس نے اسی پر اکتفا کیا کہ شیبانی اسے محاصرے سے نکل جانے کی اجازت دے رہا ہے۔

شیبانی نے اپنے گشتی دستے کو فوراً پیغام بھجوا دیا کہ بابر کو نکل جانے دیا جائے۔

بابر اس وقت الغ بیگ کے مدرسے میں تھا۔ وہیں سے اس نے قاسم بیگ کو شہر سے باہر نکل کر جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ اس نے آ کر بتایا کہ گشت پر کوئی نہیں ہے۔ سب غافل ہیں۔ بابر نے اسے اپنی خوش قسمتی تصور کیا اور قاسم بیگ کو نیلے محل کی طرف روانہ کیا۔

"تمام خواتین کو گھوڑا گاڑیوں میں سوار کر کے شیخ زادہ کے دروازے پر پہنچو۔ میں بھی پیچھے پیچھے سپاہیوں کو سمیٹ کر وہاں پہنچتا ہوں۔"

وفادار قاسم بیگ نیلے محل میں پہنچا اور قتلق نگار خانم سے کہا کہ وہ تمام عورتوں کے ساتھ ان گاڑیوں میں سوار ہو جائیں۔ اس نے یہ تاکید بھی کی کہ اس وقت گشت پر کوئی موجود نہیں ہے ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہے۔

محل میں ہلچل مچ گئی۔ تیاری پہلے ہی کر لی گئی تھی، جس کے سامنے جو گھوڑا گاڑی آئی وہ اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی بانوں نے گاڑیاں دوڑائیں۔ بابر اپنے رفقا کے ساتھ دروازے پر [illegible] موجود تھا۔

[illegible] سواروں، پیدل سپاہیوں [illegible] گھوڑا گاڑیوں نے دروازے کو پار کر لیا۔ تمام [illegible] کر لیا تھا کہ کس راستے سے جانا تھا۔ وہ معروف [illegible] چھوڑ کر [illegible] اور نالوں کو پار کرتے ہوئے اس [illegible] پر خطر راستے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ قافلہ [illegible] کی آنکھوں میں دھول جھونک کر باہر نکل آیا تھا۔ اسے [illegible] اختیار کرنا پڑ رہا تھا کہ کئی مرتبہ راستہ بھٹک [illegible] گیا۔

بابر سمرقند چھن جانے پر اداس ضرور تھا لیکن یہ سوچ کر خوش بھی تھا کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کو صحیح سلامت بچا کر نکل لایا ہے۔ اسی وقت قاسم بیگ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کے پاس آیا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے گھوڑا پھیرا اور قتلق نگار کی سواری کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جو کچھ سنا اس سے آگے سننے کی تاب نہیں تھی۔ قافلے میں خانزادہ نہیں ہے۔ یہ ابھی ابھی معلوم ہوا تھا۔

"نکل جانے کی جلدی میں کسی نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔" نگار خانم کہہ رہی تھیں۔

"وہ بچی تو نہیں تھی جسے پکڑ کر بٹھایا جاتا جبکہ میں نے ان سے ابتدائے شب ہی میں کہہ دیا تھا کہ آج رات ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ وہ کہیں محل میں سوتی تو نہیں رہ گئیں۔ باہر شیبانی کی فوجیں پڑی ہوئی ہیں ہم انہیں دیکھنے بھی نہیں جا سکتے۔"

شور مچا تو ایک ملازمہ سامنے آ گئی۔ "میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ مجھے ماریں یا زندہ چھوڑ دیں۔ میں آپ کو حقیقت بتاتی ہوں۔ میں نے انہیں باب فیروزہ کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اکیلی اور مردانہ لباس میں۔ میں اس لیے خاموش رہی کہ میرا خیال تھا وہ واپس آ جائیں گی۔"

بابر اب سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس دروازے کے قریب ہی شیبانی کا پڑاؤ ہے۔ وہ یقیناً شیبانی کے پاس پہنچ گئی ہوگی۔ وہ شروع ہی سے اصرار کر رہی تھی کہ میں شیبانی کی شرط مان لوں۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آنے لگا تھا کہ اس وقت شیبانی کے سپاہی گشت پر کیوں نہیں تھے۔ قتلق نگار، خانزادہ کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں۔

"آپ کیوں روتی ہیں۔ وہ مجھ پر قربان ہو گئی ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ ایک بھائی کی بات نہ مانتیں، ایک بادشاہ کا حکم تو مانتیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ مجھے شیبانی کی شرط منظور نہیں۔ انہوں نے میری حکم عدولی کی ہے۔ خدا انہیں شیبانی کے پاس خوش رکھے۔"

بابر جو اپنی بہن کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا، اس وقت پتھر کا ہو گیا تھا۔ اس نے قافلے کو آگے چلنے کا حکم دے دیا لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہے حالانکہ وہ پلٹ کر دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔

یہ قافلہ ذرا آگے بڑھا تھا کہ "سعد" کی پر پیچ نہروں اور ان سے سیراب ہونے والے باغات میں پھنس کر راستہ بھول گیا۔ بڑی مشکلوں سے "خواجہ دیدار" پہنچا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سمرقند پر حملہ کرنے سے پہلے شیبانی خاں ٹھہرا تھا۔ اس کے قیام [illegible] آثار یہاں ابھی تک موجود تھے۔

[illegible] ڈیڑھ دو سو سپاہیوں پر مشتمل یہ لشکر رواں دواں تھا۔ ایک منزل سے دوسری منزل۔ جب وہ فرغانہ کے نزدیک پہنچا تو اسے یہ اطلاع ملی کہ اندجان اس کے ہاتھ سے چلا گیا۔ وہ جب سمرقند کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا تھا تو یہ طے ہوا تھا کہ خجند سے آخشی تک کا علاقہ جہانگیر مرزا کا اور اندجان کی سمت کا ملک بابر کے قبضے میں رہے گا۔ سمرقند فتح ہو گیا تو اندجان جہانگیر مرزا کو دے دیا جائے گا۔

سمرقند فتح ہو گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اسے اب پھر نکلنا پڑا تھا۔ اندجان پر جہانگیر کا قبضہ تھا۔ بابر کی عدم موجودگی میں احمد تنبل نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے تھے اور فرغانہ کے کئی شہروں پر قابض ہو گیا تھا۔ بابر کے لیے لازمی تھا کہ وہ ان علاقوں کو دوبارہ فتح کرے۔ ڈیڑھ دو سو سپاہیوں کے ساتھ ان علاقوں کو فتح کرنا ممکن نہیں تھا۔

وہ کھلے صحرا میں بیٹھا تھا۔ اندجان جا نہیں سکتا تھا، سمرقند کے دروازے اس پر بند تھے۔ اس نازک وقت میں قتلق نگار خانم نے اسے تاشقند چلنے کا مشورہ دیا تا کہ وہ اپنے بھائیوں سے مل سکیں اور ان کی مدد لے کر اندجان بھی بابر کو دلا سکیں۔ یہ بات بابر کی سمجھ میں بھی آ گئی۔

اب ایک اور سفر درپیش تھا۔ یہ قافلہ تاشقند جا رہا تھا۔ بابر کو اپنے ماموں سے کچھ زیادہ امید نہیں تھی۔ وہ انہیں پہلے بھی آزما چکا تھا۔ وہ چونکہ ڈوبنے کے قریب تھا لہٰذا تنکے کی

تلاش میں چلا جا رہا تھا۔

اسی سفر میں اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی چھوٹی خالہ اور نانی اس دنیا سے رخصت ہو گئی ہیں۔

وہ تاشقند پہنچا تو اس کے ماموں محمود خاں اس سے بہ ظاہر خوش دلی سے ملے لیکن سرد مہری ان کے انداز سے ظاہر تھی۔ بابر نے اس سرد مہری کو نظر انداز کیا کیونکہ اس وقت وہ ایک فقیر کی حیثیت سے آیا تھا، بادشاہ نہیں تھا۔ یہی بات اس نے قاسم بیگ سے کہی تھی۔ اس کے سپاہی شہر سے باہر پڑے ہوئے تھے اور وہ محل میں تھا۔ اسے یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کے سپاہی اسے چھوڑ کر نہ چلے جائیں۔

عائشہ بیگم اس سے خفا ہو کر اپنی بہن رضیہ سلطان کے محل میں منتقل ہو گئی تھی۔ بابر بھی کچھ دنوں اس سے ناراض رہا لیکن پھر اسے دیکھنے رضیہ سلطان کے محل جا پہنچا۔ رضیہ سلطان سخت غصے میں تھیں۔ محمود خاں کی بیوی تھیں اس لیے بابر سے دبنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خوب سخت سست سنائیں۔ بابر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیے۔

''آپ دیکھتے نہیں ہیں۔ عائشہ بیگم آپ کے ساتھ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے ہڈیوں کا ڈھانچ بن گئی ہے۔''

''میری اور ان کی قسمت مشترک ہے۔'' بابر نے کہا۔ ''ٹھوکریں میں بھی کھا رہا ہوں، تکلیف یہ بھی اٹھا رہی تھیں۔''

''یہ قسمت اسے آپ نے عطا کی ہے۔''

''پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''آپ تاشقند میں رہیں۔ قسمت آزمانے کے لیے کسی میدان جنگ کا رخ نہ کریں۔ اگر آپ کو ایسے ہی لٹیروں کی زندگی گزارنی تھی تو شادی نہ کرتے۔''

انہوں نے اتنی سخت بات کہہ دی تھی کہ بابر اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ ''میں آپ سے بات کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے عائشہ سے بات کرنے دیں۔'' پھر وہ عائشہ سے مخاطب ہوا۔ ''میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

''میں اب تاشقند سے باہر کہیں جانے کو تیار نہیں۔ سفر کے نام سے میری روح لرز اٹھتی ہے۔ یہی حال رہا تو میں بھی کسی دن خانزادہ کی طرح کسی شیبانی کی بھینٹ چڑھا دی جاؤں گی۔''

اس نے ایسا طنز کر دیا تھا کہ بابر کی روح کانپ اٹھی۔ ''ہمیں افسوس ہے کہ ہم خانزادہ کی حفاظت نہ کر سکے لیکن تمہاری حفاظت کی قسم کھاتے ہیں۔ آپ یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ شیبانی یہاں بھی حملہ آور ہونے والا ہے۔''

''میں یہاں اپنوں میں ہوں۔ یہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں۔''

''اور میں؟ میں تمہارا اپنا نہیں؟''

''اپنے ہوتے تو میرے ساتھ رہتے۔ آپ مجھے مار کے ساری دنیا کو فتح کرنے چلے ہیں۔''

''کیا تمہیں عظیم بادشاہ کی بیوی بننا پسند نہیں؟''

''کیا بات ہے عظیم بادشاہ کی۔'' اس نے حقارت سے کہا۔

''یاد ہے تم نے مجھے کبھی نجات دہندہ کہا تھا۔ میں تمہیں ایک مرتبہ پھر اپنی قید سے نجات دے رہا ہوں۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ مجھے پوری طرح آزاد کر دیں۔''

بابر نے اسے اسی وقت طلاق دے دی اور بڑے ماموں کی خدمت میں پہنچ گیا۔

''میں آپ پر زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں، میرے گزارے کے لیے آپ مجھے کوئی جگہ عنایت فرما دیں۔''

وہ تو خود یہی چاہتے تھے کہ یہ بوجھ سر سے اترے۔ اس کی موجودگی سے انہیں یہ خطرہ ہونے لگا تھا کہ شیبانی اس کا پیچھا کرتے ہوئے کہیں یہاں بھی نہ آ جائے۔ اسی خوف کی بنا پر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اچھہ خاں کو ملک خطا سے اپنے پاس بلانے کے لیے خط لکھ دیا تھا۔ اب جو بابر نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو فوراً تیار ہو گئے اور اسے اوراتیپہ عطا کر دیا۔

اوراتیپہ پر محمد سیف مرزا قابض تھا۔ بابر اس خیال سے چل پڑا تھا کہ جب یہ شہر اس کے ماموں نے اس کے حوالے کر دیا ہے تو محمد سیف کو بھی خبر کر دی ہو گی اور وہ یہ شہر اس کے حوالے کر دے گا لیکن محمد سیف نے شہر حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ وہ محمد سیف سے جنگ کرے اور شہر پر قبضہ کر لے۔ اس نے اپنے لشکر پر نظر ڈالی تو اسے لشکر کہنا بھی لشکر کی توہین تھی۔ اتنے کم سپاہیوں کے ساتھ وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک پہاڑی گاؤں دہکت میں پناہ لے لی۔ یہاں تاجک نسل کے لوگ آباد تھے لیکن ترکوں کی طرح گھوڑے اور بھیڑیں پالتے تھے۔ یہاں وہ ایک معزز شخص کا مہمان بنا۔ گاؤں کے لوگ یہ سوچ کر اس کی عزت کرتے تھے کہ وہ فرغانہ اور سمرقند کا حاکم رہ چکا ہے۔

ایک مرتبہ وہ پھر ایسے ہی حالات سے دوچار ہوا جن کا شکار وہ سمرقند جانے سے پہلے ہوا تھا۔ گرمیوں نے سردیوں کی چادر اوڑھی تو اس کے ساتھیوں میں سے بہت سوں نے اس سے اندجان جانے کا اذن طلب کیا اور وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

ہر حال میں خوش رہنا بابر کے مزاج کا حصہ تھا اور یہی اس کی کامیابی کا راز بھی تھا۔ وہ اندجان کی حکمرانی میں بھی خوش تھا۔ سمرقند کے نیلے محل میں بھی خوش تھا اور اب اس غربت میں بھی خود کو خوش رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے سنگلاخ پہاڑوں میں پیدل گھومنا شروع کر دیا۔ آس پاس کی بستیوں میں چلا جاتا۔ گلہ بانوں کے پاس بیٹھ کر غم غلط کرتا۔ اس طرح وہ راستوں سے بھی واقف ہو رہا تھا اور دشمن پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔

موسم بہار آیا تو خبر آئی کہ شیبانی خاں نے اوراتیپہ پر حملہ کر دیا ہے۔ اس نے یہ جگہ فوراً چھوڑ دی اور ایک دوسرے پہاڑی سلسلے کوہستان مسیحا میں قیام کر لیا۔

شیبانی خاں جلدی میں تھا۔ آیا اور گیا۔ وہ کوہستان مسیحا میں دبکا بیٹھا رہا لیکن اسے یہ یقین ضرور ہو گیا کہ شیبانی اس کی تلاش میں ہے۔ اگر نہیں بھی ہے تو وہ اس علاقے میں منڈلا ضرور رہا ہے۔

وہ سخت پریشان تھا۔ نہ گھر تھا نہ قلمرو۔ پہاڑوں پر چڑھتے اترتے تنگ آ چکا تھا۔ آدھے سے زیادہ ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اگر ایسے میں شیبانی اس پر ٹوٹ پڑے؟ اسے پھریری آ گئی۔ وہ ان پہاڑوں سے نکلا اور ایک مرتبہ پھر ماموں کے پاس چلا گیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بابر کی پریشانیوں میں اضافہ بھی اسی حساب سے ہو رہا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے دن بیکار بیٹھا ہو۔ جیب میں کچھ نہیں تھا کہ لشکر جمع کرتا یا لشکر کو ساتھ لے کر گھومتا۔ ماموں کی بیوی جس کی بہن کو وہ طلاق دے چکا تھا، اسے ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جیسے وہ اسے پال رہی ہو۔ آخر وہ اس بے کیف زندگی سے تنگ آ گیا۔ اس نے سوچا وہ شمالی چین کے ملک خطا کی طرف چل دے۔

وہ اپنے ماموں سے اجازت لیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ پھر اسے ایک بہانہ سوجھ گیا۔ اپنے چھوٹے ماموں اچھہ خاں سے ملاقات کے بہانے یہاں سے نکلا جا سکتا ہے۔ اس نے ماموں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن اس وقت اس کے سب بہانے دھرے رہ گئے جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اچھہ خاں خود تاشقند آ رہے ہیں۔

محمود خاں نے چھوٹے بھائی کو اس لیے بلایا تھا کہ اس کے ساتھ مل کر احمد تنبل سے مقابلہ کریں اور فرغانہ کی وادی اس سے خالی کرا لیں۔ اس عرصے میں شیبانی سے ان کا معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ الگ تھلگ رہے گا۔

قاصد نے خبر دی ہے کہ اچھہ خاں تاشقند کے نواح میں پہنچ چکے ہیں۔ تمام اہل خانہ ان کے استقبال کے لیے تاشقند سے باہر نکلے۔

اچھہ خاں نے اپنے نوجوان بھانجے کو اپنے ہتھیاروں میں سے کچھ ہتھیار اور اپنی سواری کا گھوڑا اور مغلئی ٹوپی عنایت کی اور تاشقند کے محل میں داخل ہوئے۔

کئی دنوں کی مشاورت کے بعد یہ طے ہوا کہ احمد تنبل سے مقابلہ کیا جائے اور اس باغی کو فرغانہ سے نکال باہر کیا جائے۔ چھوٹا خاں صرف دو ہزار شمشیر زن اپنے ساتھ لایا تھا لیکن بڑے خاں (محمود خاں) کے پاس بہ کثرت مسلح سوار تھے۔ فوجوں کی کل تعداد تیس ہزار تھی جو احمد تنبل سے مقابلے کے لیے بہت تھی۔ بابر بھی خوش تھا کہ اب وہ اس کثیر فوج کے ساتھ جائے گا اور اپنے علاقے دوبارہ حاصل کر لے گا۔

ان سب نے مل کر آخشی پر چڑھائی کر دی۔ ایک مقام پر پہنچ کر خبر آئی کہ تنبل بھی فوج کے ساتھ آخشی آن پہنچا ہے۔ دونوں ماموؤں نے بابر کو ایک دستۂ فوج دے کر حکم دیا کہ تنبل کے عقب میں جا کر اس پر چڑھائی کر دے۔ بابر نے دریائے خجند عبور کیا اور اوش پر چڑھائی کر دی۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ شہر پر بغیر لڑے قبضہ ہو گیا۔ لوگ تو چڑھتے سورج کے پرستار ہوتے ہیں۔ اسے یہ فتح ملی تو اردگرد کے علاقوں کے سردار جوق در جوق اس کے پاس آنے لگے اور اس سے فرمانبرداری کا اقرار کیا۔ کچھ دن بعد مرغینان کے لوگوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور تنبل کے مقرر کردہ حاکم کو بڑی ذلت کے ساتھ شہر سے نکال دیا۔

فرغانہ کے جتنے اہم شہر اور مقامات تھے، اندجان کے سوا سب اس کی اطاعت میں آ گئے۔

ادھر احمد تنبل اس کے ماموں کے سامنے ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ بابر نے موقع غنیمت جانا۔ تنبل کو مصروف دیکھ کر اندجان کی طرف بڑھا۔ احمد تنبل نے صرف سو آدمیوں کے ساتھ بابر کا تعاقب کیا۔ بابر کے پاس بھی اس وقت صرف دس سپاہی تھے۔ تنبل سے اس کا دوبدو مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں ایک تیر بابر کی ران میں لگا۔ بابر نے چابک دستی سے گھوڑے کا رخ پھیرا اور اسے ایڑ لگائی۔ راستے میں ایک ندی آئی جو اس وقت پایاب تھی۔ اس وقت

تک اس کے ساتھی بھی آگئے تھے۔ اس نے ندی پار کر لی۔ اس کے بہت سے آدمی پکڑے گئے۔

وہ جیسے تیسے اوش پہنچا اور بڑے ماموں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اسے اطلاع دی کہ اس کے مقبوضہ مقامات چھوٹے ماموں کو دے دیے گئے ہیں۔ چھوٹے ماموں یہاں رہ کر مقابلہ کریں گے۔ ان کی گزر اوقات کے لیے ضروری ہے کہ کچھ مقامات ان کے پاس ہوں۔

بابر کے ساتھیوں نے اسے ورغلایا کہ اس حق تلفی کے لیے وہ احمد تنبل سے سمجھوتا کر لے اور ان دونوں بھائیوں (ماموؤں) کو یہاں سے نکال دے لیکن بابر کی مروت نے یہ گوارا نہیں کیا۔ ماموں کی ہدایت پر آخشی پر حملہ کرنے چل دیا۔ بایزید نے جو احمد تنبل کا چھوٹا بھائی تھا لڑے بغیر اس کا استقبال کیا اور قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔ بابر اپنے والد کے محل میں ٹھہرا۔ اس بے بسی کے دور میں باپ کا محل مل جانا اس کے لیے طمانیت کا باعث ہوا۔ پائیں باغ میں باپ کی قبر تھی۔ فصیل کے طاقوں، کنگوروں پر کبوتر غٹرغوں کر رہے تھے۔ قدیم خدمت گار آ آ کر ہاتھ چوم رہے تھے۔

بایزید نے اتنی آسانی سے آخشی اس کے حوالے اس لیے کر دیا تھا کہ وہ اپنے دونوں ماموؤں سے الگ ہو جائے اور وہ دونوں تنہا رہ جائیں۔ ان کے اکیلے ہوتے ہی احمد تنبل نے اپنی مدد کے لیے شیبانی خاں کو بلا لیا۔ اس کی آمد کے شور نے وادی کے حالات ہی بدل دیے۔ چالاک بایزید نے ایک داؤ اور چلا کہ بابر کے منحرف بھائی جہانگیر مرزا کو بھی جو اپنے کیے پر نادم تھا یہیں لے آیا۔

عمر شیخ کے تینوں بیٹے اس نے ایک جگہ جمع کر لیے تھے۔ کسی بھی جلاد کی ایک ضرب تینوں کے لیے کافی تھی۔ اس کا ایک امیر سید قاسم جسے ایک دور کے قلعے میں تعینات کیا گیا تھا، قلعہ چھوڑ کر آ گیا۔ یہ ایک سنگین غلطی تھی۔ کوئی ایک قلعہ تو اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔ وہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اب یہی طے ہوا کہ یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔ بایزید نے پیچھا کیا لیکن وہ ہوا ہو گیا۔

بابر راستہ بھول گیا تھا۔ دونوں خانوں کے پاس جانے کے لیے بے تاب تھا لیکن راستہ نہیں مل رہا تھا۔

بابر اس وقت ہر طرف سے مایوس ہو کر ایک باغ کے ایک گوشے میں دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ جو بچے کھچے ساتھی رہ گئے تھے وہ بھی وہیں تھے کہ اس وقت عجیب ماجرا ہوا۔ اس کے دو جاں نثار عسکری باغ کی دیوار توڑ کر آ پہنچے۔ وہ اندجان میں تھے کہ انہوں نے خواب میں بابر کی پناہ گاہ دیکھ لی تھی۔

انہوں نے بابر کو وہاں سے نکالا اور تاشقند جانے کی ٹھانی لیکن ماجرا کچھ اور ہی ہو گیا۔ ایک قاصد آیا۔ یہ قاسم بیگ تھا جو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر آیا تھا۔

شیبانی خاں نے احمد تنبل سے خفیہ معاہدہ کیا۔ وہ دونوں خانوں کو جنگ میں الجھائے رہا اور شیبانی کسی بھیڑیے کی طرح غیر متوقع تاشقند پر حملہ آور ہو گیا۔ شیبانی کے لشکریوں نے تین دن تک شہر کو جی بھر کے لوٹا۔ پھر حرم کی خواتین قید کر لی گئیں۔ ان میں بابر کی ماں بھی تھی۔

بابر کے ماموں [illegible] دولت [illegible] شیبانی کے بیٹے تیمور سلطان کی تیسری بیوی بنی۔ سولہ سالہ [illegible] خانم کو شہباز نے اپنے لیے پسند کر لیا۔

''اور [illegible] اور [illegible] ایک وہاں عائشہ بھی تو تھی۔''

بابر نے قاصد سے پوچھا۔

''وہ شیبانی کے پچپن سالہ چچا کوچ کنجی کے حصے میں آئی۔''

بابر نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ عائشہ سے اب اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن بہرحال وہ اس کی بیوی تو رہ چکی تھی۔

اس کے بعد [illegible] شیبانی خاں مشرق کی طرف [illegible] مغل فوجوں [illegible] کا [illegible] بھی نہیں دیا۔ گردِ راہ کی طرح منتشر [illegible] گئے اور [illegible] خاں کسی نہ کسی طرح [illegible] کی طرف [illegible] محمود خاں [illegible] شیبانی [illegible] گئے۔ بعد میں محمود خاں بھی [illegible] دیا گیا۔

اب [illegible] فرغانہ بلکہ دریا پار تک کا علاقہ بلا شرکت غیرے شیبانی کے زیرِ نگیں تھا۔ اس نے اپنی خانہ بدوش قسم کی ایک سلطنت قائم کر لی تھی اور سمرقند میں میر تیمور کے تخت پر خود متمکن ہو گیا۔

شیبانی خاں صرف بہادر نہیں، سفاک بھی تھا اور آلِ تیمور سے تو وہ خاص پرخاش رکھتا تھا۔ تاشقند کو اجاڑ کر اس نے جیسے اپنے انتقام کی پیاس بجھالی تھی۔ یونس خاں کے خانوادے سے اس نے خوب بدلہ لیا تھا۔ اس کے گھرانے کی عورتیں اب اس کی باندی بنی ہوئی تھیں۔ ان میں خانزادہ بھی شامل تھی جو سمرقند میں شیبانی کے ساتھ ہی تھی۔ تاشقند کی غارت گری کے بعد وہ سمرقند پہنچا تو خانزادہ اسے اس چڑیا کی طرح لگی جس کے سارے پر نوچ دیے گئے ہوں۔

''جانتی ہو اس مہم میں جہاں سے میں ہو کر آ رہا ہوں کیا ہوا؟''

''مجھے تمہاری مہمات سے کوئی غرض نہیں۔'' خانزادہ نے اٹھتے ہوئے کہا لیکن شیبانی نے اسے اتنی زور سے گھسیٹا کہ وہ اوندھے منہ زمین پر گر گئی۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

''میں نے تمہارے بڑے ماموں کو قتل کرا دیا۔'' یہ سنتے ہی خانزادہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ''ارے چنگائی کیوں ہو۔ اس کی [illegible] میرے بیٹے کے تصرف میں ہے اور [illegible] لے آیا ہوں۔ اب تمہاری ضرورت کم کم ہی پڑا کرے گی۔''

''خدا کے لیے شاہ بخت! یہ تم مجھے کیوں سنا رہے ہو؟''

''اس لیے کہ تم بھی میرے انتقام کا ایک حصہ ہو۔ تمہارے نانا یونس خاں نے میرے دادا کو قتل کرایا تھا۔ تم سب میرے مجرم ہو۔''

''اگر میں [illegible] بری تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟''

''تو فاحشہ تھی۔ خود ہی میرے پاس چل کر آئی تھی۔ پھر میں کیا کرتا۔''

''میں تو اس لیے آئی تھی کہ میرے بھائی کی زندگی سلامت رہے۔''

''تیرا یہ خواب میں پورا ہونے نہیں دوں گا۔ وہ مجھ سے بچ کر بھاگتا پھر رہا ہے لیکن میں اسے پکڑ کر دم لوں گا۔ پھر اس کا سر تیرے قدموں میں رکھوں گا۔''

''خدا کے لیے شاہ بخت۔ ایسا مت کرنا۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ برسوں گزر گئے میں نے اسے دیکھا تک نہیں میرے لیے یہی سزا بہت ہے۔ میں اسے نہ دیکھوں لیکن وہ زندہ ہے میرے لیے یہی بہت ہے۔ وہ اگر مل بھی جائے تو اسے میری خاطر زندہ رہنے دینا۔''

''میں تجھے رکھے ہوئے ہوں کہ بابر کا حشر تجھے دکھاؤں۔ اگر میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا تو پھر تو بھی میرے پاس نہیں رہے گی۔''

''اپنے بھائی کے دشمن کے پاس میں خود بھی رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے ابھی طلاق دے دو۔''

''ابھی نہیں۔ یہ فیصلہ کروں گا لیکن وقت آنے پر۔''

اس بک بک کے بعد شیبانی پھر کسی مہم پر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

ازبکوں کے کھوجی بابر کی تلاش میں تھے۔ بابر کے دونوں ماموں اس کی پہنچ سے دور تھے۔ اب وہ ان سے کوئی مدد نہیں لے سکتا تھا۔ ایک ماموں قتل ہو گئے تھے دوسرا چھوٹا ماموں اپنے علاقے کی طرف بھاگا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد مر گیا تھا۔ اس سرزمین پر اب بابر کا کوئی حامی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو سو کے قریب سپاہی اب بھی تھے جو اس امید میں اس کے ساتھ لگے چلے آتے تھے کہ شاید بابر کے دن پھر جائیں لیکن ان کا حال یہ تھا کہ زیادہ تر بے سواری کے پیدل، تلواروں کی جگہ ہاتھوں میں لاٹھیاں، بھیڑ کی کھالوں کے کوٹ شانوں پر ڈالے ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔ صرف دو خیمے ساتھ تھے۔ مہم جو بابر ابھی تھکا نہیں تھا۔ وہ ان پہاڑی پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا جنہیں وہ خوب جانتا تھا۔ اسے ایک بار پہاڑ کے درے سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا جسے تھوڑی دیر بعد ہی برف نے بند کر دیا۔ ان برف پوش پہاڑیوں میں وہ ایک سال تک نہایت تکلیف دہ حالات میں گزارہ کرتا رہا۔ یہاں سے نکل کر وہ کوہستانِ سفید کے قبائل ایماق کا مہمان بنا ہوا تھا۔ قبائل اور یہ پہاڑ اس سے واقف تھے۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں پناہ لے چکا تھا۔

وہ ان قبائل میں بابر مہمان بنا ہوا تھا کہ شیبانی خاں نے اس کی ماں کو [illegible] یا [illegible] حال میں کہ فرغانہ سے باہر [illegible] کا پتا کسی کو نہیں تھا، اس کی ماں کو بھی نہیں۔ اس کی قسمت تھی کہ وہ بابر تک پہنچ گئی۔ بابر نے ایک خفیہ قاصد فرغانہ کی وادی کی طرف جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ نگار خانم اسے مل گئیں۔ وہ انہیں بابر تک لے آیا۔

بابر اپنی ماں کو زندہ دیکھ کر خوش تو بہت ہوا لیکن یہ سوچنے ضرور لگا کہ شیبانی کے لیے اسے رہا کرنے کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ شیبانی نے سوچا ہوگا کہ بیمار ماں میرے ساتھ ہوئی تو مجھے ڈھونڈنے میں آسانی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے خلاف توقع ایک فیصلہ کر لیا۔ بس بہت ہو چکا۔ ''میرا ملک میری رعایا'' کہتے کہتے میری زبان خشک ہو گئی۔ اب مجھے کوئی ایسا مسکن تلاش کرنا چاہیے جو میرا مستقل ٹھکانا ہو۔ جہاں میں اہلِ خانہ کی فکر کیے بغیر رہ سکوں۔ اس نے آن کی آن میں میر دریا اور قدیم دارالسلطنت سمرقند کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

دس برس کی کدوکاوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اجداد کی زمین چھوڑ کر ان پہاڑوں کی طرف چل دیا جن کے اس پار کابل تھا۔ اس نے سوچا، یہ تھکا دینے والا سفر ضرور ہوگا لیکن وہاں کوئی شہر ایسا ضرور ہوگا جس کے گرد سمرقند جیسے باغ تیار کیے جا سکیں گے۔

اس نے مقررہ راستوں کو اختیار کیا یعنی پہاڑی

گزرگاہوں کی طرف چلا جو خانہ بدوش ایماق قبائل کے پڑاؤ سے گزرتی تھیں اور وہ رات کے وقت اس کے لیے اور اس کے ساتھیوں کے لیے کھانا لا دیتے تھے۔ رات کے وقت اس کے دو خیموں کے لیے پاسبان مقرر کر دیتے تھے۔ یہ اس پر احسان نہیں تھا، قبائل کا دستور تھا۔

دریائے سیحون کے سرچشمے اوپر رہ گئے تھے اب وہ آمو کے منبعوں سے گزر رہا تھا۔ یہاں پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ اسی کو ایماق قبائل بدخشاں کہتے تھے۔

وہ چلا جا رہا تھا کہ جہانگیر مرزا اور ناصر مرزا بھی ازبکوں سے جان بچا کر بھاگے اور بابر کے پاس آ گئے۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ ازبک سواروں کی ٹولیاں پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ شیبانی کا ٹڈی دل لشکر جنوب کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں خسرو کی عمل داری ہے اور شیبانی اس کی سرکوبی کے لیے بڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ شکست خوردہ خانوں کے تیس ہزار مغل سپاہی بھی ہیں۔

بابر دریائے آمو کے کنارے پہنچا تھا کہ خسرو شاہ کا بھائی باقی بیگ اس کا منتظر تھا۔ یہ اس علاقے کا حاکم تھا۔ وہ نہایت تعظیم سے ملا اور اپنی رفاقت میں رہنے کی پیشکش کی۔

بابر کو اس علاقے میں دیکھ کر خسرو شاہ کے مغل سپاہیوں نے درخواست بھیجی کہ اگر بابر قبول کرے تو ہم اس کی ملازمت قبول کرتے ہیں۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا لشکرِ مغل کے کئی ہزار افراد اس سے آ ملے۔ بابر خود حیران تھا کہ اس کے پاس اتنا بڑا لشکر جمع ہو گیا ہے۔

جنوب میں وہ جس قدر آگے بڑھتا گیا، پہاڑوں کی سیاہ نیلگوں قطاریں ایک کے بعد ایک بلند ہوتی گئیں۔ یہ ہندوکش کے پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں کے پار ہونے کے بعد وہ ازبکوں کی دسترس سے باہر تھا۔

بہت سے پہاڑی لوگ جو کسی لشکر کے جھنڈے کے نیچے لوٹ مار کے طالب تھے اس کے عقب میں چل پڑے۔ یہ بے قاعدہ فوج اس کے لیے دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ یہ لوگ اپنی خوراک کے لیے دیہات میں لوٹ مار مچاتے ہوئے چل رہے تھے۔

اب وہ کابل میں داخل ہو رہا تھا۔ کسی زمانے میں یہاں کا حاکم بابر کا ایک چچا الغ بیگ تھا۔ جب وہ مرا تو ایک شخص نے غاصبانہ قبضہ جمالیا اور متوفی کے رشتہ داروں سے جنگ کرتا پھر رہا تھا۔ اس خانہ جنگی کے درمیان بابر کے ساتھ آیا ہوا ایک بڑا لشکر آ گیا۔ ہر طرف مار دھاڑ کی ایک وبا سی پھیل گئی۔

پہاڑوں کے ایک عظیم دائرے میں تپتے ہوئے صحراؤں کے درمیان چاندی کی ایک زنجیر سی ندی چلی جاتی تھی۔ اسی کے کنارے قلعہ کابل تھا۔

حاکم قلعہ ڈٹا ہوا تھا اور کسی قیمت پر قلعہ خالی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ بابر نے ... شہر پناہ کے قریب بھیج کر تیر اندازی کا حکم دیا، جو پہرے دار مقابلے پر آئے انہیں بھگا دیا گیا۔ بالآخر حاکم قلعہ مصالحت پر آمادہ ہو گیا۔

کبھی یہاں آلِ تیمور کی حکمرانی تھی۔ اب اسی خانوادے کا ایک شہزادہ حکمران بن کر آیا تھا۔ اس نے فوج کو اجازت دی کہ کابل میں داخل ہو جائے۔

بابر کے اس طرح نکل جانے پر ازبک ہاتھ ملتے رہ گئے تھے۔ یہ خبریں خانزادہ تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اس کی فکر دور ہو گئی تھی۔ اس کے بھائی کی جان کو اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ خوش رہنے لگی تھی۔ شیبانی نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے۔ اسے خوش دیکھ کر شیبانی کو اپنی بے بسی کا خیال آتا تھا۔ اب وہ بابر کا تذکرہ کر کے اس کی روح کو چرکے نہیں لگا سکتا تھا۔ اسے تکلیف پہنچانے کا ایک ہی راستہ اسے نظر آیا اور وہ یہ کہ اس کے ماتھے پر طلاق کا ٹیکا لگائے۔ اس سے یہ اعزاز چھین لے کہ وہ شیبانی کی بیوی ہے۔

"تمہیں خانزادہ کیسی لگتی ہے؟" شیبانی نے ایک دن اپنے ایک سردار سے عجیب بے تکا سوال کیا۔

"وہ آپ کی بیوی ہے۔ میں نے اس کی طرف بہت کم آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے۔"

"وہ ویسی ہرگز نہیں ہے جیسی نظر آتی ہے۔ بہت مضبوط اور گرم جوش ہے۔ بستر کی ساتھی بہت اچھی ہے۔ تم کبھی اس سے ملاقات کرو گے تو خود حیران ہو جاؤ گے۔"

"آپ یہ باتیں مجھ سے کیوں کر رہے ہیں۔"

"اس لیے کہ میں اسے چھوڑ رہا ہوں۔ وہ بابر کی بہن ہے، اسے دیکھتا ہوں تو بھاگا ہوا بابر نظر آنے لگتا ہے جو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ مجھے دیکھتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میرا تمسخر اڑا رہی ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ بابر کا سر اس کے قدموں میں لا کر رکھ دوں گا۔ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ مجھے اس سے شرمندگی ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس سے شادی کر لو۔"

"شیبانی مجھ میں ایک بری عادت ہے۔ مجھے عورتوں کو

اذیت پہنچا کر خوشی ملتی ہے۔ کبھی یہ شکایت مت کرنا کہ میں اسے مارتا پیٹتا کیوں ہوں۔

”وہ تمہاری بیوی ہوگی جو جی چاہے کرنا۔“

شیبانی نے خانزادہ کو طلاق دے دی اور اسے اپنے سردار کے حوالے کرکے خوش ہوگیا۔ اپنی دانست میں اس نے بابر سے ایک اور بدلہ لے لیا تھا۔

☆☆☆

[illegible] سمرقند سے [illegible] اکڑے ہوئے پیر پھر کھلنے لگے۔ قناعت تو اس میں تھی ہی نہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب دیکھنا چاہتا تھا کہ مزید کتنا ملک [illegible] کرسکتا ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے نئے دارالحکومت کی ندی مشرق کو بہتی ہوئی دریائے سندھ میں جاملتی ہے جس کے پار ہندوستان ہے تو اس نے سوچ لیا کہ وہ اسی ندی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے وفادار سردار اس سے اختلاف کررہے تھے۔

”پہلے نئے گھر کو اچھی طرح قابو کرلو اور آس پاس کے قبیلوں کی طرف سے اطمینان کرلو پھر انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے جانا۔ ورنہ یہ سوچ لو سرزمینِ کابل کسی کی حکومت برداشت نہیں کرتی۔“

بابر اپنی جلد بازی کے نتائج پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ اب اس نے سرد و گرم بھی بہت دیکھ لیے تھے لہٰذا یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اپنے نئے شہر، نئے ملک اور وہاں کے باشندوں پر توجہ مبذول کرلی۔ بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اسے سمرقند ثانی بنا سکتا ہے۔

اسے نانی کی نصیحت یاد تھی لہٰذا اس نے عطیات تقسیم کرنے کی روایت برقرار رکھی۔ ملک کے دوسرے بڑے شہر غزنی کو جہانگیر مرزا کی جاگیر میں دے دیا اور اپنے مقربین کو بڑی بڑی زمینداریاں عطا کیں۔ نذرانے وصول کرتا تو اس کے بدلے میں خود بھی کچھ نہ کچھ دیتا تھا لیکن اسے نانی کا یہ قول بھی یاد تھا کہ ”بادشاہت میں کوئی دوست یا رشتہ دار نہیں ہوتا۔“ جہاں سختی کی ضرورت تھی اس نے سختی اختیار کی۔ کابل کے اردگرد سرکش قبائل کی کمی نہیں تھی۔ وہ ان سے [illegible] انہیں زیر کرکے ثابت کیا کہ وہ حکمرانی کا اہل ہے۔ اس دوران وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ کابل میں قلم سے نہیں تلوار سے حکومت کی جاسکتی ہے۔

اسے کابل کا بندوبست کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا تھا کہ اس کی والدہ کو سخت بیماری نے جکڑ لیا۔ بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ اس بیماری میں وہ برابر اصرار کرتی رہی تھیں کہ بابر دوسری شادی کرلے۔ بابر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے شاہِ سمرقند کی ایک عم زاد زینب سلطان بیگم سے شادی کرلی۔

بابر اس معاملے میں بدنصیب ثابت ہورہا تھا۔ پہلی بیوی عائشہ بیگم کو طلاق دینی پڑگئی تھی۔ زینب سلطان صرف دو سال اس کا ساتھ دے سکی اور چیچک کے مرض میں انتقال کرگئی۔ اس [illegible] کے اولاد بھی نہیں ہوئی۔

موسم بہار کی ایک صبح اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

وہ ابھی سیاہ ماتمی لباس اتارنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے معمر چچا سلطان حسین مرزا نے اسے [illegible] اپنے بیٹوں کو طلب کررہا ہوں۔ تم بھی آؤ۔ ازبک ہرات پر فوج کشی کی تیاریاں کررہے ہیں۔“

شیبانی خاں دریائے آمو کے کنارے حصار پر قبضہ کرلینے کے بعد اب ہرات پر فوج کشی کی تیاریاں کررہا تھا جہاں سلطان حسین مرزا کی بادشاہت تھی۔

جب بابر نے فرغانہ لینے کے لیے سلطان حسین مرزا کو آواز دی تھی تو کوئی جواب تک موصول نہیں ہوا تھا لیکن بابر کو یہ گوارا نہیں تھا کہ [illegible] دشمن نہیں اور [illegible] کو طلب کرے اور وہ نہ جائے۔ شیبانی [illegible] ابھی اس کے منہ میں پانی بھر [illegible] آیا تھا [illegible] بہت [illegible] ہوگئے تھے۔ [illegible] اس نے [illegible] جانے کا ارادہ [illegible]

[illegible] نے کابل [illegible] سرداروں کو نگرانی میں دیا اور [illegible] چل پڑا۔

بابر پہاڑوں کے حصار سے [illegible] ہوا ادھر جارہا تھا جہاں لے اپنے چچا سے مل جانا تھا لیکن [illegible] کو کہیں اور جانے کی جلدی تھی۔ خبر ملی کہ سلطان حسین مرزا کا انتقال ہوگیا لیکن بابر رکا نہیں۔ وہ ہرات کی طرف بڑھتا [illegible] لشکروں کے مقام تک پہنچ گیا۔ مشہد اور قدیم [illegible] کے پرچم لہرا رہے تھے۔ وحشی ترکمانوں کے سیاہ لبادے ماتمی ماحول کو گہرا کررہے تھے۔ نوکروں کا ہجوم تھا۔ نقیبوں نے بابر کی آمد کی نوید سنائی۔

وہ سلطان حسین مرزا کے دونوں بیٹوں مظفر حسین مرزا اور بدیع الزماں سے ملا اور ان سے اپنے چچا کی تعزیت کی۔ وہ عمر میں ان دونوں سے چھوٹا تھا لیکن سمرقند کے لیے دو دفعہ لڑ چکا تھا اور اپنے بزرگوں کا تخت واپس لے چکا تھا۔ یہ سب اس نے صرف 23 سال کی عمر میں کیا تھا لہٰذا دونوں بھائی

محبت سے ملے۔ اس کا اظہار انہوں نے دو مرتبہ اس کی دعوت سے کیا۔

بابر یہ دیکھ کر حیران ہورہا تھا کہ ضیافتوں کے سوا ان لوگوں کو کوئی اور کام نہیں۔ دشمن سر پر تھا اور یہاں جنگ کی تیاری بالکل نظر نہیں آرہی تھی۔

شیبانی کے سامنے بلخ نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کی لوٹ مار کی داستانیں مرزاؤں کی لشکرگاہ سے چالیس میل کے فاصلے تک سنائی دے رہی تھیں اور ان شہزادوں سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ایک رسالہ بھیج کر کم از کم اپنی موجودگی کا احساس ہی [illegible] دیتے۔ بابر کی رگِ شجاعت ایسے موقعوں پر خوب پھڑکتی تھی۔ اس نے بدیع الزماں سے اجازت مانگی کہ وہ اپنے آدمیوں کو لے کر جاتا ہے لیکن اس نے انکار کردیا غالباً اس لیے کہ کہیں بابر کی جنگی شہرت میں اضافہ نہ ہوجائے۔

شیبانی کی عقابی آنکھیں ہرات کے لشکروں کو دیکھ رہی تھیں لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ جاڑے سر پر ہیں۔ برفانی طوفانوں کا... موسم ان اتحادی لشکروں کو پراگندہ کرکے اپنے اپنے گھروں کو واپس بھیج دے گا۔ وہ خود بھی مضبوط حصار سمرقند میں چلا گیا۔ اس کے اٹھتے ہی مرزاؤں نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ ہرات واپس چلے جائیں۔ انہوں نے بابر کو بھی مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ ہرات چلے اور کچھ روز وہاں ٹھہرے۔

بابر بضد تھا کہ وہ اب زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اگر اب بھی چلا تو کابل پہنچتے پہنچتے اسے ایک مہینا لگ جائے گا۔ لیکن اس کے دونوں چچازاد بھائی گھوڑوں پر سوار اس کے خیمے میں آئے اور ہرات چلنے پر اصرار کیا۔ شاہی رتبے کے لوگ جب اصرار کریں تو انکار مشکل ہوتا ہے۔ اتنے اصرار کے بعد اس کے دل میں یہ شوق بھی جاگا کہ وہ ہرات کی اس ترقی کو بھی دیکھے جس نے اسے آباد دنیا میں بے نظیر بنادیا تھا۔

اس نے ہرات میں قدم رکھا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ [illegible] لگا اگر وہ اس جنتِ بے نظیر کو دیکھے بغیر چلا جاتا تو کتنے [illegible] تجربے سے محروم رہ جاتا۔ اس کی تجسس پسند طبیعت اسے ہرات کی عمارات میں لیے پھرتی رہی۔ مدارس، [illegible]، خانقاہیں، کاریزیں، مچھلیوں کے تالاب، [illegible]۔ یہاں کے کتب خانے نے تو بابر کو ہرات کا [illegible] کردیا۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ یہیں رہ جائے۔

وہ سلطان حسین مرزا کی بیوی خدیجہ بیگم سے بھی ملنے گیا۔ دیوان خانے کی سجاوٹ دیکھ کر بابر کے ہوش اڑ گئے۔ [illegible] بیگم بڑی آن بان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ چالیس سال کی [illegible] نہایت سڈول تھی۔ اس کے عقب میں نمایاں ترین جگہ پر رکھا ہوا سونے کے تنے، زمرد کی پتیوں اور یاقوت کے گلابوں والا ایک عجیب و غریب پودا درخشاں تھا۔ اس کی ایک ٹہنی پر سونے کی بلبل دمکتے ہوئے ہیرے کو چونچ میں دبائے بیٹھی تھی۔ یہاں پڑے ہوئے پردوں تک میں قیمتی ہیرے چمک رہے تھے۔ خود اسے جس میز کے پاس بٹھایا گیا اس کی سطح پر سیپ کا جڑاؤ کام بنا ہوا تھا۔

کمرے کی چمک دمک دیکھ کر وہ باتیں کرنا بھول گیا تھا البتہ دو باتیں اس کے ذہن میں ضرور آئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ شیبانی ہرات پر کیوں قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ماحول میں پرورش پانے والے شہزادے کبھی فتح یاب نہیں ہوسکیں گے۔ جو لوگ عیش و عشرت کے دلدادہ ہوجاتے ہیں، مشکلات سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔

خدیجہ بیگم سے گفتگو کرنے کے بعد اس کا اندازہ مزید درست ثابت ہوا۔ جنگ کا خطرہ خدا خدا کرکے ٹلا تھا لیکن منڈلا ضرور رہا تھا اور وہ باتیں یہ کررہی تھیں۔

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ اس نوجوانی میں حرم کے بغیر ہیں۔“

”میں نے دو شادیاں کیں اور دونوں [illegible]“

خدیجہ بیگم کے بے باک قہقہے نے اس کے لفظ اس سے چھین لیے۔ ”بس دو شادیاں کیں۔ اس کے بعد کیا کان پکڑ لیے۔ ایک ہرات سے لے جائیے۔“

”میں تو چچا جان کے بلانے پر شیبانی سے مقابلے کے لیے آیا تھا۔“

”وہ بزدل تو واپس چلا گیا۔“

”میں اس کی فطرت کو جانتا ہوں۔ سردیاں گزرنے کے بعد اس کا حملہ یقینی ہے۔“

”ہم مظفر مرزا سے کہیں گے وہ اس پر نظر رکھے۔ ویسے اس کی تلوار ماوراء النہر میں چلتی ہے یہاں توڑ دی جائے گی۔ تم یہاں چند دن کے لیے آئے ہو خوب گھومو پھرو۔ میں مظفر مرزا سے کہوں گی تمہیں بھائیوں کی طرح عزیز رکھے۔“

وہ ان کے پاس سے اٹھا تو اسے یقین ہوچکا تھا کہ وہ بدیع الزماں کے مقابلے میں اپنے بیٹے مظفر مرزا کو آگے کرنے کے لیے سازشیں کررہی ہے۔ اگر ایسے وقت میں شیبانی نے حملہ کیا تو کوئی بھی جم کر مقابلہ نہیں کرسکے گا۔

خدیجہ بیگم نے بابر جیسے دلاور کو خود سے قریب کرنے کے لیے پانسا پھینک دیا تھا۔ اسے یہ امید دلا دی تھی کہ وہ ہرات کی کسی لڑکی سے شادی بھی کرسکتا ہے۔

سلطان احمد مرزا کی چھوٹی بیٹی معصومہ بیگم مرزا کی حرم

حبیبہ بیگم کے پیٹ سے تھی۔ خراسان آئی تھی۔ ایک دن وہ اس سے ملنے کے لیے اس کے مکان پر پہنچی۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ اس سے ملنے آئی۔ بابر اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا جیسے تیسے خود کو سنبھالا اور وہاں سے چلا آیا۔ رات بڑی بے چینی میں گزاری اور صبح ہوتے ہی پھر وہاں چلا گیا۔

معصومہ بیگم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی تھی۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے ماں اندر گئی تو معصومہ کو موقع مل گیا۔

''آپ چلے جائیں گے تو ہمیں بہت یاد آئیں گے۔''

''آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''آپ کہیں تو ہم آپ کی والدہ سے بات کریں۔''

''ہم نے اجازت نہ دی تو کون سا آپ مان جائیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کی طرف سے اجازت ہے۔''

اس نے خاندان کی بزرگ خواتین سے بات کی اور ان کے ذریعے معصومہ کی والدہ کے پاس رشتہ بھیجا جو انہوں نے قبول کرلیا اور یہ طے ہوگیا کہ بابر کے کابل چلے جانے کے بعد معصومہ کی ماں اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر کابل آجائیں گی۔

اب بابر کا وہاں رکنا غیر ضروری تھا۔ شدید برف باری ہورہی تھی کہ وہ روانہ ہوا۔ یہ سفر نہایت تکلیف دہ تھا۔ جگہ جگہ برف باری نے راستے بند کردیے تھے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح وہ کابل میں داخل ہوگیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے اس سازش کا علم ہوا جو اس کے خلاف کی جارہی تھی۔ وہ اگر کچھ دن اور نہ آیا ہوتا تو تخت اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس سازش کا ناگوار پہلو یہ تھا کہ وہ ان عزیزوں نے تیار کی تھی جنہیں سمرقند اور تاشقند کی تباہیوں سے نجات دلا کر بابر نے پناہ دی تھی۔ یہ شاہ بیگم اور اس کی بیٹی چنتا بیگم، بابر کی سوتیلی خالہ تھیں جو اپنے بیٹے خاں مرزا الاغری کو بابر کے بجائے تخت کابل پر بٹھانے کے لیے راہ ہموار کررہی تھیں۔ ان لوگوں نے یہ افواہ پھیلادی تھی کہ ہرات کے دونوں شہزادوں نے بابر کو قید کرلیا ہے۔ انہوں نے ایک جمعیت بھی تیار کرلی تھی جو قلعۂ کابل کا محاصرہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔

بابر نے بروقت پہنچ کر اس بغاوت کو بڑی آسانی سے دبادیا۔

اب نوجوان شہزادی معصومہ بیگم کی کابل آمد کا وقت تھا۔ بابر نے اسے عقد زوجیت میں لیا۔ شادی سادگی سے ہوئی تھی لیکن پھر بھی چند روز تک قلعۂ کابل میں جشن اور جلسے ہوتے رہے۔

سردیاں گزر گئی تھیں۔ موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ بابر ظاہر کرچکا تھا۔ شیبانی خاں نے اپنے پچاس ہزار لشکریوں کے ساتھ دریائے مرغاب کو پار کیا اور خراسان کی سرحدوں میں داخل ہوگیا۔

یہ خبر بابر نے بھی سن لی لیکن اب اس کا ہرات جانا محال تھا۔ اسے ہرات کے شہزادوں نے بلایا بھی نہیں تھا۔ دونوں بھائی اسی مقام پر پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے جہاں پہلی مرتبہ بابر ان سے ملا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کریں۔ دراصل ایک مملکت کے دو بادشاہ ہوں تو پھر یہی ہوتا ہے۔ ایک بھائی جو کہتا تھا دوسرا اس کی مخالفت کرتا تھا۔ وقت گزرتا جارہا تھا کہ قندھار کا حاکم اپنی فوج لے کر ازخود ان کے پاس آگیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ چھوٹا بھائی مظفر قلعے کو مورچہ بند کرکے یہاں رہے اور بدیع الزماں کوہستانی علاقوں میں گشت لگا کر قبائل سے جتنے جوان مل سکیں بھرتی کرے۔ مشورہ معقول تھا لیکن اختلاف رائے کا نشانہ بن گیا۔

شیبانی دونوں بھائیوں کے پڑاؤ کے سامنے پہنچا تو والی قندھار کے سوا کوئی سامنے نہ ٹھہر سکا۔ اس کے مرنے تک معرکہ گرم رہا۔ اس کے مرتے ہی دونوں بھائی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

مظفر کا تو کچھ پتا نہ چلا۔ بدیع الزماں نے بھاگ کر ایران میں پناہ لی۔

دونوں بھائی نہ صرف بھاگ کھڑے ہوئے بلکہ اپنی ماں، بہن، جورو اور بچوں تک کو اسیر بننے کے لیے چھوڑ گئے۔ مظفر کی ایک بیوی کو شیبانی اپنے عقد میں لے آیا۔

اب شیبانی خان سمرقند سے ہرات تک کا بلاشرکت غیرے مالک تھا۔

بابر نے ہرات کی تباہی کا سنا تو صرف اتنا کہہ سکا۔

''افسوس! تیموری حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔''

بابر زندگی میں پہلی مرتبہ خوف زدہ ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیبانی اب کابل کی طرف بڑھے گا۔ اس نے فوراً مجلس مشاورت طلب کی کہ اب کیا، کیا جائے۔

''ہمارے دشمن اور اغیار ازبکوں کا، امیر تیمور کی اولاد کے جملہ ممالک پر قبضہ ہوچکا ہے۔ ترک و مغل قبائل جو ادھر ادھر دور دراز گوشوں میں ہیں وہ بھی ازبکوں سے مل گئے ہیں۔ میں تنہا کابل میں رہ گیا ہوں اور ایسے طاقتور دشمن کے مقابلے میں اتنا کمزور ہوں کہ نہ صلح کی شرائط حسب منشا طے کرانے کے ذرائع رکھتا ہوں اور اتنی جمعیت بھی نہیں کہ جم کر لڑ سکوں۔ ساتھ ملاؤں تو کس کو؟'' بابر نے تقریر کی اور مشورہ مانگا۔

قاسم بیگ کی رائے تھی۔ ''کابل کے مورچے ناقص ہیں اور ایک میدان میں وہ سب سے الگ واقع ہے۔ اس کی حفاظت نہ ہوسکے گی۔ ہمیں بدخشاں کے پہاڑوں میں ہٹ جانا چاہیے۔''

پچھلے دس برسوں میں وہ اتنا بدل گیا تھا کہ پہاڑوں میں چھپ جانے کی تجویز کو اس نے مسترد کردیا ورنہ تو اس کا ہمیشہ یہ وتیرا رہا تھا کہ پہاڑوں میں پناہ لے کر موقعے کی تاک میں رہے اور جب وقت آئے حملہ کرکے پانسا پلٹ دے۔

اس نے تجویز دی کہ ہندوستان کی طرف چلا جائے۔ اس وقت دشمن سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ درمیان میں کافی فاصلہ حائل ہو۔

وہ اپنی اس تجویز میں اتنا سنجیدہ تھا کہ اس نے بدخشاں اپنے ایک امیر کے حوالے کیا، کابل ایک دوسرے عزیز کے، لیکن قسمت نے اسے روک لیا۔ افغانستان کے جنوب مشرق سے جو خبریں آئیں وہ خوش آئند تھیں۔ شیبانی خاں کابل تو ایک طرف قندھار سے بھی دست بردار ہوگیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ازبکوں میں بغاوت ہوگئی تھی۔ بہرحال اسے بابر کا علاقہ چھوڑ کر واپس جانا پڑا۔

بابر نے بھی فی الحال ہندوستان جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ اپنی چھوٹی سی سلطنت کی سلامتی کا یقین ہوتے ہی اس نے حکم دیا کہ آئندہ لوگ اسے بادشاہ کہا کریں۔ کسی تیموری فرماں روا نے اس لقب کو اپنے لیے استعمال نہیں کیا حالانکہ وہ اب صرف کابل کا حکمراں رہ گیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے لیے آئندہ ترقی کی منازل دیکھ رہا ہو۔

بابر نے معصومہ سلطان کی وفات کے بعد خراسان کے ایک امیر کی بیٹی ماہم انگہ سے شادی کرلی تھی۔ جن دنوں وہ بادشاہ بنا، ماہم انگہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا نام ہمایوں رکھا گیا۔ کئی بیویاں کرنے کے بعد اسے وارث ملا تھا۔ جتنی خوشی منائی جاتی کم تھی۔

اس خوشی کے موقعے پر اچانک اسے اپنی بہن خانزادہ بیگم یاد آگئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو خانزادہ پانچ سال کی تھی۔ ماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ اسے بڑی بوڑھیوں کی طرح گود میں لیے بیٹھی رہتی تھی۔ آج وہ یہاں ہوتی تو ہمایوں کو دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔ خدا کرے شیبانی اسے خوش رکھ رہا ہو۔

ہمایوں کی ولادت کی خوشی میں ''چار باغ'' میں جشن منایا گیا۔ بادشاہ بابر نذریں وصول کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہمایوں کی آمد اس کے لیے کتنی بخت آور ہے کہ ہر طرف امن ہی امن ہے۔

کچھ دنوں تک شیبانی اور اس کے عزائم کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیبانی کو آل تیمور کی حکمرانی سے نفرت تھی۔ ہرات جو خاندان تیمور کا آخری ٹکڑا تھا۔ اسے ختم کرنے کے بعد وہ پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے لیکن شیبانی سکون سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنی فتوحات کا رخ دوسری جانب موڑ دیا۔ بابر پر شیبانی کے حملہ آور ہونے کی کوششیں ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئیں۔ بابر جو کابل کے کوہستانوں میں دبکا بیٹھا تھا، آئندہ اسے ان واقعات نے فائدہ پہنچایا جو خود اس کی دسترس سے باہر تھا۔

شیبانی خاں نے ہرات کے فوراً بعد مشہد پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس قبضے کے بعد جب وہ مزید فتوحات کے لیے آگے بڑھا تو مغرب کی ان کاروانی شاہراہوں پر چھنے لگا جو وسط ایران کے علاقے کرمان کو جاتی تھیں۔ اس پیش قدمی کی اطلاع شاہ ایران اسمٰعیل صفوی کو ملی تو وہ فرخ دے گیا۔ شاید غبار ہے کسی اور طرف جا نکلے گا لیکن جب سرحدی دیہات سے ازبکوں کی لوٹ مار کی خبریں آنے لگیں تو اس نے شیبانی کو سخت زبان میں خط لکھا۔

''تو اور تیرے کارندے ان دیہات میں لوٹ مار کررہے ہیں جو میری موروثی مملکت ہیں۔ اگر اب مجھے شکایت ملی تو میں تجھ سے تاوان طلب کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔''

☆☆☆

ایران میں روحانی سلسلے کے پہلے شخص صفی الدین تھے۔ وہ شیخ زاہد گیلانی کے مرید تھے۔ جب شیخ صفی الدین کا انتقال ہوگیا تو ان کا بیٹا صدرالدین ان کا جانشین ہوا۔ یہ اس پائے کے بزرگ تھے کہ امیر تیمور ان کی بزرگی کا شہرہ سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

بزرگوں کا یہی سلسلہ مختلف مرشدین سے ہوتا ہوا شیخ حیدر تک پہنچا تھا۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو حکم دیا تھا وہ کلاہ کے بجائے بارہ کنگروں والی سرخ ٹوپی پہنا کریں۔ جب ان لوگوں نے سرخ ٹوپی پہننی شروع کردی تو لوگ انہیں ''قزلباش'' کہنے لگے یعنی سرخ سر والے اور صفی الدین کی

رعایت سے اس خاندان کے بزرگ صفوی کہلانے لگے۔

ان بزرگوں کے ''مسلک'' کی وجہ سے اس وقت کے ایرانی حکمراں ان کے دشمن ہوگئے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کے ایرانی بادشاہ کی بیٹی نے شیخ حیدر سے شادی کرلی تھی۔

قزلباشوں کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ شیخ حیدر صفوی نے ان لوگوں کی مدد سے علم بغاوت بلند کردیا۔ اس بغاوت میں شیخ حیدر قتل ہوگئے۔ شیخ اسمٰعیل صفوی کی عمر اس وقت صرف ایک سال تھی۔ شیخ حیدر کے مریدوں نے اس بچے کو غائب کرادیا اور خفیہ طور پر اس کی پرورش کرتے رہے۔ جب وہ جوان ہوا تو یہی قزلباش اسے مذہب کی بنیاد پر مسند حکومت تک لے آئے۔ یہی شاہ اسمٰعیل صفوی تھا جو اس وقت شیبانی خاں کے سامنے تھا۔

شیبانی نے اس کا حقِ وراثت ماننے سے انکار کردیا اور جواب میں ایلچی کے ہاتھ کاسۂ گدائی اور عصا تحفے میں ارسال کیے۔ یہ اس بات کا پیغام تھا کہ تجھے چاہیے اپنے باپ کا پیشۂ فقر اختیار کرے۔ جواب میں نوجوان صفوی نے سن رسیدہ ازبک کو چرخہ اور تکلا بھیجا کہ اگر تلوار کی نوک سے جان چراتا ہے تو اپنی ماں کی سہیلیوں میں زندگی گزار۔

شاہ اسمٰعیل کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ تخت تبریز سے عباسی خلفا کے افسانوی شہر بغداد تک تاراج کرچکا ہے۔ اصفہان پر حملہ آور ہوا ہے۔ حکمرانوں کے دانت کھٹے کرکے اصفہان کو پایۂ تخت بنایا ہے۔ شیبانی کو یہ غرور تھا کہ اس نے آلِ تیمور کو نیست و نابود کردیا ہے۔

شیبانی کے دستے اپنے مفتوحہ ممالک کی حفاظت کے لیے ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے کہ شاہ اسمٰعیل، قزلباشوں کو لے کر نکل کھڑا ہوا۔ شیبانی اس خبر کو سنتے ہی دریا کے کنارے شہر مرو میں آگیا اور اپنے سپہ سالاروں کی طلبی کے لیے ہرکارے دوڑا دیے۔ اسے امید نہیں تھی کہ شاہ اسمٰعیل اتنی جلدی نکل کھڑا ہوگا ورنہ وہ اپنی فوج کو طلب کرچکا ہوتا۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ ہراول دستے کو باہر چھوڑ کر خود قلعہ بند ہوجائے اور بقیہ فوج آنے کا انتظار کرے۔

شاہ اسمٰعیل بار بار اسے خط لکھ رہا تھا۔ ''جو کشکول اور ڈنڈا تم نے مجھے تحفے میں بھیجا تھا میں وہ لے کر تمہاری مملکت تک آگیا ہوں۔ اب اگر ہمت ہے تو میدان میں آکر ٹکر لو۔''

شیبانی کو یاد آیا کہ ایک دن ایسا ہی ایک خط اس نے بابر کو لکھا تھا۔ جب وہ سمرقند میں بند ہوکر بیٹھ گیا تھا تو اس نے بابر کو باہر نکل کر لڑنے کا طعنہ دیا تھا۔

اسے اپنے سپہ سالاروں پر غصہ آرہا تھا۔ ماوراءالنہر سے مرو تک کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔ پھر انہیں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ اسے وہ بغاوت یاد آگئی جو پچھلے دنوں ہوئی تھی، کہیں اس کے اثرات اب تک قائم تو نہیں۔ کہیں وہ سب جان بوجھ کر تو دیر نہیں لگا رہے۔ یہ سوچ کر ہی اسے جھرجھری آگئی۔ پندرہ ہزار فوج جو میرے ساتھ ہے ان میں بھی اکثریت مغلوں کی ہے۔ ان پر میں کتنا بھروسا کروں گا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اگر اس وقت کوئی چیز اس کی ڈھارس بندھا رہی تھی تو وہ تھی موسم کی سختی۔

قیامت کی سردی پڑنے لگی تھی۔ شیبانی یہ سوچ کر خوش تھا کہ قزلباش اس سردی کا مقابلہ نہ کرسکیں گے اور بالآخر محاصرہ اٹھا کر چلے جائیں گے۔ موسم بہار تک ان کا آنا مشکل ہوگا۔ اس وقت تک میں پوری تیاری کرچکا ہوں گا بلکہ میں خود آگے بڑھ کر ایران میں داخل ہوجاؤں گا۔

اسے قدرے اطمینان ہوگیا۔ اس اطمینان میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب شاہ اسمٰعیل کی طرف سے ایک خط اسے ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ محاصرہ اٹھا رہا ہے لیکن انتقام لینے موسم بہار میں پھر آئے گا۔

شیبانی جیسے آگ بگولا ہوگیا۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اسی دن سے منتظر بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ قلعے میں پندرہ ہزار سپاہی موجود تھے۔ اس نے ان سب کو حکم دیا کہ صفوی پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔

''عظیم خان۔ دشمن تو محاصرہ اٹھا رہا ہے۔''

''جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ تیاری پکڑو۔''

اس نے مرو کے مضبوط قلعے کی فصیلوں کے اوپر سے دیکھا۔ شاہ اسمٰعیل کے سپاہی خیمے اکھاڑ کر سازوسامان باربرداری پر لاد رہے تھے۔ پھر یہ فوج شمال کی طرف متحرک ہوگئی اور ایسی افراتفری میں جیسے انہیں تعاقب کا خطرہ ہو۔ بہت سے خیمے بھی اسی طرح لگے چھوڑ گئے تھے۔ ایک مرتبہ پھر اس نے ایک بلند مینار سے اپنے سپہ سالاروں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے دھندلا سا لشکر نظر آیا لیکن اس نے ابھی دریائے آمو پار نہیں کیا تھا۔ اس طرح تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بھاگتے ہوئے قزلباشوں کا شکار کرنا کتنا دلچسپ مشغلہ ہوگا۔

''قلعے سے باہر نکلو اور دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے راستے ہی میں اسے دبوچ لو۔ کوئی زندہ نہ بچنے پائے۔ تم تیاری کرو میں بھی آتا ہوں۔'' اس نے اپنی گھڑسوار فوج کو حکم دیا۔

ایک سردار ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ ''عظیم خان ہمیں ماوراءالنہر والی فوج کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''اگر تیری ماں نے تجھے بزدل پیدا کیا ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ میں اپنے سپہ سالاروں کا محتاج نہیں۔ میں اپنی جنگ خود لڑوں گا۔''

شیبانی کی کمان میں گھڑسوار، ایرانی لشکر کے تعاقب میں تیزی سے روانہ ہوئے۔ اسے ڈر تھا کہ آگے جانے والے کہیں اس سے زیادہ تیز نہ دوڑ رہے ہوں۔

جب شامت آتی ہے تو مت ماری جاتی ہے۔ شیبانی جیسا تجربہ کار اس چال کو سمجھ ہی نہیں سکا جو اسمٰعیل صفوی اس کے خلاف چل رہا تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے بہت تھوڑی فوج مرو کے محاصرے پر رکھی تھی۔ اپنے بیس ہزار منتخب سپاہی دریائے مرغاب کے اس پار ریگستانی ٹیلوں کے عقب میں چھپا دیے تھے اور اب وہ شیبانی کو تعاقب میں لگا کر وہاں تک لے جانا چاہتا تھا۔

شیبانی کو سوچنا چاہیے تھا کہ شاہ اسمٰعیل صرف دس بارہ ہزار فوج لے کر اس سے لڑنے کیسے آگیا ہے لیکن اس نے غور نہیں کیا اور اب بچھے ہوئے دام میں پھنسنے کے لیے چلا جارہا تھا۔

اسمٰعیل شاہ کا لشکر دریائے مرغاب پر بنے ہوئے پل کو پار کرکے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ شیبانی نے بھی پل پار کیا اور تعاقب کرتے ہوئے اس میدان تک آگیا جہاں شاہ صفوی کی فوج گھات لگائے بیٹھی تھی۔ یہ دستے اچانک ٹیلوں سے باہر نکلے اور ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ بھاگتی ہوئی فوج بھی پلٹ کر واپس آگئی۔ قزلباشوں نے شیبانی کی فوج کو تین اطراف سے گھیرلیا۔ چوتھی طرف دریا تھا۔

پل کی جانب ایرانی لشکر تھا اور پل کے بغیر دریا پار نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں کوئی گھاٹ نہیں تھا۔ سردی کی شدت سے پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ پاؤں ڈالتے ہی ہڈیاں گلا سکتا تھا۔ شیبانی خاں اب سمجھا کہ پھندے میں پھنس گیا ہے۔ نہ آگے جاسکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

چاروں طرف سے تلواریں برس رہی تھیں۔ لاشوں سے میدان پٹ گیا تھا۔ کچھ سپاہی جان بچانے کے لیے دریا میں کود پڑے، یخ پانی نے انہیں زیادہ دیر زندہ نہیں رہنے دیا۔ سطحِ آب پر لاشیں ہی لاشیں تیرنے لگیں۔ شیبانی نے دریا کے کنارے کنارے بھاگنا شروع کردیا۔ برہنہ تلوار اس کے ہاتھ میں تھی لیکن بھاگتا تھا تو کبھی پلٹ کر مقابلہ کرنے لگتا تھا۔ اس کے چند ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ جب ایرانی لشکر نے دیکھا کہ وہ ہاتھ سے نکل جائے گا تو کسی سپاہی نے تاک کر تیر چلایا۔ اس کا گھوڑا اچھلا اور سوار سمیت زمین

پر گرا۔ شیبانی رکاب سے پاؤں نہ نکال سکا۔ اسی وقت اس کے کسی ساتھی کا گھوڑا بھی تیر کھا کر نیچے گرا۔ یہ گھوڑا اس کے اوپر گرا۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ ایک قزلباش سردار کی نظر اس پر پڑ گئی جو اسے پہچانتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیبانی کا سر کاٹ لیا اور شاہ اسمٰعیل کے پاس جا کر یہ سر اس کے گھوڑے کے سموں کے پاس ڈال دیا۔

جیسے ہی شور مچا کہ شیبانی مارا گیا، وہ مغل جنگ آزما جو فتح تاشقند کے بعد شیبانی کے لشکر میں بھرتی کیے گئے تھے، بھاگتے ہوئے ازبکوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک ایک ازبک کو تہ تیغ کر دیا۔ پھر یہ مغل خان مرزا کے پاس آئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ بابر کو بلائے۔

شاہ اسمٰعیل مرو سے ہرات تک جھاڑو پھیرتا ہوا چلا گیا۔

بدخشاں کو بابر نے اپنے ایک عم زاد خان مرزا کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی نااہلی کی وجہ سے یہ علاقہ ازبکوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اب جو شیبانی کو شکست ہوئی تو خان مرزا نے بابر کو خط لکھا اور اسے بدخشاں آنے کی دعوت دی۔ اس خط کے ملتے ہی بابر خان مرزا کے پاس چلا گیا اور خان کی مدد سے قلعے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن ازبک اس کی آمد سے واقف ہو گئے تھے۔ انہوں نے قلعہ اچھی طرح مستحکم کر لیا تھا۔ اس کے باوجود بابر نے جان توڑ حملہ کیا اور ازبکوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ ازبک شکست کھا کر بھاگے۔

بابر نے حصار پر قبضہ کیا اور پھر قندوز پہنچ گیا۔ اس وقت اس کا لشکر ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ اب اس کا حق تھا کہ اپنے علاقے دوبارہ فتح کر لے۔

قندوز پہنچ کر بابر نے اپنے ایک ایلچی کو شاہ اسمٰعیل کے پاس ہرات روانہ کیا۔ بابر نے اسے مبارک باد دی تھی کہ اسے شیبانی پر شاندار فتح حاصل ہوئی۔ کچھ تحائف روانہ کیے اور یہ درخواست کی کہ اس کی بہن خانزادہ بیگم جو زبردستی شیبانی کے حرم میں داخل کر لی گئی تھی، اسے تلاش کر کے اس پر خاص طور پر رحم کیا جائے۔

شاہ اسمٰعیل کو یہ پیغام ملا تو اس کے ارادوں نے ایک اور انگڑائی لی۔ وہ شیبانی خاندان کے بچے کھچے حکمرانوں کے خلاف اپنی مہموں کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے بھتیجوں اور بیٹوں سے سارے ماوراء النہر کو چھین لینا چاہتا تھا۔ یہ کام وہ بابر کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بابر کی طاقت سے واقف تھا۔ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ کابل سے نکل کر قندوز تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے گرد ایک عظیم لشکر جمع ہو چکا ہے۔ اس نے سوچا اگر اس موقعے پر بابر کو اپنے احسان تلے دبا لیا جائے تو وہ ہمیشہ اس کا دوست رہے گا۔

مرو کے قلعے میں شیبانی کی بیویاں اور کنیزیں موجود تھیں جنہیں قید کر لیا گیا تھا۔ اسمٰعیل صفوی نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ان عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ بابر کا پیغام پہنچا تو اسے ان عورتوں کا خیال آیا۔ اسے کسی پر بھروسا نہیں تھا، وہ خود مرو کے قلعے میں پہنچا۔ قلعے میں موجود عورتوں کو ایک ایک کر کے اس کے سامنے پیش کیا جاتا رہا۔ وہ ہر ایک سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے واپس بھیجتا رہا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا کہ سب سے آخر میں ایک عورت کو اس کے سامنے لایا گیا۔ لانے والوں نے بتایا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتانے کو تیار نہیں۔ یہاں آنے سے بھی کترا رہی تھی۔ اسے زبردستی لایا گیا ہے۔

”کیا تم اپنے بارے میں مجھے کچھ بتانا پسند کرو گی؟“

”میں وہ ہوں جو اپنے بھائی کی زندگی بچانے کے لیے اس حال کو پہنچی ہوں اور میں وہ ہوں جسے کچھ نہیں معلوم کہ اس کا بھائی زندہ بھی ہے یا نہیں۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا بھائی زندہ ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ میں کس بھائی کا ذکر کر رہی ہوں؟“

”اگر تم خانزادہ ہو تو تمہارا بھائی بابر ہے۔“

”میں ہی بد نصیب خانزادہ بیگم ہوں۔“

”تم اگر خانزادہ ہو تو تمہیں شیبانی کی بیویوں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں قلعے کی دوسری عورتوں کے ساتھ کیوں تلاش کیا گیا؟“

”اس لیے کہ میں اب اس کی بیوی نہیں رہی تھی۔“

”کھل کر بتاؤ۔ مجھے شک ہے کہ تم ہی خانزادہ ہو۔“

”شیبانی نے مجھے طلاق دے دی تھی کیونکہ میں اپنے بھائی کی حمایت میں اس سے لڑتی رہتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ایک سردار کے حوالے کر دیا تھا... تم نے جب محاصرہ کیا تو میں اس کے ساتھ اسی قلعے میں تھی۔ وہ تمہارے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔“

شاہ اسمٰعیل نے اپنے ایک سردار محمد جان کو حکم دیا کہ وہ اسے قندوز میں بابر کے پاس چھوڑنے جائے۔ سو سپاہیوں پر مشتمل دستہ بھی اس کے ساتھ کر دیا گیا۔

خانزادہ کو کچھ نہیں بتایا گیا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ تو ان اندیشوں میں گھری ہوئی تھی کہ شیبانی اور اس کا سردار مر گئے۔ اب وہ کسی اور مالک کے سپرد کر دی جائے گی۔ جب ہرات فتح ہوا تھا تو شیبانی نے مظفر مرزا کی بیوی کو اپنے حرم میں شامل کر لیا تھا۔ اب اسمٰعیل شاہ فاتح ہے، وہ اسے پسند کر کے لے جا رہا ہے۔ خود رکھے گا یا اپنے کسی سپہ سالار کے حوالے کر دے گا۔ وہ اب تک یہی دیکھتی چلی آئی تھی کہ عورتیں مال غنیمت کی طرح تقسیم ہوتی ہیں۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ کیا خبر میں اب اپنے بھائی کو دیکھ بھی سکوں یا نہیں۔ شیبانی ماوراء النہر کے علاقوں میں گھومتا رہتا تھا، وہیں میرا بھائی بھی تھا۔ اس بندھی رہتی تھی کہ کسی وقت دور سے ہی دیکھنے کو مل جائے گا۔ یہ فاتح تو ایرانی ہے۔ مجھے ایران لے جائے گا۔ پتا نہیں میرا بابر کہاں ہوگا۔ میری ماں کتنی بوڑھی ہو گئی ہوگی۔ کیا اسے میری خدمت کی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی۔

سفید اونٹ پر رکھے شاندار محمل میں بیٹھی وہ انہی خیالات میں غرق تھی۔ باہر ساتھ چلنے والے محافظوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لق و دق صحرا ہے جس سے وہ گزر رہی ہے۔

اس کا اونٹ آہستہ ہوا اور پھر رک گیا۔ خانزادہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ شاید ایران آ گیا۔ اسے مار دیا جائے گا یا باندی بنا لیا جائے گا۔ جس احترام سے اسے لایا جا رہا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کسی بڑے آدمی کے حوالے کیا جائے گا۔

اسے نیچے اتارا گیا تو اس نے خود کو ایک محل کے پھاٹک پر دیکھا۔ محل دار نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اسے ایک آراستہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ سب ایک ایسے خواب کی طرح تھا کہ وہ خوف زدہ بھی تھی اور فکر مند بھی۔ محل دار اسے اس کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

بابر کو خبر کی گئی۔ وہ جس حال میں بیٹھا تھا اسی طرح تقریباً دوڑتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں خانزادہ تھی۔ چوڑے شانوں، ہلکی ڈاڑھی اور ترشی ہوئی مونچھوں والا ایک نوجوان جس کی عمر کوئی تیس برس ہوگی خانزادہ کے سامنے کھڑا تھا۔ خانزادہ کا خوف ابھی دور نہیں ہوا تھا۔ جال میں پھنسی ہرنی کی طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے انیس سال کی عمر میں بابر کو دیکھا تھا جب اس کے ٹھیک طرح ڈاڑھی بھی نہیں آئی تھی۔ وہ بھلا اسے کیا پہچانتی۔

”آپ نے پہچانا نہیں؟“ بابر نے کہا۔

”تم شاہ اسمٰعیل کے کوئی سپاہی ہو گے۔ میں تمہیں کیسے پہچان سکتی ہوں؟“

”آپ تو کہتی تھیں آپ میری آنکھیں کبھی نہیں بھول سکتیں۔“

نوجوان کی اس یاد دہانی پر خانزادہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ”بابر جان، یہ تم ہو؟“ خانزادہ نے کہا۔

”ہاں آپا جان۔ آپ کی تمام مشکلات کا ذمے دار بابر۔“

یہ سننا تھا کہ خانزادہ دوڑ کر اس کے گلے لگ گئی۔ وہ جو بڑی سے بڑی مشکل میں نہیں روئی تھی اس کے گلے لگ کر زندگی بھر کے آنسو لٹا رہی تھی۔

”بابر جان، میری ماں؟“

”وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ پانچ سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔“

خانزادہ نے رہے سہے آنسو ماں کے انتقال کی خبر سن کر بہا دیے۔

”مت روئیے۔ سب چلے گئے ہیں لیکن اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں اپنا بچپن بھی آپ کو دکھاؤں گا۔“

”آپ کا بچپن؟“

بابر نے ایک ملازمہ کو حکم دیا اور وہ تین سالہ ہمایوں کو لے کر وہاں آ گئی۔

”یہ ہے میرا ہمایوں؟ میرا ولی عہد۔“

ہمایوں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ خانزادہ آگے بڑھی اور اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی۔

”ہے نا میرا بچپن؟“

”ہاں بابر جان۔ اس وقت مجھے یہی لگ رہا ہے کہ میں آخشی کے محل میں ہوں۔“

”بہت جلد ہم آخشی اور اندجان کو بھی دشمنوں سے آزاد کرا لیں گے۔ پھر آپ کو وہاں بھی لے کر چلیں گے۔ اب آپ آ گئی ہیں تو میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔“

”ہمایوں کو دیکھ کر ہمیں عائشہ بیگم یاد آ گئیں۔ وہ اب تک ملنے نہیں آئیں۔“

”ہمایوں کی والدہ عائشہ نہیں، ماہم ہیں۔ خراسان کی رہنے والی ہیں۔ ان کے والد پر وقت پڑا تھا تو میں نے انہیں کابل بلا لیا تھا۔ وہیں ان سے ملاقات ہوئی اور شادی ہو گئی۔“

”حکمرانوں کی تو عادت ہو گئی ہے۔ ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ عائشہ سے بھی تو......“

”ایک بیٹی ہوئی تھی جس کا انتقال ہو گیا۔ پھر عائشہ

مجھے چھوڑ کر چلی گئی، وقت ملا تو تفصیل بتاؤں گا۔"

"یا میرے خدا۔ اتنے دنوں میں دنیا ہی بدل گئی۔ ملنا تو در کنار اتنے دنوں میں آپ کے بارے میں کچھ جان بھی نہیں سکی۔" وہ تھکی ہوئی آئی تھی لہٰذا آرام کی ضرورت تھی۔ بابر نے بھی اسے باتوں میں لگائے رکھنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ جی چاہتا تھا اس سے باتیں کرتا رہے۔

اس کے بعد بابر کچھ عرصے تک ماوراء النہر سے ازبکوں کے وجود کو پاک کرتا رہا۔ اپنے ایک چچازاد کو اندجان کی طرف بھیجا اور خود بخارا کی طرف روانہ ہوا۔ اب اس قافلے میں خانزادہ کا اضافہ ہو چکا تھا۔

بخارا میں شیبانی کے بیٹوں نے مدافعانہ جنگ لڑی لیکن شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ہزیمت اٹھا کر سمرقند کی طرف بھاگے۔

بابر کو بھی ان کے پیچھے روانہ ہونا تھا لیکن اسے اطلاع ملی کہ شیبانی کا بیٹا تیمور سلطان اپنے ایک سفیر کو تحائف کے ساتھ شاہ اسمٰعیل کے پاس بھیج چکا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر دونوں کا میل ہو گیا تو وہ سمرقند سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گا۔ اس نے بھی اپنے ایلچی مرزا خاں کو شاہ کے پاس بھیجا۔

"یہ سوچ کر معاہدہ کرنا کہ میں سمرقند کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔"

ایلچی کے روانہ ہوتے ہی بابر نے معاہدے کا انتظار کیے بغیر دریائے پنج کو پایاب عبور کیا اور وادی وخش میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ازبک سمرقند سے نکل کر وادی وخش میں جمع ہو رہے ہیں۔

بابر کا لشکر پہاڑوں پر سے بہت تیزی کے ساتھ اترا اور اپنے دشمنوں سے پہلے ہی وخش کے کنارے پہنچا اور دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ چٹانوں پر مورچے قائم کر لیے۔ تیمور سلطان وہاں پہنچا تو تمام انتظامات مکمل دیکھے۔ وہ بلندیوں پر چڑھنے کے لیے دوپہر تک بہادری سے لڑتا رہا لیکن اس کی کوشش رائگاں ثابت ہوئیں۔ وہ یہاں سے ایک دوسری وادی کی طرف بھاگا۔ ممکن ہے وہ دوبارہ ٹکر لیتا لیکن اسی وقت شاہ اسمٰعیل کے بھیجے ہوئے تیس ہزار سپاہی بھی آن پہنچے۔ اب ازبکوں پر لرزہ طاری ہوا۔ ان کی صفیں منتشر ہو گئیں۔ ازبک فوجیں صحرائی علاقوں کی طرف بھاگ رہی تھیں۔

اب بابر کے لیے سمرقند کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ یہاں کوئی حاکم نہیں تھا۔ نو سال بعد وہ امیر تیمور کے شہر میں دوبارہ داخل ہو رہا تھا۔ سمرقند کے شہری اس کے استقبال کے لیے گھروں سے نکل آئے تھے۔ امرا نے اسے گھیر لیا۔ غریب غربا نے گھروں کی آرائش میں مصروف ہو گئے۔ ہر دریچے میں قالین لٹکے نظر آ رہے تھے جو ان لوگوں کی پرانی رسم تھی۔

وہ تمام مانوس مقامات جہاں بابر اپنی نوجوانی میں گشت لگایا کرتا تھا، وہ سب ایک مرتبہ پھر اس کے قدموں کے نیچے تھے۔ سمرقند ہی نہیں تمام تیموری ممالک اس کے زیرنگیں تھے۔ اس کا بھائی کابل اور غزنی میں اس کی طرف سے حاکم تھا۔ قندوز اور بدخشاں لینے والی خان مرزا کے اطاعت گزار تھے۔ اندجان سے تاشقند تک ہر شہر کے دروازے کھل گئے تھے۔ اس نے جو بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا وہ اب اس کا سزاوار ہوا تھا۔

بابر کو اس استقبال سے خوشی ہو رہی تھی لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ اس کے ساتھ چلنے والے قزلباشوں سے خوش نہیں ہیں۔ جب قزلباش ان کے سامنے سے گزرنے لگتے تھے تو قرنے اور نقارے خاموش ہو جاتے تھے۔ شہری یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ صرف بابر کا استقبال کر رہے ہیں۔

بابر کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا۔ یہ لوگ قزلباشوں کو برداشت نہیں کر رہے ہیں تو شاہ اسمٰعیل کے خلوص کو کیا برداشت کریں گے۔ یہ دوستی زیادہ دیر چلنے والی نہیں لگتی۔ پھر بھی اس نے خیال کیا کہ وہ اپنے لوگوں کی اتنی خدمت کرے گا کہ ان کی نفرت محبت میں بدل جائے گی۔

تین دن کے بعد جب وہ جشن مسرت سے فارغ ہوا تو خان مرزا نے وہ معاہدہ بابر کے سامنے رکھا جو وہ شاہ اسمٰعیل سے کر کے آیا تھا۔

شاہ اسمٰعیل نے تیموری وارث کو تخت سمرقند پر قائم رہنے میں مدد کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ بابر اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرے۔ ایک شرط یہ بھی کہ آئندہ سکے پر شاہ اسمٰعیل کی شبیہ ہو اور بارہ اماموں کے نام کندہ کرائے جائیں اور اسی طرح ہر خطبے میں اپنی بجائے شاہ کا نام پڑھوایا جائے۔

یہ شرائط اتنی سخت تھیں کہ بابر کے لیے ناقابل قبول تھیں لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فاتح خراسان کی حمایت کے بغیر وہ سمرقند پر قابض نہیں رہ سکے گا۔

بابر نے بے دلی سے سہی اس معاہدے پر پوری طرح عمل کیا۔ سکے بھی ڈھلوا دیے اور شاہ کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جانے لگا۔ اہل سمرقند کو یہ کسی طرح بھی گوارا نہیں تھا۔ یہ ان کے مذہب کا معاملہ تھا۔ شاہ اسمٰعیل شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے جبکہ اہل سمرقند سنی تھے۔ انہیں مصلحتوں سے تعلق نہیں تھا۔ ہر طرف سے مخالفت کی آوازیں آنے لگیں۔ بابر

پر بھی انگلیاں اٹھنے لگی تھیں۔ قزلباش جس طرف سے گزرتے ان پر آوازے کسے جاتے۔

ایک روز ایک دکاندار نے قزلباش گاہک سے وہ سکہ لینے سے انکار کردیا جس پر شاہ اسمٰعیل کی شبیہ تھی اس پر تکرار ہوگئی، ہجوم جمع ہوگیا۔ کسی طرف سے پتھر آیا اور قزلباش نے جھپٹ کر دکاندار کے دو ٹکڑے کردیے۔ پھر ایسے ہنگامے روز ہونے لگے۔ بابر اب دل سے دعا کررہا تھا کہ یہ قزلباش کسی طرح سے رخصت ہوں۔ اس نے انہیں بڑی مشکل سے قیمتی تحائف دے کر رخصت کیا۔

تیس ہزار سپاہیوں کے رخصت ہوتے ہی ازبک لشکر، شیبانی کے ایک سپہ سالار عبید سلطان کی سربراہی میں شمال سے اترا۔ بابر اپنی مغل جمعیت کو لے کر لڑنے کے لیے نکلا لیکن اس کی مختصر فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ بھاگ کر سرحدی قلعے حصار میں چلا گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اسمٰعیل شاہ سے مدد طلب کی۔ شاہ نے گیارہ ہزار "ترکمان" اپنے سپہ سالار نجم ثانی کے ہمراہ مدد کے لیے بھیج دیے۔

نجم ثانی نے قلعہ قرشی کا محاصرہ کیا اور بابر کی رائے کے برخلاف اپنی فوج کے ساتھ یورش کرکے قلعہ فتح کیا اور وہاں کے تمام باشندوں حتیٰ کہ دودھ پیتے بچوں اور معذور بوڑھوں تک کو ذبح کر ڈالا۔

بابر کو اس سفاکی نے تذبذب میں ڈال دیا۔ ایسا ظلم تو کبھی شیبانی نے بھی نہیں کیا تھا۔ نجم ثانی غرور کے نشے میں مست تھا۔ عبید سلطان کی تلاش میں بخارا کی طرف گیا اور ازبکوں سے آمنا سامنا ہوگیا۔ بابر کی فوج نجم ثانی کی سفاکی دیکھ چکی تھی۔ بابر کے حکم کے باوجود پیچھے ہٹ گئی۔ ازبکوں نے جی بھر کے انتقام لیا۔ نجم ثانی اور جملہ ترکمان سردار تہ تیغ ہوگئے۔

بابر اپنی جان بچا کر حصار کے قلعے میں نظربند ہوگیا۔

شاہ اسمٰعیل کو ترکوں کے خلاف جنگ کے لیے جانا پڑا۔ ازبکوں کی بن آئی۔ بابر اپنے سات ہزار کے لشکر کے ساتھ ایک مرتبہ پھر بے یارومددگار رہ گیا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ قدیم سلطنت کے کسی قطعے پر بھی قبضے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس نے سمرقند کے محلات اور ہرات کے باغوں کو خیرباد کہا اور کابل کو واپس روانہ ہوگیا۔

اس کی قدیم میراث ازبک اور ایرانیوں میں بٹ گئی تھی اور اسے واپس لینے کا کوئی امکان نہیں تھا البتہ بدخشاں کی مستور وادی باقی تھی اور اس نے پوری استقامت سے اس کے پہاڑی راستے کھلے رکھے۔

وہ پچھلے پانچ برسوں میں کابل کی تزئین و آرائش میں مصروف رہا۔ خانزادہ کے لیے محل "باغ دل کشا" بنایا۔ اپنی تینوں بیویوں کے لیے الگ الگ محلات بنوائے۔ اس عرصے میں اس کے دو بیٹے اور ہوگئے تھے۔ ہندال اور عسکری۔ ایک اور نئی بات یہ ہوئی کہ اس نے کثرت سے شراب نوشی شروع کردی۔ اسے جب بھی یہ خیال آتا کہ اس کے ممالک اس سے چھن گئے تھے تو وہ پینے بیٹھ جاتا اور اس وقت تک پیتا رہتا جب تک کوئی نہ کوئی بیگم اس کا ہاتھ نہ روک لیتی۔ قاسم بیگ کی وفات ہوگئی تھی اور وہ کسی دوسرے کو اپنی رائے پر اثرانداز ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا۔

ہرات مسلسل افراتفری کی لپیٹ میں تھا۔ پہلے شاہ اسمٰعیل نے شہر پر قبضہ کیا اور قزلباشوں نے لوٹ مار شروع کردی لیکن زیادہ دن نہیں بیتے تھے کہ حکومت بدل گئی اور اب شیبانی کے بیٹے اور سپہ سالار انتقام لینے لگے۔ مرو میں قبریں کھود ڈالی گئیں اور وہاں جن قزلباشوں نے شیبانی کو ہلاک کیا تھا ان کی ہڈیاں توپوں میں بھر بھر کے داغی جانے لگیں۔ قزلباشوں نے ہرات پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور ایک بار پھر انتقام لیا جانے لگا۔

بابر گھنٹوں بیٹھ کر شراب پیتا رہتا۔ کبھی کبھی اس کا ذہن ماضی کی طرف پلٹ جاتا۔ اس کا ذہن وہ تصویریں اسے دکھانے لگتا جو اس نے سمرقند میں دیکھی تھیں۔ ان تصویروں میں تیمور کے ہندوستان پر حملے کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ افغانی قبائل پر بار بار چڑھائیاں کرنے سے کہیں سودمند بات یہ ہے کہ اپنی فوج کو لے کر خیبر کے پار جائے اور ہندوستان کے مال غنیمت سے اپنا خزانہ معمور کرے۔

وہ خراسان، بدخشاں، کابل اور خاص طور پر شمالی ہندوستان کو ملا کر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگتا تھا۔

اس مقصد کے لیے وہ خود دریائے سندھ کے علاقوں میں گیا۔ اپنے کچھ جاسوسوں کو ہندوستان بھیجا کہ وہ وہاں کی حکومت کے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہیں۔ بہت سے جاسوسوں نے وہاں ایسے لوگ تلاش کرلیے تھے جو بابر کے یا کسی بھی بیرونی حملہ آور کے حق میں نظر آتے تھے۔ اس طرف سے امید بندھی دیکھ کر بہت سے اہم لوگ دہلی کے سلطان ابراہیم سے تنگ آکر کابل آگئے تھے۔

ہندوستان سے جو خبریں آرہی تھیں ان سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ مہیب خانہ جنگیوں کا دور دورہ ہے۔ یہ اچھا موقع ہے جب کوئی وہاں جائے اور سارے ملک کو متحد کردے۔

بابر کے خفیہ منصوبے زیادہ دن خفیہ نہ رہ سکے۔ سب سے پہلے اس کا انکشاف خانزادہ پر ہوا۔ اس لیے نہیں کہ بابر نے اسے بتایا ہو بلکہ یہ انکشاف اس لیے ہوا کہ اس کی محبت بھائی کی حرکات و سکنات کے گرد پہرا دیتی رہتی تھی۔ وہ نظر رکھتی تھی کہ بابر اب کیا سوچ رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں اتنے نشیب و فراز سے گزری تھی کہ محلاتی سازشوں کا اسے غیرمعمولی ادراک ہوگیا تھا۔ جب سے وہ کابل میں تھی اس نے ایسے لوگ اپنے گرد جمع کرلیے تھے جو اسے پل پل کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ خانزادہ کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا بھائی ہندوستان جانے کے خواب دیکھ رہا ہے لیکن وہ اس سے پوچھتے ہوئے گھبرا رہی تھی کیونکہ بابر اسے راز رکھے ہوئے تھا، پھر اس نے ایک روز کسی اور طرح پوچھا۔

اس نے اپنے بھتیجے ہندال کو سکھا دیا۔ وہ آٹھ سال کا بچہ تلوار لگا کر باپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب "ظفرنامہ" تھی اس میں ہندوستان کے حالات اور کچھ تصویریں تھیں۔

"یہ شیر ہے نا؟"

"ہاں، اسے شیر کہتے ہیں۔"

"میں نے سنا ہے یہ ہندوستان میں پایا جاتا ہے؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔"

"آپ اس سے ڈرتے ہیں؟"

"تمہارا باپ شہنشاہِ کابل ہے، کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"پھر آپ ہندوستان جائیں اور مجھے بھی لے جائیں۔ میں اس تلوار سے اس جانور کا سر قلم کروں گا اور ہاتھی کی سونڈ اڑا دوں گا۔"

"مرزا ہم ہندوستان جانے کی تیاری کررہے ہیں۔ بس سمجھو چلے گئے۔ تم وہاں شیر کا شکار کرنا۔"

جب یہ باتیں ہورہی تھیں، خانزادہ ایک پردے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی، فوراً سامنے آگئی۔

"کہاں جانے کی باتیں ہورہی ہیں۔ کیا ماوراء النہر چھوڑنا پڑ گیا؟"

"صاحبزادے ہندوستان جانے کی ضد کررہے تھے۔"

"تو کردیجیے نا فرمائش پوری۔"

"جی تو یہی چاہتا ہے آپا جان۔ ماوراء النہر واقعی چھوڑنا پڑ گیا ہے۔"

"میرے بھائی، میں اب کسی بھی ایسے خواب سے ڈرنے لگی ہوں جس میں تلواریں نظر آتی ہوں۔"

"عظیم الشان فتوحات میں تلواروں کا دخل تو ہوتا ہے۔"

"میں اپنی زندگی میں اتنا خون بہتا ہوا دیکھ چکی ہوں، اب جنگ و جدل کے نام سے بھی کانپ جاتی ہوں۔"

"کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ دریا کا راستہ اگر روک دیا جائے تو وہ دوسری طرف بہنے لگتا ہے۔ ماوراء النہر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب ہم ہندوستان جائیں گے اور ایک عظیم مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھیں گے۔"

"کتنا خون بہہ جائے گا اس وقت تک۔"

"ہندوستان کی خانہ جنگیوں میں کتنا خون بہہ رہا ہے۔ میں تو اس خون کو روکنے کا سبب بنوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ پورے ملک کو متحد کردوں۔"

"میرے عظیم بھائی، اپنا ملک پھر اپنا ہوتا ہے۔ آپ اگر کامیاب ہو بھی گئے تو نامہربانی کے سکے آپ کی جیب میں نہیں آئیں گے۔ تاریخ یہی کہتی رہے گی کہ آپ نے کسی کی زمین پر قبضہ کیا تھا۔"

"یقین کیجیے کہ ہم وہاں مال غنیمت کی ہوس میں نہیں جارہے ہیں۔ میں ایک عظیم سلطنت قائم کرنے جارہا ہوں جس کے میں ہمیشہ سے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ یہ بات آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔"

"میں تو اپنے بھائی کی زندگی چاہتی ہوں۔"

"کئی ہندو راجا اور مسلمان حکمران مجھ سے معاہدہ کرچکے ہیں۔ ہم ابراہیم لودھی کے خلاف متحدہ لشکر کشی کریں گے۔ یہ افغان میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ ان سے مقابلہ کرنا میں خوب جانتا ہوں۔"

"آپ یہاں کیا برے ہیں۔ ہم سب ایک ساتھ رہیں تو کتنا اچھا ہے۔"

"ہم وہاں بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"آپ قندوز، قندھار اور بدخشاں سے لے کر کابل تک کے حکمراں ہیں۔ کابل کو آپ نے کتنی ترقی دی ہے، کیا یہ سب کچھ بہت نہیں؟"

"اس کے باوجود میں مجبور ہوں۔ سرکش قبائل میرے چاروں طرف موجود ہیں۔ کابل میں غلہ کم ہے پتھریلی زمین کو کیسے سرسبز کروں۔ اتنی آمدنی نہیں کہ صاحبانِ علم کو بلاؤں۔ معماروں کو طلب کروں۔ میں کابل اس لیے آیا تھا کہ میں اسے ہرات و سمرقند کی طرح پررونق بنا دوں گا۔ یہ مواقع مجھے نہیں ملے۔ یہ مواقع مجھے ہندوستان میں ملیں گے۔ میں نہیں تو میری اولادیں یہ کام کریں گی۔"

"آپ وہاں تلوار کے بغیر حکومت نہیں کر سکیں گے۔ تلوار اور کتاب میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔"

"تو آپ اس لشکر کشی کے خلاف تھیں؟"

"میں لشکر کشی کے نتائج سے خوف زدہ رہتی ہوں۔ اس کے علاوہ میرا ہمایوں بھی مجھ سے دور ہو جائے گا۔"

"آپ بھی تو ساتھ ہوں گی۔ میں مرزا کامران کو قندھار کا صوبے دار بنا دوں گا۔ وہ اپنے ساتھ عسکری کو بھی لے جائے گا۔ ہندال کی سرپرست اس کی ماں ہوگی۔"

خانزادہ نے دیکھ لیا تھا کہ بابر نے پورا نقشہ پہلے ہی تیار کر لیا ہے لہٰذا اس نے چپ رہنے میں عافیت سمجھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا ضدی بھائی جس کام کی ٹھان لیتا ہے پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔

خانزادہ بیگم نے اتنی ٹھوکریں کھائی تھیں کہ اب بیس سال کی فراغت بھی اس کے خوف کو دور نہیں کر سکی تھی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ اس کا جنگ آزما بھائی اب کسی مہم پر نہ نکلے لیکن اس کے چاہنے سے کیا ہوتا تھا۔

انہی دنوں سلطان علاؤالدین کابل آیا اور دہلی کی تسخیر کے لیے مدد چاہی۔ معتبر افغان امیر دولت خاں کا خط بھی بابر کے نام آیا جس میں سلطان ابراہیم بادشاہ دہلی کی بدسلوکیوں کی شکایت کی گئی تھی۔ بابر نے اب پوری طرح ہندوستان کا عزم کر لیا۔

اس کا شوقِ سفر ایسا تھا کہ صرف سات ہزار لوگ لے کر ہندوستان کی عظیم افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ ولی عہد ہمایوں اس کے ساتھ تھا۔

شاہی لشکر سیالکوٹ پہنچا تو سلطان علاؤالدین خدمت میں حاضر ہوا۔ جب لاہور پہنچا تو وہاں کے مقرر کردہ حاکم حاضر خدمت ہوئے۔

جس دن اس نے دریائے سندھ عبور کیا تو اس کی فوج دس ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔ جاسوسوں نے خبر دی کہ سلطان ابراہیم ایک لاکھ سواروں اور جنگی ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد لے کر دہلی سے پانی پت پہنچ گیا ہے۔ بابر بھی سرہند پہنچا اور وہاں سے سلطان ابراہیم کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔

وہ پانی پت پہنچا تو دونوں کی افواج کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اس کی فوج ابراہیم کی فوج کا دسواں حصہ بھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھی ہراساں تھے اور اسے لوٹ چلنے کا مشورہ دے رہے تھے لیکن وہ جنگ آزما بضد تھا کہ صف آرائی کی جائے۔

جب مقابلہ ہوا تو دونوں طرف سے فوجیں غضب ناک موجوں کی طرح بڑھیں۔ صفوں سے صفیں ٹکرا گئیں، تاحدِ نظر خون کے فوارے چھوٹتے نظر آنے لگے۔ یہ معلوم ہوتا تھا زمین پر زلزلہ آگیا ہو۔ دوپہر ہوئی نہیں تھی کہ ہزار ہا آدمیوں کے سر اڑ گئے، ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے کچلے گئے۔ ایک لاکھ اور دس ہزار کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

چغتائی لشکر پھریرے اڑاتا ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا۔ دوپہر کے بعد سلطان ابراہیم کسی کو میدان میں نظر نہیں آیا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ وہ مارا گیا ہے۔

بابر کے لشکر جنگ میں مصروف تھے اور وہ خود چند ساتھیوں کو لے کر سلطان ابراہیم کی تلاش میں نکلا۔ ایک جگہ بابر کی نظر سلطان ابراہیم کے سر پر پڑی اور بہادر لشکریوں نے باگیں کھینچ لیں۔

فتح کے شادیانے بجا دیے گئے۔

اس دن پندرہ سولہ ہزار پٹھان راجپوت اور میواتی قتل و گرفتار ہوئے۔ باقی بچے اپنے علاقوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

فتح کے بعد بابر نے ہمایوں کو آگرہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا اور خود دہلی کی طرف کوچ کر گیا۔ وہاں پہنچ کر شیخ زین الدین کو حکم دیا کہ وہ ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھیں۔

دوسرے دن بابر نے دہلی کے قلعۂ شاہی، محلات اور باغات کی سیر کی اور مزارات کی زیارت کے لیے نکلا۔

دس دن دہلی میں قیام کرنے کے بعد خود بھی آگرہ روانہ ہو گیا جہاں اس کا بیٹا ہمایوں قلعہ فتح کرنے کے بعد اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا۔

ہندوستان صرف آگرہ اور دہلی کا نام نہیں تھا۔ وہ اپنی موت تک اپنے خواب کی تکمیل کے لیے جنگ آزمائی کرتا رہا اور مغلیہ سلطنت کے بانی کی حیثیت سے اس کا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

مآخذات

تزکِ بابری - رشید اختر ندوی، ظہیر الدین بابر - ہیرلڈلیم

منتخب اللباب - خافی خاں، ظہیر الدین بابر - میر تمقل قادر

جواری

کاشف زبیر

کوئی کتنا ہی بڑا بازیگر کیوں نہ ہو... کسی نہ کسی موڑ پر مات کھا ہی جاتا ہے۔ اس روز وہ بھی زندگی کے ایک ایسے ہی موڑ پر کھڑا تھا جہاں اس کے ہاتھوں میں جیت ہی جیت تھی، لیکن اس کی جدوجہد اسے کس سمت محوِ سفر کرتی ہے... اس کا فیصلہ فقط ایک پل میں پوشیدہ تھا اور بس... وہی ایک لمحہ اس کے تعاقب میں سرگرداں رہا۔

زندگی اور موت کے مابین رسّاکشی کا کٹھن احوال

مارٹن گھوڑے کی ہنہناہٹ سن کر بیدار ہوا تو سورج نمودار ہونے والا تھا اور اس کا وفادار گھوڑا اسے یاد دلا رہا تھا کہ اسے ابھی کافی دور جانا ہے۔ اگرچہ مارٹن کی کوئی منزل نہیں تھی مگر اسے پھر بھی اس علاقے سے دور نکل جانا تھا کیونکہ اس کی جان کے دشمن اسے تلاش کر رہے تھے۔ معاملہ سنگین نہیں تھا لیکن دوسری طرف سے عاقبت نااندیشی کے مظاہرے نے اسے سنگین بنا ڈالا تھا۔ مارٹن اتنا کامیاب جواری تھا کہ تاش کے پتے اس کے ہاتھ میں آ کر جیسے غلام ہو جاتے تھے۔ یہ بات دوسروں کو پسند نہیں آتی تھی۔ دو دن پہلے وہ ٹیکساس کے ایک چھوٹے سے شہر مورن ٹاؤن میں

تھا۔ جہاں ایک متوسط درجے کے جوئے خانے میں مارٹن نے دو جواریوں سے اچھی خاصی رقم جیت لی۔ کیونکہ قسمت سے اس کے پاس خود اچھے پتے آگئے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ جب وہ رقم سمیٹ رہا تھا تو اتفاق سے اس کا ایک جاننے والا، بریڈ وہاں آگیا۔ مارٹن ایک بار اسے بھی چونا لگا چکا تھا اور یہ وہ بات بھولا نہیں تھا۔

"کیا ہو رہا ہے مارٹن؟" بریڈ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "میرا خیال ہے جیت ہمیشہ کی طرح تمہاری ہی ہوئی ہوگی۔"

"بکواس بند کرو۔" مارٹن نے رقم جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ وہ دل ہی دل میں اسے گالیاں دے رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اب کوئی الٹی سیدھی بات کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ بریڈ نے ہارنے والوں کی طرف دیکھا جن کی بھویں پہلے ہی تنی ہوئی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے۔" بریڈ شاطرانہ انداز میں بولا۔ "مگر دوستو! جیت مارٹن کی انگلیوں میں چھپی ہوتی ہے۔ اس سے رقم نکلوانا بہت مشکل کام ہے۔"

یہ سنتے ہی دونوں جواری غرانے لگے اور اس سے پہلے کہ مارٹن انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا، انہوں نے اپنے پستول نکال لیے۔ اب مجبوری تھی۔ دو منٹ بعد جب مارٹن وہاں سے گرتا پڑتا نکلا تو اندر دونوں جواری مر چکے تھے یا آخری دموں پر تھے۔ اگر وہ انہیں نہ مارتا تو خود مارا جاتا۔ باہر نکلتے ہی وہ گھوڑے پر بیٹھا، وراسے بگٹٹ دوڑاتے ہوئے شہر سے نکل گیا۔ باہر نکلنے کے بعد اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور مغرب کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسے امید تھی جن لوگوں نے اسے فرار ہوتے دیکھا تھا ان کی نشان دہی پر دشمن اسے مشرق کی طرف ہی تلاش کریں گے۔ اتفاق سے اسے معلوم تھا کہ مارے جانے والے دونوں جواری ایک گینگ سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا لازمی طور پر اس گینگ کے لوگ اسے تلاش کرتے۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ جلد از جلد یہاں سے جتنا ہوسکے دور نکل جائے۔

مارٹن اس وقت تک گھوڑا دوڑاتا رہا جب تک اس نے تھک کر مزید آگے بڑھنے سے انکار نہیں کر دیا۔ خود مارٹن کا بھی جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا، اس لیے وہ تپتی دھوپ میں ایک کیکٹس کی مختصر چھاؤں میں بے خبر سو گیا۔ جب شام قریب آئی تو وہ بغیر کچھ کھائے دوبارہ عازم سفر ہوا۔ اس دوران میں اس کا گھوڑا وہاں پودے اور گھاس چر کر تازہ دم ہو چکا تھا۔ مارٹن کے پاس کھانے کے لیے صرف چنے تھے اور ایک بوتل میں پانی تھا۔ وہ پانی بھی بہت احتیاط سے استعمال کر رہا تھا۔ چھ گھنٹے کے سفر کے بعد جب مکمل تاریکی چھا گئی تو اسے رکنا پڑا۔ گزشتہ رات تو وہ تاریکی کی پروا کیے بغیر گھوڑا دوڑاتا رہا تھا حالانکہ تاریکی میں خطرہ تھا کہ تاریکی میں گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرے اور وہ بھی مارا جائے۔

جولائی کا مہینا ہونے کے باوجود صحرا میں رات خاصی سرد ہو جاتی تھی لیکن اس نے الاؤ جلانے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ اگرچہ وہ شاید نیو میکسیکو کی سرحد کے پاس کہیں تھا مگر دشمن کے تعاقب کا خدشہ اس کے ذہن سے نکلا نہیں تھا۔ چنے کھا کر اور تھوڑا پانی پی کر وہ سو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ صبح ہوتے ہی وہاں سے چل پڑے گا اور کم سے کم کیلیفورنیا پہنچ کر دم لے گا۔ یہ بہت طویل سفر تھا۔ ابھی اسے مزید کوئی بارہ سو کلومیٹرز کا سفر درکار تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ چار دن بعد کیلیفورنیا میں پہنچ جائے گا۔ وہاں تک اس کے دشمنوں کی رسائی آسان نہیں تھی۔

بیدار ہو کر اس نے چنوں والی تھیلی دیکھی جس میں بس چند دانے ہی پڑے تھے، اس نے وہی منہ میں ڈال لیے۔ بوتل میں پانی بھی کم رہ گیا تھا اور کم سے کم آج اسے لازمی کہیں سے پانی حاصل کرنا تھا ورنہ دن کی گرمی اسے مار ڈالتی۔ اب تک وہ خود آبادیوں سے گریز کرتا آیا تھا آبادیوں سے وہ اس خدشے کے باعث۔۔۔ دور رہا کہ اس کا پیچھا کرنے والے دشمن لازمی ان جگہوں سے پوچھ گچھ کرتے اور اس طرح وہ اس کا سراغ پالیتے۔ اب اس کا امکان کم تھا، مگر اب پانی لازمی حاصل کرنا تھا۔

سورج طلوع ہوتے ہی آگ برسانے لگا تھا۔ پہلے گھنٹے میں وہ بوتل کا سارا پانی پی چکا تھا مگر کچھ ہی دیر بعد اس کا گلا یوں خشک ہو گیا جیسے اس نے چوبیس گھنٹے سے پانی نہ پیا ہو۔ اس کا گھوڑا بھی پانی کی کمی سے کچھ سست ہو رہا تھا لیکن اس کی توانائی فی الحال برقرار تھی۔ مارٹن جانتا تھا اگر آج کے دن گھوڑے کو پانی نہ ملا تو وہ بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دے گا۔ دوپہر تک مارٹن کا برا حال ہو گیا تھا، اس کی نظر دھندلا رہی تھی اور وہ بہ مشکل خود کو گھوڑے پر سوار رکھے ہوئے تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ اس وقت وہ صحرا کے کسی ویران حصے میں سفر کر رہا تھا جہاں دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔

ایک بار اس نے اپنا جھولتا ہوا سر اٹھایا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا کیونکہ سامنے ہی ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس دکھائی دے رہا تھا۔ لکڑی اور تاروں سے بنے

ہوئے اس احاطے میں ایک چھوٹا لیکن خوب صورت مکان بھی دکھائی دے رہا تھا جس کے ساتھ ہی ہوائی چکی لگی ہوئی تھی جو زمین سے پانی کھینچ کر نکالتی تھی۔ ہوائی چکی دیکھتے ہی مارٹن جیسے ہوش میں آگیا۔ فارم زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن بہت اچھی طرح بنا ہوا تھا۔ اندر لگی مکئی کی فصل بتا رہی تھی کہ یہاں پانی وافر مقدار میں تھا۔ لکڑی کی بلیاں گاڑ کر ان سے خاردار تاریں باندھ کر باڑھ بنائی گئی تھی۔ دروازہ جنوب کی طرف تھا۔ وہ ذرا سا گھوم کر احاطے میں داخل ہوا۔ یہاں سے اسے مکان کے عقب میں ایک چھوٹا سا اصطبل اور مویشی گھر بھی نظر آئے۔

مکان کی طرف جانے والے راستے کے دونوں طرف مکئی کے تین فٹ اونچے ہو جانے والے پودے ہلکی ہوا میں ہل رہے تھے۔ پھر اسے ہوائی چکی کے عین نیچے نالی میں گرتا ہوا پانی دکھائی دیا تو وہ گھوڑے سے اتر کر پانی کی طرف لپکا۔ اس نے بلا تکلف بہتے پانی میں منہ ڈال دیا اور اس شیریں اور سرد پانی کو گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ اس کا گھوڑا بھی آگیا اور اس کے ساتھ ہی پانی پینے میں مصروف ہو گیا۔ پیٹ بھر کر پانی پینے کے بعد مارٹن نے اپنا سر بھی پانی میں ڈال دیا تھا، اسے بہت سکون مل رہا تھا۔ اچانک گھوڑا ہنہنایا۔ مارٹن نے چونک کر سر اٹھایا تو اسے اپنے چہرے کے عین سامنے شاٹ گن کی نال دکھائی دی۔ وہ ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی نال سے شعلہ نکلے گا اور اس کا سر غائب ہو جائے گا لیکن جب ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو اس نے بہت آرام سے سر اوپر کیا۔

یہ ایک نوجوان آدمی تھا اور اس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ یہ طاقتور اور مضبوط جسم کا شخص تھا۔ چہرے پر ایک مخصوص مردانہ وجاہت پائی جاتی تھی جو خواتین کو پسند ہوتی ہے۔ اس کے دائیں شانے پر ٹیٹو کھدا ہوا تھا۔ وہ شاید پچیس سال کا تھا۔ مارٹن ہاتھ اوپر کرتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ نوجوان نے غرا کر کہا۔ "کون ہو تم اور بنا اجازت اندر کیسے آئے؟"

"میں پیاسا تھا اور صرف پانی کے لیے اندر آیا ہوں، میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔" مارٹن نے جلدی سے کہا اور اپنا نام غلط بتایا۔ "میرا نام جیسن کیڈ ہے اور میں ایریزونا جا رہا ہوں۔"

نوجوان اسے بدستور گھورتے ہوئے بولا۔ "تم ایریزونا میں ہی ہو لیکن کہاں سے آرہے ہو؟"

یہ سن کر مارٹن کو حیرت ہوئی، اس کا خیال تھا کہ وہ ابھی نیو میکسیکو میں ہوگا لیکن وہ ایریزونا میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس نے عجلت میں بہت تیزی سے سفر کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔ "میں نیو میکسیکو سے آ رہا ہوں۔ یقین کرو میں صرف مسافر ہوں۔ اگر تم کہو تو میں چلا جاتا ہوں۔"

نوجوان اب بھی اس سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے مارٹن کو حکم دیا۔ "اپنی بیلٹ گرا دو۔ کوئی ہوشیاری مت دکھانا، میں گولی چلانے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

بیلٹ میں مارٹن کے دونوں پستول لگے تھے۔ بادل ناخواستہ اس نے بیلٹ کھول دی اور وہ اس کے پیروں میں گر گئی۔ پھر اس نے نوجوان کے حکم پر اسے پاؤں سے اس کی طرف دھکیل دیا۔ نوجوان نے بیلٹ اٹھائی اور مارٹن سے کہا۔ "اندر کی طرف چلو لیکن اس سے پہلے اپنے گھوڑے کو باندھ دو کہ یہ کھیتوں میں نہ گھسے۔"

مارٹن نے گھوڑے کی لگام ہوائی چکی کے ایک پائپ سے باندھی اور نوجوان کے آگے آگے مکان میں چلا آیا۔ مکان اندر سے بھی خوب صورت اور بہترین فرنیچر اور دیگر اشیا سے آراستہ تھا لیکن ان سب سے زیادہ خوب صورت وہ عورت نکلی جو اندر موجود تھی۔ اس نے صرف ایک مردانہ شرٹ پہن رکھی تھی جو بہ مشکل اس کی رانوں تک آ رہی تھی۔ گلابی بے داغ رنگت اور بہت حسین ناک نقشہ تھا۔ جسامت بہت موزوں تھی۔ عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی مگر مارٹن کو اس کی ہلکی سرمئی آنکھیں بہت سرد لگی تھیں۔ اس نے غور سے مارٹن معائنہ کیا۔ اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ وہ اسے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ نوجوان اور عورت کا حلیہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اندرون خانہ کن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ پھر وہ مرد کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اسے اندر لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی۔" نوجوان نے معنی خیز انداز میں کہا اور عورت کو ذرا دور لے گیا اور دونوں کچھ دیر سرگوشیوں میں بات کرتے رہے۔ مارٹن ان کی باتیں نہیں سن سکا تھا اس لیے وہ نشست گاہ کا جائزہ لینے لگا۔ فارم، مکان اور اس کی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ یہ لوگ دولت مند تھے۔ اسی لیے اس ویرانے میں اتنی اچھی رہائش تھی۔ کچھ دیر بعد نوجوان اور عورت آئے تو ان کا انداز بدلا ہوا تھا۔ نوجوان نے مسکرا کر مارٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ شاٹ گن اور اس کے پستول کہیں رکھ آیا تھا۔ "معاف کرنا، ہم ایک ویرانے میں رہتے ہیں اور آسانی سے کسی اجنبی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔"

مارسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یعنی اب تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے؟“

”نہیں اب ہم مطمئن ہیں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

”تب میرے پستول واپس کر دو، میں یہاں سے جا رہا ہوں۔“

”اتنی جلدی کیا ہے؟“ عورت بھی وہاں آ گئی۔ اب اس نے گاؤن پہن لیا تھا جس نے اس کی لمبی ٹانگوں کو چھپا لیا تھا لیکن سراپے کی دل کشی کو پوری طرح عیاں کر رہا تھا۔ مارسن نے دل میں اعتراف کیا کہ اس نے اتنی حسین عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نوجوان کم عمر ہونے کے باوجود اس کے ساتھ تھا۔ ویسے جوڑی دونوں کی شاندار تھی۔ ”کھانے کا وقت ہو گیا ہے امید ہے تمہیں میرا بنایا ہوا اسٹو پسند آئے گا۔“

مارسن کا بھوک سے برا حال تھا لیکن اس افتاد میں وہ فی الحال بھول گیا تھا۔ عورت نے کہا تو اسے یاد آیا اور اس نے جلدی سے سر ہلا دیا۔ ”میں شکر گزار ہوں گا۔“

”میں شین والٹر ہوں اور یہ میری بیوی میری این والٹر ہے۔“ نوجوان نے تعارف کرایا تو مارسن مسکرایا۔

”میں نے اتنا دل کش جوڑا پہلی بار دیکھا ہے۔“

میری کے رخسار سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے شرماتے ہوئے انداز میں مارسن کو شکریہ کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ شین اس کے لیے مکئی کی مقامی طور پر کشید کی ہوئی شراب نکال لایا۔ یہ خاصی تیز تھی لیکن مارسن کو اچھی لگی۔ ذرا سی دیر میں وہ دونوں بے تکلف ہو چکے تھے۔ مارسن نے اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا جو سب جھوٹ تھا۔ شین اسے بتانے لگا کہ اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی اس لیے اس نے گاؤں سے ذرا دور یہ زمین لے لی کیونکہ یہاں زیر زمین پانی بہت اچھا ہے۔ اب وہ یہاں گندم، مکئی اور کپاس کاشت کرتا ہے۔ کچھ سبزیاں بھی لگا رکھی ہیں جن سے اسے اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ مارسن نے بچوں کے بارے میں پوچھا تو شین نے بے پروائی سے جواب دیا کہ انہیں بچے اچھے نہیں لگتے اس لیے فی الحال وہ اکیلے ہی خوش ہیں۔ اس نے معنی خیز انداز میں کہا کہ ان کی زندگی بہت عیش و سکون سے گزر رہی ہے۔

”تم نے میری کو دیکھا ہے، کسی کو ایسی عورت مل جائے تو اور کیا چاہیے؟“

مارسن نے تائید کی کہ واقعی ایسی عورت مل جائے تو اور کیا چاہیے۔ کچھ دیر بعد میری نے ان کو کچن سے پکارا۔ کھانا بن گیا تھا۔ اسٹو کے ساتھ گارلک بریڈ تھی۔ میری نسلاً فرانسیسی تھی اس لیے میز پر بریڈ کی موجودگی لازمی تھی۔ پھر سرخ وائن تھی۔ کھانا بہت مزے کا تھا اور مارسن بھوکا بھی تھا اس لیے اس نے ڈٹ کر کھایا۔ کھا پی کر وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ روانگی سے پہلے اس نے نزدیکی گاؤں کے بارے میں پوچھا۔ شین نے بتایا۔ ”وہ شمال مشرق کی طرف ہے، تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔“

”پھر ایریزونا کی جانب جانے والے راستے پر پہلی بستی کون سی آئے گی؟ مجھے خوراک بھی حاصل کرنی ہے۔“

”اس راستے پر تمہیں کل ہی کوئی آبادی ملے گی۔ جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو ہمارے پاس کافی ہے، وہ لے جاؤ۔“

میری نے اسے ایک تھیلی میں کچھ کھانا دے دیا۔ اس کا ایک دو دن اس سے گزارا ہو سکتا تھا۔ ویسے اس نے اتنا کھا لیا تھا کہ اسے ایک دو وقت کھانے کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے بوتل پانی سے بھر لی اور روانہ ہونے سے پہلے خوب پانی پی لیا۔ اس کا گھوڑا پہلے ہی سیر ہو چکا تھا۔ وہ فارم سے نکل کر دوبارہ شمال مغرب کی طرف چل پڑا۔ سورج ڈھل رہا تھا لیکن اس کی تمازت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بہرحال پانی کی موجودگی میں اسے گرمی کی پروا نہیں رہی تھی۔

سفر کے دوران دو گھنٹے بعد اچانک اسے پیٹ میں تکلیف کا احساس ہوا۔ جو دم بدم بڑھنے لگا۔ پہلے وہ سمجھا کہ شاید اس نے بہت زیادہ کھانا کھا لیا تھا اور تکلیف اسی کا نتیجہ ہے مگر جب تکلیف زیادہ ہی ہونے لگی اور اسے یوں لگا جیسے اسے اندر سے کوئی خنجر سے کاٹ رہا ہے تو اسے اپنے خیال پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ یہ زیادہ کھا لینے کا نتیجہ ہرگز نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ کوئی اور مسئلہ تھا۔ اچانک اسے ابکائی آئی اور وہ گھوڑا روک کر نیچے کود گیا۔ اسے قے ہوئی اور جو کھایا تھا وہ سب باہر نکل آیا لیکن اس میں خون ہی خون تھا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ مگر قے کرنے کے بعد اسے کچھ سکون ملا تھا لیکن فوراً ہی اسے شدید کمزوری کا احساس ہوا اور اس کے جسم سے پسینا پھوٹ پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تو گر جائے گا اس لیے وہ جیسے تیسے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اسے آگے بڑھا کر خود اس کی گردن سے چمٹ گیا تاکہ بے ہوش بھی ہو جائے تو نیچے نہ گرے۔ اس نے نحیف آواز میں گھوڑے سے کہا۔

”بیڈی بوائے چلتے رہو، رکنا مت۔“

گھوڑے نے ہنہنا کر سر ہلایا جیسے اسے تسلی دے رہا

ہو۔ گھوڑا مناسب رفتار سے چلنے لگا۔ کچھ دیر تو مارسن کے حواس سلامت رہے لیکن پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ گھوڑے کی گردن سے چمٹے ہونے کی وجہ سے وہ گرنے سے بچا ہوا تھا۔ کبھی کبھی اسے ذرا سا ہوش آتا تو اسے محسوس ہوتا کہ گھوڑا چل رہا ہے۔ وفادار جانور اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ چلتے چلتے رات ہو گئی تھی لیکن وہ رکا نہیں۔ آخری بار مارسن نے ماحول کو تاریک ہوتے دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کی زندگی موت کی تاریکی میں اتر رہی ہو۔ اس کے بعد اسے ہوش میں آنا نصیب نہیں ہو گا۔

”اے..... ہوش میں آؤ۔“ کسی نے اس کے گال پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا اور یہ تھپڑ بہت قوت سے مارے جا رہے تھے۔ مارسن کچھ دیر تو بے سدھ پڑا رہا پھر اس نے بھنا کر اٹھنے اور اس بدتمیز آدمی کو سبق سکھانے کی کوشش کی جو اسے مسلسل مارے جا رہا تھا لیکن اس سے ہلا بھی نہیں گیا۔ بس وہ کراہ کر رہ گیا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کسی تاریک جگہ پر تھا لیکن پاس ہی بہت تیز روشنی بھی تھی۔ اسے ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ غرانے کے بجائے اس کے منہ سے منمناتی ہوئی آواز نکلی تھی۔ اس نے مارنے والے کو دفع ہو جانے کو کہا تھا۔

”اٹھو، ہوش میں آؤ۔“ مارنے والے نے بھی غرا کر کہا۔ لہجے سے وہ اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا لیکن فوراً ہی کسی نے نرمی سے کہا۔

”اب مت مارو، اسے ہوش آ گیا ہے۔“

مارسن کی آنکھیں کھل چکی تھیں اس نے دیکھا وہ ایک گول چھت والی بگھی میں لیٹا ہوا ہے اور بہت تیز روشنی اصل میں باہر دھوپ کی تھی۔ بگھی کا پچھلا پردہ گرا ہوا تھا۔ اس کا ایک گوشہ ہٹا ہوا تھا، مارسن نے ایک کرخت چہرے والے ادھیڑ عمر آدمی کو دیکھا۔ اسے شاید وہی تھپڑ مار رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گیا اور مارسن نے ایک سفید بوڑھے شخص کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی گول تھا اور گل مچھوں کی وجہ سے چوڑا لگ رہا تھا۔ اس نے چھوٹے چاندی کے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ سرخ رنگت شاید دھوپ کی وجہ سے چقندر جیسی ہو گئی تھی۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”بہت کمزوری۔“ مارسن نے سرگوشی میں کہا۔ ”لیکن میں کہاں ہوں؟“

”میں ڈاکٹر جوزف مورگن ہوں۔“ بوڑھے نے

کترنیں

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ ”لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے!“

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی، انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی، کچھ دیر تو ہم سمجھے عالمِ خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا۔ دروازے کے ساتھ لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤاجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوں گی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں اچھا..... اچھا..... تھینک یو..... جاگ گیا ہوں..... بہت اچھا! نوازش ہے..... آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخرکار جب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

احمد شاہ پطرس بخاری کی کتاب ”پطرس کے مضامین“ سے اقتباس

مرسلہ: محمد عبداللہ دانش، حافظ آباد

تعارف کرایا۔ ''تمہیں کسی نے زہر دیا تھا لیکن تم بچ گئے ہو۔ میں نے تمہارا علاج کیا ہے لیکن شاید تم نے قے کر دی تھی اس سے زہر کا اثر کم ہو گیا اور تم مرنے سے بچ گئے۔''

''زہر...؟'' مارٹن نے بے یقینی سے کہا۔

بوڑھے ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''ہاں۔ یہ ایک قسم کا نباتی زہر ہوتا ہے جو ایک بوٹی سے ملتا ہے۔ اسے پیس کر سفوف کی شکل میں کر لیتے ہیں۔ پھر اسے کسی مشروب میں ملا کر دیا جا سکتا ہے۔ اس کا کوئی ذائقہ یا بو نہیں ہوتی۔ ہاں سادہ پانی میں ڈالو تو اس کا رنگ گلابی ہو جاتا ہے۔ یہ کھانے کے دو گھنٹے بعد اثر کرتا ہے۔''

ڈاکٹر جوزف نے زہر کی پوری کارکردگی بیان کر دی تھی۔ مارٹن کا ذہن فوری سرخ وائن کی طرف گیا جو اسے لنچ میں دی گئی تھی۔ لیکن وہ شراب تو سب نے پی تھی...... لیکن ہو سکتا ہے کسی طرح اس کی شراب میں زہر ملا دیا گیا ہو۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے وہی زہر دیا گیا ہے۔''

''تمہاری قمیص پر قے کے آثار تھے۔ میں نے اس سے پتا چلا لیا۔'' ڈاکٹر جوزف نے بتایا۔ ''یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں اس زہر کے علاج کا ماہر ہوں ورنہ تم شاید قے کرنے کے باوجود نہ بچ پاتے۔''

مارٹن نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ واقعی خوش قسمت تھا ورنہ ضروری نہیں تھا کہ اس ویرانے میں اسے ایک ایسا ڈاکٹر میسر آ جاتا جو اس مخصوص زہر کے علاج کا ماہر بھی ہو۔ ڈاکٹر جوزف اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ ''یہ زہر میں بھی بعض دواؤں میں استعمال کرتا ہوں اس لیے اس کی بوٹی بھی کاشت کرتا ہوں۔''

مارٹن اب بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ ''اس وقت میں کہاں ہوں؟''

''میں فونکس سے آ رہا تھا کہ تمہیں گھوڑے پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ فونکس یہاں سے چالیس میل دور جنوب مغرب میں ہے۔''

یعنی گھوڑا اسے لے کر غلط سمت میں چل پڑا تھا...... لیکن نہیں، وہ صحیح سمت میں آیا تھا اگر وہ بدستور شمال مغرب کی طرف چلتا رہتا تو اس وقت مارٹن دنیا میں نہ ہوتا۔ اسے غلط راستے پر آنے کی صورت میں ڈاکٹر ملا تھا اور اس کی جان بچ گئی تھی۔ اسے یاد آیا۔ ''میرا گھوڑا کہاں ہے؟''

''فکر مت کرو۔'' ڈاکٹر جوزف نے اسے تسلی دی۔ ''وہ ہمارے پاس ہے۔''

بگھی رکی ہوئی تھی اور اس کی اندرونی آرائش بتا رہی تھی کہ یہ خاصی قیمتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ اس نے قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے کوٹ کی جیب سے سونے کی زنجیر لٹک رہی تھی جو یقیناً جیبی گھڑی کی تھی۔ مارٹن کو پیاس لگ رہی تھی اس نے پانی مانگا۔ ڈاکٹر نے اپنے آدمی کو آواز دی۔ ''گومز پانی لاؤ۔''

''یہ شخص کون ہے؟'' مارٹن نے آہستہ سے پوچھا۔

''میرا ملازم ہے۔''

''تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''ہم کوئن ویلی جا رہے ہیں۔'' ڈاکٹر جوزف نے بتایا۔ مارٹن کے لیے یہ نام اجنبی تھا۔ ڈاکٹر نے اس سے اب تک کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آ رہا تھا نیز اسے زہر کس نے دیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ابھی مارٹن آرام کرے۔ وہ پردہ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ مارٹن نے دیکھا وہ صحرا میں رکے ہوئے تھے اور شاید یہاں کوئی چشمہ تھا کیونکہ پاس ہی نباتات اور پانی کی مہک آ رہی تھی۔ اتنے میں گومز پانی لے کر آیا۔ اس نے سہارا دے کر مارٹن کو پانی پلایا لیکن اس وقت بھی وہ اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مارٹن نے پانی پی کر آہستہ سے کہا۔

''تم مجھے ناپسند کرتے ہو؟''

''میں تم جیسے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے کڑوے تیوروں کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ سب پر اعتبار کر لیتا ہے لیکن میں نہیں کرتا۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا اور وہ کٹورا لے کر باہر چلا گیا۔ مارٹن نے اسے زیر لب تین چار گالیاں دیں۔

''بیٹے...... تم کو تو دیکھ لوں گا۔''

مارٹن کچھ دیر بعد سو گیا تھا۔ درمیان میں ایک بار ڈاکٹر جوزف نے اسے زبردستی اٹھا کر ایک مشروب پلایا جو خاصا کڑوا تھا۔ اسے پی کر وہ پھر سو گیا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی اور وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس بار آسانی سے اٹھ گیا تھا لیکن جب وہ بگھی سے اترا تو اسے چکر سا آ گیا۔ اگر اس نے کنارے کو مضبوطی سے نہ پکڑا ہوتا تو شاید گر جاتا۔ ڈاکٹر جوزف اور گومز کچھ دور الاؤ روشن کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر گومز بیٹھا رہا لیکن ڈاکٹر جلدی سے اٹھ کر آیا اور اسے بازو سے پکڑ کر الاؤ کے پاس لے آیا۔

''تمہیں شاید چکر آ گیا تھا؟''

مارٹن نے اپنا بازو چھڑا لیا اور کسی قدر بدمزگی سے

بولا۔ ''نہیں، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

ڈاکٹر جوزف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں تم بالکل ٹھیک نہیں ہو۔ ابھی تو تمہیں سفر کے قابل ہونے میں کم سے کم ایک رات اور لگے گی یعنی تم کل صبح سے پہلے سفر کے قابل نہیں ہو سکو گے۔ اب بھی ہم تمہاری وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ بگھی کا سفر بھی تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

مارٹن کا خیال تھا کہ ڈاکٹر اس کی کمزوری کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ گومز اس کے لیے گوشت اور دلیا تیار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جوزف نے اسے بتایا کہ اسے اب کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے بس اچھی غذا کی ضرورت ہے اس طرح وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ مارٹن سوچ رہا تھا کہ شین اور میری نے اسے زہر کیوں دیا؟ اسے یاد آیا کہ جب میری نے شین سے پوچھا تھا کہ وہ اسے اندر کیوں لایا ہے تو اس نے معنی خیز انداز میں کہا تھا کہ اسے لانا ضروری تھا پھر وہ میری کو ایک طرف لے گیا تھا جس کے بعد میری کا رویہ ہی بدل گیا تھا، وہ اس سے بہت لگاوٹ بھرے انداز میں بات کرنے لگی تھی۔ ظاہر ہے مقصد یہی تھا کہ وہ رک جائے اور اسے زہر دیا جا سکے۔ مگر سوال وہی تھا کہ وہ اسے کیوں زہر دینا چاہتے تھے؟ پھر زہر ہی کیوں، وہ اسے گولی بھی مار سکتے تھے۔ بعد میں اسے ڈاکو قرار دینا بھی مشکل نہیں تھا۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد بھی مارٹن نہیں سمجھ سکا تھا کہ شین اور میری نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا تھا؟ اس دوران میں دلیا تیار ہو گیا تھا۔ انہوں نے کھایا اور پھر کافی پی۔ اتفاق سے ڈاکٹر بھی وہی سوچ رہا تھا جو مارٹن کے ذہن میں تھا۔ اس نے اچانک پوچھا۔

''تمہیں زہر کس نے دیا؟''

''ایک جوڑے نے۔'' مارٹن نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میں ان کے فارم پر رک گیا تھا۔''

''کیوں، کیا تمہاری ان سے کوئی دشمنی ہے؟'' ڈاکٹر جوزف نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''انہوں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔'' مارٹن نے آہ بھر کر کہا۔ ''لیکن باکی کا! میں نے اتنی حسین عورت اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ اس کا شوہر بھی کم نہیں تھا لیکن عورت تو بس سمجھ لو قیامت تھی۔ جب سے مجھے ہوش آیا ہے میں یہی سوچ رہا ہوں میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا جو انہوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ میں پیاس سے مرنے والا تھا جب ان کے فارم تک پہنچا۔ ابھی وہاں نالی سے میں اور میرا گھوڑا پانی پی رہے تھے کہ شین نامی آدمی

نکتہ ریزی

☆ وہ دماغی حالت قابلِ رحم ہے جو صرف چند خواہشات کی آرزومند ہو اور دنیا کی باقی ماندہ نعمتوں سے خائف...... (جی کے چسٹرٹن)

☆ میں نے شراب کے پیالے کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا لیکن مالِ حرام شیرِ مادر کی طرح ہضم کر جاتا ہوں...... (فرانسس بیکن)

☆ ایک دانا سے دوستی، ہزار نادانوں کی دوستی سے بہتر ہے۔ (ڈیموکریٹس)

☆ لوگ مذہب کے لیے جان تو بہ آسانی دے دیتے ہیں لیکن مذہبی بننا پسند نہیں کرتے۔ (لوئیس بورخیز)

☆ دوستی محبت سے زیادہ تکلیف دہ ہے، اس کا دورانیہ طویل ہوتا ہے۔ (آسکر وائلڈ)

☆ محبت عارضی پاگل پن ہے جو شادی ہوتے ہی درست ہو جاتا ہے۔ (ایمروز بیرس)

☆ دوسروں کو ناکام بنانے کی کوششیں خود ہمیں ناکام بناتی ہیں۔ (ایمرسن)

☆ جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ بے وقوف ہے وہ دنیا کا سب سے عقلمند آدمی ہے لیکن جو بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بیوقوفی سے لاعلم بھی ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ہے۔ (سقراط)

☆ بیس سال کی عمر میں انسان کا جو چہرہ رہتا ہے وہ قدرت کی دین ہے۔ تیس سال کی عمر کا چہرہ زندگی کے نشیب و فراز کی دین ہے اور پچاس سال کی عمر کا چہرہ انسان کی اپنی کمائی...... (اشٹاوک)

☆ عیسائی مبلغ پہلی بار افریقا آئے تو ہم افریقیوں کے پاس زمینیں تھیں۔ مبلغوں کے پاس بائبل، انہوں نے ہمیں مذہب کی تعلیم دی، ہم نے آنکھ بند کر کے ان کی تعلیم پر عمل کیا اور جب ہماری آنکھیں کھلیں تو ہمارے پاس بائبل تھی اور ان کے پاس زمینیں۔ (جوموکینیاٹا)

☆ سچی خوشی جسمانی قوت اور دولت سے میسر نہیں آتی بلکہ اس کا راز سمجھ کی پختگی اور اعلیٰ کردار میں پوشیدہ ہے۔ (ڈیموکریٹس)

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

باہر آیا اور مجھے گن پوائنٹ پر اندر لے گیا اس نے میرے پستول بھی چھین لیے تھے۔ مگر اندر جا کر اس کا رویہ بدل گیا۔ انہوں نے مجھے کھانا کھلایا اور شراب بھی دی تھی۔ شاید شراب میں ہی زہر تھا۔ اس کے دو گھنٹے بعد میری حالت خراب ہو گئی اور پھر مجھے ایک بہت بڑی قے ہوئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو تمہارے پاس تھا۔"

ڈاکٹر جوزف اور گومز غور سے اس کی کہانی سن رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "ممکن ہے وہ کوئی مجرم ہوں اور انہیں تم سے خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہو؟"

"وہ مجرم نہیں لگ رہے تھے۔ وہ مکان اور فارم ان کا ہی تھا۔" مارٹن نے اصرار کیا۔ "انہوں نے کسی اور وجہ سے مجھے زہر دیا ہے لیکن وہ وجہ میں سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

گومز اسے گھور رہا تھا، اس نے کہا۔ "ممکن ہے انہیں تم سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ تم بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہو۔"

مارٹن نے اسے جواباً گھورا۔ "ممکن ہے میں شریف آدمی نہ ہوں لیکن میں نے انہیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔"

"گومز زیادہ بحث مت کرو۔" ڈاکٹر جوزف نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "جا کر سو جاؤ۔"

گومز نے کچھ نہیں کہا اور اٹھ کر اس طرف چلا گیا جہاں اس کا بستر لگا تھا۔ ڈاکٹر اور مارٹن وہیں بیٹھے رہے۔ مارٹن نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارا ملازم تمہارے برخلاف بہت اکھڑ ہے۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر جوزف نے تسلیم کیا۔ "لیکن میرا بہت وفادار ہے، میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

مارٹن نے موضوع بدل دیا۔ "کیا تم کسی کا علاج کرنے گئے تھے؟"

ڈاکٹر جوزف نے سر ہلایا۔ "ہاں میں اکثر علاج کرنے دور دراز علاقوں میں جاتا ہوں جہاں ڈاکٹر کی سہولت میسر نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ سال میں چھ مہینے میں گھر سے باہر رہتا ہوں۔"

"شادی شدہ ہو؟"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "ہاں... اور مسز مورگن بہت اچھی عورت ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے وہ ملی ہے۔"

کیونکہ مارٹن کو بیوی کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے وہ اس بارے میں اپنی رائے نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "کل صبح میں روانہ ہو جاؤں گا۔"

"ابھی تم نہیں جا سکتے۔" ڈاکٹر جلدی سے بولا۔ "زہر کے اثرات ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اس کا ایک حملہ ناکام ہوا ہے اس لیے تم خود کو بہتر محسوس کر رہے ہو لیکن جلد اس کے اثرات دوبارہ حملہ کریں گے اور تم پہلے کی طرح بیمار ہو جاؤ گے۔"

مارٹن کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کچھ زیادہ ہی بیان کر رہا ہے۔ وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا لیکن اس نے بحث نہیں کی۔ اس کے سونے کے لیے بگھی میں ہی جگہ بنائی گئی تھی۔ وہ بگھی میں آ گیا۔ پھر اس کی آنکھ کھلی تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اسے رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کمزوری اتنی نہیں تھی کہ وہ نزدیکی چٹانوں کے پیچھے نہ جا پاتا۔ ڈاکٹر الاؤ کے پاس کمبل میں لپٹا سو رہا تھا۔ اس نے فارغ ہو کر پینٹ کے بٹن بند کیے ہی تھے کہ گومز کو آتے دیکھا۔ اس کے تاثرات بدستور خراب تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "میرا خیال ہے تم آج رخصت ہو جاؤ گے؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے زہر کے اثرات ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئے اس لیے مجھے اس کے ساتھ جانا ہوگا۔"

"میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔" گومز بولا۔

مارٹن نے مضحکہ خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم...؟"

"ہاں میں۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "تم نے کل بتایا تھا کہ جس عورت نے تمہیں زہر دیا، وہ بہت حسین تھی؟"

"بہت سے بھی زیادہ۔" مارٹن بولا۔ "لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

گومز نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پھر سوال کیا۔ "وہ فارم کیسا تھا؟"

"ویسا ہی تھا جیسے کہ فارم ہوتے ہیں۔ چاروں طرف کھیت درمیان میں مکان اور ایک عدد ہوائی چکی۔"

"ہوائی چکی......!" گومز نے دہرایا۔ "اس کا پنکھ گلابی رنگ کا تھا؟"

مارٹن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں... کیسے پتا؟"

گومز نے ایک بار پھر اس کا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔ "تمہارا ڈاکٹر کے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے اس لیے تم ناشتا کر کے اپنی راہ پکڑو، میں ناشتا بنا رہا ہوں۔"

مارٹن اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ اچھل پڑا، پھر اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ

آ گئی۔ وہ چٹانوں سے نکل کر باہر آیا تو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور وہ آ کر ڈاکٹر کے پاس ریت پر تقریباً گر گیا۔ ڈاکٹر جاگ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

مارٹن پیٹ پکڑ کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا...... اس نے مشکل سے کہا۔ "پتا نہیں پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے اور بہت کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ زہر کا اثر اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر بولا۔ "تم میرے ساتھ چلو میں تمہارا مکمل علاج کروں گا۔"

ناشتے کی تیاری کرتا ہوا گومز چونک گیا، اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے یہ اب ٹھیک ہے۔"

ڈاکٹر نے ناگواری سے کہا۔ "ڈاکٹر میں ہوں اور مجھے معلوم ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

گومز نے مارٹن کی طرف دیکھا تو وہ مسکرایا اور گومز کو آنکھ ماری لیکن جیسے ہی ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوا اس کے چہرے پر دوبارہ سے تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے۔ گومز کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ ناشتے کے بعد وہ سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ کیونکہ ڈاکٹر کے خیال میں مارٹن کو فی الحال گھوڑے کی سواری سے گریز کرنا چاہیے تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ بگھی میں بیٹھا تھا۔ مارٹن کا گھوڑا بگھی کے ساتھ ساتھ بندھا دوڑ رہا تھا۔ بگھی میں پہلے ہی دو طاقتور گھوڑے لگے تھے۔ مارٹن سارا دن خود کو بیمار ظاہر کرتا رہا اور شام کو جب انہوں نے پڑاؤ ڈالا تو وہ باہر نکل کر صحرا کی سرد ہوتی ریت پر لیٹ گیا۔ گومز سامان نکال رہا تھا اور ڈاکٹر جوزف ایک طرف بیٹھا پائپ سے شغل کر رہا تھا۔ اس نے راستے میں مارٹن کو وہی کڑوا سا مکسچر پلایا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس زہر کی مکمل دوا اس کے پاس گھر میں ہے۔

گومز وقفے وقفے سے اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی ڈاکٹر ٹہلنے کے لیے صحرا کی طرف گیا، وہ مارٹن کے سر پر سوار ہو گیا۔ "سنو، میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔" مارٹن مسکرایا۔

"تم ڈاکٹر کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تو یقین کرو زندہ نہیں جا سکو گے۔"

مارٹن عیاری سے بولا۔ "میں ڈاکٹر کا احسان مند ہوں اس نے میری جان بچائی ہے اور اب بھی میرا علاج کر رہا

ہنسی ہنسی میں

آپ نے زندگی میں کبھی ایسی ہنسی سنی ہے، گویا چینی کے پیالے میں موتیوں کو ایک خاص رفتار سے گرایا جائے، جیسے ہلکے ہلکے آبشار کی سی آواز، مدھر جھرنے کے بہنے کی آواز یا شاید وہ لوگ ہی دل کے اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ ان کی ہنسی بھی دلفریب لگتی ہے۔

اس کے برعکس کچھ لوگوں کو ہنستے دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ ان کو روک دیں کیونکہ کچھ لوگوں کو منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنستے دیکھ کر ہم اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ سوتے میں بھی ڈرنے لگے تھے۔

ہمارے ایک جاننے والے اتنا شرمندہ شرمندہ سے ہنستے ہیں کہ ہمیں آج تک ان کی شرمندگی کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ انہی صاحب کو ایک دن ہم نے روتے ہوئے دیکھا تو یقین کریں کہ ہماری ہنسی کا فوارہ اتنا بلند ہو گیا کہ اگر ہم والد محترم کی غضب ناک اور قہر آلود نظریں نہ دیکھتے (کہ کوئی موقع ہے دانت نکالنے کا) تو شاید ہم دو دن تک ہنستے رہتے۔

ہنسی کی ایک خطرناک کیفیت تب ہوتی ہے، جب ہماری ایک عزیز خاتون اپنے بے تحاشا قہقہے کے دوران ہی تمام بات کہہ جاتی ہیں اور آخر میں کہتی ہیں...... کیسا؟؟ اور ہم ہونقوں کی طرح سوچتے ہیں کہ کیا کہیں، پلے تو کچھ پڑا ہی نہیں۔ ان تمام مثالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہنسنے کے طبی فوائد سے انکار ناممکن ہے۔ خوب ہنستے رہنے سے خون کی وافر مقدار مہیا ہوتی ہے، جس کی فی زمانہ بے حد قلت ہے۔ ہنستے رہنے سے چہرہ سرسبز و شاداب اور طبیعت ہشاش بشاش رہتی ہے۔ لوگ بلاوجہ غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں جبکہ آپ کی خوش مزاجی کے چرچے چار سو پھیل جاتے ہیں۔ جلنے والے جلتے ہیں لیکن آپ تو صرف یہ سوچیے کہ جل کر کباب ہونے سے بہتر ہے کہ بندہ کھل کر گلاب ہو جائے، لیکن بات بے بات خوب ہنستے مسکراتے وقت یہ بات بھی ضرور ذہن نشین رکھیے کہ ان لازوال قہقہوں اور چیخوں نما ہنسی پر ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر اتنا ضرور ہے کہ شاید آپ کا حلقۂ احباب روز بروز مختصر ہوتا جائے۔

کرن ناز کے خیالات...... نارتھ کراچی سے

ہے، میں کیوں اسے نقصان پہنچاؤں گا؟''

''مجھے لگتا ہے تم کسی چکر میں ہوں۔'' گومز نے ڈاکٹر جوزف کو واپس آتے دیکھ کر کہا۔ ''میں نے تمہیں خبردار کردیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ مارٹن کا خون رگوں میں تیز ہوگیا تھا۔ ایک بار اس کا ہاتھ بیلٹ میں لگے پستول کی طرف گیا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پالیا۔ البتہ دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس شخص کو سبق ضرور سکھائے گا۔ اگلی صبح وہ ذرا دیر سے روانہ ہوئے کیونکہ کوئن ویلی وہاں سے کچھ ہی دور رہ گئی تھی۔ یہ علاقہ مارٹن کے لیے جانا پہچانا تھا۔ چند دن پہلے بھی وہ یہاں سفر کرچکا تھا۔ شام ہونے سے کچھ پہلے ہی وہ ڈاکٹر جوزف کے گھر پہنچ چکے تھے۔ خوب صورت فارم ہاؤس اور اس میں بنا ہوا مکان بھی مارٹن کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ جیسے ہی بگھی احاطے میں داخل ہوئی مکان کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر آئی۔

''مسز مورگن۔'' ڈاکٹر نے مارٹن سے کہا۔

''ڈاکٹر، تم خوش قسمت ہو۔'' مارٹن نے کہا۔ ''تمہاری بیوی حیرت انگیز حد تک کم عمر اور خوب صورت ہے۔''

''یہ مجھ سے پورے تیس سال چھوٹی ہے۔'' ڈاکٹر بولا تو اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ''مگر مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''یہ تو اس کی بے تابی بتارہی ہے۔'' مارٹن نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ڈاکٹر بیوی کو دیکھ کر جلدی سے بگھی سے اتر گیا اور بیوی نے پوری گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا۔

''میرے ساتھ ایک آدمی بھی آیا ہے۔''

عورت چونکی۔ ''کون ہے؟''

جب مارٹن بگھی سے اترا تو عورت کی حالت دیکھنے والی تھی... یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ وہ میری این تھی۔ اس نے گھیر والا مخصوص لباس پہن رکھا تھا جو عام طور سے گھریلو عورتیں پہنتی تھیں۔ یہ کمر سے تنگ اور گریبان کسی قدر کشادہ تھا۔ وہ اس عام سے لباس میں بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ مارٹن احترام سے اس کے سامنے جھکا اور اس کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا۔ ''مجھے مسز مورگن سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔''

ڈاکٹر جوزف نے میری سے کہا۔ ''مسٹر ایڈگر کے لیے اوپر والا کمرا درست کردو، ابھی یہ کم سے کم دو دن یہاں رکیں گے۔''

''میں ڈاکٹر کا مریض ہوں۔'' مارٹن نے کہا۔ ''کچھ لوگوں نے مجھے زہر دیدیا تھا لیکن ڈاکٹر کی مہربانی سے میں بچ گیا۔'' پھر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ''تم فکر مت کرو میرے علاج پر جو خرچ آئے گا میں ادا کردوں گا۔''

ڈاکٹر جوزف ہنسا۔ ''میں بھی فیس کبھی نہیں چھوڑتا۔''

وہ اندر آئے۔ گومز سامان لا رہا تھا پھر اسے گھوڑے اصطبل میں باندھنے تھے اس لیے وہ باہر ہی رہا۔ مسز مورگن کا نام میری این ہی تھا لیکن وہ والٹر ہرگز نہیں تھی۔ البتہ خاصے مضبوط اعصاب کی عورت تھی اس لیے اس نے جلد خود پر قابو پالیا اور اندر آتے ہی مارٹن سے بولی۔ ''میرا خیال ہے تم تھکے ہوئے ہو۔ آؤ میں تمہیں تمہارا کمرا دکھادوں۔''

ڈاکٹر جوزف نے بھی تائید کی۔ ''ہاں تمہیں ابھی آرام کرنا چاہیے۔''

مارٹن میری کے ساتھ اوپر آیا۔ اس نے کمرے میں آتے ہی مارٹن سے کہا۔ ''تم واپس کیوں آئے ہو؟''

مارٹن نے بھی بلا تکلف کہا۔ ''یہ جاننے کے لیے کہ تم نے مجھے زہر کیوں دیا تھا؟''

وہ صاف مکر گئی۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بھلا میں تمہیں کیوں زہر دینے لگی۔''

مارٹن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے سوائے اس کے کچھ نہیں کھایا پیا جو تم دونوں نے مجھے دیا تھا۔ اس لیے لازمی طور پر زہر بھی تم ہی لوگوں نے مجھے دیا ہوگا۔''

''میں نے کہا نا یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' میری متاثر ہوئے بغیر بولی۔

''غلط فہمی۔'' مارٹن نے طنز کیا۔ ''مجھے یقین ہے تم نے مجھے اس لیے زہر دیا تھا کہ میں نے تمہیں شین کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔''

''کون شین؟''

''اوہ... تو اس کا مطلب ہے اس نے اپنا نام غلط بیان کیا تھا۔ بہرحال میں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ تمہارا راز فاش کروں۔''

''پھر تم کس لیے آئے ہو؟'' میری ناخوش تھی۔

''ایک تو مجھے ڈاکٹر سے مکمل علاج کرانا ہے۔ اس کا کہنا ہے یہ زہر بار بار حملہ کرتا ہے، اگر اس کے اثرات کا علاج نہ کیا جائے اور دوسری وجہ جلد تمہارے علم میں آجائے گی۔'' مارٹن نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ چھوٹا اور سادہ سا کمرا تھا جس میں ایک سنگل بیڈ اور ایک چھوٹی سی الماری تھی جس میں درازیں بھی تھیں۔ میری اسے گھور رہی تھی پھر اس نے کہا۔

''اگر تم کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہو تو تم غلطی پر ہو۔''

مارٹن مسکرایا۔ ''میں ایک جواری ہوں اور فائدہ اٹھانے کے ساتھ ہمیشہ نقصان اٹھانے کے لیے بھی تیار رہتا ہوں لیکن تم سوچ لو تم نقصان اٹھاسکتی ہو۔''

مارٹن کی بات پر میری کا رنگ بدلا اور وہ جانے کے لیے پلٹی تھی۔ ''ایک بات اور سن لو...... میں ایک بار ہی دھوکا کھاتا ہوں دوسری بار نہیں۔''

میری چلی گئی اور مارٹن بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد گومز اس کا سامان لے کر آیا اور الماری کے پاس رکھ دیا۔ مارٹن نے اس سے پوچھا۔ ''مجھے نہانا ہے، یہاں حمام کہاں ہوگا؟''

''قصبے میں حمام ہے۔'' وہ کھردرے لہجے میں بولا اور چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مارٹن نیچے آیا اور ڈاکٹر جوزف سے کہا۔

''میں نہانے جارہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن زیادہ چینا گرنا مت۔''

مارٹن باہر آیا تو میری ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں کھیتوں کی طرف سے آتی دکھائی دی، اس نے تنکوں سے بنی ٹوکری اٹھا رکھی تھی جس میں کچھ تازہ سبزیاں تھیں۔ وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے جانے لگی کہ مارٹن اس کے راستے میں آگیا۔

''میں قصبے تک جارہا ہوں اگر تمہیں شین کے لیے کوئی پیغام دینا ہے تو بتادو، ممکن ہے وہ مجھے مل جائے۔''

میری نے غصے سے دانت پیسے۔ ''میرے راستے سے ہٹ جاؤ تم مجھے بلیک میل نہیں کرسکتے۔''

''میں ایسی کوئی کوشش نہیں کررہا ہوں۔'' مارٹن نے مسکرا کر کہا اور اصطبل کی طرف چلا گیا۔ کوئن ویلی ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا قصبہ ثابت ہوا جہاں سارے ہی شریف اور پرامن لوگ رہتے تھے۔ ایریزونا کا ماحول ٹیکساس سے بالکل مختلف تھا۔ ایک حمام میں نہا دھو کر اس نے کپڑے بدلے اور اپنے میلے کپڑے وہیں دھلنے کو دے دیے اور پھر وہ قصبے کے واحد بار میں چلا آیا۔ شام ہوتے ہی وہاں خاصی رونق ہوگئی تھی۔ اسے اب تک شین کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اسی قصبے کا رہنے والا ہوگا۔ بار میں ایک چھوٹا لڑکا سرو کررہا تھا۔ مارٹن نے ایک بوتھ کا انتخاب کیا اور لڑکے سے ایک ڈبل وہسکی لانے کو کہا اور جب وہ وہسکی لایا تو مارٹن نے اس کے سامنے ایک سکہ رکھ دیا۔

''تم یہ سکہ حاصل کرسکتے ہو۔''

لڑکے نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''کیسے؟''

''مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔''

حسبِ معمول

ساس کو خوش رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر ڈالیں، ساس کا منہ ہمیشہ ٹیڑھا ہی پائیں گے۔

ہمارے صاحب کی ساس لاہور سے آئیں تو لنڈا بازار سے ان کے لیے دو ٹائیاں بھی لے آئیں۔ ٹائیاں انتہائی شوخ رنگ کی تھیں جبکہ صاحب بڑے سنجیدہ و متین واقع ہوئے ہیں۔

پھر بھی طبیعت پر جبر کرکے محض ساس کو خوش کرنے کی خاطر انھوں نے ان بیہودہ ٹائیوں میں سے ایک ٹائی پہنی اور ساس کو سلام کرنے کے ارادے سے اندر پہنچے ساس نے گھور کر انھیں دیکھا اور غراتے ہوئے بولیں۔

''کیا بات ہے اقبال؟ معلوم ہوتا ہے تمہیں دوسری ٹائی پسند نہیں آئی؟''

''کون؟''

''سنہرے بالوں والا نوجوان ہے، اس کے دائیں شانے پر میڈوسا کا ٹیٹو بنا ہوا ہے۔''

لڑکا خاموش کھڑا رہا تو مارٹن نے ایک سکہ اور رکھ دیا۔ تیسرا سکہ رکھنے پر لڑکے نے سر ہلایا اور بولا۔ ''اس کا نام ہان بین ہے۔'' لڑکے نے کہتے ہوئے سکے اٹھانے کی کوشش کی لیکن مارٹن نے ان پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اس کا پتا؟''

''وہ قصبے کے شمال میں، آخر میں رہتا ہے۔'' اس بار لڑکا کسی قدر فکرمند نظر آیا۔ ''دیکھو میرا نام نہ آئے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' مارٹن نے ہاتھ ہٹالیا۔

کچھ دیر بعد وہ بار سے نکلا اور قصبے کی شمالی سمت روانہ ہوگیا۔ اس نے اپنا ہیٹ سر پر جھکا لیا تاکہ آسانی سے نہ پہچانا جائے۔ رات ہونے پر قصبے میں جگہ جگہ تیل کے لیمپ جل اٹھے تھے۔ گلیوں میں روشنی تھی۔ ہان بین کا مکان خاصا بڑا اور بہترین تھا۔ وہ بھی یقیناً دولت مند آدمی تھا۔ میری خوش قسمت عورت تھی جسے شوہر اور محبوب دونوں ہی دولت مند ملے تھے۔ مارٹن نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ جواری ہونے کی وجہ سے اس کی جیب اکثر خالی رہتی تھی اور بعض اوقات تو فاقوں کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ اسے اس کوئن ویلی سے دولت کی خوشبو آرہی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کے پاس

درست پتے آگئے تھے۔ اگر وہ انہیں احتیاط سے کھیلتا تو یقیناً یہاں سے جاتے ہوئے اس کی جیب بھری ہوتی۔

وہ واپس آیا تو میری نے ڈنر تیار کرلیا تھا۔ ڈاکٹر جوزف کھانے کے دوران اس سے گپ شپ کرتا رہا۔ مارٹن نے اسے بتایا کہ اسے کوئن ویلی بہت اچھا لگا ہے اور وہ سوچ رہا ہے کہ یہیں رہ جائے۔ یہ سن کر میری نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر جوزف نے کہا۔ ''لیکن یہاں زندگی آسان نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں مگر یہاں دولت کی کمی نہیں ہے۔ قصبے میں لوگوں نے بڑے اچھے مکان بنا رکھے ہیں۔ جیسے میں نے شمال میں ایک مکان دیکھا جس کی سیڑھیوں پر شیروں کے مجسمے بنے ہیں، بہت خوب صورت مکان ہے۔ یقیناً اس کا مالک بھی دولت مند ہوگا۔''

''تم شاید ہان مین کے مکان کی بات کر رہے ہو۔'' ڈاکٹر جوزف نے ناگواری سے کہا۔ ''اس کے باپ کی سونے کی کان تھی اور وہ اس کے لیے اتنی دولت چھوڑ کر مرا ہے کہ وہ ساری زندگی بیٹھ کر کھائے تب بھی ختم نہ ہو۔ نکما اور عیش پرست انسان ہے۔''

مارٹن نے محسوس کیا کہ میری ان کی گفتگو کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اس کے چہرے پر دبی دبی تشویش بھی تھی۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر جوزف نے اسے کچھ دوائیاں دیں۔ پھر اسے گائے کے گرم دودھ میں کچھ ملا کر دیا۔ ڈاکٹر نے اسے کم سے کم ایک دن کے لیے الکحل کے استعمال سے بھی روک دیا تھا ورنہ دوا اثر نہیں کرتی۔ دوا لیتے ہی مارٹن کو نیند آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو تمہیں ابھی دس گھنٹے آرام کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے نیند کی دوا دی ہے۔''

دس گھنٹے کی نیند لے کر جب مارٹن بیدار ہوا تو خود کو بہت تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ روز والی کمزوری کا بس شائبہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آیا، پیچھے کوئی نہیں تھا، وہ گھر سے نکل آیا۔ سامنے میری الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے لٹکا رہی تھی۔ اس کا انداز قطعی کسی گھریلو عورت جیسا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بے وفائی کے نام سے بھی ناآشنا ہو۔ مارٹن کا خیال تھا کہ وہ اسے دیکھ کر منہ بنائے گی لیکن اس کے برعکس وہ مسکرائی تھی۔

''میں تو سمجھ رہا تھا تم نفرت کا اظہار کرو گی؟''

''کیا اس کا کوئی فائدہ ہوگا؟'' میری نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے نہیں۔''

''تم نے کل رات ہان کا ذکر کیا تھا، اس کا مطلب ہے تم نے اسے تلاش کرلیا ہے۔''

''ہاں میں نے تم سے کہا تھا، میں اسے تلاش کرلوں گا۔''

''مسٹر جیسن یا ایڈگر یا تم جو کوئی بھی ہو، اس وقت تم بہت بڑی غلطی کرنے جا رہے ہو۔ ہان ایسا آدمی نہیں ہے جو کسی کے سامنے جھک جائے۔''

''کیا اسے تمہاری بدنامی کی پروا بھی نہیں ہوگی؟'' مارٹن نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''نہیں ہے اور نہ ہی مجھے ہوگی، اس لیے اگر تم ہمارے بارے میں دوسروں کو بتا بھی دو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''تم دونوں کا ردِعمل کیا ہوگا؟''

''ہم صاف انکار کر دیں گے۔'' میری نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ''تم یہاں اجنبی ہو اس لیے جوزف اور دوسرے لوگ میری بات مانیں گے پھر ڈاکٹر کی کوئن ویلی میں بہت عزت ہے اور عین ممکن ہے اس کی بیوی پر الزام لگانے کی صورت میں تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔ تمہیں چور یا ڈاکو بھی سمجھا جاسکتا ہے اور تم جانتے ہو کہ چور یا ڈاکو کے ساتھ یہاں کیا سلوک کیا جاتا ہے؟''

مارٹن ایک لمحے کے لیے چپ ہوا تھا۔ یہ عورت نہایت سخت ثابت ہو رہی تھی اور اس نے ابھی تک مارٹن کے سامنے ذرا بھی کمزوری نہیں دکھائی تھی۔ اس کی بات سن کر ایسا لگا جیسے واقعی کوئی مارٹن کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ لیکن ابھی مارٹن کے ہاتھ میں ترپ کا پتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ میں تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟''

''تو پھر تم کیا کر رہے ہو؟''

''تم شاید بھول رہی ہو کہ ایک دوسرا معاملہ بھی ہے۔'' مارٹن نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تھی۔''

اس بار میری کا اعتماد کسی قدر متزلزل دکھائی دیا تھا۔ ''اس بات کا کیا ثبوت...''

''ڈاکٹر تصدیق کرے گا کہ مجھے زہر دیا گیا تھا۔ یہاں سے روانہ ہونے کے دو گھنٹے بعد ہی میری حالت خراب ہوگئی تھی۔ جب میں یہ الزام لگاؤں گا اور یہ بات پھیلے گی تو تم سوچ سکتی ہو کہ یہاں تم لوگوں کی کیا عزت رہ جائے گی۔ میرا خیال ہے کسی حد تک لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ

تمہارے ہان سے ناجائز تعلقات ہیں۔''

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' میری کا لہجہ کمزور ہوگیا تھا۔

''ہاں میں ایسا نہیں کروں گا بشرطیکہ تم اور ہان مل کر یہ مطالبہ پورا کردو۔''

''تمہارا مطالبہ کیا ہے؟''

''صرف دس ہزار ڈالرز۔''

میری کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''دس ہزار ڈالرز...؟ تم جانتے ہو یہ کتنی بڑی رقم ہے؟''

''اچھی طرح جانتا ہوں۔'' مارٹن نے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن اگر تم اپنی پوزیشن اور عزت محفوظ رکھنا چاہتی ہو تو تمہیں اور ہان کو مل کر یہ مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔''

میری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہان نہیں مانے گا۔''

''اسے منوانا تمہاری ذمے داری ہے۔'' مارٹن نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آخر وہ تمہارا محبوب ہے۔''

''وہ میرا محبوب نہیں ہے۔'' میری کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''ہم میں صرف وقتی تعلق ہے۔''

مارٹن کو تعجب ہوا تھا۔ ''تو وہ تم سے محبت نہیں کرتا؟''

''نہیں... میں نے کہا نا یہ صرف ایک وقتی تعلق ہے۔''

''جب تم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے تو اس طرح ڈاکٹر کو دھوکا کیوں دے رہی ہو؟''

میری نے گہری سانس لی۔ ''تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔''

''مجھے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' مارٹن نے کہا۔ ''تمہارے پاس صرف دو دن کی مہلت ہے، مجھے دس ہزار ڈالرز دیدو۔ شاید ہان کو اس سے کوئی فرق نہ پڑے لیکن دو دن بعد تم اور ڈاکٹر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔''

میری کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ ''پلیز... میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتی۔''

''تمہارے پاس صرف دو دن ہیں۔'' مارٹن نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میری جیسی حسین عورت کے ساتھ یہ رویہ اپناتے ہوئے اسے افسوس ہو رہا تھا۔ عورتوں کے معاملے میں وہ ویسے بھی نرم دل شخص تھا مگر اسے رقم کی ضرورت تھی اور یہاں سے اسے رقم مل سکتی تھی۔ دس ہزار ڈالرز کی مدد سے وہ کیلیفورنیا میں آرام سے کئی سال گزار سکتا تھا۔ وہ گھوم پھر کر واپس آیا تو ناشتا تیار تھا۔ ڈاکٹر اس کا منتظر تھا۔ ناشتے سے پہلے اس نے مارٹن کا معائنہ کیا اور بولا۔

''تمہاری حالت اب تقریباً ٹھیک ہے اور تم چاہو تو کل سفر کرسکتے ہو۔''

مارٹن ہنسا اور معنی خیز انداز میں میری کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے مجھے کل تک رخصت ہو جانا چاہیے۔''

ڈاکٹر مسکرا دیا۔ ''نہیں دوست! تم چاہو تو مزید رہ سکتے ہو۔ میں صرف اطلاع دے رہا ہوں۔''

مارٹن نے سر ہلایا۔ ''اس صورت میں، میں مزید ایک دو دن رکنا پسند کروں گا۔ مجھے یہ علاقہ اچھا لگا ہے۔''

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''اگر تم یہاں رہنا چاہو تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ تم نے دیکھا ہوگا یہاں آبادی کم ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس علاقے کی آبادی بڑھے۔ ورنہ آس پاس کی ریاستوں میں پھیلتے بڑے شہر ایریزونا کی آبادیوں کو کھا جائیں گے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' مارٹن نے پرخیال انداز میں کہا۔ وہ خود کسی بڑے شہر میں جا کر رہنے کی سوچ رہا تھا، جہاں اس کے دشمن اسے تلاش نہ کرسکیں لیکن اس کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی اور اب یہ رقم اسے میری اور ہان سے مل سکتی تھی اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی دھمکی نے میری کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کیونکہ زہر دینے کا الزام بہ نسبت بے وفائی کے الزام کے نہایت سنگین تھا اور اس کا ثبوت بھی تھا۔ جس وقت مارٹن، ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا، میری کچن کی صفائی میں مصروف تھی۔ مارٹن نے اسے سنانے کے لیے کسی قدر اونچی آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! اگر میں ان لوگوں کے خلاف پولیس کو رپورٹ کرنا چاہوں تو تم گواہی دو گے کہ مجھے خطرناک زہر دیا گیا تھا؟''

''بالکل...'' ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''یہ تمہارا حق بنتا ہے اور ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں گواہی دوں گا۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔'' مارٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم حقیقت میں ایک اچھے انسان ہو۔''

مارٹن نے میری پر دباؤ بڑھانے کے لیے یہ سب کیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کچن سے برآمد ہوئی، اس نے ہاتھ میں شاپنگ والی ٹوکری تھام رکھی تھی۔ ''جوزف میں شاپنگ کے لیے قصبے تک جا رہی ہوں اگر تمہیں کوئی کام نہ ہو تو تمہیں بھی لے جاؤں؟''

''ضرور۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا۔

میری کے جانے کے دس منٹ بعد مارٹن نے کہا۔ ''میرا خیال ہے میں آس پاس گھوم لوں۔ اس طرح

مجھے اندازہ ہوجائے گا کہ میں عزت کے قابل ہوں یا نہیں۔"

"چاہو تو ایسا کر لو۔ ویسے میرا مشورہ ہے تم آرام ہی کرو۔"

لیکن مارٹن باہر نکل گیا۔ وہ گھوڑا لے کر نکلا اور چکر کاٹ کر قصبے کی طرف آیا۔ ڈاکٹر جوزف کی بگھی کچھ پہلے ہی قصبے میں داخل ہوئی تھی اور ایک اسٹور کے سامنے رکی تھی۔ مارٹن دور سے اس کی نگرانی کرتا رہا۔ نصف گھنٹے بعد میری اسٹور سے نکلی۔ اس نے سامان بگھی میں رکھا اور شمال کی طرف روانہ ہو گئی۔ مارٹن اس کے پیچھے رہا۔ کچھ دیر بعد بگھی ہان مین کے مکان سے کچھ دور رکی اور میری اس سے اتر کر مکان میں چلی گئی۔ مارٹن نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ وہ اسی توقع کے لیے میری کے پیچھے آیا تھا، اسے امید تھی کہ اس کی دھمکیوں کے بعد وہ ہان سے بات ضرور کرے گی۔ اس کا امکان تھا کہ ہان اس کی دھمکی میں نہ آئے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ میری کی طرح وہ بھی گھبرا جاتا اور اس کا مطالبہ پورا کر دیتا۔

میری کوئی دس منٹ بعد ہی ہان کے مکان سے نکل آئی اور عجلت میں گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ مارٹن نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہان کا کیا ردعمل ہے۔ ہان بھی کچھ دیر بعد گھر سے نکلا اور اپنے شاندار سفید گھوڑے پر سوار ہو کر قصبے کے مرکز کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ بینک کی عمارت کے سامنے رکا تو مارٹن کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ نصف گھنٹے بعد ہان بینک سے نکل کر واپس گھر کی طرف چلا گیا اور مارٹن مسکراتا ہوا ڈاکٹر جوزف کے فارم کی طرف لوٹ آیا۔ گومز کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ مارٹن جان بوجھ کر اس کے پاس رکا۔

"تم بہت محنت کرتے ہو۔"

گومز نے اس کا جملہ نظر انداز کیا۔ "کیا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"ڈاکٹر تمہاری تعریف کر رہا تھا کہ تم اس کے بہت وفادار ہو۔"

"تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟" گومز کا لہجہ مزید سخت ہو گیا تھا۔

"اگر کوئی شخص ڈاکٹر کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کرے تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟"

گومز نے کھیتوں میں گوڈی کرنے والا کانٹے نما اوزار اٹھا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلا گیا اور مارٹن اندر آ گیا جہاں ڈاکٹر اس کے لیے دوا تیار کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مارٹن سے کہا۔ "بس یہ آخری خوراک ہے۔ اس کے بعد تمہارے جسم سے زہر کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔"

"اسے کھا کر مجھے نیند تو نہیں آئے گی؟" مارٹن نے پوچھا۔ اب وہ پوری طرح ہوشیار رہنا چاہتا تھا۔

"نیند والی دوا میں تمہیں رات کو دوں گا۔" ڈاکٹر نے اسے اطمینان دلایا۔ لنچ کے بعد وہ آرام کرنے چلا گیا تھا۔ میری کھانے کی میز پر تھی اور بالکل خاموش تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ مارٹن شام کو نیچے آیا تو ڈاکٹر کسی کام سے قصبے کی طرف گیا ہوا تھا۔ میری نشست گاہ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھی ایک سوئٹر بن رہی تھی۔ یہ شاید ڈاکٹر کے لیے تھا۔ مارٹن نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم نے ہان سے بات کر لی ہے؟"

"تم نے دیکھ تو لیا تھا، تم پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

مارٹن کو جھٹکا لگا گویا وہ اس کے تعاقب سے باخبر تھی۔ "ٹھیک ہے، میں نے دیکھ لیا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میری نے تسلیم کیا۔

"ہان نے کیا جواب دیا؟"

"میری شادی... تمہیں دس ہزار ڈالرز دینے کو تیار ہو گیا ہے۔" میری نے کہا۔ "لیکن یہ رقم تمہیں اس شرط پر ملے گی جب تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ اور دوبارہ اس طرف نہیں آؤ گے۔"

"مجھے واپس آ کر کیا کرنا ہے؟" مارٹن نے بے پروائی سے کہا۔ "ویسے بھی اب میں کہیں دور ہی جاؤں گا۔"

مارٹن تاریکی چھانے تک کھیتوں میں گھومتا رہا۔ اسے حیرت تھی کہ یہاں صحرا میں زمین اتنی زرخیز تھی کہ مکئی کے پودے نہایت سبز اور توانا تھے۔ شاید یہ صدیوں کی زرخیزی تھی جو زمین میں رچ بس گئی تھی۔ ڈاکٹر جوزف واپس آ چکا تھا۔ مارٹن نے اس کی فیس ادا کی۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔ رات کھانے کے بعد ڈاکٹر نے اسے نیند کی دوا دینا چاہی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ "میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

جیسے ہی ڈاکٹر کمرے سے گیا، میری نے آہستہ سے کہا۔ "سونا مت میں تمہارے پاس آؤں گی۔"

ممکن ہے کوئی اور موقع ہوتا تو مارٹن کے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی لیکن وہ جانتا تھا میری اس سے معاملے کی بات کرنے آئے گی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ نصف رات کے قریب میری نہایت خاموشی سے کمرے میں آئی اور اس نے آتے ہی ایک تھیلی مارٹن کو پکڑا دی۔ "اس میں دس ہزار ڈالرز ہیں، یہ لو اور صبح ہونے سے پہلے یہاں سے چلے جاؤ۔"

مارٹن نے تھیلی کھول کر رقم دیکھی، پورے دس ہزار ڈالرز ہی تھے۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ "تھینک یو مائی لیڈی۔"

"شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ زہریلے انداز میں بولی۔ "میں نے ہان کو بڑی مشکل سے راضی کیا ہے ورنہ اس کے خیال میں دس ہزار ڈالرز کے بجائے ایک گولی سستی پڑتی۔ اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ کل یہاں مت نظر آنا۔" میری بات مکمل کرتے ہی کمرے سے چلی گئی تھی۔ مارٹن کو اس کی دھمکی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے تو خوشگوار حیرت تھی کہ اس کا مطالبہ اتنی آسانی سے پورا ہو گیا۔ اس خوشی میں اس نے ڈاکٹر کی ہدایت نظر انداز کرتے ہوئے اپنے پاس موجود شراب کی چھوٹی بوتل خالی کر دی اور بے سدھ ہو کر سو گیا۔ رات کسی وقت اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی اور پھر ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید سوچتا اسے نیند آ گئی تھی۔

مارٹن کو ہوش آیا تو تیز دھوپ اس کے چہرے پر چبھ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ لیٹا رہا پھر بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ڈاکٹر جوزف کے آرام دہ گھر میں بستر کے بجائے ویران صحرا میں ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سوائے اس کے لباس کے کچھ نہیں تھا۔ وہ اٹھا تو یہ دیکھ کر مزید بوکھلا گیا کہ پاس ہی گھوڑے پر ہان موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ مارٹن کی طرف تھا۔

"میں یہاں کیسے آ گیا؟"

"بہت آسانی سے۔" ہان اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "رات تمہیں کلوروفارم سنگھایا گیا اور تم بے ہوش ہو گئے اور تمہیں اٹھا کر یہاں لایا گیا۔ تم اس وقت کوئن ویلی سے کوئی چار گھنٹے کی مسافت پر ہو۔"

"مگر...؟" مارٹن بولتے بولتے رک گیا، اس نے اپنے گھوڑے کو دیکھ لیا تھا جو ایک طرف ہری جھاڑی پر منہ مار رہا تھا۔ اس کے پستول، سامان اور رقم والی تھیلی غرض کہ ہر چیز غائب تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور دوبارہ بولا۔ "ہان، تم اب کیا چاہتے ہو...... مجھے قتل کرنا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن تم نے واپس آ کر بہت بڑی غلطی کی۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟"

ہان نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ "تمہارے پاس دو راستے ہیں۔ ایک...... میں تمہیں ابھی گولی مار دوں۔"

مارٹن کا حلق خشک ہو گیا تھا، اس نے بہ مشکل کہا۔ "اور دوسرا راستہ؟"

ہان نے ایک چھوٹی بوتل اس کی طرف اچھال دی جس میں سرخ شراب تھی۔ "یہ پی لو، اس میں وہی زہر ہے۔"

مارٹن نے بوتل کیچ کر لی تھی لیکن ہان کی بات سن کر وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ "تمہارا دماغ خراب ہے؟" وہ چلایا۔

ہان نے پستول بدستور اس کی طرف کیے ہوئے کہا۔ "میں دس تک گنوں گا اور اگر اس دوران میں تم نے بوتل خالی نہیں کی تو میں تمہیں گولی مار کر واپس چلا جاؤں گا۔ ایک... دو... تین۔"

"خدا کے لیے رک جاؤ۔" مارٹن کانپتی آواز میں بولا۔

"زہر پینے کے بعد بھی تمہارے پاس چند گھنٹوں کا وقت ہوگا اور تم کسی آبادی میں پہنچ گئے تو اپنی جان بچا سکو گے۔" یہ کہہ کر ہان نے گنتی کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ وہ نو تک پہنچا تھا کہ مارٹن نے بوتل کھول کر ایک ہی سانس میں خالی کر دی۔ ہان مسکرایا۔ "تو تم نے دوسرا راستہ منتخب کر لیا لیکن اگر تم نے کوئن ویلی کی طرف جانے کی کوشش کی تو اس کا مطلب ہوگا تم فوری مرنا چاہتے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑا موڑا اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مارٹن اپنے گھوڑے کی طرف لپکا اور اس پر سوار ہو کر اسے مخالف سمت میں دوڑا دیا۔ اس نے زندگی کی سب سے بڑی بازی کھیلی تھی اور داؤ پر خود اس کی زندگی لگی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ یہ بازی جیتتا ہے یا ہار جاتا ہے۔ وہ گھوڑا دوڑاتا رہا۔ سورج سر پر آ کر ڈھل رہا تھا لیکن وہ پیاس اور گرمی کی پروا کیے بغیر گھوڑا دوڑاتا رہا۔ حتیٰ کہ سورج ڈھلنے لگا اور تب اسے جھٹکا لگا، اسے سفر کرتے ہوئے چار گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا اور اب تک زہر کی علامات نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ وہ رک گیا اور پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ ہان نے جھوٹ کہا تھا، شراب میں زہر نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مارٹن جلد از جلد یہاں سے دور چلا جائے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مارٹن نے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا اور زندگی بچ جانے کی خوشی سے سرشار آگے کی طرف چل پڑا تھا۔

قسط نمبر: 06

کشکول

انوار صدیقی

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روندکر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔
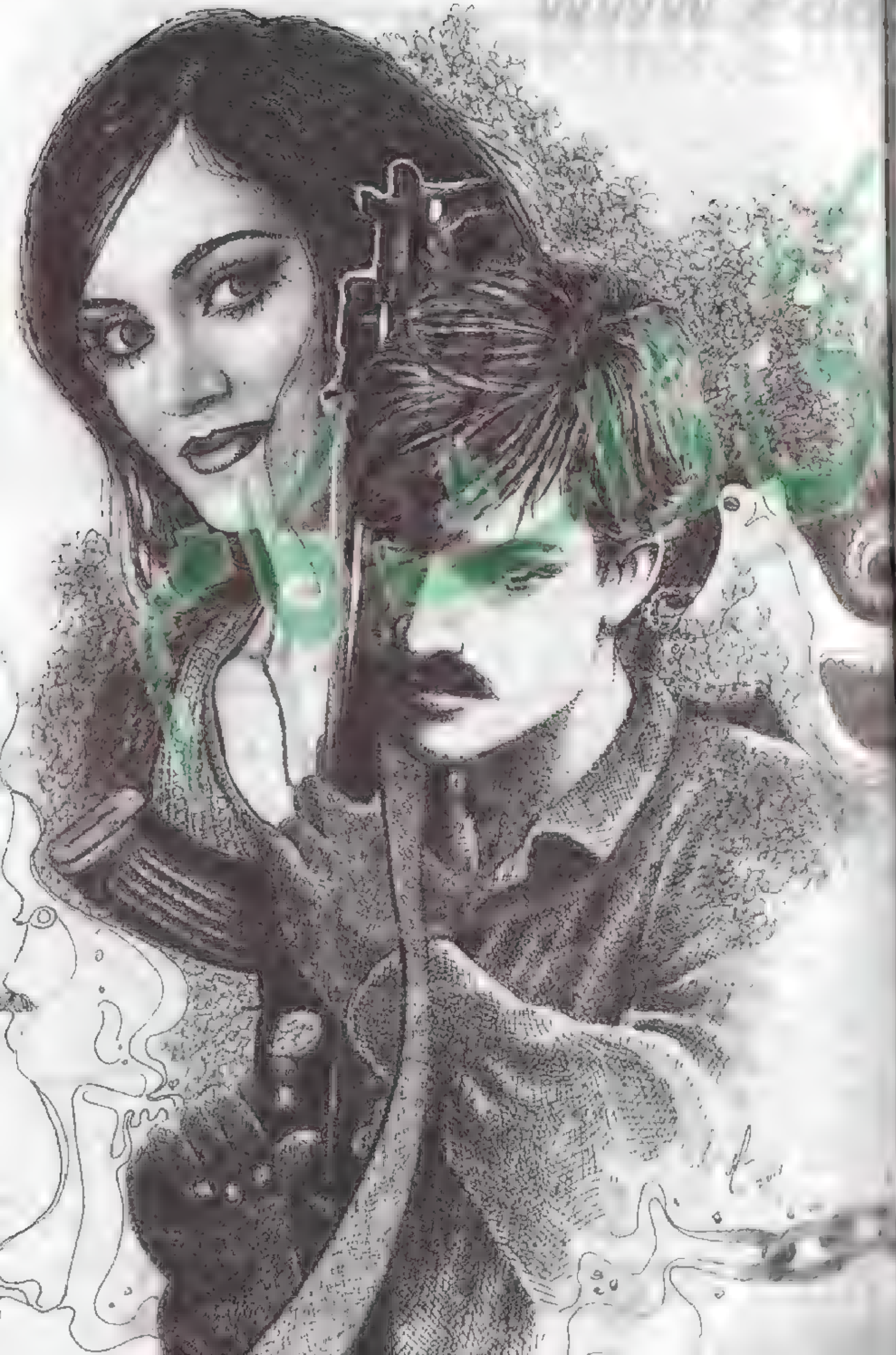
چارلی کی آنکھوں کی پٹی کھولی گئی تو اس کے سامنے شیخ حامد ایک صوفے پر بیٹھا تھا، اس کمرے میں صوفے کے علاوہ فرنیچر نام کی اور کوئی چیز نہیں تھی، شیخ حامد کے کمرے میں اس کے تین مسلح گارڈز بھی تھے جن کے چہرے ماسک میں چھپے ہوئے تھے۔

کمرے میں روشن بلب سے چارلی نے اس بات کا اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کی تھی کہ اسے بارہ گھنٹے بعد ہی ہوش میں آنے کے بعد شیخ حامد کے روبرو پیش کیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ ہوٹل ذیشان سے فرار ہونے کے بعد وہ بنگالی پاڑے میں اپنے مکان تک بہ آسانی پہنچ گیا تھا لیکن اس کے بعد شیخ حامد کے آدمیوں نے اسے اس مکان ہی میں پہنچ کر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال سونگھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا چارلی کے پاس کوئی دوسرا آپشن بھی نہیں تھا اور اب...... اسے پوری طرح ہوش میں آنے کے ایک گھنٹے بعد ہی بگ باس کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

"میں تمہیں کمانڈوز کی موجودگی کے باوجود بچ نکلنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔" شیخ حامد نے سپاٹ لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

"اتفاق ہی تھا سر ورنہ میں بھی پھنس جاتا۔" چارلی نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ وہ شیخ حامد کی نظروں میں ابھرنے والی سرخی دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کے ستارے بھی گردش میں آچکے ہیں۔

"یہ بھی شاید اتفاق تھا کہ جو لوگ میرے آدمیوں کو لے گئے وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئے تھے؟" شیخ حامد کسی زخمی ناگ کی طرح بل کھانے لگا۔

"وہ...... وہ......" چارلی نے ہکلاتے ہوئے اپنے بچاؤ میں ایک اور کمزور دلیل پیش کرنے کی کوشش کی۔ "ان دونوں نے اوپر جاتے ہوئے مجھے اچانک اسلحے کے زور پر بے بس کر دیا تھا۔"

"انٹرسٹنگ......" شیخ حامد نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "انہوں نے تمہیں اسلحے کے زور پر اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کیا پھر اتنے غافل ہوگئے کہ تم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہوگئے...... باسٹرڈ...... سن آف اے بچ!" اس نے آخری دو باتیں کرخت لہجے میں ادا کیں پھر اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلی نے مخصوص انداز میں جنبش کی۔ پشت پر کھڑے گارڈ کے پستول سے 'ٹھچ' کی آواز نکلی۔ چارلی اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ سیدھے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوئی تو وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اذیت ناک انداز میں چیختا ہوا شیخ حامد کے سامنے منہ کے بل ڈھیر ہو کر تڑپنے لگا۔

"مخبری کسے کی تھی......؟" شیخ حامد نے گرج کر پوچھا۔

ایک پل کو چارلی کے ذہن میں آیا کہ وہ زندگی بچانے کی خاطر سراج کا نام زبان پر لے آئے لیکن اس نے فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ میجر اور کیپٹن کے علاوہ ابھی دو خطرناک دہشت گرد آزاد تھے۔ ان کو بھی غداری کا علم ہو جاتا تو اس کی حسینہ بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ وہ بھی اس پر اچھی نظر نہیں رکھتے تھے۔ چارلی کی غداری اور بگ باس کے ہاتھوں عتاب کی خبر سنتے ہی وہ حسینہ کے خوبصورت وجود کی دھجیاں اڑا ڈالنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ اس کے جسم کا ایک ایک بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ اسی کی خاطر تو چارلی نے بگ باس جیسے آدم خور کے حلق میں ہاتھ ڈالنے کا خطرہ مول لیا تھا۔ کم از کم اپنی زندگی میں وہ حسینہ کے اجلے ریشمی جسم کو میلے ہاتھوں سے داغدار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"دو ٹکے کتے...... میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا......" شیخ حامد کے تیور انتہائی خطرناک ہوگئے۔

"مم...... میں...... میں نے غداری نہیں کی سر...... وہ...... وہ میری لاعلمی میں میرے پیچھے......"

شیخ حامد کے سر کو ہلکی سی جنبش ہوئی، اسی لمحے دوسرا فائر ہوا۔ چارلی ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا، اس کے دوسرے گھٹنے کی ہڈی بھی کرچیوں میں بدل گئی۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے جانور کی طرح کرب سے چلا رہا تھا۔

"حسینہ کو ہتھیلی پہ رکھنے کی خاطر تو نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا۔ ڈرٹی ڈاگ!" شیخ حامد نے انتہائی سرد آواز میں کہا پھر اس نے تالی بجائی تو چار ہٹے کٹے آدمی اور اندر آگئے۔

"یس باس......!" چاروں نے بیک وقت بگ باس کو مخاطب کیا۔

شیخ حامد نے آخری بار چارلی سے زبان کھولنے کو کہا لیکن اب وقت گزر چکا تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ اب حسینہ بھی ایک اپاہج کے ساتھ زندگی گزارنا پسند نہیں کرے گی۔ وہ بگ باس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھ کر حلق کے بل چیخا۔

"ہاں...... میں نے مخبری کی تھی...... میں غدار ہوں...... تت...... تت تم مجھے گولی مار دو پھر بھی میں زبان نہیں کھولوں گا...... مار دو گولی، میرا جسم چھلنی کرا دو لیکن میری زبان بند ہی رہے گی، سنا تم نے...... تم اور تمہارے شکاری کتے بوٹیاں چبا ڈالیں پھر بھی میں زبان بند رکھوں گا۔"

شیخ حامد کا چہرہ غضب ناک ہوگیا، سب ہی کا یہی خیال تھا۔ بگ باس چارلی کی بکواس سن کر ایک ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دے گا، دوسرے ہی لمحے چارلی کا پورا وجود گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا...... لیکن ایسا نہیں ہوا، کچھ دیر تک بگ باس کی قہر آلود نظریں چارلی کے چہرے پر مرکوز رہیں پھر اس نے نئے آنے والے چاروں ہٹے کٹے آدمیوں کو مخاطب کیا۔

"تم باسی ہانڈی میں منہ مارتے مارتے تھک چکے ہو، آج تمہیں بالکل تازہ شکار ملے گا لیکن میری شرط بھی سن لو۔" شیخ حامد نے کسی زخمی شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے اس کے ساتھ چنگیزی بربریت کا ثبوت نہیں دیا تو پھر تم کو بھی زندگی سے محروم کر دیا جائے گا۔"

چارلی بار بار موت کی بھیک مانگ رہا تھا، وہ جان کی بازی لگا کر اپنی حسینہ کی عزت کو محفوظ رکھنے کا خواہش مند تھا لیکن بگ باس کے حکم کے بعد جو کچھ اس کی نظروں نے دیکھا وہ بھی ناقابلِ یقین تھا۔

شیخ حامد نے چاروں کو اپنا فیصلہ سنانے کے بعد ایک گارڈ کو انگلی سے کچھ اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حسینہ کو برابر کے کمرے سے گھسیٹ کر باہر لے آیا۔

"شروع ہو جاؤ......" شیخ حامد نے دوبارہ چاروں ہٹے کٹے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ "میں تمہیں صرف بیس منٹ دیتا ہوں۔ تازہ خوراک کو اس بے دردی سے کھا جاؤ کہ اس کی سانسیں بھی اس کے حسین جسم میں گھٹ کر بند ہو جائیں ورنہ پھر تم چاروں کو گولی ماردی جائے گی۔"

چارلی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... بگ باس کا اشارہ پا کر وہ چاروں بھوکے گدھ کی طرح حسینہ پر ٹوٹ پڑے۔ پل بھر میں انہوں نے اس کے لباس کو تار تار کر دیا پھر بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس کے گداز جسم کو بھنبھوڑنے لگے۔ حسینہ کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں لیکن وہ اپنے بچاؤ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ چارلی بھی گم صم رہ گیا۔ وہ ان چار انسانوں کو دیکھ رہا تھا جو درندوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ایک خوبصورت، نازک اور گداز جسم کو چار انسان بڑی بے دردی سے بھنبھوڑ رہے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ خود چارلی بھی کسی بت کی طرح اس شیطانی کھیل کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شیخ حامد کی نظریں بار بار دستی گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ وہ بڑے پُرسکون انداز میں چاروں درندوں کو گزرتے وقت کا احساس دلا رہا تھا...... اٹھارہ منٹ...... پندرہ منٹ...... دس منٹ...... پانچ منٹ......!

اس کی گنتی شمار کرنے کے ساتھ چاروں بھوکے بھیڑیوں کی حالت بھی جنونی ہوتی جا رہی تھی، حسینہ بارہ پندرہ منٹ بعد ہی بے ہوش ہوگئی تھی لیکن وہ چاروں اس کے جسم کے نازک ترین حصوں کو درندوں کی طرح بھنبھوڑ رہے تھے۔ چارلی نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلیں شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس نے جس کی پاکیزگی کو محفوظ کرنے کی خاطر غداری کو بطور ہتھیار استعمال کرنا چاہا تھا وہ کسی کام نہ آسکا...... حسینہ کے بدن کو جھٹکے ان چار درندوں کی وحشیانہ جارحیت سے لگ رہے تھے ورنہ اس کی سانسیں اس کے وجود سے سارے رشتے توڑ چکی تھیں۔

"بیس منٹ...... اوور اینڈ...... اسٹاپ۔"

شیخ حامد کے اس جملے کے ساتھ ہی وہ چاروں ہانپتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چارلی نے آنکھوں کے درمیان ہلکی سی جھری کر کے دیکھا۔ حسینہ کا نازک جسم جگہ جگہ سے اس طرح ادھڑا ہوا تھا جیسے کسی آدم خور نے اپنے من پسند حصوں سے پیٹ بھرنے کے بعد بچا کھچا اگلے وقت کے لیے چھوڑ دیا ہو۔

وہ خون میں لت پت تھی۔ اس کی ہیئت بدل چکی تھی۔ اس کے گالوں سے خون ابل رہا تھا، اس کے سینے کو جیسے چاپر (Chopper) سے زبردستی گزارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کی رانوں کا گوشت بھی جگہ جگہ سے ادھڑا نظر آرہا تھا۔ جسم کے نازک حصوں سے خون ہی خون جاری تھا۔

شیخ حامد کے اشارے پر ایک گارڈ نے اس کے پھول جیسے جسم کو جس کی ساری نازک پنکھڑیاں مرجھا کر بکھر چکی تھیں، پاؤں سے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر دبی زبان میں بولا۔

"اس کی سانسیں اکھڑ چکی ہیں باس...... کھیل جیت کے فیصلے کے ساتھ ختم ہوگیا۔"

"نہیں......" شیخ حامد دھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔" اس نے نظریں گھما کر چارلی کو دیکھا۔ "مادہ مر جائے تو پھر نر کی زندگی بھی کس کام کی......" اس نے آخری فیصلہ بھی صادر کر دیا۔ "اس باسٹرڈ کو بھی اس کی محبوبہ کے پاس پہنچا دو پھر...... ان دونوں کو لے جا کر کہیں قریبی ویران جنگل نما علاقے میں چھوڑ آؤ...... ان کی بچی کھچی بوٹیاں اگر چیل کوؤں اور دوسرے جانوروں کے کام آجائیں تو کیا برا ہے۔"

وہ اپنا حکم سنا کر لمبے لمبے قدم اٹھاتا دو گارڈز کے ساتھ کمرے سے چلا گیا۔ باقی افراد حسینہ اور چارلی کے مردہ

جسموں کو سمیٹنے لگے۔ اس لرزہ خیز سزا نے سب ہی کے ذہن میں بہت سارے سوالات پیدا کر دیے تھے لیکن اس کے اظہار کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جس زمین دوز سرنگ میں وہ داخل ہو چکے تھے اس سے نکاسی کا ایک ہی راستہ تھا۔ موت، عبرت ناک اور اذیت ناک موت......!

☆☆☆

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اس وقت ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے جب ایک وارڈ بوائے نے آ کر لیاقت حسین کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی۔

"آپ حضرات چلیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں ایک ضروری فون کر کے آتا ہوں۔"

سیٹھ عثمان نے دبی زبان میں راحیلہ بیگم کو بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ لیاقت حسین سے کسی بات کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ دونوں قدم بڑھاتے مریض کے کمرے میں داخل ہوئے جہاں لیاقت حسین بستر پر اٹھ کر بیٹھنے کی ضد کر رہا تھا، نرس اسے بار بار سمجھا رہی تھی۔ "ڈاکٹر نے تمہیں آرام کا بولا ہے۔"

"میں ادھر اسپتال میں کیسے آ گیا......؟" لیاقت حسین نے حیرت بھرے انداز میں نرس سے سوال کیا۔

"پریشان مت ہو......" سیٹھ عثمان نے قریب جا کر کہا۔ "ہماری گاڑی کو کسی نے پشت سے ٹکر ماردی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔"

"ٹکر ماردی......؟" لیاقت حسین نے بدستور حیرت سے کہا۔ "مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں ہے صاحب......!"

"اس لیے کہ ٹکر کی وجہ سے تم بے ہوش ہو گئے تھے۔" راحیلہ بیگم نے کہا۔ "ہم تمہیں فوری طور پر اسپتال لے آئے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن تمہیں ابھی ایک دو دن آرام کرنا ہوگا۔"

"صاحب......!" لیاقت حسین نے بڑی معصوم نظروں سے سیٹھ عثمان کو دیکھا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے آپ کو اور بیگم صاحبہ کو سپر اسٹور پر اتارا تھا پھر...... پھر......" لیاقت حسین جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ اس کے آگے اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔

"پھر تم نے شاید گاڑی کسی مناسب جگہ پارک کرنے کی کوشش کی تھی جب گڈز کمپنی کی ٹرک نے ہماری کار کو پیچھے سے ہٹ کیا تھا۔" سیٹھ عثمان نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "قصور اس کا بھی نہیں تھا اس لیے کہ اس کے بریک نے عین وقت پر اسے بھی دھوکا دے دیا۔"

"اپنی گاڑی کو زیادہ نقصان تو نہیں ہوا......؟"

"تم گاڑی کو چھوڑو۔" راحیلہ بیگم نے بڑے خلوص سے پوچھا۔ "تمہاری طبیعت اب کیسی ہے......؟"

"بدن میں درد تو ہے لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں کہ میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر ادھر آرام کروں۔" لیاقت حسین نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ "چھوٹا موٹا جھٹکا آ گیا ہوگا۔ چلنے پھرنے سے خون کی گردش کے ساتھ ساتھ آرام بھی آ جائے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن تمہیں بہرحال ڈاکٹر کے کہنے پر ایک دو دن آرام کرنا ضروری ہے......" سیٹھ عثمان نے اس کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے بڑی اپنایت کا اظہار کیا۔ ویسے انہیں اس بات پر تعجب بھی ہو رہا تھا کہ لیاقت حسین کو اس شدید ایکسیڈنٹ کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا جس نے ان کی گاڑی کو اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ اسے دوبارہ ٹھیک کرایا جا سکتا۔

"خدا کا شکر ہے صاحب کہ آپ اور بیگم صاحب اس وقت گاڑی میں نہیں تھے......" لیاقت حسین نے کہا پھر چونک کر پوچھا۔ "ٹرک والے کو تو سراج صاحب نے اندر کرا دیا ہوگا؟"

"نہیں" سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ "قصور اس کا نہیں بریک کا تھا اس لیے ہم نے اس حادثے کی کوئی رپورٹ نہیں کی۔"

"تمہارے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے ......" راحیلہ بیگم نے کہا۔ "تمہارے صاحب پڑوس نے جس بنگلے کو خریدنے کی بات کر رہے تھے آج صبح اس کا سودا بھی پکا ہو گیا ہے...... اب تم اور فرحین اسی بنگلے کی انیکسی میں رہو گے...... فرحین کے قریب ہونے سے مجھے بھی آرام ہو جائے گا۔ تم بھی بسوں میں دھکے کھانے سے بچ جاؤ گے۔"

"صاحب......" اچانک لیاقت حسین نے سیٹھ عثمان کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟"

"تمہیں اس کا شبہ کیوں کر ہو گیا؟"

"بس......" لیاقت حسین نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "میرا دل بولتا ہے کہ کہیں نہ کہیں......"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔" راحیلہ بیگم نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ "بنگلے کی بات طے ہونے کے علاوہ ایک خوش خبری اور بھی ہے تمہارے لیے...... تمہارے صاحب نے اب ایک نئے ماڈل کی گاڑی لینے کا ارادہ بھی

کر لیا ہے۔"

لیاقت حسین نے جواب میں خوشی کا اظہار کیا لیکن اس کے دماغ میں نہ جانے کیوں ایک خیال رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی خلا ضرور ہے۔ کوئی بات ایسی...... جو اس سے چھپانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اسے خود بھی یاد نہیں آرہی تھی۔ پھر اس کے کانوں میں کہیں دور سے ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔

"لیاقت حسین...... خود کو سنبھالو...... جو گزر گئی اسے بھول جاؤ۔ خدا کی مصلحتیں سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جتنا کریدو گے، اتنا ہی اور الجھتے جاؤ گے۔"

"کیا بات ہے لیاقت حسین......؟" سیٹھ عثمان نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو......؟"

"سوچنا...... سوچنا کیا ہے صاحب۔" لیاقت حسین نے سنبھل کر جواب دیا۔ "آپ جیسے مہربان لوگ تو بندوں کے لیے ایک نعمت ہوتے ہیں۔ جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔"

"تم ادھر دو روز اور آرام کر لو......" راحیلہ بیگم نے کہا۔ "کل تک بنگلے کی ادائیگی وکیل کے ذریعے کر کے ہمیں اس کا قبضہ بھی مل جائے گا۔ پرسوں تم آ کر پرانے مکان سے اپنا سامان بھی لے آنا لیکن...... نئے مکان کی ساری سیٹنگ فرحین آنے کے بعد اپنی مرضی سے کر لے گی۔"

"ٹھیک ہے بیگم صاحب......"

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کچھ دیر بعد چلے گئے تو لیاقت حسین کے دماغ میں پھر وہی پُراسرار آواز گونجنے لگی۔ وہ اس پر غور کرتا رہا۔ الجھتا رہا پھر چونک اٹھا...... "وہ آواز تو اس کی اپنی تھی۔" اس کے دل نے گواہی دی تو وہ ایسے سوالات کی گہرائیوں میں غوطہ کھانے لگا جس کی کوئی اتھاہ نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ سرخ رنگ کی اسپورٹس کار تھی جو خان گڈز ٹرانسپورٹ کے سامنے رکی تھی۔ اس میں سے جو شخص اترا وہ ایک سیاہ فام تھا۔ درمیانہ قد اور چھریرے جسم کا مالک۔ اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا، سر پر تنکوں والی سفاری ٹائپ فلاپی ہیٹ نظر آرہی تھی۔ دونوں شانوں پر نہایت جدید قسم کے کیمرے لٹک رہے تھے، ایک کینوس کا ہینڈ بیگ بھی تھا۔ آنکھوں پر اسموک کلر کے گلاسز تھے، گلے میں ایک پاور فل دوربین بھی جھول رہی تھی۔ بہ ظاہر وہ کوئی سیاح ہی نظر آتا تھا جسے فوٹو گرافی کا شوق بھی جنون کی حد تک تھا۔ ورنہ دو دو کیمروں کا رکھنا فضول ہی تھا۔ اس وقت اس نے جس جگہ گاڑی پارک کی تھی اس کے دونوں اطراف گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفاتر ہی واقع تھے، چھوٹے چھوٹے آفس کے ساتھ ہی بڑے بڑے آہنی دروازوں والے شیڈ بھی تھے جہاں سیکڑوں کی تعداد میں لوڈنگ ٹرکس پارک تھے۔

گاڑی روکنے کے بعد اس نے اگنیشن سے چابی نکال کر جیب میں ڈالی پھر نیچے اتر کر قریب کے دفتر میں گیا جہاں ایک بھاری بھر کم شخص چھوٹی سی میز کی دوسری جانب شلوار قمیص پہنے بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا، باہر اسٹول پر بیٹھا ہوا شخص اس کا ملازم لگ رہا تھا۔

دفتر میں داخل ہو کر سیاہ فام نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بھاری بھر کم شخص کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے ایک ایسا صاف ستھرا بڑا ٹرک درکار ہے جس پر تقریباً نو آدمی مع کیمپنگ کے ساز و سامان کے آسانی سے سفر کر سکیں۔ وہ ٹرانسپورٹر کو خاصی دشواری کے بعد سمجھا سکا کہ اسے وہ ٹرک اپنی شکاری پارٹی کے لیے درکار ہے جسے دس سے بارہ روز اپنی پارٹی کے ساتھ رہنا ہوگا۔ بھاری بھر کم شخص نے چند ضروری سوال جواب کے بعد اس کی مدد سے معذوری ظاہر کر دی۔

"جتنا پیسہ مانگتا دے گا لیکن ٹرک نیا ہو تو ونڈر فل......"

"نو...... نو...... سوری۔"

"شوگی ری مارا......" سیاہ فام نے اس کے طرزِ عمل پر نفرت کے اظہار کے طور پر اپنی زبان میں کچھ کہا پھر باہر آ کر دوسری کمپنیوں کے دفتر باری باری جھانکنے لگا۔ آٹھویں آفس میں بیٹھے ہوئے شخص نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ اس کے آفس کے باہر شہباز گڈز ٹرانسپورٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔ کچھ دیر تک سیاہ فام حسبِ معمول اس شخص کو بھی اپنی ضرورت سے آگاہ کرتا رہا۔ میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا گول مٹول آدمی سیاہ فام کی باتوں کو پورے دھیان سے سنتا رہا پھر اس کی مکمل بات سن کر بولا۔

"ہمارے پاس ایک نیا ٹرک ہے جو ہیوی ڈیوٹی کے لیے بھی ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔" اس نے بڑے کاروباری انداز میں بات جاری رکھی۔ "اگر تم بولو گے تو اس پر دھوپ سے بچنے کی خاطر ترپال کی عارضی چھت بھی کھینچی جا سکتی ہے۔"

"فائن...... ویری گڈ......" سیاہ فام نے خوشی کا اظہار کیا پھر کاروباری انداز میں اپنا مافی الضمیر سمجھاتے ہوئے

دریافت کیا۔

''سوری یا خی!...... آئی مین ...... ہاؤ مچ منی ......! رو کڑا؟''

''ون ویک...... ٹوئنٹی تھاؤزنڈ ......'' گول مٹول آدمی نے دو بار اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھولنے اور بند کرنے کے بعد اسے سمجھانے کی کوشش کی پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''ایوری ایکسٹرا ڈے...... فیفٹین ہنڈرڈ...... فائنل۔''

''اوکے...... اوکے......'' سیاہ فام نے گردن ہلاتے ہوئے اس کی پیشکش کو بغیر کسی حیل وحجت کے منظور کرلیا تو ٹرانسپورٹر نے مزید وضاحت کی۔ ''گیسولین...... فیول چارجز ایکسٹرا...... یور ہیڈک۔''

''یس...... آئی نو...... نیور مائنڈ......'' سیاہ فام نے اثبات میں سر کو جنبش دی پھر گھٹنے کے قریب والی زپ پاکٹ سے پانچ ہزار روپے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایڈوانس...... ڈن۔''

''روانگی...... گوئنگ وھن؟'' گول مٹول آدمی نے انگریزی کی گردن مروڑتے ہوئے دریافت کیا۔

''ٹوڈیز...... آفٹر۔'' سیاہ فام نے پھر ہاتھ ہلا کر بولا۔ ''لی شو ماری گا...... آئی لائیک...... بی وز وڈ کل......''

''اوکے۔'' گول مٹول آدمی نے پانچ ہزار کا ایڈوانس سمیٹ کر جیب میں رکھنے کے بعد باہر بیٹھے اپنے ملازم سے کہا۔ ''منو ورے...... اس کالٹین کو اندر لے جاکر وہ ٹرک دکھا دے جو دو روز سے پیچھے کھڑا ہے۔''

''اگر اس نے سامنے کی باڈی پر ڈینٹ کے بارے میں معلوم کیا تو کیا گولی دوں......؟''

''تو بھی نرا جنگلی ہے...... کہہ دینا کہ کسٹم ڈیلیوری کے وقت وہ اسی حالت میں ملا تھا۔'' گول مٹول آدمی نے آنکھ مار کر اسے سمجھایا۔ ''زیادہ پھیلنے کی کوشش کرے تو بول دینا کالٹین کو وہ چاہے تو ڈینٹ بھی نکلوا دیا جائے گا...... موٹی آسامی ہے۔ کم عقلی سے کام لیا تو تیرا کمیشن بھی مارا جائے گا، اندر جاکر کالٹین کے سامنے ماٹھو بن کر کھڑا رہا تو بات نہیں بنے گی۔''

ملازم آہنی دروازہ کھول کر سیاہ فام کو اندر لے گیا......

سیاہ فام وہاں موجود پانچوں ٹرک کو دیکھتا رہا پھر ملازم اسے کسی طرح کھینچ تان کر اس ٹرک تک لے گیا جو سب سے آخر میں کھڑا تھا، وہ دوسرے ٹرکس کے مقابلے میں نسبتاً بڑا بھی تھا اور نیا بھی لگ رہا تھا۔ سیاہ فام کسی ماہر کی طرح اسے چاروں طرف سے...... اور اوپر نیچے سے دیکھتا رہا پھر اس نے بھی حسب توقع ٹرک کے سامنے کی طرف نظر آنے والے اس معمولی ڈینٹ کے بارے میں دریافت کیا جو بہت زیادہ نمایاں بھی نہیں تھا لیکن اس ڈینٹ کے مقام پر اور ریجنل باڈی کلر کے علاوہ کہیں کہیں گرے کلر بھی نظر آرہا تھا۔ سیاہ فام اس نشان کو غور سے دیکھتا رہا پھر ملازم نوجوان کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''ایکسیڈنٹ...؟''

''نو...... کسٹم...... ڈیلیوری ٹیم...... ہینڈلنگ رگڑا......''

ملازم نے بھی مادر پدر آزاد انگریزی زبان استعمال کی۔

''اوہ...... آئی سی...... مس ہینڈلنگ......'' سیاہ فام اس کی بات سن کر مسکرایا۔ جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے رازداری سے بولا۔ ''آ سمال ریوارڈ...... فار یو اونلی۔''

ملازم نے ادھر اُدھر دیکھا پھر نوٹ لے کر اپنے نیفے میں جلدی سے اڑس لیا۔

''تھینک یو...... سر...... شور یو......'' سیاہ فام روانی میں بول گیا پھر مسکرا کر وضاحت کرنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے اشارے سے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی...... ''ون...... گلاس...... واٹر...... کولڈ۔''

''ابھی لایا۔'' ملازم نے جواب دیا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر کی طرف چلا گیا۔

سیاہ فام نے آہنی دروازے کی طرف دیکھا پھر ٹرک کے پچھلے پہیوں کے درمیان ادھر اُدھر جھکا۔ دیکھا پھر اس نے ہینڈ بیگ سے دو بائی تین انچ کی ایک چپٹی سی پلاسٹک میڈ...... چاروں جانب سے سیلڈ ڈبیا نما شے نکالی۔ اس کے ایک طرف پالی پاور میگنیٹک (Magnetic) سائڈ پر لگی ہوئی پیپر ٹیپ کھینچ کر علیحدہ کی پھر...... دونوں ٹائر کے درمیان باڈی کے اوپری حصے پر ایسی جگہ فکس کر دیا کہ بہ ظاہر ایک نظر میں آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنا کام بہ مشکل ایک منٹ میں مکمل کرنے کے بعد وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور ادھر اُدھر گھوم کر ٹرک کو اس طرح دیکھنے لگا، جیسے خود اپنی پسند کو سراہ رہا ہو۔ ملازم پانی لایا تو اس نے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر پانی پیا پھر اس کے گلے میں دوستانہ انداز میں ہاتھ ڈالے باہر والے آفس میں آگیا۔

''گڈی آ گیا درے وچ......؟'' گول مٹول آدمی نے ملازم سے اپنی مادری زبان میں دریافت کیا۔ بہ ظاہر یہی لگا جیسے وہ کوئی خاص کام کی بات کر رہا ہو۔

''گڈ ٹرک......'' سیاہ فام نے گول مٹول آدمی سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا پھر

اس نے یہ بھی باور کرا دیا کہ وہ کل صبح تک اپنا سارا سامان بھی ملازموں کے ذریعے بھیج دے گا اس لیے کہ اگلے دن شام ہی کو ان کی روانگی متوقع ہے۔

''ٹو مارو...... فل پیمنٹ ، ایڈوانس۔'' گول مٹول شخص نے اسے ادائیگی کے سلسلے میں بڑی صاف گوئی سے آگاہ کیا۔ جواب میں سیاہ فام نے اپنی آمادگی کا بڑی خندہ پیشانی سے اظہار کیا پھر الٹے قدموں اس سرخ اسپورٹ کار کی طرف قدم بڑھانے لگا جو تقریباً تیس فٹ دور پہلے والی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے سامنے پارک تھی۔

سیاہ فام نے اسپورٹنگ کار کو اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس طرح نظرانداز کر دیا جیسے اس سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہ رہا ہو، تیز تیز قدم اٹھاتا کشادہ سڑک پر آیا پھر ایک ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے استفسار پر اس نے بڑی روانی سے مقامی زبان بولتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ایک سیاح ہے۔ بڑے دکھ سے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ جنگلی جانوروں اور آزاد پرندوں کو دنیا کے بیشتر ممالک میں مختلف طریقوں سے کسی نہ کسی طرح ان کی آزادی سلب کرکے محض لوگوں کی تفریح کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اس نے زولوجیکل گارڈن (Zoological Garden) چلنے کی ہدایت دیتے ہوئے اس بات کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھ رہا ہے جس میں دنیا میں مختلف ممالک میں موجود چڑیا گھروں میں رکھے گئے ایسے جانوروں کی تصاویر بھی شامل ہوں گی جنہیں انتہائی غیر صحت مندانہ ماحول میں لوگوں کی تفریح کی خاطر رکھا جا رہا ہے۔

اسی شام اس نے ٹھیک سات بجے اپنے موبائل فون پر ایک متوقع کال ریسیو کی۔

''ہیلو...... ہاشم اسپیکنگ۔'' سیاہ فام نے بے پروائی سے کال ریسیو کی۔

''سیون اسٹار......'' دوسری جانب سے بھرائی نسوانی آواز میں کوڈ ورڈ بتانے کے بعد سوال کیا گیا۔ ''آپریشن کے سلسلے میں کیا رپورٹ ہے؟''

''ہنڈرڈ پرسنٹ سکسس فل۔'' اس بار بھی نارمل انداز میں جواب دیا گیا۔

''سرخ اسپورٹس کار پر تم نے کوئی فنگر پرنٹس تو نہیں چھوڑے؟''

''ہاشم نے زندگی میں کبھی کوئی کچا کام نہیں کیا۔''

''گڈ...... میرے آدمی تمہاری کارکردگی کو واچ کر رہے تھے۔'' دوسری جانب سے سرسراتے ہوئے انداز میں جواب ملا۔ پھر پوچھا گیا۔ ''بلاسٹ ٹائم کیا فکس کیا ہے؟''

''میری رسٹ واچ کے مطابق ٹھیک نو بجے دھماکا ہو جائے گا۔ اس وقت میری گھڑی میں سات بج کر اکیس منٹ ہو رہے ہیں۔''

''ایک بات یاد رکھنا......'' اس بار دوسری جانب سے تنبیہی انداز اختیار کیا گیا۔ ''جو لوگ فل پیمنٹ ایڈوانس کرتے ہیں وہ کسی بات سے غافل بھی نہیں ہوتے...... ہمارے پاس غلطی کو نظرانداز کرنے کا کوئی تصور بھی نہیں ہے۔ جو لوگ ہمیں ڈاج دینے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزائیں بھی جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مقرر ہیں۔''

ہاشم نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری...... وہ سوچنے لگا کہ بیروت سے تعلق رکھنے والے دراز قد اور دلکش صورت کے مالک ذوما کو کیا سزا ملے گی جس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی گرل فرینڈ کو بھی دوسری فلائٹ سے بلانے کی حماقت کی تھی؟ کیا سیون اسٹار کا کوڈ استعمال کرنے والے اس کے پروگرام سے واقف نہیں ہوں گے؟

☆☆☆

طے شدہ پروگرام کے تحت ڈی ایس پی سراج اور ڈی آئی جی کرائمز آدھے گھنٹے کے وقفے کے ساتھ ملٹری ہیڈ کوارٹر میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے سے موجود تھے۔ بیس منٹ کے بعد ان دونوں کے علاوہ ملٹری انٹیلی جنس کا ایک کرنل بھی ان کے ساتھ ملٹری کی بلٹ پروف گاڑی میں اگلی نشست پر بیٹھا اسپیس ڈویژن کی طرف سفر کر رہا تھا۔ دس منٹ تک کرنل بڑی سنجیدگی سے ایک فائل میں لگے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا پھر اس نے خود ہی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے پولیس آفیسرز سے اپنا تعارف کرایا۔

''آئی ایم کرنل رشید پرویز۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ ہی ان دو مجرموں کی زبان کھلوانے کا ٹاسک ملا ہے جو ابھی تک کسی خاص وجہ سے خاموش ہیں۔ ہمارے جوانوں نے ان پر فی الحال کوئی سختی بھی نہیں کی۔''

جواب میں باری باری سراج اور ڈی آئی جی کرائمز علیم احمد نے بھی اپنا مختصر تعارف کرایا پھر علیم الدین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کرنل...... کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم کھل کر بات کریں؟''

''یہ بہت اہم ہے۔ اس کے بغیر ہم کوئی لائحہ عمل بھی

طے نہیں کرسکتے۔'' کرنل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''کرمنلس کی زبان کھلوانے کی خاطر ان کا پس منظر اور لائف ہسٹری کا بھی معلوم ہونا ضروری ہے۔''

''جو مجرم زندہ ہمارے ہاتھ آئے وہ بھی ہمارے کمانڈوز اور گن شپ کی مہربانی تھی ورنہ ہمیں یہی ہدایت دی گئی تھی کہ کسی قیمت پر بھی زندہ گرفتاری نہ دیں۔''

''آئی سی۔'' کرنل پرویز نے لمبا سانس لیا۔ ''کیا ان کی پشت پر بھی بیورو ریٹ کا ہاتھ ہے؟''

''جی!'' علیم احمد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''آپ نے حامد کا نام کہیں نہ کہیں کسی حوالے سے ضرور سنا ہوگا۔''

''اوہ......'' کرنل نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''دیٹ بلاڈی راسکل (Rascal)۔ میں اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ مجبوری یہ ہے کہ فوجی انتظامیہ کو آپ کی سول گورنمنٹ کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں۔ ہم خود بھی اس گند میں ملوث نہیں ہونا چاہتے۔ ملٹری کی اپنی ایک علیحدہ شناخت ہوتی ہے۔ سول حکومت کے کاموں میں الجھ کر ہم اپنا امیج بھی خراب نہیں کرنا چاہتے لیکن......'' کرنل نے کچھ توقف سے کسمسا کر بھرپور انداز میں گفتگو جاری رکھی۔ ''جو مجرم ہماری کسٹڈی میں دیے گئے ہیں ہر قیمت پر سچ اگلنا ہوگا۔ مجھے خاص طور سے اوپر سے یہ احکامات ملے ہیں کہ پس پردہ رہ کر بھی ہر طرح سے آپ دونوں حضرات سے تعاون کیا جائے۔''

''شکریہ کرنل!'' ڈی آئی جی رائز نے مہذب لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر آپ کے اشتراک سے ہم ان دونوں کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوگئے تو یہ بھی ہمارے لیے ایک بڑی کامیابی ہوگی۔''

''کیا بات ہے آفیسر؟'' کرنل نے سراج سے پوچھا۔ ''آپ کس سوچ میں گم ہیں؟''

''سوچ رہا ہوں کہ اگر اہم جرائم کے معاملات میں ہمیں ملٹری کی سپورٹ بھی حاصل ہو تو شاید ہمارے ملک میں بھی جرائم کا گراف تیزی سے نیچے آجائے۔''

''نو کمنٹس......'' جواب میں کرنل نے شانے اچکا کر مختصراً مگر معنی خیز انداز میں کہا۔

چالیس منٹ بعد وہ ضروری پابندیوں سے گزرنے کے بعد ملٹری اسپیس ڈویژن کی سُل نمبر تین کے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں ذیشان ہوٹل سے گرفتار کیے جانے والے دونوں مجرموں کو رکھا گیا تھا۔ ملٹری کے دو مسلح گارڈ کرسی پر مضبوط شکنجوں میں جکڑے ہونے کے باوجود ان کے سروں پر موجود تھے مگر...... وہ دونوں اس طرح پُرسکون نظر آرہے تھے جیسے کسی مہمان خانے میں بیٹھے ہوں۔

آنے والے تینوں تفتیشی آفیسران تین کرسیوں پر بیٹھ گئے جو مجرموں کے سامنے تقریباً دس فٹ کے فاصلے سے موجود تھیں۔ ان کی آمد کے بعد میجر اور کیپٹن کے نام سے آپس میں گفتگو کرنے والے دونوں مجرموں نے نظریں گھما کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یکے بعد دیگرے دونوں کی نظریں جھپکیں، وہ کوئی مخصوص اشارہ ہی تھا جس کے تبادلے کے بعد ہی وہ بڑی سنجیدگی سے مسکرائے تھے۔

''تم اب تک جس غلط فہمی میں مبتلا تھے اسے ذہن سے نکال دو۔'' کرنل پرویز نے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ انداز میں دونوں کو مخاطب کیا۔ ''ہم اپنے مجرموں کو زبان کھولنے کی خاطر بڑے جدید اور سائنٹفک طریقے استعمال کرتے ہیں۔''

''یہ ہمارا پہلا تجربہ ہوگا۔'' درمیانے قد والے کیپٹن نے بڑی سادگی سے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم دونوں میرے ساتھ کوآپریٹ کروگے ورنہ......'' کرنل کا لب ولہجہ بتدریج سرد ہونے لگا۔ ''ورنہ تمہیں ہر حال میں اگلنی ہوگی۔''

''ہم آپ کی زبان سمجھ رہے ہیں آفیسر!'' چھریرے بدن والے میجر نے شکنجوں میں کسمسا کر سنجیدگی سے کہا۔ ''غلط فہمی اور غلط فیملی۔ شاید آپ کی ڈکشنری میں اس کا فرق سلیس اردو میں لکھا ہو لیکن ہم...... جدید لینگویج بولنے کے عادی ہیں۔''

کرنل پرویز کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے قہرآلود نظروں سے اپنے مخاطب پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ سول اور ملٹری کے طریقۂ کار میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

''میں آپ کو سمجھاتا ہوں کرنل......'' کیپٹن کہلانے والے نے معصومیت سے وضاحت کی۔ ''جو لوگ غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں وہ جان بچانے کی خاطر فرفر سارا کھایا پیا اگلنے لگتے ہیں مگر...... غلط فیملی کے گروپ سے تعلق رکھنے والے اس بات کو سمجھتے ہیں کہ زبان نہ کھولنے کی صورت میں بھی ان کا وہی انجام ہوگا جو زبان کھولنے کی صورت میں...... پھر بلا ضرورت چمڑے کی زبان کو لپ لپ کرنے کی زحمت کیوں دی جائے۔ یو انڈر اسٹینڈ!''

''باسٹرڈ......'' کرنل کے ضبط کرنے کا پیمانہ چھلک گیا۔

دم ہی آخری ڈگری پر پہنچ گیا۔ گرج کر بولا۔ ''ہم تمہاری غلط فیملی کو بھی اپنے اشاروں پر کسی روبوٹ کی طرح چلنا سکھا دیں گے۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اس بار ڈی آئی جی رائز نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم اگر جرائم کی دنیا کے حرف آخر ہو تو میرے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہوگے...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ سچ اگل دینے کے بعد تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا کر......''

''امریکن رگڑا......'' چھریرے بدن والا مسکرا دیا۔ ''یہ تکنیک بہت پرانی ہوچکی ہے ڈی آئی جی صاحب...... تم ایماندار آفیسر ہو۔ ہم واقف ہیں...... یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے ماتحت بھی تمہیں زبردستی جھیل رہے ہیں۔ اندر سے وہ بھی تم سے نفرت ہی کرتے ہیں۔ تمہاری ایمانداری کو پسند نہیں کیا جاتا۔''

''تمہیں اس وقت غالباً اپنی پوزیشن کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔'' سراج نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ تمہارے باقی دو ساتھی بھی گرفتار ہوچکے ہیں۔ ان دونوں کو بھی علم تھا کہ قانون نے بہت زیادہ رعایت کی تو پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل ہوسکتی ہے لیکن انہوں نے اپنا انجام جانتے ہوئے بھی زبانیں کھول دیں۔ شاید انہیں آخری وقت میں یہ احساس ہوگیا ہے کہ انسان اگر آخری سانس لیتے وقت بھی ایک نیکی کر جائے تو اس کے اجر سے اسے محروم نہیں کیا جاتا۔''

''ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں ڈی ایس پی ورنہ تمہارے اس سفید جھوٹ پر تالیاں ضرور بجاتا۔'' مضحکہ خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا گیا تو کرنل غصے سے بھنا کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کی پیشانی پر آڑی ترچھی لکیروں کا...... پھیلا ہوا جال اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس کی قوت برداشت اپنی حد سے گزر چکی ہے۔

''آئرن ماسک۔'' کرنل نے ہونٹ چباتے ہوئے سرد اور سفاک لہجے میں آرڈر دیا، دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ایک سیاہ پوش دو آئرن ماسک لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے وہ ماسک دونوں مجرموں کے چہرے پر پہنا کر ان کی پشت پر لگے ہوئے تاروں کو بجلی کی اس ہائی ٹینشن لائن سے کنیکٹ کردیا جو کرسی کی پشت پر زمین پر موجود تھی۔

''میں تم دونوں کو لاسٹ وارننگ دے رہا ہوں۔'' کرنل نے دونوں مجرموں کو باری باری دیکھا پھر غضب ناک لہجے میں بولا۔ ''بجلی کا سوئچ آن ہوتے ہی تم دونوں کی مکروہ صورتیں ہیٹ اپ ہونے کا عمل شروع کردیں گی۔ زندگی اور موت کا فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔ ماسک فل ہیٹ اپ ہونے کے بعد تم دونوں کے چہروں کو پگھلی ہوئی چربی کی صورت میں منتقل کرنے میں پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لے گا۔ کیا کہتے ہو؟'' کرنل نے ان دونوں کو کسی جلاد کی سفاک نظروں سے گھورا۔ ''کیا فیصلہ کرو گے؟ یس...... یا...... نو؟''

''تم جس جدید اور سائنٹفک طریقے سے ہم جیسے مجرموں کو موت کی نیند سلانے کی دھمکی دے رہے ہو وہ ہمارے لیے کسی سوتیلی ماں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی...... ہم بہت پرانے اور تجربے کار کھلاڑی ہیں۔ اس پار یا اس پار کرنے میں پانچ سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لیتے۔''

''مسٹر سراج......!'' چھریرے بدن والے نے سراج کو مخاطب کیا۔ ''اپنے آخری ورلڈ ٹور پر روانہ ہونے سے پیشتر تمہیں ایک سچ ضرور بتانا پسند کروں گا۔ ہمارے دوسرے دونوں ساتھیوں نے ہٹ لسٹ پر تمہارا نمبر آن ٹاپ رکھا ہے۔ ان کے ہاتھوں بچ گئے تو پھر بگ باس بھی تمہیں کسی پالتو کتے کی طرح بڑی اذیت ناک موت سے ہمکنار کرے گا۔''

''شٹ اپ!'' کرنل حلق کے بل چیخا پھر اس کا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند ہوگیا۔ ''میں صرف پانچ تک کاؤنٹ ڈاؤن کروں گا پھر تم نے ہامی بھی بھرلی تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، انڈر اسٹینڈ۔''

''پانچ تک گننے میں تم اپنا ٹائم ہی ویسٹ کروگے۔'' گٹھے ہوئے جسم والے نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہم دوسروں کی مرضی کی نہیں اپنی مرضی کی موت پسند کرنے کے عادی ہیں۔'' اس نے اپنے جملے کو مکمل کرنے کے بعد دوسرے ساتھی کی جانب دیکھا، دوسرے نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ اس کے بعد ان دونوں نے اپنے منہ کو اس طرح گول گول گھمایا جیسے کسی اینٹی سیپٹک سے منہ کو اندر ہی اندر صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ کیفیت صرف بیس پچیس سیکنڈ تک رہی پھر دونوں کے چہرے اس طرح ان کی گردنوں پر جھول گئے جیسے ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو پھر...... ان کے ہونٹوں سے چھوٹے چھوٹے بلبلوں کی شکل میں جو رطوبت خارج ہوئی اسے دیکھتے ہی علیم احمد اور سراج بھی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بعد میں کرنل نے جس ملٹری ڈاکٹر کو فوری طلب کیا، اس نے بھی یہی تصدیق کردی کہ دونوں کی موت کا سبب کوئی

سریع الاثر زہر ہی تھا جسے بڑی مہارت سے ان دونوں نے مٹر کے دانے سے بھی چوتھائی حصہ کم چھوٹے چھوٹے کیپسول کی صورت میں غالباً ڈاڑھوں کی کسی خلا میں بوقت ضرورت استعمال کرنے کی خاطر چھپا رکھا تھا۔

کرنل پرویز اپنی اس ناکامی پر بری طرح تلملا رہا تھا۔ سراج اور علیم احمد کے چہروں پر بھی مایوسی کے گہرے بادل منڈلانے لگے۔ دونوں مجرموں کی لاشیں ملٹری کے نوجوانوں نے کرنل پرویز کے حکم کے مطابق خفیہ طور پر نیل تھری سے ہٹا دیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈی آئی جی کرائمز اور سراج کو سی آف کرتے وقت ٹھوس لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

''ہم اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ موجودہ معاملے میں کسی طرح بھی ملٹری کا انوالومنٹ ظاہر ہو۔ آپ دونوں کو اس کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ ہے۔'' علیم احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر سراج کے ساتھ اسی گاڑی میں بیٹھ گئے جس میں کچھ دیر پیشتر کرنل پرویز بھی ان کا ہم سفر تھا۔ آدھے راستے تک دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ شاید دونوں ہی کو اس بات کا ملال تھا کہ دو اہم مجرم ان کے ہاتھ آنے کے بعد بھی آخری وقت میں انہیں سرخ جھنڈی دکھا گئے تھے۔ پھر گفتگو کی ابتدا ڈی آئی جی کرائمز نے کی۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ پہلی فرصت میں دوبارہ اپنا استعفیٰ لکھ کر حکومت کے حوالے کردوں گا۔''

''کیوں سر؟'' سراج نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ''کیا آپ اتنی جلدی......''

''جو پولیس آفیسر وقت پر ریٹائر ہونے کے باوجود اپنی ڈیوٹی سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ میں انہیں بھی بزدل ہی کہتا ہوں۔ فرائض کی ادائیگی آخری سانس تک ہم پر قرض ہوتی ہے۔''

''پھر آپ......''

''میرا خیال ہے کہ میں کرسی چھوڑ دینے کے بعد تمہارے زیادہ کام آسکوں گا۔'' علیم احمد نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''لیکن مخالف گروپ کے لوگ اس انداز میں نہیں سوچیں گے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ان کی سوچ مثبت نہ ہو۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے......؟'' سراج نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

''تم جذبات میں آکر کوئی حماقت کا ثبوت نہیں دو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔'' علیم احمد نے بڑی سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میرے کرسی چھوڑ دینے کے بعد...... تمہیں شیخ حامد کی سرپرستی حاصل رہے گی۔''

''سر......'' سراج چونکا۔ ''یہ...... یہ...... آپ کہہ رہے ہیں؟''

''میں نے ابھی کہا تھا کہ تم کسی حماقت سے گریز کرو گے۔'' علیم احمد نے ڈرائیور کی وجہ سے بدستور مدھم لہجے اور انگریزی زبان کا استعمال جاری رکھا۔ ''میں تمہیں جو گُر کی بات بتا رہا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرو...... نیول فورس میں جنگ کے دوران ہی کسی سب میرین کا رول سب سے اہم ہوتا ہے۔ امید ہے تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔''

سراج جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔ ڈی آئی جی کرائمز نے ''سب میرین'' کا حوالہ دے کر اسے جو راہ دکھانے کی کوشش کی تھی وہ وقت کی نزاکت کے اعتبار سے موثر ترین طریقہ ثابت ہوسکتی تھی لیکن...... شاید وہ اس اہم نکتے کو فراموش کرگیا تھا کہ خشکی اور سمندر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

''سر......'' اچانک ڈرائیور نے کہا۔ ''دشمن کی ایک کار ہمارا پیچھا کررہی ہے۔ کیا حکم ہے؟''

''ڈسپوز کرادو......'' سراج نے فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

جواب میں گاڑی کے ڈرائیور نے جیب سے موبائل نما ایک واکی ٹاکی ٹائپ آلہ نکال کر اس کے دو چار بٹن پنچ کرکے واپس جیب میں ڈال لیا۔ دوسرے ہی لمحے عقب میں کچھ فاصلے پر آنے والی سفید کار کو ایک ملٹری کی جیپ نے اوورٹیک کرنے کی خاطر اسپیڈ تیز کی۔ سفید کار کے برابر آتے ہی جیپ سے ریپڈ فائرنگ کی تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری۔ سفید کار کے دو ٹائر دھماکوں کے ساتھ پھٹے تو وہ لہراتی ہوئی سڑک پر داہنے ہاتھ لگے بل بورڈ کے کھمبے سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ جیپ سے ایک فائر اور کیا گیا۔ سفید کار سے شعلے سے بھڑک اٹھے۔ جیپ تیزی سے اسپیڈ بڑھاتی اس کار سے بھی آگے نکل گئی جس میں ڈی آئی جی اور سراج سفر کررہے تھے۔

''تم میرے فیصلے سے پریشان نہ ہونا۔'' ڈی آئی جی نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''محکمے کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد میں تمہارے اور قانون کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوں گا۔''

''ان آہنی ہاتھوں کی بیخ کنی کون کرے گا جس کا

والا بھی خود قانون بنانے والے ہر بڑی واردات کے بعد اپنی دھواں دار تقریروں میں دیتے ہیں؟'' سراج جذباتی ہونے لگا۔

''لطف تو یہی ہے کہ ہمیں جس حد بندی میں رکھا گیا ہے اسی میں ہم پوری دیانت اور ذمے داری سے اپنا کام انجام دیں۔''

''آپ کے جانے کے بعد اس سیٹ پر کون آئے گا؟'' سراج نے متحمل لہجے میں سوال کیا۔

''سینیارٹی سے تو کسی اور کا حق بنتا ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے تمہارے آغا منظور کے کسی کے منظور نظر ہونے کی وجہ سے زیادہ امکانات ہیں۔''

''میڈم کی وجہ سے اب ان دونوں کے درمیان کولڈ وار شروع ہوچکی ہے۔''

''اسی لیے میں چاہوں گا کہ میرے بعد میری کرسی پر آغا منظور براجمان ہو۔'' علیم احمد نے مسکرا کر جواب دیا۔

جواب میں سراج نے ڈی آئی جی کرائمز کو وضاحت طلب انداز میں دیکھا تو علیم احمد نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''بحری جنگ کے دوران میں دشمنوں کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کچھ ایسی ہی کھینچا تانی کسی سب میرین کے لیے جگہ بناتی ہے اور کامیابی کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ آئی وش آل دی بیسٹ......''

☆☆☆

شیخ حامد کا چہرہ اس وقت کسی ایسے آتش فشاں کی طرح سرخ ہورہا تھا جو کثیف دھواں اڑانے کے بعد ایک دھماکے سے اپنے اندر کا سارا لاوا ابل دینے کے لیے بے چین ہو۔ ہونٹ چبانے کے ساتھ ساتھ وہ موبائل پر دوسری جانب سے دی جانے والی...... بلیک ٹائیگر کی رپورٹ بھی سن رہا تھا۔

''ڈی آئی جی کرائمز اور سراج تنہا واپس لوٹے ہیں، کرنل پرویز ان کے ساتھ نہیں تھا۔ نمبر تھری کی رپورٹ کے مطابق پولیس والوں نے قبرستان میں کچھ دیر پیشتر دو تابوت دفن کیے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ...'' دوسری جانب سے جملہ مکمل نہیں کیا گیا۔

''رک کیوں گئے؟'' شیخ حامد نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''بولتے رہو۔''

''خیال یہی ہے کہ وہ دونوں تابوت ہمارے ہی آدمیوں کے ہوں گے۔''

''اور......'' شیخ حامد کے لہجے میں کسی سانپ کی پھنکار ابھر رہی تھی۔

''جس ٹرک نے ایکسیڈنٹ میں کام دکھایا تھا، کل رات تقریباً نو بجے وہ بھی دھماکے سے اڑا دیا گیا، اس کے ساتھ قرب وجوار کے......''

''غیر ضروری باتوں میں وقت مت برباد کرو۔'' اس بار سرد لہجہ اختیار کیا گیا۔ ''افضل خان کی کیا خبر ہے؟''

''ہمارے آدمیوں نے جان پر کھیل کر وہاں تک رسائی حاصل کرلی تھی لیکن وہ بستر پر موجود نہیں تھا۔'' بلیک ٹائیگر کی آواز بجھنے لگی۔ ''شاید کسی نے اس کی مخبری کردی تھی۔ افضل خان کی جگہ ایک وارڈ بوائے چادر اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا۔''

''ڈیوٹی نرس کیسے لپیٹ میں آگئی؟''

''وہ بھی ایک اتفاق ہی تھا باس، ہمارے آدمی کا کام ہونے کے بعد واپسی کے ارادے سے پلٹے تھے جب نرس کی موت اسے راستے میں لے آئی وہ...... وہ اگر اچانک بدحواس ہوکر شور نہ مچاتی تو......''

''کچھ کہانیاں میرے پاس بھی ہیں وہ بھی ذہن نشین کرلو۔'' شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''بنگالی پاڑے میں ہمارے باقی آدمیوں کو بھی ختم کردیا گیا۔ چارلی اور حسینہ بھی غائب ہوگئیں۔ خاص ذرائع سے یہ بھی اطلاع مل رہی ہے کہ کل دفتر چھوڑنے سے پہلے حافظ مولوی، قاری، مفتی اور فرشتہ صفت علیم احمد نے بھی پے در پے ناکامیوں سے بوکھلا کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔''

شیخ حامد پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ ''جس ٹرک کو اڑا دیا گیا اس کا ڈرائیور بھی لاپتا ہے۔''

''اوہ......'' بلیک ٹائیگر نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''یہ سب کون کررہا ہے؟''

''رُبش......'' شیخ حامد ایک دم ہی پھٹ پڑا۔ ''تم کس مرض کی دوا ہو......؟'' وہ تحکمانہ لہجے میں غرایا۔ ''معلوم کرو کہ کس نے اپنی موت کو دعوت دی ہے؟ مجھے کل شام تک مکمل تفصیل درکار ہوگی...... اوور......''

موبائل آف کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے مخصوص کمرے میں کسی بھوکے کے مانند ٹہلنے لگا، جو سوالات اس نے بلیک ٹائیگر سے کیے تھے ان میں سے بہت سے جوابات خود اس کے پاس بھی نہیں تھے۔ وہ خاصی دیر تک دبیز قیمتی قالین کو قدموں تلے روندتا رہا پھر اس نے میز کے قریب آکر ایک جھٹکے سے فون کا ریسیور اٹھایا اور سراج کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں چٹخ رہی تھیں، ایک منٹ بعد ہی دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔

"سراج اسپیکنگ۔"

"شیخ حامد بول رہا ہوں۔" اس نے دھمکتی آواز میں اپنا تعارف کرایا۔ "ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے۔"

"کب حاضر ہو جاؤں؟" دوسری جانب سے بڑی فرمانبرداری سے دریافت کیا گیا۔

"یہاں نہیں ... اسپتال میں۔" شیخ حامد نے الفاظ چباتے ہوئے فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا۔ "میں دو گھنٹے بعد افضل خان کی عیادت کی خاطر وہاں پہنچ رہا ہوں، زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہونی چاہیے۔ کچھ اہم اور فائنل باتیں کرنی ہیں۔"

"او۔کے" سراج نے اس بار بھی نرم آواز میں کہا۔ "میں وقت سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

شیخ حامد نے کسی رسمی ہائے ہو...... یا بائی بائی کی ضرورت نہیں سمجھی، ریسیور کو واپس رکھ کر بس ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک سی ابھری، دوسرے ہی پل اس نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے رابطہ قائم کیا۔

"یس باس۔" دوسری جانب سے ایک مترنم نسوانی آواز ابھری۔

"دس منٹ بعد شبنم کو میرے ساؤنڈ پروف کمرے میں بھیج دینا۔"

"رائٹ باس...!" مستعدی سے جواب ملا۔

شیخ حامد دوبارہ اپنی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ پے در پے ہونے والی ناکامیوں نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ وہ ہر قسم کا نقصان ہنس کر برداشت کرنے کا عادی تھا لیکن کسی کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ اس کے چار شکاری کتے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ دو کی موت کی تصدیق بلیک ٹائیگر نے کر دی تھی۔ باقی دو کی موت کے اسباب اس کے ذہن میں کسی بچھو کی طرح ڈنک مار رہے تھے۔ لیاقت حسین کے مقابلے میں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس نے ایک ہی داؤ میں سیٹھ عثمان کو ختم کرانے کے ساتھ ساتھ لیاقت حسین کا قصہ بھی پاک کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ سیٹھ عثمان سپر اسٹور پر اترنے کی وجہ سے بال بال بچ گیا۔ بعد میں ہونے والے خطرناک ایکسیڈنٹ میں بھی لیاقت حسین معمولی زخمی ہوا تھا۔ اس کے بعد اچانک جو جوابی حملے شروع ہوئے ان کے بارے میں شیخ حامد نے بھول کر بھی غور کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی لیکن...... اب وہ سنجیدگی سے ایک ایک امکان پر غور کر رہا تھا۔

سیٹھ عثمان سیدھا سادا بزنس مین تھا۔ اس سے کسی انتہائی قدم اٹھانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ سراج کی ایک ایک نقل و حرکت کی رپورٹ اسے مل رہی تھی۔ ڈی آئی جی کرائمز جیسے ایماندار آدمی سے بھی وہ غافل نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ علیم احمد کی ذاتی کوشش اور اثر و رسوخ کی وجہ سے ذیشان ہوٹل سے پکڑے جانے والے دو مجرموں کی زبان کھلوانے کی خاطر ملٹری افسران کو شامل تفتیش کر لیا گیا ہو لیکن...... ٹرک کے دھماکے کا ذمے دار کون تھا؟ بنگالی باڑے کی پُر پیچ گلیوں میں اس مکان کی نشاندہی کس نے کی تھی جہاں باقی دو خطرناک مجرم روپوش تھے؟ ان کو ٹھکانے لگانے کے احکامات کس سورما نے صادر کیے؟ ... وہاں تک اس کی رسائی کس طرح ممکن ہوئی ...؟ ایکسیڈنٹ میں استعمال کیے گئے ٹرک ڈرائیور کو حادثے کے بعد فوراً ہی صرف شہر تک محدود رہنے کو کہا گیا تھا پھر...... اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان؟ کس میں اچانک اتنا دم خم پیدا ہو گیا تھا جس نے شیخ حامد کے مقابلے پر آنے کی حماقت کی تھی؟ کیا اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ہاتھی کا شکار کرنے کی خاطر کسی شیر کا دل گردہ درکار ہوتا ہے...؟ تو...... پھر اس نے کس وجہ سے مقابلے پر آنے کی کوشش کی تھی؟

اور بھی بے شمار سوالات تھے جو اس کے شیطانی ذہن میں ابھر رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب شیخ حامد نے اپنے ذہن کو ٹٹولنے کی زحمت گوارا کی تھی، ورنہ اس کی آنکھ کے چپ اشارے پر اس کے پروردہ بڑے بڑے افراد، جن کی زندگیں سرد خانے میں پڑی سڑ گل رہی تھیں، اس کے مخالف کو موت کی ابدی نیند سلانے میں ایک لمحے کی بھی غفلت نہیں کرتے تھے۔

بڑی دیر تک وہ ذہنی جمناسٹک کرتا رہا پھر اس کے ذہن میں ایک ہی نام ابھرا، میڈم روبی! ہو سکتا تھا کہ افضل خان کی ناکامی کے بعد میڈم کے ذہن میں شیخ حامد ہی کا نام ابھرا ہو۔ شاید اسے بعد میں اس بات کی بھنک بھی مل گئی ہو کہ افضل خان نے کس مقصد کی خاطر اسے شیری کی سال بند بوتل میں بھی شامل بے ہوشی کی دوا کے ذریعے ٹریپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اگر کیمرے کی خفیہ حالت میں اس کے خوبصورت اور گداز برہنہ جسم کو تصاویر یا مووی کی صورت میں محفوظ کر لیا جاتا تو پھر وہ کسی سے نظر ملانے کے بھی قابل نہ رہتی۔ اسی سوچ کے مختلف زاویوں نے اسے انتقام لینے پر اکسا دیا ہوگا۔ دولت کے بل بوتے پر ممکن ہے اس نے بھی دو تین بدمعاش اور اٹھائی گیروں کی خدمات حاصل کر لی ہوں، لیکن کوئی نہ کوئی اس کی پشت پناہی بھی

ضرور کر رہا تھا جس نے اسے خاص اور اہم اطلاعات فراہم کی ہوں گی۔ اس بھیدی کا نام اگلوانے کی خاطر میڈم کو شکنجوں میں جکڑنا ضروری تھا۔ اپنے اسی منصوبے پر عمل کرنے کی خاطر اس نے شبنم کو طلب کیا تھا۔

کسی ماہر جوہری کی طرح وہ بھی جانتا تھا کہ ہیرے کو صرف ہیرا ہی سب سے بہتر انداز میں کاٹ سکتا ہے۔

☆☆☆

شبنم حسبِ معمول اپنی ڈیوٹی انجام دے رہی تھی۔ شیخ حامد کے بنگلے پر اس نے سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کی دعوت میں جبراً شرکت کی تھی۔ اتفاقاً صبا بیگم نے اس سے نفرت کا اظہار کرنے کے باوجود اسے عورت سمجھ کر اپنی زندگی کی دکھ بھری کہانی بھی سنا دی۔ شاید بیگم حامد کا خیال تھا کہ شبنم اس کے کسی کام آسکے گی لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ جس چھت کے نیچے سانس لے رہی تھی اس کا ایک ایک ذرہ بھی شیخ حامد کی خصلت سے واقف تھا۔ وہ کسی کو ڈھیل دینے کا عادی نہیں تھا۔ جو دل میں ٹھان لیتا، وہی کر گزرنا اس کے خمیر میں شامل تھا۔

شبنم کو بیگم حامد کی کہانی میں کوئی جھول نہیں نظر آیا تھا۔ وہ عورت تھی اس لیے عورت کی دکھ بھری کہانی کی گہرائی کی پیمائش بھی کرسکتی تھی لیکن...... کسی خطرے کے امکانات کے پیشِ نظر اس نے صبا بیگم کی کہانی سن کر کسی ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے تلخی سے جواب دیا تھا۔ ”آپ جو خود ساختہ کہانی سنا رہی ہیں میں اس پر یقین نہیں کرسکتی۔ میرا ذاتی مشورہ ہے کہ آپ فوری طور پر کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کریں۔ ویسے بھی بگ باس کی اعلیٰ شخصیت پر آپ بیوی ہو کر جو گند اچھال رہی ہیں، وہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔“

وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ شبنم اپنے سائے سے بھی محتاط رہے۔ اس نے صبا بیگم کو جو جواب دیا تھا وہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ جو کہانی بیان کی گئی تھی اس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ شبنم کے دل نے گواہی دی تھی کہ صبا بیگم کی کہانی کا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی تھا لیکن وہ اپنے بدترین دشمن کی چھت کے نیچے کھڑے ہو کر زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کی وہ احتیاط رائگاں بھی نہیں گئی۔ شیخ حامد فوراً ہی دوسرے کمرے سے نکل کر سامنے آگیا تھا۔ پھر اس نے صبا بیگم کو دعوت میں بھی شریک ہونے سے روک دیا تھا۔

ایک بار گولی کان کے قریب سے نکل جانے کے بعد وہ اور محتاط ہوگئی تھی۔ اسے میڈم روبی سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں لیکن کسی اندرونی خوف کے پیشِ نظر اس نے خود کو صرف اپنے خول میں بند کرلیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ شیخ حامد نے واپسی کے لیے اسے ایک گاڑی فراہم کی تھی بلکہ بے حد سنجیدگی سے یہ بھی کہا تھا۔ ”تم میرے انتخاب پر پوری اتریں، یہ تمہاری خوش قسمتی بھی ہے۔ میں تمہیں اب اپنے کچھ خاص کاموں کے سلسلے میں موقع دیتا رہوں گا۔“

شیخ حامد کے وہ آخری جملے اس کی قوتِ سماعت میں اکثر گونجتے رہتے۔ وہ خود کو کسی غیر قانونی کاموں میں ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے شیخ حامد کے ہاں محض اپنی بدنصیب ماں اور بے قصور باپ کی دردناک اموات کا انتقام لینے کی خاطر ملازمت اختیار کی تھی، اسی منصوبے کے تحت اس نے افضل خان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن...... دفتر سے افضل خان کی مسلسل غیر حاضری نے اسے مزید چونکا دیا تھا، اسے اصل صورتِ حال کا علم بہت زیادہ نہیں تھا لیکن اس کا ذہن گواہی دے رہا تھا کہ خود افضل خان بھی شاید زیرِ عتاب آگیا ہے۔ شبنم نے کئی بار اس پہلو پر بھی غور کیا تھا کہ وہ خاموشی سے کوئی خوبصورت بہانہ تراش کر، ملازمت سے مستعفی ہو جائے اور میڈم روبی کے ساتھ مل کر اپنے انتقام کی خاطر کوئی نیا پلان تشکیل دے۔ ایک دو بار اس نے اپنا استعفیٰ لکھ بھی لیا لیکن بعد میں اسے ریزہ ریزہ کرکے تلف کر دیا۔ فوری طور پر وہ بگ باس کو ایسا موقع نہیں فراہم کرنا چاہتی تھی جو اس کی پوزیشن کو مشکوک کر دیتا۔

اس وقت بھی سوچ بورڈ پر پوری تندہی سے اپنے فرائض انجام دیتے وقت اس کے ذہن میں مختلف پلان ابھر رہے تھے جب اسے شیخ حامد کی سیکریٹری نے انٹر کام پر بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

”میں سب سے پہلے تمہیں اس بات پر مبارک پیش کروں گی کہ تم نے بگ باس کا اعتماد حاصل کرلیا ہے۔“

”جی...... !“ اس نے شپٹا کر کہا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”باس نے تمہیں ٹھیک دس منٹ بعد اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں طلب کیا ہے۔“ اس بار بھی چبھتے ہوئے انداز میں اسے بگ باس کا حکم سنایا گیا پھر سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

شبنم کے ذہن میں پھر خشک آندھی کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھی کہ بگ باس کی پسند اور ناپسند دونوں ہی اس کے حق میں خطرناک ہوسکتی تھیں، پانچ چھ منٹ تک وہ ذہنی الجھن میں مبتلا رہی۔ شیخ حامد کی سیکریٹری کا جملہ بدستور اس کے وجود میں ببول کے کانٹے کے مانند چبھ رہا تھا۔ ایک ایک منٹ اسے کوئی آخری

فیصلہ کر گزرنے پر اکسا رہا تھا، چھٹی حس میں کوئی نادیدہ خطرہ رہ رہ کر کلبلا رہا تھا پھر...... شبنم نے دل کڑا کرکے ایک آخری فیصلہ کرلیا...... کہ پہلی فرصت میں اس ملازمت سے کوئی خوبصورت بہانہ کرکے سبکدوش ہو جائے گی۔ ذہن کو پوری طرح علیحدگی پر آمادہ کرنے کے بعد اس نے وقتِ مقررہ پر ساؤنڈ پروف کمرے میں قدم رکھا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے شیخ حامد کے چہرے پر منڈلانے والے قہر و غضب کا بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ خاموشی سے نارمل رہنے پر خود کو سنبھالتے ہوئے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہو...... شبنم۔“ شیخ حامد نے گہری نظروں سے اس کے لباس...... اور لباس کے اندر روپوش جسمانی خطوط کے گراف کی لکیر کے ایک ایک نشیب و فراز...... اتار چڑھاؤ کو توجہ سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے اس کی خیریت دریافت کی۔ اس کے چہرے کا تناؤ بھی بتدریج کم ہونے لگا۔

”آپ کی نظرِ عنایت ہے سر...... !“ شبنم نے سنبھل کر جواب دیا۔

”میں نے تمہیں اس وقت ایسے مخصوص کام کے لیے بلایا ہے جو میرے خیال میں تم بڑی آسانی سے انجام دے سکتی ہو۔“

”میں خادم ہوں سر...... آپ کے لیے کوئی کام سرانجام دینا یقیناً میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے لیکن......“ شبنم نے کچھ کہنا چاہا لیکن شاید وہ بگ باس کا خوف ہی تھا جو الفاظ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔

”کم آن......“ شیخ حامد نے اس بار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ ”تم اگر چاہو تو مجھے باس کے بجائے اپنا ہمدرد یا دوست سمجھ کر بھی جو چاہو کہہ سکتی ہو۔ بات دل میں رہ جائے تو گھٹن کا احساس بھی شدت اختیار کرنے لگتا ہے۔“

”سر...... !“ شبنم نے دوبارہ اپنا مقصد بیان کرنے کی خاطر پیش بندی ضروری جان کر دبی زبان میں کہا۔ ”ادھر کچھ دنوں سے میں بہتر محسوس نہیں کر رہی ہوں...... شاید...... شاید مجھے آرام کی ضرورت ہے۔“

”اوکے۔“ شیخ حامد نے دریا دلی سے جواب دیا۔ ”تم سوچ بورڈ کا تھکا دینے والا کام کسی اور کو سونپ دو۔ اس کے علاوہ میں تمہیں آرام کرنے کی خاطر دس روز کی چھٹی بھی دوں گا۔ وہ بھی (With Pay)۔ میں نے جس کام کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے وہ تمہارے لیے دلچسپ بھی ہے اور ایڈونچرز بھی۔ دس روز کے دوران میں تم سے موبائل پر بھی رابطہ کرسکتا ہوں۔“ شیخ حامد نے کچھ توقف سے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں ایک موبائل اور سم بھی دوں گا جو کہیں کسی موبائل کمپنی کے رجسٹر پر درج نہیں ہوگی...... وجہ بھی سن لو، میں نہیں چاہتا کہ اپنے مخالفین کے پاس کوئی ثبوت چھوڑوں جو میرے خلاف کبھی استعمال ہوسکے...... انڈر اسٹینڈ۔“

”بھلا آپ کا کون مخالف ہوسکتا ہے؟“ شبنم نے بڑے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جملہ ادا کرتے وقت اس کے دل میں نفرت کا طوفان ٹھاٹیں مار رہا تھا۔

”تم نے ابھی تک کام کی نوعیت نہیں پوچھی......؟“ اس نے شبنم کو اس بار قدرے برہم نظروں سے دیکھا۔

”سر...... !“ شبنم نے ایک بار پھر کسمسا کر بڑی ہمت سے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جو کام مجھے سونپ رہے ہیں وہ کسی اور کو سونپ دیں اور...... اور......“

”اور کیا......؟“ شیخ حامد کے تیور بدلنے لگے۔ وہ کسی کا انکار یا مشورہ سننے کا عادی نہیں تھا۔

”م...... میں...... ملازمت سے ریزائن کرنا چاہتی ہوں۔“ شبنم نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھال کر کسی نہ کسی طرح اپنی خواہش ظاہر کردی۔ جواب میں شیخ حامد کے ہونٹوں پر ایک غلیظ مسکراہٹ پھیل کر گہری ہونے لگی۔

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ اس کا لب ولہجہ یک لخت سپاٹ ہوگیا۔

”آخری فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے سر......“ شبنم نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ ”میں تو صرف درخواست کرسکتی ہوں۔“

”اگر میں تمہاری درخواست رد کردوں تو......؟“ اس نے شبنم کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ میری درخواست پر......“

”سوری......“ شیخ حامد نے اس کا جملہ کاٹ کر بڑے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”تم اب اس پوزیشن میں بھی نہیں رہ گئی ہو کہ میری مرضی کے بغیر ریزائن بھیج کر گھر بیٹھ جاؤ۔“

”م...... میں سمجھی نہیں...... سر!“ شبنم نے چونک کر اسے وضاحتی نظروں سے دیکھا۔ کسی نادیدہ خوف سے اس کے وجود کے اندر اتھل پتھل بھی شروع ہوچکی تھی۔ جواب میں شیخ حامد نے دراز کھول کر ایک بڑے سائز کا بادامی انویلپ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا اور خود اٹھ کر اس عقبی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا جہاں سے وہ دور دور تک کے مناظر دیکھ سکتا تھا۔

"تم اب اس پوزیشن میں بھی نہیں ہو کہ میری مرضی کے بغیر ریزائن بھیج کر گھر بیٹھ جاؤ۔" شیخ حامد کے وہ جملے شبنم کے ذہن پر بجلی بن کر گرے تھے، اس جملے میں ایسا چیلنج تھا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے لفافہ کو کھول کر دیکھا تو دم بخود ہی رہ گئی۔ پہلی ہی تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کی آنکھیں بھی شرم سے جھک گئیں، ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ پھر اسے یاد آگیا کہ جس دن وہ دعوت کے بعد گھر پہنچی تھی تو اسے بڑی شدت سے نیند آرہی تھی۔ اپارٹمنٹ میں وہ تنہا رہتی تھی اس لیے اسے کسی کا خوف بھی نہیں تھا۔ چینج کرنے کی خاطر اس نے نائٹ سوٹ نکالا تھا، اوپر کا سامنے سے کھلا ڈھیلا ڈھالا ہلکی فراک پہننے کے بعد اس نے شلوار اتار کر ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہننا چاہا تھا لیکن نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ وہ بے سدھ ہوکر اپنے بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ صبح اٹھ کر پوری طرح چینج کرلے گی۔ اکیلے کمرے میں کون اس کی پرائیویسی کو دیکھے گا؟ اس نے لمبے فراک کے سامنے کے بٹن بھی بند نہیں کیے۔ بستر پر لیٹ کر اسے پنکھے کی ہوا لگی تو اس کو ٹھنڈک کا خوشگوار احساس ہوا تھا پھر وہ آنکھ بند کرتے ہی بے خبر ہوگئی تھی۔

شبنم کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد گول لاک کا پش بٹن دبا کر اسے اندر سے لاک کر دیا تھا لیکن ...... شاید شیخ حامد کے حکم پر اس کے کسی کارندے نے اپارٹمنٹ کی ڈپلی کیٹ چابی پہلے ہی سے تیار کرلی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ شرمناک تصویریں بھی اس کے سامنے نہ رکھی جاتیں۔ وہ زبان کھولنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہی تھی، استعفیٰ دینا تو دور کی بات تھی۔ اس نے نہ چاہنے کے باوجود کسی خیال سے ان چاروں سلسل بائی ایٹ سائز تصویروں پر نظر ڈالی۔ تصویر میں وہ ٹانگوں اور سینے کے اعتبار سے بالکل عریاں ہی نظر آرہی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ تنہا تھی ورنہ تصویریں اتارنے والا ہر پوز میں خود کو بھی اس کے ساتھ شامل کرسکتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ذہن کو ٹٹولا، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے صبح دفتر جاتے وقت گول لاک بہ ہوش وحواس کھولا تھا، لیکن اس کا ذاتی اعتماد تھا جو اسے کسی خطرناک سازش کا سراغ دے رہا تھا۔ کوئی اور ان مخرب اخلاق تصویروں کو دیکھتا تو اس کے وضاحتی بیان کی کوئی اہمیت نہ ہوتی...... نظریں جھکائے وہ اپنی پوزیشن کا صحیح تعین بھی نہیں کر پائی تھی کہ بگ باس کی پاٹ دار آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"ان تصاویر کے دوسرے پرنٹ اور نگیٹو میرے پاس تمہاری امانت کے طور پر محفوظ رہیں گے۔ گو کہ تم اب اس پوزیشن میں نہیں رہ گئی ہو کہ میں تمہیں کسی بات کا یقین دلاؤں لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ رعایت ہی کی ہے۔ جب تک تم میرے اشارے پر میرے لیے کام کرتی رہو گی، ان تصاویروں کے بارے میں ہر بات راز رہے گی۔ بصورت دیگر......"

"سر! م ... م ... میرا جرم کیا تھا؟" شبنم نے بڑی نحیف اور مردہ سی آواز میں دریافت کرنے کی جسارت کی۔

"قصور تمہارا بہت تو شاید ... " وہ کہتے کہتے رک کر بولا۔ "صبا بیگم کی زندگی کا راز ... اس کی وہ کہانی جو اس نے تمہیں سنانے کی غلطی کی تھی، اور وہ تمہارے ذہن میں پہنچ گئی۔ یہ تصویریں اس سلسلے میں تمہاری زبان پر قفل کا کام سرانجام دیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ خود صبا بیگم کو بھی زبان کھولنے کی ناقابل تلافی سزا بھگتنی پڑے، ممکن ہے کہ تم ہی اس کہانی کو مادی شکل میں اس کے آخری انجام تک پہنچاؤ ...... پھر ...... تمہاری ضرورت ختم ہو جائے گی لیکن اس سے پیشتر تمہیں میرے لیے کچھ ضروری کام بھی کرنے ہوں گے۔"

"وہ کیا......؟" شبنم نے دل کی دھڑکنوں پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی پوزیشن اب اس معصوم اور کمزور پودے سے مختلف نہیں تھی جو آندھی کی زد میں پوری طرح آگیا تھا۔ ایک تند جھونکا ہی اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔

شیخ حامد پلٹ کر میز پر آگیا۔ اس نے لفافہ اٹھا کر دراز میں ڈالا پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔

"ریڈینس کلب میں تمہارا آنا جانا بھی رہ چکا ہے؟"

"ہاں، میں انکار نہیں کروں گی۔"

"کبھی میڈم روبی سے ملی ہو...... یا...... ملنے کا کوئی اتفاق ہوا ہے؟" اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ اس کی عقابی نظریں شبنم کے چہرے پر مرکوز تھیں جو پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکی تھی۔

"میں میڈم کو جانتی ہوں...... ایک...... ایک بار اس کے گھر بھی جا چکی ہوں۔"

"گڈ......" شیخ حامد کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پورے طمطراق سے ابھری۔ "تمہیں سارے کام چھوڑ کر میڈم روبی سے دوستی بڑھانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ جو چاہو جواز پیش کرو لیکن اسے اس طرح اپنے اعتماد یا اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کرو کہ وہ تمہیں اس دنیا میں سب سے قابل اعتماد سمجھنے لگے۔" اس نے ایک لمحے کے بعد بڑے خونخوار لہجے میں کہا۔ "یہ میری درخواست نہیں، میرا حکم ہے، شیخ حامد کا حکم ہے۔ شیخ حامد کا حکم جسے ٹالنے کا انجام تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔"

"میں ویسا ہی کروں گی جیسا آپ چاہیں گے لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا بات ہے؟ جو چاہو کھل کر کہو۔" اس بار شیخ حامد نے پینترا بدل کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"میں دو بات کی درخواست کروں گی۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں اس طرح کہا جیسے آہنی سلاخوں کے پیچھے مقید کوئی قیدی ہٹلر جیسے بے رحم اور درندہ صفت ظالم سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ "میں اپنی بربادی پر موت کو ترجیح دینا پسند کروں گی اگر آپ نے......"

"فکر مت کرو۔" شیخ حامد نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "میں خود بھی نہیں چاہوں گا کہ تمہارے پھول جیسے نازک مگر مہکتے جسم کو کوئی پامال کرے، مگر اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا...... اور کچھ؟"

"میڈم کی مالی حیثیت سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ اس کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی خاطر کرائے کی گاڑیوں کے اخراجات......"

"تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال کیا گیا۔

"جی ہاں...... ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے، میں نے شوقیہ ڈرائیونگ سیکھنے کی خاطر ایک ڈرائیونگ اسکول سے......"

"فکر مت کرو۔ تمہارے لیے ایک گاڑی کا بندوبست کر دیا جائے گا۔"

"سر......" شبنم نے ہمت کرکے مردہ سی آواز میں پوچھ ہی لیا۔ "کیا کام مکمل ہوجانے کے بعد آپ مجھے باعزت طور پر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد کر دیں گے؟"

"یہ حالات پر منحصر ہے، مگر اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ اگر کبھی تم نے مجھے ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی تو پھر اس کا انجام بھی اچھا نہیں ہوگا۔"

وہ خاموش بیٹھی دل کی دھڑکنوں کو شمار کرتی رہی، جس دلدل میں وہ پھنس چکی تھی اس کا صرف ایک ہی علاج تھا۔ بگ باس کی موت!...... لیکن اس سوچ کو انجام تک پہنچانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ خاصی دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھی شیخ حامد کی طرف سے دی جانے والی ہدایات ذہن نشین کرتی رہی پھر...... جانے کے لیے لرزتے قدموں پر بہ مشکل کھڑی ہوئی تو بگ باس نے بڑے ٹھوس لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "ایک بات غور سے سن لو...... میرے نادیدہ ہاتھ، کان اور آنکھیں تمہاری ایک ایک حرکت کو کسی حساس کلوز سرکٹ کیمرے کی طرح واچ کرتے رہیں گے...... تم اپنے اپارٹمنٹ کے بند کمرے میں بھی بستر پر لیٹ کر سانس لوگی تو وہ بھی مجھے سنائی دیتی رہے گی۔"

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دے کر اس کی بات سننے اور سمجھنے کا اقرار کیا پھر سر جھکائے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ذہن میں گرم لو کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔

☆☆☆

سفید فام، دراز قد اور خوبصورت شکل کا مالک ڈوما جس کا تعلق بیروت سے تھا اس وقت ایک پرسکون ساحلی علاقے میں اپنی حسین، بے باک اور گداز جسم کی مالک گرل فرینڈ میرینا کے ساتھ کرائے پر حاصل کردہ ہٹ کے اندر زندگی کی لذتوں سے اپنے طور کا لطف کشید کر رہا تھا۔ دونوں کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز برائے نام بھی نہیں تھی۔ وہ جس تہذیب سے تعلق رکھتے تھے وہاں برہنگی اور جسم کی نمائش کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ امریکا کے ایک نائٹ کلب میں بیلے رقص کا ہیجان انگیز مظاہرہ کرنے والی ہر شو میں اپنا آئٹم ختم کرنے سے دو منٹ پہلے اپنے جسم سے اس مختصر زیر جامہ کو بھی اتار کر تماش بینوں کی طرف اچھال دیتی تھی جو برائے نام ہی اس کے مخصوص حصوں کو تماش بینوں کی للچائی ہوئی نظروں سے پوشیدہ رکھتا تھا۔ بس آخری دو منٹ کے وقت ہال میں بیٹھے ہوئے افراد کھڑے ہوکر سیٹیاں بجانا شروع کر دیتے...... پھر میرینا ان کے دلوں پر بجلیاں گراتی، فضا میں انگلیوں کے اشارے سے بوسے اچھالتی، لہراتی بل کھاتی اسٹیج سے چلی جاتی تھی۔ شور اس کے جانے کے بعد بھی جاری رہتا پھر لوگوں کی رگوں میں دوڑتے اور جوش مارتے خون کی گردش بہ تدریج کم ہوتی تو وہ شراب وکباب میں مگن ہوجاتے تھے۔

فضائی سفر کے دوران سیاہ فام ہاشم نے بھی تیسرے مسافر لوچن سے اس کے بارے میں یہی کہا تھا کہ...... "ڈوما نے طے شدہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کو بھی پہلے جہاز سے خاموشی سے روانہ کر دیا ہے۔" لڑکی کا نام دریافت کرنے پر اس نے چینی باشندے اور مارشل آرٹ کے ماہر سے یہ بھی کہا تھا...... "ہاں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا تعلق امریکا کے ایک نائٹ کلب سے ہے۔"

پھر اس نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا تھا ...... ''لڑکی خاصی نمکین ہے، مگر میرا تجربہ کہتا ہے کہ نمک کی زیادتی کبھی کبھی زہر سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔''

اس وقت ڈوما شراب کے نشے میں بدمست میرینا کے اسی نمکین جسم سے سیراب ہو رہا تھا جب اس کے مخصوص موبائل نے وائبریٹ کرنا شروع کیا۔ دوسرے ہی لمحے ڈوما نے میرینا کو انگلی ہونٹ پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر موبائل آن کر کے کہا۔

''یس ...... ڈوما ہیئر ......!''

''سیون اسٹارز'' دوسری جانب سے ایک بھرائی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ ڈوما ایک ثانیے کو چونکا۔ ''سیون اسٹارز'' کے کوڈ کا حوالہ دینے والی موجودہ نسوانی آواز اور اندازِ تخاطب ان دو کالوں سے مختلف تھا جو وہ پہلے سن چکا تھا۔

''آپ کی آواز مجھے بدلی بدلی محسوس ہو رہی ہے ......'' اس نے اپنی ذہانت اور شبہے کا اظہار کیا۔

''فائن ......'' جواب میں کہا گیا۔ ''تمہاری میموری یقیناً قابلِ رشک ہے لیکن تمہیں صرف یہ ہدایت ملی تھی کہ تمہیں سیون اسٹارز کے کوڈ کے حوالے سے جو بھی حکم دیا جائے اس پر عمل کرنا ضروری ہے ...... بدلی ہوئی آواز یا عورت اور مرد کی آوازوں کے چکر میں الجھنے کی کوشش دوبارہ نہ کرنا ......''

''اوکے ...... فائن۔'' ڈوما نے شانے اچکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔ اس کی بے تاب نظریں اس وقت بھی میرینا کے گداز جسم کے نشیب و فراز پر منڈلا رہی تھیں جو بستر پر خاص اسٹائل سے لیٹی سگریٹ کا دھواں اڑا رہی تھی۔

''تم نے بنگالی پاڑے میں جس طرح بھیس بدل کر اور شاطرانہ انداز میں ان دو مطلوبہ افراد کو ٹھکانے لگایا وہ ہمیں پسند آیا۔ اس کے لیے تمہیں پانچ ہزار ڈالرز بطور انعام علیحدہ سے دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے، رقم تمہیں کسی طرح تمہارے ہوٹل کے کمرے تک پہنچا دی جائے گی ...... ہم اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں اور طے شدہ معاہدے پر عمل کرنے والوں کو ہمیشہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔''

''تھینکس ......'' ڈوما نے میرینا کو دیکھ کر بائیں آنکھ جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''اپنی ماہرانہ صلاحیتوں اور کارکردگی کی وجہ سے ابھی تک قانون کے آہنی ہاتھ میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔''

''اسی رپورٹ کے بعد ہی تمہیں بھاری اور منہ مانگے معاوضے پر انگیج کیا گیا ہے لیکن ...... ضرورت سے زیادہ چالاکی بھی کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔''

''میرے لیے کوئی اور حکم ......؟'' ڈوما نے آخری جملہ دوسرے کان سے اڑاتے ہوئے سوال کیا۔

''تم اس وقت کہاں اور کس کے ساتھ ہو ......؟'' اس بار بے حد سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔

''میں سمجھا نہیں ......'' ڈوما نے ہچکچانے کی کوشش کی۔ اس کی نگاہیں میرینا پر جم کر رہ گئی تھیں، سوال کی نوعیت بھانپنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی، اسے اپنی پلاننگ کا یقین تھا جو کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

''میں سمجھاتی ہوں ......'' دوسری جانب سے تحکمانہ انداز اختیار کیا گیا۔ ''تم نے جو معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اسے چوبیس گھنٹے کے اندر پہلی فلائٹ سے خود سے دور کر دو ...... کیا مجھے مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟''

''آئی ایم سوری لیکن ......'' ڈوما نے بوکھلا کر کہا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ جملہ مکمل کرتا، دوسری جانب سے زیادہ سرد لہجے میں کہا گیا۔

''نو آرگومنٹس ...... چوبیس گھنٹے کی مہلت بہت ہے ...... دوسری شکل میں مجھے جو طریقہ اختیار کرنا پڑے گا وہ شاید تمہارے اور تمہاری گرل فرینڈ دونوں ہی کے لیے انتہائی ذلت آمیز ہو ...... یہ تمہارے لیے سیون اسٹارز کی طرف سے پہلی اور لاسٹ وارننگ ہے ...... بائی۔''

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ ڈوما نے میرینا کی طرف دیکھا جو اس کے انتظار میں سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر فضا میں چھوڑ رہی تھی۔ ڈوما نے طے کر لیا تھا کہ وہ سیون اسٹارز کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرے گا لیکن وہ اس آخری لمحے میں بھی میرینا کے ساتھ انجوائے کرنے کی خواہش کو دل سے نہیں نکال سکا۔

☆☆☆

افضل خان ہوش میں آچکا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے اب بھی خطرے سے باہر قرار نہیں دیا تھا، اس وقت بھی نیم غنودگی کی کیفیت سے دوچار بستر پر پڑا بری طرح کراہ رہا تھا، ڈاکٹروں کی ماہرانہ رائے تھی کہ اغوا کرنے والوں نے اس پر جو شدید تشدد کیا تھا اس کے اندرونی اثرات کو ختم ہونے میں دو تین ہفتے اور بھی لگ سکتے تھے۔

سراج، شیخ حامد کی متوقع آمد سے خاصی دیر قبل اسپتال پہنچ گیا تھا، اس نے سادہ لباس والوں کو بھی خاص طور پر بہت زیادہ محتاط رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ اس وقت وہ

افضل خان کے کمرے میں تنہا ہی تھا، ڈیوٹی نرس کو اس نے کچھ دیر کے لیے باہر بھیج دیا۔ وہ افضل خان سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنے کا خواہش مند تھا۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' اس نے افضل خان کی نگاہوں میں دور تک جھانکتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''زندگی سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔'' افضل خان نے نقاہت سے جواب دیا۔ ''آپ اس وقت ایسی پوزیشن میں ہیں کہ میری مشکل دور کر سکیں۔''

''کوئی خاص فرمائش؟''

''ہاں ......'' افضل خان نے کرب کو چھپاتے ہوئے دبے لہجے میں جواب دیا۔ ''ڈاکٹر سے کہیں کہ ایک آخری انجکشن لگا کر مجھے اس اذیت سے نجات دلا دے جو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔''

''اس کی فرمائش تم اپنے بگ باس سے بھی کر سکتے ہو۔'' سراج نے طنز کیا۔ ''وہ کچھ دیر میں تمہاری خیریت دریافت کرنے کی خاطر آنے والا ہے، تم نے کبھی اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس کی خاطر زندگی داؤ پر لگاتے رہے۔ اب ایک فرمائش کرنا تو تمہارا حق بھی بنتا ہے۔''

افضل خان نے جواب میں ہونٹ بھینچ لیے، وہ سراج کے جملے کی گہرائی کو سمجھ کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ وہ میڈم کے بدن کو روند کر اس کی مووی اور تصاویر بنا کر باس کی خدمت میں پیش کر دیتا تو اس کی حیثیت میں چار چاند لگ جاتے۔ اس نے جو پلاننگ کی تھی اس میں ناکام بھی نہیں رہا تھا۔ میڈم نے سیل بند بوتل منگا کر اپنی دوراندیشی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید بھول گئی تھی کہ شیخ حامد کا دستِ راست ہونے کے سبب اس کے لیے کوئی بات ناممکن نہیں تھی۔ اس نے تاج محل ہوٹل کے بارٹینڈر سے مل کر پہلے ہی سے عورتوں کی پسند کی کچھ مخصوص اب کی ایسی سیل بند بوتلیں بھی تیار کرا لی تھیں جن میں بے ہوشی کی دوا شامل تھی۔ میڈم اس کے جال میں پوری طرح پھنس گئی تھی۔ بے ہوشی کے عمل کے دوسرے اسٹیج میں پہنچنے کے بعد اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کسی دلدل میں پھنس چکی ہے، اس نے افضل خان کو اپنے رعب میں لینے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ بھی پرانا، تجربہ کار اور گھاگ شکاری تھا، میڈم کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر مسہری تک لے گیا تھا لیکن ...... اٹھانے میں اس سے تاخیر ہو گئی، اسے امید نہیں تھی کہ اچانک بلیک ٹائیگر کی کال اس کے رنگ میں بھنگ ڈال دے گی ...... پھر جو کچھ ہوا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

بلیک ٹائیگر کے خطرے سے آگاہ کرنے کے فوراً ہی بعد وہ چور راستے سے نکل گیا تھا۔ وہ میڈم کو دبوچنے کی لالچ میں خود دبوچ لیا گیا تھا۔ اسے ناقابلِ برداشت حالات میں رہنا پڑا۔ انعام کے بجائے وہ بگ باس کے عتاب کا شکار ہو گیا پھر اسے جس حالت میں کچرا کنڈی سے اٹھایا گیا تھا وہ بھی اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کیفیت کو وہ فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

''اب کیا سوچ رہے ہو ......؟'' سراج نے اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''میں ...... میں غلطی پر تھا۔'' اس نے ہونٹ چباتے ہوئے بڑی اذیت سے کہا۔ ''اسی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔''

''بہت جلدی احساس ہو گیا ......''

''پلیز مسٹر سراج!'' اس نے شرمندگی کا اظہار کیا۔ ''آپ اگر مجھے کانٹوں میں گھسیٹنے کے بجائے میری مشکل آسان کرا دیں تو میں اور میری روح دونوں ......''

باہر سے کچھ آوازیں ابھریں۔ نرس دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو افضل خان نے خاموشی اختیار کر کے آنکھیں بند کر لیں، سراج بھی نرس کے قریب جا کر اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے افضل خان کی کیفیت کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہو۔

دو منٹ بعد شیخ حامد نے کمرے میں قدم رکھا تو سراج نے نہ چاہنے کے باوجود ڈی آئی جی کرائمز کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ شیخ حامد اس کا ہاتھ بے تکلفی سے تھام کر افضل خان کے قریب آ گیا جس نے مجبوراً آنکھیں کھول دی تھیں لیکن ان آنکھوں میں زندگی کی امنگ دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیخ حامد کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے براہِ راست ہاتھ کے اشارے سے نرس کو باہر بھیج دیا۔ سپاٹ آواز میں افضل خان سے مخاطب ہوا۔

''میں تمہیں زندگی کی طرف واپس لوٹ آنے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

''تھینکس ...... باس۔'' افضل خان نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

''کیا پولیس تمہارا بیان لے چکی ہے؟''

''جی ہاں ......'' افضل خان کے بجائے سراج نے کہا۔ ''بیان کی روشنی میں کسی ایسی پارٹی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا جو اغوا برائے تاوان کی لسٹ پر موجود ہیں۔''

"پھر......" اس نے افضل خان کے چہرے سے نظر ہٹا کر سراج کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "پولیس نے پھر نہ کچھ تو ضرور سوچا ہوگا۔"

"ابھی صرف امکانات پر غور کیا جا رہا ہے۔" سراج کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ "ابھی کوئی حتمی رائے نہیں قائم کی جا سکی۔"

"میں آپ سے بعد میں باتیں کروں گا۔" شیخ حامد نے کھردرے انداز میں جواب دیا پھر اس کی نظریں دوبارہ افضل خان کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں، سیدھا ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔ چند لمحے وہ افضل خان کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا پھر اس نے ہاتھ جیب سے باہر نکال لیا۔ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میری اطلاع کے مطابق تمہیں تاج محل ہوٹل سے فرار ہونے کے بعد اغوا کیا گیا تھا۔ یہ بھی تمہاری خوش نصیبی ہی ہے ورنہ جس انداز میں تمہارے اپارٹمنٹ کو تہس نہس کیا گیا اس طرح وہ تمہیں بھی روسٹ کر دینے کے موقعے کو شاید ضائع نہ کرتے۔"

افضل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بگ باس جیسے خطرناک آدمی کے سامنے وہ اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"میڈم روبی کو تم تاج محل ہوٹل میں کیوں لے گئے تھے...؟" شیخ حامد نے کسی سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے سوال کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مسٹر سراج نے اگر میرے خیال سے معاملے کو نہ سنبھال لیا ہوتا تو تمہاری حماقت سے میری کاروباری ساکھ بھی متاثر ہو سکتی تھی۔"

"آئی...... ایم سوری باس۔" افضل خان نے دل پر جبر کر کے کمزور لہجے میں جواب دیا۔

"عیاشی کے لیے تمہیں کیا ایک مجبور بیوہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ملا تھا......؟" شیخ حامد کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔ "تم یہ بھی بھول گئے کہ میرے بزنس گروپ میں تمہاری حیثیت کیا ہے۔"

افضل خان بدستور خاموش رہا۔ شیخ حامد کچھ دیر اس سے ایسے ہی سوالات کرتا رہا جو اس کے مطلب کے تھے، جن کے جوابات اور...... افضل خان کی خاموشی دونوں یہی ظاہر کرتی تھیں کہ افضل خان نے جو کچھ کیا اور اس کا نتیجہ بھگتا وہ اس کی ذاتی بے پروائی تھی۔ شیخ حامد کا اس سے دور کا بھی سروکار نہیں تھا۔ سراج کو اس طفلانہ "شو آف" کی توقع نہیں تھی۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے......؟" شیخ حامد نے بڑے سرد لہجے میں سوال کیا۔ "کیا اب بھی تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکو گے؟"

"پلیز مسٹر حامد......!" سراج چپ نہ رہ سکا۔ ایک اچٹتی نظر افضل خان کے چہرے پر ڈالتے ہوئے شیخ حامد سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ افضل خان کو جو سزا مل چکی ہے وہی کافی ہے۔"

"یہ آپ کا ذاتی خیال ہے لیکن میں اس شخص کو دوبارہ بحیثیت بزنس منیجر کے عہدے پر قبول کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اس کے باوجود آپ اس کی سرپرستی سے منہ بھی نہ پھیریں۔" سراج نے دل پر جبر کر کے کہا۔ "میں آپ کے فیصلے سے متفق ہوں لیکن میرا ذاتی خیال ہے افضل خان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دینا بھی...... " سراج نے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"فی الحال میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کر سکتا البتہ آپ کی سفارش پر غور ضرور کروں گا۔"

"تھینکس......!" سراج نے اس بار اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ شیخ حامد کے پینٹ کے سیدھے ہاتھ کی جیب میں چھپا کوئی حساس ٹیپ ریکارڈ تمام گفتگو کو ریکارڈ کر رہا تھا۔

افضل خان میڈیم کی کیبن...... دوچار تھا۔ شیخ حامد کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد ہی اس نے سکون کا گہرا سانس لیا تھا۔ سراج بھی شیخ حامد کے ساتھ ساتھ تھا۔ کمرے کے باہر ...... شیخ حامد کے ...... وہ لباس والے گارڈ بھی نظر آئے۔ شیخ حامد سراج سے باتیں کرتے ہوئے اپنی کار تک آیا۔ ڈرائیور نے تیزی سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔

"تم دوسری گاڑی میں آنا......" اس نے ڈرائیور کو حکم دیتے ہوئے سراج کی طرف دیکھا۔ "مجھے اس وقت ڈی ایس پی صاحب سے اکیلے میں کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

اشارہ بہت واضح تھا، سراج مسکرا دیا پھر اس نے اگلی نشست پر بیٹھنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کیا، شیخ حامد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

گاڑی اسپتال کے کمپاؤنڈ سے نکل کر ساحلی علاقے کی طرف موڑ دی گئی۔ سراج نے گفتگو کی ابتدا نہیں کی۔ دس منٹ تک مکمل خاموشی رہی پھر شیخ حامد نے بڑی سنجیدگی سے پہل کی۔

"مسٹر سراج...... آپ کو شاید علم ہوگا کہ آپ کے ڈی آئی جی کرائمز نے ذاتی بنیادوں پر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے؟"

"جی ہاں...... یہ بھی خبر گرم ہے کہ اس کرسی پر ایس پی آغا منظور کی تعیناتی کی سفارش کی گئی ہے۔"

"سفارش والی بات آپ نے غلط نہیں سنی......" شیخ حامد نے ٹھوس آواز میں کہا۔ "یہ بھی بتا دوں کہ سفارش میں نے ہی کی ہے۔ دو روز کے اندر آرڈر بھی آ جائیں گے۔"

"فائن......" سراج نے خوشی کا اظہار کیا، اس وقت بھی اس کے ذہن میں "سب میرین" کی اہمیت والی بات گونج رہی تھی۔

"میں تاج محل ہوٹل والے معاملے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں...... اصل صورتِ حال اگر اخباری نمائندوں کے ہاتھ لگ جاتی تو......"

"مجھے اس بات کا احساس تھا۔" سراج نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "ایک لاکھ کی رقم ابھی تک مجھ پر قرض ہے۔"

"فارگیٹ دیٹ......" شیخ حامد مسکرا کر بولا۔ "میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ دوستوں کا احساس دل میں ہوتا ہے لیکن، کچھ باتیں ہیں جن کے بارے میں اب کھل کر بات کرنا ضروری ہو گئی ہے۔" آخری جملہ سنجیدگی سے ادا کیا گیا۔

"میں آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں۔" سراج نے سنبھل کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "اگر آپ کا اشارہ فریشان ہوٹل والے آپریشن کی طرف ہے تو وہ میری مجبوری تھی...... اس کی تمام تر پلاننگ ڈی آئی جی کرائمز نے کی تھی......" اس نے بات جاری رکھی۔ "اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کو اس کی خبر بھی ضرور ہوگی، ان دونوں نے زبان کھولنے کے بجائے موت کو ترجیح دی تھی...... بعد میں ہمارا تعاقب کرنے والی نیلی کار کو بھی مسٹر علیم احمد کے حکم پر ہی ڈسپوز کیا گیا تھا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ کو اس کا علم بھی ضرور ہوگا۔"

"بنگالی پاڑے سے پولیس کو دو مطلوبہ مجرموں کی لاشیں ملی تھیں۔" سراج نے بے پروائی سے کہا۔

"ان کے بارے میں پولیس کو کہاں سے معلومات ملی تھیں؟" شیخ حامد نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

"آئی ڈونٹ نو......" سراج نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "...... نے ...... کیا؟ فی الحال میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا میں آپ کی بات پر یقین کر لوں......؟" اس بار شیخ حامد کے سوال میں چبھن بہت واضح تھی۔

"ایز یو وش......" سراج نے مسکرا کر شیخ حامد کو مخاطب کیا۔ "بحیثیت ایک پولیس آفیسر کے ہم دیدہ و دانستہ قانون کی نظروں میں دھول بھی نہیں جھونک سکتے...... تعاون ایک حد تک کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے آنکھ بند کر کے ایک دوسرے پر اعتماد کرنا بھی شرط ہے۔"

شیخ حامد ایک پل کو تلملا کر رہ گیا لیکن فوراً ہی اس نے کینچلی بدلنے میں دیر بھی نہیں کی۔

"میڈم روبی کے سلسلے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟ کیا وہ میرے مقابلے پر آنے کی حماقت کر سکتی ہے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا......" سراج نے شانے اچکا کر کہا پھر کھوجتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "آپ کو اس بات کا شبہ کیوں ہو رہا ہے کہ میڈم ہی......؟"

"سوری......" شیخ حامد نے بے حد ٹھوس آواز میں کہا۔ "میں ہر بات کا جواب دینا پسند نہیں کرتا لیکن فی الحال جو دھند طاری ہے، اس کو چھٹنے میں زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔"

"افضل خان کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" سراج نے میڈم کا موضوع بدل دیا۔ "میری ذاتی رائے ہے کہ اسے اہم ذمے داری نہ دیں مگر ایک موقع تو ضرور دیا جا سکتا ہے۔"

"میں آپ کو ابھی تک دوست سمجھ رہا ہوں اس لیے آپ کی بات نہیں ٹالوں گا مگر ایک بات کھل کر واضح کر دوں...... میں ڈبل کراس کرنے والوں کو نظر انداز کرنے کا عادی نہیں ہوں...... ان کو اپنے اشاروں پر چلانے کی ٹرکس (Tricks) بھی جانتا ہوں۔"

"گڈ......" سراج نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "کسی بھی انسان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ موقعے کی مناسبت سے اپنے کارڈز استعمال کرے۔" وہ شیخ حامد کے جملے میں کھلی ہوئی وارننگ کو بھانپ گیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک شیخ حامد اور سراج کے درمیان اسی قسم کی ذو معنی گفتگو ہوتی رہی پھر سراج کو دوبارہ اسپتال پر ڈراپ کرنے کے بعد وہ گاڑی کا اسٹیئرنگ ڈرائیور کے حوالے کر کے پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ سراج نے اس وقت بھی بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا تھا، شیخ حامد کا انداز بھی دوستانہ تھا لیکن...... گاڑی اسپتال کے احاطے سے باہر نکلی تو

اس کے چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہو گئے۔ نشست کی پشت سے سر ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں...... ذہن سراج کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنے کے سلسلے میں شیطانی انداز میں تانے بانے بن رہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر کے مشورے کے باوجود لیاقت حسین نے اسپتال میں پڑے رہنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اسے وہاں ہر قسم کی سہولت حاصل تھی لیکن وہ آرام طلبی کا عادی نہیں تھا۔ نوشہرہ میں بھی جب وہ بیمار پڑتا تو ماں فوری طور پر ڈاکٹر کو طلب کرتی۔ ڈاکٹر سردار سرفراز خان کی بڑی حویلی کا نام سنتے ہی دوڑے چلے آتے تھے۔ ماں اسے اپنے شفیق ہاتھوں سے دوا پلاتی تو وہ اکسیر ثابت ہوتی۔ مارے باندھے وہ گھنٹے دو گھنٹے بستر پر لیٹتا پھر اپنے کاموں میں جت جاتا، اس کے سنگی ساتھی بھی یہی کہتے تھے کہ بیماری کو بستر پر لیٹ کر پالو گے تو وہ کمزوری کم کرنے کے بجائے جسم کو اور کھلا دے گی، ہاتھ پاؤں حرکت میں رہیں تو بیماری خود پیچھا چھڑا کر بھاگ جاتی ہے، لوہے کی بھی یہی خاصیت ہوتی ہے، وہ استعمال میں رہے تو اس کی کارکردگی متاثر نہیں ہوتی، دھوپ اور پانی میں پڑا رہے تو زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ ایک بار لوہے کو زنگ یا کسی میٹھے پھل کو پھپھوند لگ جائے تو پھر وہ اپنی اصلیت کھو دیتا ہے۔ لیاقت حسین بھی اسی ماحول میں پل کر بڑا ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی ساری باتیں ایک کان سے سنیں، دوسرے سے اڑا دیں۔ وہ حرکت میں برکت کا قائل تھا۔

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اس کے ممنون احسان تھے، انہوں نے بھی اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تو لیاقت حسین کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔

سیٹھ عثمان نے جو نئی گاڑی خریدی تھی وہ پہلے والی کے مقابلے میں زیادہ قیمتی اور پاورفل تھی۔ اسی کمپنی کی لینڈ کروزر لیاقت حسین کے باپ کے پاس بھی تھی۔ اسپتال سے فارغ ہو کر وہ باہر آیا تو نئی چمچاتی گاڑی دیکھ کر اسے بہت ساری بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں، ماں کا لاڈ پیار، باپ کی شفقت کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کے خود ساختہ اصول جس کی وجہ سے اسے گھر چھوڑنا پڑا تھا اور فرحین کا خوبصورت اور معصوم سا چہرہ بھی جس نے لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کر اس کی محبت کا مان رکھ لیا تھا، وہ آخری جملے بھی اس کے کانوں میں گونجنے لگے جو ماں نے اسے نوشہرہ کو خیر باد کہتے ہوئے بڑے پیار سے کہے تھے۔

"خدا تم کو اور فرحین کو زندگی کی ڈھیر ساری خوشیاں نصیب کرے۔ ماں کی دعائیں بھی تمہارے ساتھ جاری ہیں، کبھی خود کو تنہا نہ سمجھنا، ماں کا سایہ ہر گھڑی، ہر پل تم دونوں کے ساتھ رہے گا۔ رب سے میری دعا ہے کہ تم نئی زندگی کے سفر میں اتنی ترقی کرو کہ تمہارے پاس ہمیشہ خدا کی ہر نعمت موجود ہو، کبھی تنگی اور ترشی تمہارے آڑے نہ آئے۔ پھولو، پھلو آباد رہو۔"

یہ ماں کی دعاؤں ہی کا نتیجہ تھا کہ کراچی آتے ہی اس کے دن پھر گئے تھے۔ کچھ دن اس نے قبرستان کے ساتھ بنے مکان میں گزارے تھے۔ وہاں اسے کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔ گل خان اور راحیلہ نے اسے یا فرحین کو اپنے آبائی شہر سے دور ہونے کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا تھا لیکن ایک بدکار ستلی کا عمل کرنے والا ضرور ان کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا۔

اسپتال سے باہر نکل کر وہ نئی گاڑی کے پاس آ کر رک گیا، اس نے بڑے پیار سے گاڑی کو دیکھا، سیٹھ عثمان کو مبارک باد دی پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا تو سیٹھ عثمان نے اسے آرام کی خاطر روکنا چاہا لیکن راحیلہ بیگم نے ان کا ہاتھ تھام لیا، انہیں لیاقت حسین کے چہرے پر دکھی خوشی کا احساس تھا۔ اسے گاڑی چلانے سے روکا جاتا تو شاید اسے دکھ ہوتا۔

لیاقت حسین نے اگنیشن میں لگی چابی گھمائی تو نئی کار یکدم ہی اسٹارٹ ہوئی، اس کا دل مسرت سے جھوم اٹھا۔ نوشہرہ میں جب وہ باپ کو ایسی طاقت ور اور قیمتی گاڑی چلاتے دیکھا کرتا تو اس کے دل میں بھی ارمان مچل جاتے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کبھی باپ کی طاقتور اور منہ زور گاڑی کو اپنی مہارت سے زیر کرے لیکن اس کی حسرت کبھی پوری نہ ہو سکی۔ آج ماں کی دعاؤں سے وہ ارمان بھی پورے ہو رہے تھے۔ وہ بڑی احتیاط سے جانے پہچانے راستوں سے گزرتا رہا، فرحین اس کے ساتھ ہوتی تو وہ بھی خوش ہو جاتی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید فرحین کو بھی کسی نہ کسی طرح اس کے حادثے کی اطلاع مل چکی ہوگی۔ وہ بھی ادھر بے چین ہوگی۔ ماں کے دل سے بھی اولاد کے حق میں دعاؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا ہوگا اور اب...... اب جب اسے لیاقت کے تندرست ہونے کی اطلاع ملے گی تو وہ سب سے پہلے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر دو رکعت شکرانے کی ضرور پڑھے گی۔ فرحین کے دل کی بے چین دھڑکنوں کو بھی قرار مل جائے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو لیاقت حسین؟" راحیلہ بیگم نے جو

اپنی دوربین نظروں سے لیاقت حسین کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں چپ نہ رہ سکیں۔ "کیا گھر والے یاد آ رہے ہیں؟"

"ہاں......" لیاقت حسین نے دبی زبان میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ "سوچ رہا ہوں کہ اب فرحین کو واپس بلا لوں۔ اسے کسی نہ کسی ذریعے سے میری بیماری کی اطلاع مل گئی ہوگی...... وہ...... وہ بھی بے چین ہوگی۔"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔" سیٹھ عثمان نے کہا۔ "تمہارے گھر کے پاس پڑوس میں کوئی نہ کوئی فون تو ضرور ہوگا۔ تم نمبر بتا دو۔ میں ابھی گھر چلتے ہی تمہاری صحت یابی کی خوش خبری سنا دوں گا۔"

سیٹھ عثمان کی فراخدلی اور سردار سرفراز خان کے اصول دونوں بیک وقت لیاقت حسین کے ذہن میں ابھرے تو وہ دہلا سا ہو گیا۔ لیاقت بتا کر بولا۔

"مجھے ایسا کوئی نمبر یاد نہیں ہے ورنہ ضرور بتا دیتا۔"

"فکر مت کرو...... گھر پہنچتے ہی خط لکھ کر پوسٹ کر دو۔" راحیلہ بیگم نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو گہری نظروں سے دیکھ کر بڑی فراخدلی سے کہا۔ "تم چاہو تو فرحین کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کو بھی بلا لو۔ وہ بھی خوش ہوں گے۔"

"یہ بھی لکھ دوں گا۔" لیاقت حسین نے دل مسوس کر جواب دیا۔ اس کی دلی تمنا بھی تھی کہ ماں کچھ دنوں کو آ کے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ اس کی دعاؤں نے اس کے لیاقت حسین کو کس طرح نوازا ہے لیکن...... وہ جانتا تھا کہ ماں اپنے سہاگ کو ناراض نہیں کرے گی اور سردار سرفراز خان کبھی اپنی اونچی پگ نیچی نہیں ہونے دے گا۔ اس کے علاوہ، وہ سیٹھ عثمان پر اپنے والد کی حیثیت بھی نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

لیاقت حسین نے گاڑی سیٹھ عثمان کے خوبصورت بنگلے کے سامنے روکی تو راحیلہ بیگم نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔ "یہ تم نے گاڑی کہاں روک دی؟"

لیاقت حسین ایک پل کے لیے گھبرا سا گیا پھر اس نے کسی خیال سے پوچھا۔ "کیا آپ لوگوں نے گھر بھی بدل دیا ہے؟"

"نہیں......" راحیلہ بیگم نے اپنائیت سے جواب دیا۔ "آج ہم نے تمہاری انیکسی کا افتتاح کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔"

لیاقت حسین نے برابر کے بنگلے پر نظر ڈالی تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ سیٹھ عثمان کا پرانا اور قابل اعتماد گارڈ نئے بنگلے کے گیٹ کے سامنے موجود تھا، لیاقت حسین نے گاڑی کا رخ نئے بنگلے کی طرف کیا تو گارڈ نے بڑی مستعدی سے پھاٹک کھول دیا۔ راحیلہ بیگم کے حکم کے مطابق اس نے گاڑی بنگلے کی انیکسی کے سامنے لے جا کر روک دی۔ اسے بتایا جا چکا تھا کہ اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اسے فرحین کے ساتھ وہیں قیام کرنا ہے۔ انیکسی کے در و دیوار دیکھ کر لیاقت کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگیں۔

گاڑی سے اتر کر وہ سیٹھ عثمان کے ساتھ اس خوبصورت انیکسی میں داخل ہوا جو دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک مختصر لاؤنج کے علاوہ کچن، باتھ روم وغیرہ بھی بنگلے کی شان سے مطابقت رکھتے تھے۔ انیکسی کے باہر دو اطراف پھولوں کی کیاری تھی جس کو دیکھ کر فرحین کا دل یقیناً باغ باغ ہو جاتا۔

پہلے کمرے میں قدم رکھتے ہی لیاقت حسین کھڑکی اور دروازوں پر پڑے خوبصورت پردوں کو دیکھ کر چونکا۔ سامنے ایک سنگل بیڈ کا انتظام بھی تھا۔ دوسرے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اسے اپنا ساز و سامان بھی نظر آ گیا جو گل خان کے ساتھ والے گھر میں تھا۔ اس کمرے میں کھڑکیوں اور دروازوں پر بھی میچنگ کلر کے پردے نظر آ رہے تھے، کچن بھی صاف ستھرا تھا جہاں ایک چھوٹا فریج بھی تھا، باتھ روم بھی معیاری تھا۔ وہ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کے ساتھ خاموش تماشائی کی حیثیت سے ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا رہا۔ راحیلہ بیگم نے پہلے کمرے میں آ کر لیاقت حسین سے کہا تھا۔

"فی الحال تم یہاں رہو گے...... فرحین آ جائے تو پھر اس کی پسند سے گھر بھی ڈیکوریٹ ہو جائے گا اور ضرورت کی باقی چیزیں بھی آ جائیں گی۔"

"بیگم صاحب......" لیاقت حسین کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ "آپ کے احسانات نے مجھے خرید لیا ہے۔"

"مجھے گناہ گار مت کرو......" راحیلہ بیگم نے خلوص دل سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ "میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ تمہیں ہم غیر نہیں بلکہ گھر کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے نہیں بلکہ تمہاری بے لوث محبت اور قربانیوں نے ہمیں خرید لیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس وقت جذباتی باتیں کرنے کے بجائے تم آرام کرو۔" سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو مخاطب کیا۔ "اسپتال سے تو تم آ گئے ہو لیکن اب میرے اور بیگم صاحب کے کہنے سے تمہیں چوبیس گھنٹے تک مکمل آرام کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے صاحب......" لیاقت حسین نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بھوک پیاس لگے تو کچھ سامان فریج میں رکھا ہے.... کچن کا کام فرحین آنے کے بعد سنبھال لے گی۔ اس کے آنے تک تم حسب معمول کھانا اور ناشتا اسی طرح سے ہمارے گھر میں کھاتے رہو گے۔"

"جیسا آپ کا حکم....." لیاقت حسین نے ممنونیت سے جواب دیا۔

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کے جانے کے بعد بھی لیاقت حسین اپنی قسمت پر رشک کرتا رہا پھر نہادھو کر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ماں اور فرحین کا چہرہ بار بار ابھر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرحین واپس آکر اس نئے گھر کو دیکھے گی تو خوشی سے ناچ اٹھے گی۔ گھر تبدیل کرنے کا فیصلہ لیاقت حسین نے فرحین کے جانے کے بعد ہی کرلیا تھا۔ گل خان سے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن قسمت کسی بنگلے کی خوبصورت ایکسی اس کی جھولی میں ڈال دے گی، اس کا تصور اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے ذہن میں سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کی وہ باتیں گونجنے لگیں جو انہوں نے پرانی گاڑی کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں کی تھیں۔ ڈاکٹر نے اس سے بہو اور کہا تھا۔

"تم خوش قسمت ہو جو تمہاری کوئی نیکی کام آگئی ورنہ......تمہاری گاڑی کا جو حشر نشر ہوا اس کے بعد تمہارا بچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں۔" ڈاکٹر نے کئی مواقع پر اسے حادثے کی سنگین نوعیت کے بارے میں تھوڑا تھوڑا کر کے سب کچھ بتا دیا تھا لیکن لیاقت حسین کو ذہن پر بار بار زور دینے کے باوجود اس اندوہناک حادثے کے بارے میں کوئی بات یاد نہیں آسکی تھی۔

اس وقت بھی وہ اسی بات پر غور کرتے کرتے غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہوا تو کہیں دور سے ایک مانوس آواز اس کے وجود کے سناٹے میں گونجنے لگی۔

"انسان بڑا خود غرض اور احسان فراموش ہوتا ہے۔ پہلے شیطان کے ورغلانے پر صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ جھوٹی مسرتوں کے فریب میں مبتلا ہو کر اس خداوند قدوس کو یکسر فراموش کر دیتا ہے جس نے اسے زندگی جیسی انمول نعمت عطا کی۔ چند روزہ زندگی کی پرفریب مسرتوں میں مبتلا ہو کر وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اسے ایک عارضی مسافر خانے میں کسی آزمائش کے لیے وقتی قیام کے لیے روح جیسی پاکیزہ دولت سے مالا مال کیا گیا تھا، عیش وعشرت میں مبتلا ہو کر وہ خدا اور اس کے محبوبؐ کے سارے احکامات کو فراموش کر دیتا ہے۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ اس کی رسی دراز ہوتی رہتی ہے پھر..... جب اسے کوئی جھٹکا لگتا ہے، کوئی بڑا وقت اس کے جھوٹے خوابوں کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے تو وہ پھر خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ گڑگڑا کر معافی طلب کرتا ہے۔ جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو وہ دونوں جہانوں کے مالک سے کیے گئے تمام وعدے، تمام قسمیں فراموش کر کے پھر سے شیطان کا چیلا بن کر لہو ولعب میں غرق ہو جاتا ہے۔"

لیاقت حسین اس آواز کو سنتا رہا۔

"انسان خدا کی فیاضی پر کبھی صدق دل سے غور نہیں کرتا، اس کی مقدس کتاب میں لکھی روشن باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔ یہ بھی نہیں سوچتا کہ وہ کسی نیکی کا تصور بھی کرتا ہے تو اسے اس کے نیک عمل میں شمار کرلیا جاتا ہے۔ اگر وہ نیکی کے ارادے کو عملی طور پر پورا کر دے تو حدیث کے مطابق اس کے اعمال نامے میں دس اور کبھی کبھی سات سو سے بھی زیادہ نیکیاں درج کر دی جاتی ہیں اور..... جب خاکی انسان کسی گناہ کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو وہ بھی ایک نیکی شمار ہوتی ہے۔ اگر گناہ کے ارادے پر عمل کرے تب بھی اس کے اعمال نامے میں صرف ایک ہی گناہ درج ہوتا ہے، مگر انسان کبھی یہ بھی غور نہیں کرتا کہ اس حساب سے کہیں دس اور سات سو کے حساب میں ایک ایک گناہ مل کر بھی اور سات سو پر سبقت نہ لے جائیں۔"

"میری بات دھیان سے سنو لیاقت حسین....." کچھ توقف کے بعد وہی آواز پھر ابھری۔ "ابلیس نے بھی ناری ہونے کے گھمنڈ میں آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو ملعون قرار پایا.. اس دنیا میں جہاں تم سانس لے رہے ہو۔ ایک نہیں ہزاروں اور لاکھوں ابلیس موجود ہیں جو ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں..... شیخ حامد بھی کسی ابلیس سے کم نہیں ..... غرور وتکبر نے اس کے لیے توبہ کے دروازے بھی بند کر دیے ہیں۔ وہ تمہارے محسن سیٹھ عثمان، اس کے ایماندار دوست ڈی ایس پی سراج کو بھی نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ میڈم روبی کو بھی وہ اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے مضطرب ہے۔ کچھ اور بھی ہیں جو اس انسانی ابلیس کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تمہیں خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے اپنے رب ہی کی مرضی سے ایک روحانی طاقت سے نواز دیا تھا۔ وہ نابینا ریش دراز بھی اسی خدا کا ایک فرستادہ تھا جس نے درمیان کی تمام رکاوٹوں کو ایک اشارے سے دور کر کے تمہیں اس مجذوب تک پہنچانے میں مدد کی تھی پھر......تم خدا کی کس کس نعمت کو ٹھکراؤ گے۔ کس طرح منہ پھیر سکو گے؟......اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھو، خدا کے کرم اور ماں کی دعاؤں نے ہی تمہیں عزت بخش دی ہے۔ تم اس مالک دو جہاں کے احسانوں کا شکر اگر چاہو بھی تو ادا نہیں کر سکتے لیکن جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا اس کے ذریعے تم کچھ لوگوں کو شیخ حامد جیسے ملعون ابلیس کے عتاب سے ضرور بچا سکتے ہو۔ اس ایک کام میں اس رب کریم کی رحمتیں بھی قدم قدم پر ساتھ دیں گی۔ یہی نیکیاں روز قیامت تمہیں دوزخ کے عذاب سے نجات دلائیں گی۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟" لیاقت حسین نے غنودگی کی حالت میں دریافت کیا۔

"صرف ایک نیت......جس میں کوئی کھوٹ، کوئی ریاکاری شامل نہ ہو۔ باقی مشکل وہ آسان کر دے گا جو سب کا نجات دہندہ ہے۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں.......؟"

"عہد۔ کسی مظلوم کو کسی ظالم کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کا عہد۔ سچے دل سے، پھر اس پر عمل کرتے وقت صرف اس قادر مطلق کو یاد رکھنا جو زندگی اور موت پر قادر ہے لیکن...... ابھی تمہارے لیے بھی ایک آخری امتحان باقی ہے۔"

"وہ کیا......؟"

"گندے عمل کرنے والے کافر پرتاب گھوش کے کہے ہوئے آخری جملوں کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ وہ پینترے بدل بدل کر تمہارے قدم کو ڈگمگانے کی خاطر کئی حسین جال بن رہا ہے......ان کا خیال رکھنا ورنہ......"

"ورنہ کیا ہوگا......؟" لیاقت حسین کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن کوئی آواز نہیں ابھری۔

"جو کچھ میرے بس میں تھا، میں نے تمہارے کانوں میں ٹپکا دیا... اس سے آگے مجھے زبان کھولنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔"

لیاقت حسین گہری نیند سے ایسے ہڑبڑا کر اٹھا جیسے کسی کاری ضرب نے اسے بیدار کر دیا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھتا رہا......بستر سے اتر کر اس نے پوری ایکسی کا ایک ایک کونا چھان مارا لیکن وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا...... وہ ایسا کیوں کر رہا تھا یہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آسکا۔

سوکھے حلق کو تر کرنے کی خاطر اس نے فریج سے بوتل نکال کر ایک گلاس پانی پیا پھر مشینی انداز میں دوبارہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ وہ اس آواز کو پہلے بھی کہیں سن چکا ہے...... کہاں؟ اسے کوشش کے باوجود یاد نہ آسکا پھر وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

ثمریہ نے شبنم کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا پھر

اقوالِ مس زرین

* جو شوہر کبھی کبھار اپنی بیوی کو تھوڑا بہت جیب خرچ نہیں دیتا عام طور پر اسے ہر ماہ پابندی سے خاصی بڑی رقم اپنی سابقہ بیوی کو نان نفقے کے لیے دینا پڑجاتی ہے۔
* عمر کا سب سے طویل راستہ وہ ہے جو کسی لڑکی کو اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے طے کرنا پڑے۔
* ہر لڑکی اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتی ہے جب اس کی عمر اتنی ہو جائے گی کہ وہ دوبارہ جوان ہونا شروع کر دے گی۔
* موجودہ دور میں اگر کوئی لڑکی یہ سمجھتی ہے کہ اسے ماہر نفسیات سے اپنا معائنہ کرانے کی ضرورت نہیں ہے تو بہتر ہے کہ وہ ذہنی ہسپتال میں اپنے دماغ کا معائنہ کرالے۔
* "نسیم نے ہر معاملے کو ہمیشہ ہر پہلو سے سوچ سمجھ کر .... عمارت کی ....، اس کے بعد کردہ دوسرے معاملے کی ضرورت پر توجہ ہوئی..."

(اس زبردست دلچسپ ناول کی اگلی قسط اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں) ماہنامہ .... ڈائجسٹ

* ایک ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر اور دوسرا ہاتھ شوہر کی جیب میں — ڈرائیونگ کا یہ اصول خطرناک ہے۔ اسٹیئرنگ وہیل سے ہاتھ ہٹاؤ خاتون!
* ایک بار کوشش کرو۔ ہمت نہ ہارو۔ دوسری بار بھی کوشش کر دیکھو — بس بس زیادہ حماقت کی ضرورت نہیں کسی دوسرے نوجوان کو آزماؤ۔

مرسلہ: انیسہ افشاں جمیل
دستگیر سوسائٹی کراچی

دوسرے ہی لمحے ایک خیال نے اسے چونکا کر دیا۔ حالات نے کھل کر مقابلے کی جو صورت اختیار کر لی تھی اس کا اندازہ شاید شیخ حامد کو بھی ہو گیا تھا۔ دوستی اور دشمنی میں ہر حربہ استعمال ہوتا ہے۔ جیت اسی کی ہوتی ہے جو زیادہ دور اندیشی سے اپنے دشمن پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے۔

شبنم بہت دنوں بعد آئی تھی۔ وہ شیخ کے دفتر میں کام کرتی تھی، ناممکن نہیں تھا کہ شیخ اسے بھی کسی طرح اپنے جال میں پھانس کر میڈم کے خلاف کرنے کی پلاننگ پر غور کر چکا ہو۔ اس فوری خیال نے ثمریسا کو ڈپلومیسی اختیار کر دینے پر آمادہ کیا، اس نے شبنم کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد دوستانہ انداز میں کہا۔

"کہاں غائب رہیں اتنے دنوں؟ میڈم بڑی شدت سے تمہاری منتظر تھیں۔" ثمریسا نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔ "تاج محل ہوٹل میں ہونے والی گھناؤنی سازش میں اگر خطرناک مگرمچھ کا داؤ کامیاب ہو جاتا تو......"

"یہ تمہاری ذاتی رائے ہے، بگ باس کا اس معاملے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔" شبنم نے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر ثمریسا کی طرف بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "جو کچھ بھی ہوا اس میں صرف اور صرف افضل خان کی ذاتی بدمعاشی کا عمل دخل تھا جس کا خمیازہ وہ ابھی تک بھگت رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ باس اس کے لیے بھی کوئی انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور ہو جائے۔"

شبنم کی بات سن کر ثمریسا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ تیز نظروں سے شبنم کو گھور رہی تھی۔ شبنم نے زبان کھولنے کے بجائے اس کاغذ کی طرف اشارہ کیا جسے ابھی تک ثمریسا نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ شبنم کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے بھی ثمریسا کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے شبنم کا اشارہ پا کر بے تکلفی سے کہا۔

"میڈم شاید باتھ لے رہی ہیں۔ میں ابھی جا کر انہیں تمہاری آمد کی اطلاع دیتی ہوں۔" ثمریسا اٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ میڈم تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

ثمریسا اٹھ کر اندر چلی گئی، میڈم اپنے کمرے میں ہی تھی۔ ثمریسا نے اسے شبنم کے آمد کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ وہ کاغذ بھی تھما دیا جس پر ایک خاص پیغام درج تھا۔ میڈم نے شبنم کی آمد پر ایکدم اٹھ کر باہر جانے کی کوشش کی تھی۔ اسے شبنم کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ وہ دونوں شیخ حامد سے انتقام لینے کی خاطر کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھیں۔ ثمریسا نے میڈم کو پہلے وہ تحریر پڑھنے کا مشورہ دیا جو شبنم نے شیخ حامد کی طرفداری کرتے وقت اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ میڈم نے کاغذ کی تہ کھول کر اس پر درج تحریر پڑھنی شروع کی جو خاصی سنسنی خیز تھی، لکھا تھا۔

"میڈم...... میں آپ سے کھل کر کوئی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ صرف اتنا عرض کروں گی کہ اس خطرناک مگرمچھ نے مجھے بھی پوری طرح قابو کر لیا ہے۔ کچھ ایسی تصاویر میرے اپارٹمنٹ کے پس منظر میں اتار لیں جو اگر منظر عام پر آ گئیں تو میرے پاس سوائے خودکشی کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔ وہ اب مجھے چارا بنا کر آپ کو ٹریپ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ میں اس کے کسی حکم سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ورنہ...... وہ تصویریں منظر عام پر بھی آسکتی ہیں۔ آپ سے گفتگو کے دوران بھی مجھے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر اس خطرناک دشمن کی تعریف کرنی پڑے گی جو میرے والدین کی دردناک موت کا ذمے دار ہے۔ میں صرف آپ کے تعاون ہی سے اس کے ناپاک وجود کو ختم کر سکتی ہوں۔ آپ کو جو خاص بات کرنی ہو وہ لکھ کر کریں۔ اس آڑے وقت میں مجھے صرف آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو شاید مجھے خودکشی کے علاوہ اور کوئی راستہ میسر نہیں آئے گا۔ بدنصیب شبنم۔"

میڈم نے اس تحریر کو دو بار بہت غور سے دیکھا پھر اس نے ثمریسا کی طرف نظر اٹھا کر سوال کیا۔

"تمہارا اس تحریر کے بارے میں کیا خیال ہے...؟"

"فضتی...... فضتی......" ثمریسا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہمیں تصویر کے دونوں رخ دیکھنے ہوں گے۔ ہم جلد بازی میں کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"لیکن میرا دل کہتا ہے کہ شبنم کی تحریر اس کی بے بسی کی ترجمان ہے۔" میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کی مرحوم ماں سے میں پیرس میں مل چکی ہوں۔ وہ ٹاپ ماڈل ہونے کے باوجود گھٹن کا شکار تھی۔ شبنم کا مستقبل بنانے اور اسے شیخ حامد جیسے ذلیل انسان کی نظروں سے دور رکھنے کی خاطر مرحومہ نے بڑی قربانیاں دی تھیں، پھر اس نے اپنی بیٹی ہی کی بھلائی کے پیش نظر خودکشی سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ کم از کم شبنم جو اپنی زبان سے مجھے اپنی دکھ بھری اذیت ناک کہانی سنا چکی ہے۔ کم از کم میرے ساتھ ڈبل کراس کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔"

"میں نے صرف اپنی رائے دی تھی۔" ثمریسا نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ "آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔"

میڈم ایک لمحے تک کچھ سوچتی رہی پھر کسمسا کر بولی۔

"ایک چھوٹا سا چانس لے کر دیکھتے ہیں۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں ہوگا اور اصلیت بھی کھل کر سامنے آجائے گی۔"

"ایز یو لائیک......"

"تم چل کر شبنم کے پاس بیٹھو، میں چینج کر کے آتی ہوں۔"

ثمریسا کے جانے کے بعد میڈم نے بھی ایک کاغذ پر شبنم کے جواب میں کچھ لکھا پھر وہ دس منٹ بعد اس طرح لباس تبدیل کر کے اور بال بنا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوگی جیسے سچ مچ باتھ لینے کے بعد آئی ہو۔!

شبنم اور میڈم دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑی محبت سے بغلگیر ہوئیں۔ ثمریسا ناشتے کا اہتمام کرنے اندر چلی گئی۔ "کہاں رہیں اتنے دنوں......" میڈم نے دیدہ و دانستہ گلہ کیا۔

"دفتری مصروفیات کے علاوہ کچھ ذاتی کاموں میں بھی الجھی رہی۔"

"افضل خان کے بارے میں جو سنا جا رہا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟" میڈم نے یک لخت سنجیدگی سے سوال کیا۔

"سوری میڈم......" شبنم نے بڑی خوبصورتی سے اپنا رول ادا کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اگر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ہماری ذات تک ہی محدود رہے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"آئی سی......" میڈم نے طنز کیا۔ "شیخ حامد کے سحر نے شاید تمہیں بھی اپنے......"

"میڈم...... پلیز!"

"اوکے......" میڈم نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تمہیں برا لگتا ہے تو میں تمہارے بگ باس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

"شکریہ......"

"ایک ذاتی سوال کر سکتی ہوں......؟"

"پوچھیے......"

"تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی......؟"

"اپنے منہ سے تو کسی سے نہیں کہہ سکتی۔" شبنم نے جان بوجھ کر شوخی سے جواب دیا۔ "اگر آپ کی نظر میں کوئی مناسب رشتہ ہو تو ضرور بتائیے گا۔"

"تمہارے لیے ایک نہیں ہزاروں رشتے مل سکتے ہیں مگر...... ایک شرط پر......"

"وہ کیا......؟"

"تم میرے پاس رہو...... ایک دوست، ایک عزیز سہیلی کی حیثیت سے...... تو مجھے خوشی ہوگی۔ میری تنہائی بھی دور ہو جائے گی، تمہیں رہنے، کھانے پینے کے علاوہ کسی قسم کی بھی فکر نہ ہوگی۔"

"تنخواہ کتنی ملے گی؟" شبنم نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔ خود اپنی عریاں تصاویر دیکھ لینے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ شیخ حامد ہر لمحہ چوکنا رہتا ہے، اپنی شیطانی کھوپڑی میں ہر وقت کوئی نہ کوئی خطرناک پلان مرتب کرتا رہتا تھا۔ اپنے کارندوں سے کسی وقت غافل نہیں رہتا۔ کسی نہ کسی طور ہر شخص کی رپورٹ اسے اپنے ان خفیہ آدمیوں سے ملتی رہتی ہے جن پر وہ بے دریغ دولت خرچ کرتا تھا، ہوسکتا تھا کہ اس وقت کسی خفیہ سیکریٹ ڈیوائس کے ذریعے وہ اس کے اور میڈم کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن رہا ہو۔ اس نے شبنم کو ایک خاص برانڈ کا موبائل دیتے وقت یہ ہدایت بھی خاص طور پر کی تھی کہ وہ سوتے جاگتے، کسی...... وقت بھی خود سے دور نہ کرے۔ ممکن ہے اس میں کچھ ایسی خوبیاں بھی ہوں جو صرف اسی کے علم میں ہوں۔ اس لیے محتاط رہنا ضروری تھا۔

"جتنی تم اپنے منہ سے طلب کرو گی...... اس سے دوگنی۔"

"آفر بری نہیں ہے...... آرام سے سوچ کر جواب دوں گی۔"

ثمریسا ناشتے کی ٹرے کے ساتھ داخل ہوئی تو وہ بھی حسب معمول ہنسنے بولنے میں مصروف ہوگئی۔ اس دوران میڈم نے جو تحریر شبنم کے جواب میں لکھی تھی وہ بھی شبنم نے وقفے وقفے سے پڑھ لی۔ میڈم نے جو پلاننگ کی تھی وہ قابل عمل ضرور تھی لیکن بڑے مگرمچھ کو اس سازش کا شبہ بھی ہو جاتا تو وہ شبنم کے حق میں بھی انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ شبنم نے میڈم کے لکھے ہوئے کاغذ کو اسے واپس کرتے ہوئے بڑے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے......؟"

"اس عمر میں...... ایک بیوہ سے کون اپنی قسمت پھوڑنے پر تیار ہوگا۔" میڈم نے بے اختیار ہنس کر کہا۔ ویسے وہ شبنم کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

"یہ آپ کا ذاتی خیال ہے۔" شبنم نے پہلو بدل کر کہا۔ "ویسے کوشش کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ قسمت آزمانے میں تھوڑا رسک ہے لیکن اگر کام بن گیا تو پھر شہنائی بھی بج سکتی ہے۔"

شبنم سے گفتگو کے دوران میڈم نے اپنا تحریر شدہ پرچہ تھریسا کی طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ اس تحریر میں درج پروگرام کو غور سے پڑھتی رہی، تمام زاویوں سے غور کرتی رہی پھر وہ سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر اپنی تائید کا ووٹ دیتے ہوئے بولی۔ اس کا خطاب میڈم سے تھا۔

"میں شبنم کی مخلصانہ رائے اور آپ کی خاموش نیم رضامندی، دونوں پر مسرت ہی کا اظہار کروں گی۔"

ہلکے پھلکے ناشتے کے دوران ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پھر شبنم کے جانے کے بعد میڈم نے اس کی اور اپنی تحریروں کو نذرِ آتش کر کے اس کی راکھ بھی واش بیسن میں بہا دی۔ اپنی خواب گاہ میں آنے کے بعد اس نے تھریسا کو سنجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اب افضل خان کے اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اس پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ شبنم کی طرح شاید وہ بھی اس بڑے گھر مچھ کے جوہڑ میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔"

"لیکن آپ کے سلسلے میں اس نے جو سازش کی تھی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اب اس کے بارے میں......"

"وہ اس کی مجبوری تھی......" میڈم نے سرد اور خشک لہجے میں جواب دیا۔ "اس کی پلاننگ میں بھی کسی اور کا ہاتھ تھا۔ یہ بھی نہ بھولو کہ محبت اور جنگ میں کسی بھی ہتھیار کے استعمال کو ناجائز نہیں سمجھا جاتا۔ ہر گولی پر کسی نہ کسی کی موت کا پیغام درج ہوتا ہے۔ گولی داغنے کے بعد اس کے خول کو ٹھوکر مار کر راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ وہ کسی کام کا بھی نہیں رہتا......"

"یو آر رائٹ میڈم......" تھریسا نے اس کی دوراندیشی کو سراہتے ہوئے جواب دیا۔ میڈم نے خاموشی اختیار رکھی، اس کی نظریں خلا میں کسی ممکنہ کامیابی کی تلاش میں اپنے ٹارگٹ پر مرکوز تھیں۔

☆☆☆

چہرے کی رنگت میں معمولی تبدیلی، ڈاڑھی اور مونچھوں کے اضافے کے بعد وہ کوئی تبتی یا بھوٹانی باشندہ ہی نظر آرہا تھا، سر پر بھی عجیب وضع قطع کی گول میلی کچیلی ٹوپی نے اس کی ہیئت بالکل ہی تبدیل کر دی تھی۔ پستہ قد ہونے کے باوجود وہ ٹھوس اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ کمرے میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ناک و نقشے کا ایک دراز قد شخص اور بھی تھا جس نے ملیشیا کلر کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی، اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ وہ ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ پیر مضبوط رسیوں سے کرسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، عمر پینتیس چھتیس سال کے لگ بھگ نظر آرہی تھی۔ پہلی نظر میں دیکھ کر یہی تاثر ملتا تھا کہ وہ دوردراز سے ایک پل بھی سو نہیں سکا...... ڈاڑھی والا...... اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"زندگی پیاری ہے تو اس کا نام زبان سے اگل دو جس نے تمہیں گرے کلر کی کار کو روند ڈالنے کا حکم دیا تھا۔"

"شہباز گڈز ٹرانسپورٹ کے منیجر نے مجھے اس کام کے پچیس ہزار دیے تھے۔" کرسی پر بندھے ہوئے شخص نے بیزاری کا اظہار کیا۔ "یہ بات میں تمہیں پہلے بھی دو واری بتا چکا ہوں۔"

"صرف پچیس ہزار کی خاطر تم تین آدمیوں کو زندگی سے محروم کرنے پر تیار ہو گئے تھے؟"

"ادھر پنڈ میں زمین کی آخری قسط ادا کرنے کی خاطر مجھے روپوں کی ضرورت تھی۔ اگر آخری قسط وقت پر ادا نہ کی جاتی تو اصل کے علاوہ سود بھی چڑھ جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ زمیندار کاغذوں میں ہیر پھیر کر کے ہمیں زمین سے بالکل ہی محروم کر دیتا۔"

"اور اسی لیے تم نے کسی بے قصور کو مرحوم کرنے کی ٹھان لی تھی......" پستہ قد چپٹی شکل والے نے اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں جھانکا پھر ہاتھ میں دبے ریموٹ کا سرخ بٹن دبایا تو لوہے کی کرسی میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ رسیوں میں جکڑے ہوئے شخص کا جسم جھٹکے کھانے لگا، اس کی چیخیں پھر بلند ہونے لگیں...... "زبان کھول دو تو شاید اس قابل رہو کہ اپاہجوں کی طرح سڑکوں پر بھیک مانگ سکو ورنہ...... تمہیں بھی آخری سفر پر روانہ کر دیا جائے گا۔"

"تمہیں میری گل پر یقین نہیں آتا تو شہباز گڈز کے منیجر کو سامنے لے آؤ۔" جھٹکے لگنے بند ہوئے تو کرسی پر پسینے میں شرابور شخص نے رو دینے والے انداز میں درخواست کی۔ "وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں

کرے گا۔ وہ انکاری ہو جائے تو بھلے تم مجھے مار بھی دینا۔"

"سوری......" چپٹی صورت کے پستہ قد والے نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ "جب اس کی آنکھیں ہی نہیں رہیں تو وہ تمہاری آنکھوں میں کچھ بھی نہ ڈال سکے گا۔"

"کیا مطلب......؟"

"ہم نے اس گڈز کمپنی کو بھی دھماکے سے اڑا دیا ہے۔" اس بار سفاکی سے جواب دیا گیا۔ "ہو سکتا ہے تمہیں اس کی پوسٹ بنا دیا جائے۔"

"نہیں......" کرسی سے بندھا ہوا شخص چیخ اٹھا۔ "میں مر گیا تو میری کڑی کے ساتھ ایک معصوم بچہ بھی دربدر ہو جائے گا۔"

پستہ قد چپٹی شکل والا ایک لمحے تک اسے گھورتا رہا پھر اس کی انگلی سرخ بٹن کو پش کرنے کے لیے حرکت میں آنے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک دی گئی۔ پستہ قد شخص ریموٹ کو کرسی پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر چونک ہی اضطراب کی کیفیت پھیل گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے باہر سے ابھرنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"میں ہاشم ہوں میرے عزیز...... ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ قیدی کے لیے اوپر سے ایک نیا حکم صادر ہوا ہے۔"

پستہ قد والے نے جو لوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ جہاز میں اپنے ہم سفر سیاہ فام ہاشم کی آواز پہچان کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے دروازہ کھولنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا لیکن...... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اس کے چہرے پر ایک زبردست مکا لگا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ سیاہ فام ہاشم کے ساتھ ہی ایک دوسرا شخص بھی کمرے میں داخل ہوا تھا جس نے لوچن کے سنبھلنے سے پہلے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اس پر سائلنسر لگا آٹومیٹک پستول تان لیا۔ پھر بڑے سفاک لہجے میں وارننگ بھی دی گئی۔

"کوئی آواز نکالی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔ ہاتھ اوپر اٹھا لو......"

لوچن کے پاس فوری طور پر حکم کی تعمیل میں ہاتھ اٹھانے کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ہاشم کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ لوچن کو صورت حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ مخالف گروپ نے پہلے ہاشم کو قابو کیا ہوگا اور اب اسی کے ذریعے وہاں تک بھی آ گئے تھے جہاں لوچن اس ڈرائیور کی زبان کھلوانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے لیاقت حسین کی گاڑی کو عقب سے ٹکر مار کر پچیس ہزار کھرے کیے تھے۔
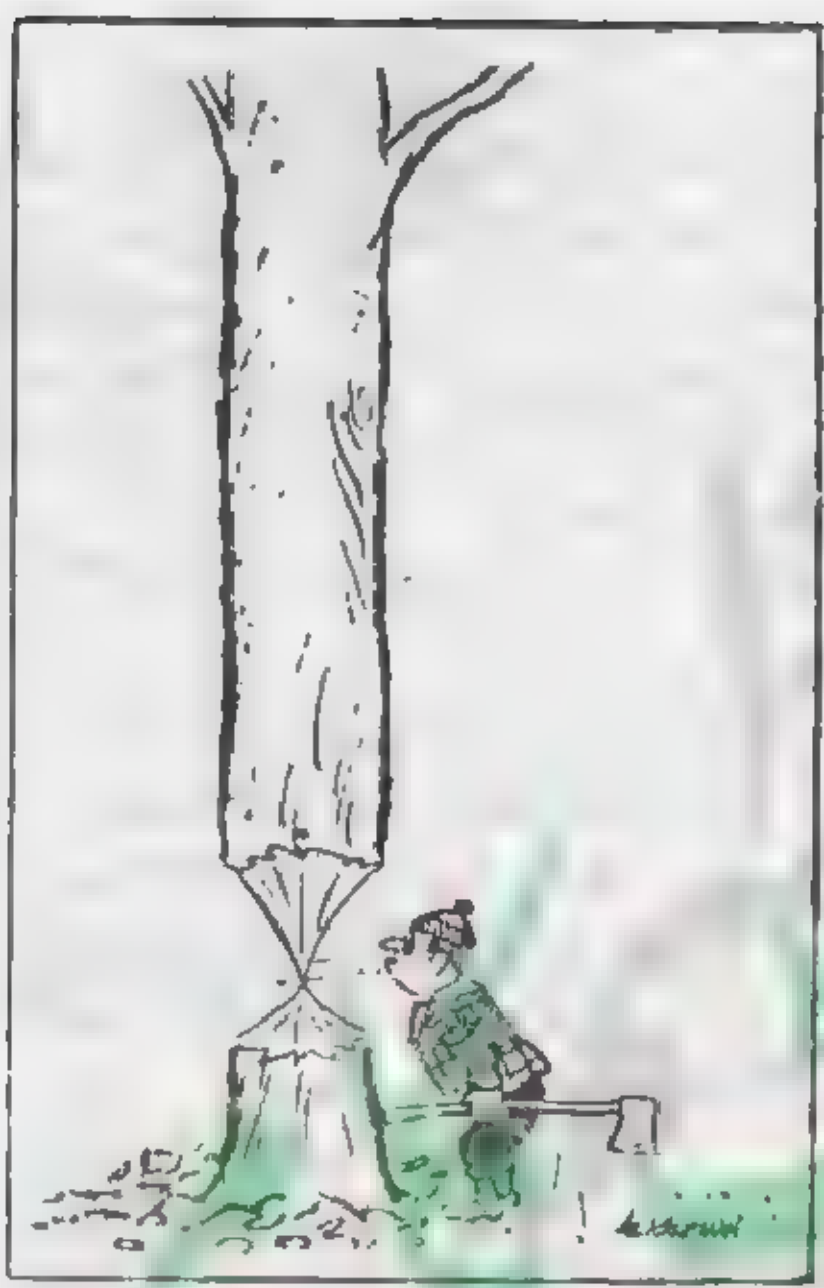
"تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے ہاشم سے شکوہ کیا۔

"ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے میرے دوست اور...... ماں کے بغیر ایک مچھر بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔" ہاشم نے بڑی رازداری سے داہنی آنکھ جھپکا کر جواب دیا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تم...... تم بکواس کر رہے ہو......" لوچن نے تلملا کر جواب دیا۔ "اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مروانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"شٹ اپ......!" آٹومیٹک پستول والے نے غرا کر کہا پھر لوچن سے بولا۔ "اس شخص کی رسی کھول دو جسے تم مارنے کا خواب دیکھ رہے تھے، ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اس کو اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم جتنا یہ بتا چکا ہے۔"

لوچن نے ایک بار پھر ہاشم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا پھر وہ جھلا کر کرسی پر بندھے ہوئے آدمی کی رسیاں کھولنے لگا۔ ہاشم کے علاوہ آٹومیٹک پستول والا بھی پوری طرح محتاط تھا، وہ لوچن کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہا تھا۔

رسیاں کھولتے وقت لوچن بار بار اپنے غصے کا اظہار کرتا رہا۔ اس کی نظریں رہ رہ کر ہاشم کی سمت اٹھ رہی تھیں

جس نے کسی دشمن کو وہاں لانے کی حماقت کی تھی۔ باہر رات کی تاریکی گہری ہوتی جارہی تھی۔ شاید اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ہاشم کو بے بس کرنے والا اسے وہاں تک لے آیا تھا۔ لوچن نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی، اس وقت رات کے سوا بارہ کا عمل تھا۔ باہر سڑکوں پر یقیناً ٹریفک کا بہاؤ بھی نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

''وقت مت ضائع کرو......'' پستول والے نے لوچن کو دھمکی دی۔ ''کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو خود بھی ضائع ہوجاؤ گے۔''

لوچن نے ہونٹ چباتے ہوئے بڑی بے بسی سے پستول والے کو دیکھا پھر دوبارہ جلدی جلدی رسی کے بل کھولنے لگا۔ شاید اسی جلد بازی میں اس کا پاؤں رسی میں الجھا تھا، توازن سنبھالنے کی خاطر اس نے الٹا ہاتھ فرش پر ٹکایا تھا پھر جیسے بجلی سی کوند گئی، لوچن کا ہاتھ زمین پر ٹکتے دیکھ کر ہی ہاشم نے ہاتھ بندھے ہونے کے سبب سیدھی ٹانگ کا گھٹنا آٹومیٹک پستول والے کے نازک مقام پر مارا۔ اسی لمحے لوچن جو مارشل آرٹ کا ماہر تھا کسی پھرکی کی طرح زمین پر چکراتا ہوا قریب آیا، دونوں شانے زمین پر ٹکا کر اس نے ٹانگیں بلند کیں، قینچی بنا کر اس نے آٹومیٹک پستول والے کی گردن میں ٹانگیں پھنسائیں پھر اس نے خود قلابازی کھائی تو آٹومیٹک پستول والا بھی اپنا توازن کھو بیٹھا، فضا میں اڑتے ہوئے دوسری جانب چاروں خانے چت گرا۔ اس کی گردن بدستور لوچن کے پیروں کے شکنجے میں تھی، دشمن کے زمین پر گرتے ہی لوچن نے زمین پر لیٹ کر ایک جھٹکے سے کروٹ لی تو ''چٹ'' کی ہلکی سی آواز ابھری پھر دشمن کا جسم ساکت ہوگیا۔ اس کا آٹومیٹک پستول بہت پہلے ہی اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ یہ سب اس قدر آناً فاناً ہوا کہ ہاشم بھی ایک لمحے کو دم بخود رہ گیا پھر اس نے بڑی معصومیت سے لوچن کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ مرگیا......؟''

''ہاں......'' لوچن کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھا۔ ''تم...... اسے یہاں کیوں لائے تھے......؟''

''یہ ثابت کرنے کے لیے ایک اور ایک ہمیشہ گیارہ ہوتے ہیں۔'' ہاشم بے پروائی سے مسکرایا۔ ''کیا تم میرے ہاتھ نہیں کھولو گے؟''

لوچن نے ہاشم کے ہاتھ کھولنے کے بعد کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا جو دہشت سے بری طرح سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے...؟'' اس نے ہاشم سے دریافت کیا۔

''بوگا سوالا...... میرا مطلب ہے کہ...... گٹ رڈ آف ہم (Get Rid of Him)'' ہاشم نے مسکرا کر کہا۔

لوچن نے بجلی کی طرح جھپٹ کر کرسی پر موجود شخص کی گردن میں الٹے ہاتھ کا پھندا ڈال کر ایک جھٹکا دیا تو اس کی گردن بھی سینے پر جھول کر رہ گئی۔ لوچن نے پھر ہاشم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اب کیا پروگرام ہے......؟''

''ہمیں فوری طور پر اپنے ٹھکانے ہی نہیں اپنے حلیے بھی بدلنے ہوں گے۔'' ہاشم نے سنجیدگی سے جواب دیا، وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ موبائل کی گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے جلدی سے لپک کر آٹومیٹک پستول والے کی جیب سے اپنا موبائل نکال کر کان سے لگاتے ہوئے آن کر دیا۔

''لانگ فیلو اسپیکنگ!'' ہاشم نے کہا۔ ''ہم نے دو آدمیوں کو پارسل کر دیا ہے۔''

''کوڈ کے تبادلے کے بغیر آئندہ گفتگو کرنے سے پرہیز کرنا۔'' دوسری طرف سے نسوانی آواز ابھری۔ ''جس نے تمہارے اوپر ہاتھ ڈالا تھا وہ اگر زندہ بچ جاتا تو مناسب نہ تھا لیکن نیور مائنڈ۔ میں تمہاری کارکردگی پر خوش ہوں۔''

''آپ کو حالات کا علم......''

''تمہاری حفاظت کے لیے ہم نے کچھ دوسرے کارندے بھی مقرر کر رکھے ہیں۔''

''اب کیا حکم ہے؟...... کیا ہمیں اپنی رہائش بدلنی ہوگی؟''

''تم چاہو تو ہوٹل کے بجائے کچھ دنوں کے لیے کسی گیسٹ ہاؤس میں منتقل ہوجاؤ۔ لوچن کا ہوٹل تبدیل کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''

''میں ایک سوال کرنا چاہوں گا......''

''پوچھو......؟''

''جس نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا اس کا تعلق کس گروپ سے تھا؟'' ہاشم نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔ اس کی نگاہوں میں انتقامی شعلے بھڑک رہے تھے۔

''ڈونٹ وری...... ہوسکتا ہے کہ تمہیں اپنے اگلے مشن میں اس گروپ کے لیڈر کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کرنے کا موقع دیا جائے۔''

''دونوں ڈیڈ باڈیز کا کیا ڈسپوزل کرنا ہے؟''

''جہاں پڑے ہیں وہیں چھوڑ دو...... اس کا بندوبست دوسرے متعلقہ ورکرز کریں گے، اوور اینڈ آل۔'' دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ ہاشم نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے لوچن سے کہا۔

''میں اس شخص کو جان بوجھ کر یہاں تک لایا تھا۔''

''کیا مطلب......؟'' لوچن چونکا۔ ''کوئی خاص وجہ......؟''

''ہاں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا اور کون ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔'' ہاشم بے پروائی سے بولا پھر مرنے والے پر اچٹتی نظر ڈال کر کہا۔ ''اس کاٹھ کباڑی پہلوان کے لیے میں اکیلا بھی بہت کافی تھا۔''

''تم جانو......'' لوچن نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''کبھی کبھی زیادہ خود اعتمادی کسی بڑے خطرے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔''

''یو آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ......'' ہاشم نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''خطروں سے کھیلنا ہی ہمارا پروفیشن ہے۔''

جواب میں لوچن نے ایک بار پھر ٹٹولتی نظروں سے ہاشم کو دیکھا پھر انہوں نے اس جگہ سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی جس کا انتخاب سیون اسٹارز نے کیا تھا۔

☆☆☆

شبنم کے جانے کے بعد بھی ثمریا اور میڈم روبی کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جو باتیں شبنم نے کاغذ پر لکھ کر کی تھیں اس کے بارے میں تبادلہ خیال ہوتا رہا پھر ثمریا نے اچانک بڑی سنجیدگی سے میڈم سے پوچھا۔

''شبنم کے بارے میں آپ نے کیا اندازہ لگایا ہے؟''

''گفتگو کے درمیان تم بھی موجود تھیں۔'' میڈم نے اس کا سوال سن کر حیرت کا اظہار کیا۔ ''تم نے کیا رائے قائم کی ہے؟''

''بہ ظاہر وہ اداکاری کرتی نظر نہیں آرہی تھی لیکن...... ہمیں ایک بات کے سلسلے میں سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا۔'' ثمریا نے کسمسا کر کہا۔ ''اس بارے میں ہمارے درمیان کوئی دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ شبنم ہمارے دشمن شیخ حامد کے دفتر میں کام کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی کوئی کمزوری خطرناک مگرمچھ کے ہاتھ آگئی ہو اور وہ اسی کے اشارے پر......''

''نہیں......'' میڈم بات کاٹ کر بولی۔ ''شبنم ایسا نہیں کر سکتی۔''

''زیادہ خود اعتمادی ہمیشہ کارآمد نہیں ہوتی۔'' ثمریا نے بڑے خلوص سے کہا۔ ''افضل خان کے سلسلے میں آپ ایک تجربہ کر کے......''

''پلیز ثمریا۔'' میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا پھر کچھ توقف سے بولی۔ ''شبنم کی دکھ بھری کہانی تمہیں نہیں معلوم...... میں جانتی ہوں۔ میری طرح وہ بھی شیخ حامد سے اپنا کچھ حساب کتاب چکتا کرنے کی خاطر مجبوراً وہاں ملازمت کر رہی ہے۔''

''بہرحال......'' ثمریا نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''ہمیں آنکھ بند کر کے اس پر اعتماد کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔''

میڈم کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے موبائل کی طرف توجہ دی جس پر سراج کا نام نظر آرہا تھا، کال ریسیو کرنے میں میڈم نے خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا۔

''خیریت تو ہے...... اس وقت آپ کو میری یاد کیسے آگئی؟'' اس نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

''سوری......!'' دوسری جانب سے بھی شوخی کا اظہار ہوا۔ ''آپ اس وقت اگر ڈسٹرب ہوئی ہیں تو مجھے کوئی دوسرا وقت بتا دیں جسے میں آپ کو یاد کرنے کے لیے مخصوص کرلوں۔''

دو دوست اپنے خریدے ہوئے قیمتی زیورات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

''تم نے سب سے قیمتی زیور کون سا خریدا ہے؟''

''شادی کی انگوٹھی۔'' دوسرے نے جواب دیا۔ ''کیونکہ اس کے بعد سے میرا ہر ہفتے کا خرچ سو روپے بڑھ گیا ہے۔''

''میں مذاق کر رہی تھی۔'' میڈم نے کھل کر جواب دیا۔ ''آپ کے لیے میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔''

''شکریہ......'' دوسری جانب سے سراج یکلخت سنجیدہ ہوگیا۔ ''مجھے آپ کو ایک اہم خبر دینی ہے...... شیخ حامد کو موجودہ ہنگاموں کی پشت پر آپ کا ہاتھ نظر آرہا ہے۔''

''آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟'' میڈم نے محتاط انداز اختیار کیا۔

''سانحۂ .... والے دھماکے کے بعد بھی میں نے آپ کو محتاط رہنے کی ایڈوائز کی تھی۔''

''پولیس والوں کا انداز کم از کم میرے ساتھ......''

''غلط خیال ہے آپ کا......'' سراج نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''پولیس کے انداز میں سوچتا تو اس وقت آپ کو فون نہ کرتا۔ میں نے آپ کو کچھ ذاتی رائے قائم کرنے کے بعد ہی فون کیا ہے۔ فی الحال اگر آپ کچھ دنوں کے لیے اپنی سرگرمیاں بند کردیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''اس ڈرٹی ڈوگ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں ہی ہر بات کی ذمے دار ہوں؟''

''کاش میں اس وقت آپ کے قریب ہوتا۔'' سراج کے لہجے میں شوخی اور شرارت گھل مل گئی۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''شاعروں کے ایک خیال کی تصدیق ہوجاتی......''

''اوہ......'' میڈم کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، وہ سراج کا مفہوم سمجھ کر گلنار ہوگئی، کچھ توقف سے بولی۔

''ایک بات یاد رکھیے گا۔ آپ کی ایک دکھتی رگ میری ہم جنس بھی ہے...... میں کسی رفاہی ادارے کی امداد کے بہانے سے الماس کو دعوت دے کر اسے اپنی سہیلی بھی بنا سکتی ہوں۔''

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے عمل کیجیے۔'' سراج دوبارہ سنجیدہ ہوگیا۔ ''آپ نے یقیناً ناپ تول کرنے کے بعد ہی کسی ٹیم کا انتخاب کیا ہوگا لیکن جو شبہ کیا جارہا ہے اس کے جواز بھی موجود ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں......؟''

''افضل خان کو جو مشن سونپا گیا تھا اس کے ناکامی کے بعد اسے بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن بگ باس کو مایوسی ہوئی، اب میری سفارش پر شاید اسے کچھ سانسیں ادھار مل جائیں۔''

''آپ کی سفارش پر......'' میڈم چونکی۔ ''کیا آپ کو امید ہے کہ وہ ڈرٹی ڈوگ کسی کی سفارش بھی سن سکتا ہے۔ خاص طور سے پولیس والوں کی۔''

''سارے پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے محترمہ۔'' سراج نے پھر شوخی سے کہا۔ ''الماس نے بھی شادی سے پہلے میری کھوپڑی کے بارے میں خاصی چھان بین کرانے کے بعد ہی ہاں کی تھی۔''

''اوکے...... میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گی۔'' میڈم نے سنجیدگی سے کہا۔

''بہت بہت شکریہ اس نوازش کا۔'' دوسری جانب سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''مسٹر سراج کا فون تھا؟'' تھریسا نے دریافت کیا۔

''ہاں......'' میڈم نے شیخ حامد کے حوالے سے بات کی۔ ''اسے میرے اوپر شبہ ہے، مسٹر سراج کا خیال ہے کہ میں کچھ دنوں کے لیے اپنی سرگرمیوں میں کمی کردوں۔''

''میں اس مشورے کی تائید کروں گی۔'' تھریسا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دشمن کو اندھیرے میں شکار کیا جائے تو وہ چوکنا ہونے سے پہلے ہی شکار ہوجاتا ہے۔ بصورت دیگر، وہ بھی اپنے حربے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔''

''شبنم نے جو پروگرام بنایا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میڈم نے موضوع بدلا۔ ''کیا وہ قابل عمل ہے؟''

''ہاں...... لیکن ہمیں اس میں احتیاطاً تقدم کے طور پر کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔''

''آئی سی۔'' میڈم مسکرائی۔ ''گویا تم آنکھ بند کرکے اس پر صاد کرنے کو تیار نہیں ہو۔''

''کھل کر گفتگو کرنے کی اجازت بھی آپ نے دی ہے۔'' تھریسا نے جواب دیا۔ ''دوسری شکل میں......''

''اس کے آگے کچھ مت کہنا تھریسا......'' میڈم کی آواز فرط جذبات سے بھرا گئی۔ ''میں تمہیں ملازمہ نہیں ایک دوست، ایک ہمدرد، ایک بہن کی طرح عزیز رکھتی ہوں ورنہ اس دنیا میں اب میرا......''

''میرا خیال ہے کہ اس وقت کولڈ کافی ہم دونوں کے لیے مناسب رہے گی۔'' تھریسا نے بڑی اپنائیت سے کہا پھر اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی اور میڈم...... ٹشو سے آنکھوں کی نمی خشک کرنے لگی۔

اس کے ذہن میں سراج کا مشورہ بھی کلبلا رہا تھا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

جب خواہشوں میں چھپی رنجشوں اور خوابوں میں پنہاں سازشوں کا ادراک نہ ہونے پائے تو انسان انجانے میں ایک چال کا شکار ہوجاتا ہے، اور اگر اس چال کو لازوال محبت کا نام دے کر عاشق اپنے دل کو نہ بہلائے تو مسلسل ایک کسک اسے بے حال رکھتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسے ہی خوابوں کے قیدی تھے، جنہیں نہ ماضی کا احساس تھا نہ مستقبل کی کچھ خبر... وہ تو فقط اپنے حال میں زندہ تھے۔

قیمتی جذبات کی دولت پانے والے نا آسودہ حال عاشقوں کا قصہ

قطعہ کہانی

منظر امام

وہ ایک شاعر بھی تھا۔

اس کی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ عام شاعروں کی طرح پھکڑ نہیں ...۔ اس کے پاس پیسے بھی تھے اور خود بھی ایک اچھی جگہ ...ت کرتا تھا۔ ہمیشہ اچھے لباس میں صاف ستھرا نظر ... اسے دیکھ کر احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک شاعر بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ اس کی اضافی خوبی تھی۔

میری اس سے بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ اس کی اچھی عادات میں سے ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ دوسرے شاعروں کی طرح بے موقع اپنے اشعار نہیں سناتا تھا بلکہ سناتا ہی نہیں تھا جبکہ میں ایسے شاعروں کو بھی جانتا ہوں جو ہر وقت

اپنی شاعری سنانے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ ان ہی میں ایک مرزا دل گیر بھی تھے۔

مجھے ان کی اس عادت کا علم نہیں تھا۔ اس لیے جب میں ایک دن ہوٹل میں داخل ہوا اور مرزا صاحب کو اکیلے بیٹھا دیکھا تو فوراً ان کے پاس چلا آیا۔ ''ارے مرزا صاحب خیریت تو ہے جناب۔ کیسے ہیں آپ؟''

مرزا دل گیر مجھے دیکھ کر نہال ہو گئے۔ ''بیٹھو میاں بیٹھو۔'' پھر انہوں نے فوراً چائے کا آرڈر دے کر مجھ سے کہا۔ ''حمید میاں خوب ملے ہو تم۔ کل رات ہی کو ایک غزل ہوئی ہے۔ تم دیکھو کتنی سنگلاخ زمین پر غزل کہی ہے۔ ہے کوئی مائی کا لعل جو میری طرح خون تھوک سکے؟

اس کے بعد انہوں نے جھوم جھوم کر پوری آواز اور توانائی کے ساتھ ترنم میں غزل گانا شروع کر دی۔ میں اسے غزل گانا ہی کہوں گا۔

ایک تو ان کی انتہائی کرخت اور بے ڈھنگی آواز پھر ان کا مسخروں والا انداز۔ میں تو تماشا بن کر رہ گیا تھا۔ لوگ میری طرف طنزیہ نگاہوں سے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے بلکہ بہت سے تو زور زور سے ہنسنے بھی لگے تھے۔

اس ماحول میں چائے مجھے زہر معلوم ہو رہی تھی۔ مرزا صاحب کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ میں خاموش کیوں ہوں؟ داد کیوں نہیں دے رہا؟ اسی لیے جب وہ جھومتے جھامتے فاتحانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے تو مجبوراً مجھے داد دینا پڑتی تھی۔

اس وقت میں اچھا خاصا چغد بن کر رہ گیا۔

ایک چائے کے عوض انہوں نے تین غزلیں سنا دی تھیں۔ چوتھی غزل پر میں بھاگ نکلا۔ اس کے بعد سے وہ جہاں بھی دکھائی دیتے میں کترا کر نکل جاتا۔ ان سے میں نے دوستی ہی ختم کر دی تھی۔

لیکن شاہد فراز ایسا شاعر نہیں تھا۔

وہ ایک پڑھا لکھا نفیس انسان تھا۔ میں نے اسے کبھی کم قیمت لباس میں نہیں دیکھا۔ بہترین مہنگے کپڑے اور جوتے استعمال کیا کرتا۔ خرچ کرنے کے معاملے میں بھی وہ بادشاہ آدمی تھا۔ ہمیشہ چائے یا کافی اچھے ہوٹلوں میں پیتا تھا۔

اس کا کہنا تھا۔ ''حمید بھائی شاعری گلا پھاڑ کر الفاظ اگلنے کا نام نہیں ہے بلکہ شاعری خاموشی میں بھی ہوا کرتی ہے۔ خوبصورت ماحول، اچھی کتابیں، اچھی خوشبو، اچھی فلم اور کوئی اچھا چہرہ یہ بھی شاعری ہے۔''

میں نے اس کے ساتھ رہتے ہوئے ہمیشہ خوشی محسوس کی۔

وہ ایک صاف ستھرے خوبصورت مکان میں رہا کرتا تھا۔ اس کے گھر والے شاید کہیں اور تھے اور وہ صرف ملازمت کے لیے ہمارے شہر میں مقیم تھا۔

میں نے ہر معاملے میں اسے بہت باذوق پایا۔

اس کے گھر کا فرنیچر بھی بہت اعلیٰ تھا۔ خوبصورت قیمتی پینٹنگز اور کتابوں سے سجا ہوا وہ گھر واقعی کسی نفیس خیال شاعر کا گھر معلوم ہوتا تھا۔

ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔ میں اپنے گھر سے نکل کر جا رہا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ ''حمید صاحب۔ پلیز ایک منٹ۔'' میں نے مڑ کر دیکھا وہ ثمن تھی۔

اس محلے میں رہنے والی بہت خوبصورت اور ذہین لڑکی، جس کے والد صاحب ایک مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ ثمن کے بارے میں سنا گیا تھا کہ وہ بہت نفیس ذوق کی نفیس لڑکی ہے۔''

وہ محلے کی دوسری لڑکیوں سے الگ تھلگ تھی۔ میں اس کی بہت قدر کرتا تھا کیونکہ عام طور پر نوجوان نسل نے چھچھورے اور کم تر ذوق کا ثبوت دینا شروع کر دیا ہے۔

مجھے اس طرح اس کے آواز دینے پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''ہاں ثمن خیریت تو ہے نا؟''

''جی ہاں۔ خیریت ہے۔ آپ سے ایک کام تھا۔''

''ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کے جو دوست آپ سے ملنے کے لیے آتے ہیں وہ شاہد فراز صاحب ہیں۔ میں نے ایک بار انہیں کالج میں ایک مشاعرے میں سنا تھا۔''

''ہاں یہ وہی ہیں۔''

''اوہ۔'' وہ خوش ہو گئی تھی۔ ''بہت باکمال شاعر ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ ان سے میری ملاقات کرو سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں، جب کہو لیکن ایسا کیا کام پڑ گیا شاہد فراز سے؟''

''میں انہیں اپنی شاعری دکھانا چاہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں بھی کچھ ٹوٹی پھوٹی شاعری کر ہی لیتی ہوں۔''

''بہت خوشی ہوئی یہ سن کر۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں جانتا ہوں کہ تم نے یقیناً اچھی شاعری کی ہوگی کیونکہ میں تمہارے پس منظر سے واقف ہوں۔''

''جی بہت بہت شکریہ۔'' تو کب ملاقات کروا رہے ہیں؟''

''کل ہی۔ میں اسے دفتر سے اپنے گھر بلا لوں گا۔ تم بھی آ جانا۔''

میں نے جب شاہد فراز سے بات کی تو وہ انکار کرنے لگا۔ ''یار حمید بھائی۔ میں ان چکروں میں کہاں پڑوں گا؟ یہ اصلاح وغیرہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ تم ایسا کرو اسے دل گیر صاحب کے پاس بھیج دو۔''

''یار وہ اس قابل کہاں ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے وہ ان چکروں میں کہاں پڑے گی؟ پھر میں نے تمہاری طرف سے اس سے وعدہ بھی کر لیا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے تو کل آ جاؤں گا۔''

دوسری شام کو میرے گھر پر دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ دفتر سے شاہد فراز آ گیا تھا اور محلے سے ثمن پہنچ گئی تھی۔

دونوں ایک دوسرے سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ثمن تو پہلے ہی سے متاثر تھی۔ خود فراز بھی اس سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے ادب کی، شاعری کی اور پتا نہیں کیا کیا؟ بہرحال دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

یہ ملاقات ختم ہوئی، دونوں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ میں نے صحیح لوگوں کو ایک دوسرے سے ملوا دیا ہے۔ دو چار دنوں کے بعد جب شاہد فراز سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''حمید بھائی میں ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھول سکتا۔ تم نے مجھے زندگی سے بہت قریب کر دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بھائی۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''یعنی میں اور ثمن۔ حمید بھائی میں نے ویسے تو ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ سب کچھ ہے میرے پاس لیکن محبت کا خلا ہمیشہ قائم رہا ہے۔ میں کسی کی نگاہ التفات کے لیے ہمیشہ سے ترستا رہا تھا۔ تمہیں شاید یقین نہیں آئے گا کہ خدا نے اگرچہ مجھے دنیا کی ہر نعمت سے نوازا ہے لیکن محبت میرے قریب سے بھی نہیں گزری۔ دو چار لڑکیاں آئیں بھی تو وہ کاغذی، مصنوعی چہروں والی تھیں جب کہ ثمن ایک خالص لڑکی ہے پاکیزہ سی......''

''اوہو۔'' میں ہنس پڑا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔''

''ہاں بھائی محبت واقعی ایک جادو ہے۔''

''کیا تم دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہر دوسرے دن۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم کسی نہ کسی ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہتی ہیں...... دنیا بھر کی باتیں۔ اس کا مطالعہ بھی بہت اچھا ہے اور اس کی باتوں میں بلا کی چاشنی ہے۔''

''چلو مبارک ہو تمہیں۔'' میں نے کہا۔ ''خدا کرے کہ تمہاری محبت کا یہ سفر یونہی جاری رہے۔''

پھر کئی دن گزر گئے۔ شاہد فراز سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ مجھے اس سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس طرحدار شاعر نے پہلی بار محبت پائی ہے تو اسی میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔

کئی دنوں کے بعد میں خود اس کی طرف چلا گیا۔ وہ واقعی بہت خوش تھا۔ اس نے بتایا کہ عشق کی مصروفیات ایسی ہیں کہ وہ خود اپنے لیے بھی وقت بہت کم نکال پایا تھا۔ میں نے ایک بات اور محسوس کی کہ اس ملاقات میں اس کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اوروں سے بھی بیگانہ ہو گیا ہو۔

میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور اس سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔ اب میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اس شاعر نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اپنے محبوب کے سپرد کر دیا ہے۔

اس کے پاس اپنے آپ سے بھی ملنے کا وقت نہیں رہا ہے۔ یہ شاعر قسم کے لوگ جب محبت کرتے ہیں تو ان کی محبت ایسی ہی طوفانی ہوتی ہے۔

ایک بار راستے میں اس لڑکی یعنی ثمن سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اس کے چہرے پر دھنک رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ محبت تو اسی طرح سرشار کرتی ہے۔

اس نے اس دن پھر مجھے آواز دے کر روک لیا۔ وہ سراپا نیاز بنی ہوئی تھی۔ ''حمید صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک لڑکی ہوں۔ خدا جانے میرے لیے یہ سب کہنا مناسب بھی ہے یا نہیں لیکن مجھے کہنے کی اجازت دیں اور اگر میری کوئی بات ناگوار ہو تو معاف کر دیجیے گا۔''

''نہیں ثمن۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بتاؤ کیا کہنا ہے؟''

''میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے مجھے دنیا کی سب سے بڑی نعمت دے دی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب جا کر احساس ہوا ہے کہ محبت سے انسان کی تکمیل ہو جاتی ہے۔''

"یہ تو ہے اور مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ یہ محبت تمہیں راس آ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت زیادہ۔"

"تو ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ "میں اس وقت ان ہی کے پاس جا رہی ہوں۔ انہوں نے ہوٹل بلیو مون میں بلایا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ آئندہ کے کیا ارادے ہیں؟"

"پتا نہیں ابھی تو ہم اپنی محبت کا سفر طے کر رہے ہیں اس کے بعد سوچیں گے۔"

مجھے اس کی باتیں اچھی لگیں۔ اس نے بہت سچائی کے ساتھ اعتراف کر لیا تھا کہ محبت اسے راس آ گئی ہے۔

اس کے بعد میں خود مصروف ہو گیا۔ یہ مصروفیت کسی اور شہر میں نکل آئی تھی۔ پورے چھ مہینوں کے بعد میری واپسی ہوئی تھی۔ اس دوران میں شاہد فراز اور ثمن کو یاد تو کرتا رہا تھا لیکن یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ ان دونوں کی محبت کا کیا انجام ہوا تھا۔

میرا خیال تھا کہ دونوں کے گھر والوں کو اس رشتے پر اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ ثمن کے والد پروفیسر تھے اور فراز خود صاحب علم تھا۔ اچھا خاصا کھاتا پیتا انسان تھا۔

جب آپ اپنے شہر سے نکل کر چند مہینوں کے لیے کہیں اور جائیں تو اپنا شہر بہت یاد آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آتا رہتا ہے کہ جب اپنے شہر واپس جاؤں گا تو نہ جانے کیا تبدیلی ہوئی ہو۔ شاید سب کچھ بدل گیا ہو لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سب چیزیں وہی ... وہی، وہی گلیاں، وہی مکان، وہی دکانیں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جب میں بھی چھ ماہ کے بعد لوٹا تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ اپنی جگہ پر ویسا ہی موجود تھا۔

زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ وہی لوگ، وہی چہرے اور مجھے ثمن بھی دکھائی دے گئی معمول کے مطابق خوبصورت اور تازہ تازہ سی۔ ... وہ خود ہی میرے پاس آ گئی۔ "ارے حمید صاحب۔ کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔" میں نے بتایا۔ "دفتر کے کام سے کل ہی واپس آیا ہوں۔"

"ہم لوگ تو پریشان ہو گئے تھے۔"

"یہ بتاؤ تمہارے شاعر کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہیں۔"

"ملاقات ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرا دی۔ "ہم کل ہی ملے تھے۔"

"میں جا رہا ہوں اس سے ملنے کے لیے لیکن تم فون کر کے اسے مت بتا دینا کہ میں پہنچ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے میں نہیں بتاؤں گی۔"

میں شاہد فراز سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ دستک کے جواب میں اس نے جب دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "ارے حمید بھائی تم۔" وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں اسلام آباد چلا گیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"آؤ۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر اندر لے آیا۔

اندر آ کر مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ ایک تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ تبدیلی خود اس کی شخصیت میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"میں نے اسے ہمیشہ قیمتی اور اچھے کپڑوں میں دیکھا تھا لیکن اس وقت اس نے بہت معمولی کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ کی قیمتی گھڑی بھی اس کی کلائی پر نہیں تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گھر میں وہ قیمتی اور خوبصورت فرنیچر بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔

... اس کی شخصیت ... ہو۔

"فراز۔" میں نے اس سے پوچھا۔ ... تو ہے۔ تمہارے گھر کی کیا حالت ہوئی۔"

"بس ... مت پوچھو بھائی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" "کہاں چلا گیا ہے سب کچھ۔"

"سب کچھ فروخت ہو گیا ہے۔" اس نے سادگی سے بتایا۔ "ایک ایک چیز بک گئی ہے۔"

"بک گئی...... مگر وہ کیوں؟" میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیا تم یقین کرو گے کہ میری ملازمت بھی ختم ہو گئی ہے۔" اس نے بتایا۔

"آخر کیوں؟" میں یہ سب سن کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"کیسے ہوا یہ سب۔"

"ٹھہرو میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں پھر اطمینان سے بتاؤں گا۔"

وہ چائے بنانے چلا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کہاں تو اتنے قیمتی اور خوبصورت فرنیچر اور کہاں یہ معمولی سی کرسیاں۔ چھ مہینوں میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا لیکن کس طرح اور کیوں؟

وہ کچھ دیر بعد چائے بنا کر لے آیا اور پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا یار ہو سکتا ہے کہ اس میں چینی ذرا کم ہو کیونکہ آج کل میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ میں چینی خرید سکوں۔"

"خدا کے بندے کچھ تو بتاؤ۔ آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "تمہاری یہ حالت کیوں ہو گئی ہے؟"

"بس" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "زندگی میں یہ دن بھی آنے تھے، وہ آ گئے۔"

"لیکن کیوں آئے کچھ پتا تو چلے۔"

"سنو۔ ثمن بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ تو میں بتا رہا ہوں کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن تم اپنے حال کے بارے میں بتاؤ۔ ثمن کا ذکر مت کرو۔"

"میرے دوست۔ میں وہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ثمن میرے لیے خدا کی عظیم نعمت، اس کا بے مثال تحفہ بن کر آئی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کے بغیر میری زندگی ادھوری تھی لیکن اب مکمل ہو چکی ہے۔"

میں افسوس بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس کا دماغ الٹ چکا تھا۔ میں اس سے کچھ اور معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس نے ثمن کی کہانی شروع کر دی تھی۔

لیکن میں نے درمیان میں اس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ چائے ختم کرنے کے بعد پھر بتانے لگا۔ "ثمن میری زندگی میں بہار بن کر آئی ہے۔ میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو جانتے ہو یہ ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"میرا خیال ہے کہ تم نے اسے کسی ہوٹل میں بلایا تھا۔"

"ہاں ایک مقامی ہوٹل میں۔" فراز نے بتایا۔ "ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دن اندازہ ہوا کہ اس کی باتوں میں چاشنی ہے۔ وہ اچھے جملوں کا استعمال جانتی ہے۔ ہاں اس دن ہم نے اگرچہ محبت کے موضوع پر بہت باتیں کی تھیں لیکن محبت کا اظہار نہیں ہوا تھا۔"

"کیا تم واقعی اس سے متاثر ہو گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔" اس نے کہا۔ "اور آج تک متاثر ہوں۔"

"یہ بتاؤ اظہار کب ہوا۔ میں یہ داستان سننے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے پوچھا۔

"پہلی ملاقات کے چوتھے دن۔ ہم ایک ہوٹل میں لنچ کے وقت ملے تھے۔" اس نے بتایا۔ "اس دن پہلی بار میں نے اس سے محبت کا اظہار کیا تھا۔"

"اوہ۔ مبارک ہو اور اس کا کیا جواب تھا؟"

"اس دن وہ خاموش رہی تھی۔" فراز نے بتایا۔ "اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس نے محبت کا اظہار اگلی ملاقات میں ایک ہوٹل میں کیا تھا۔ ہم کینڈل لائٹ ڈنر کر رہے تھے۔ بہت خوبصورت ماحول تھا اور اس وقت اس نے مجھ سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔"

"اور اس وقت تمہارا کیا حال تھا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ "میں جیسے ہواؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ دونوں جہان میرے واسطے مکمل ہو گئے تھے۔ اس اظہار کے بعد مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ سب کچھ تو مل چکا تھا، اس کے بعد اس کی سالگرہ تھی۔ اس نے یونہی ذکر کیا تھا کہ فلاں تاریخ کو اس کی برتھ ڈے ہے۔ ہم نے یہ برتھ ڈے پنج لگژری میں سلیبریٹ کی تھی حالانکہ وہ منع بھی کر رہی تھی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اس کی برتھ ڈے پر کوئی تقریب نہ کروں۔"

"بھائی فراز۔ تم نے واقعی اپنی محبت کا ثبوت دینا شروع کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کاش میں اس محبت کا حق ادا کرنے کے قابل ہوتا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "حمید بھائی تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ محبت کا جذبہ کتنا طاقتور ہوتا ہے۔"

"چلو تم سے سن کر کچھ تجربہ حاصل کرتا جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"پھر یہ ہوا کہ ہم روزانہ ملنے لگے۔ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر سکون ہی نہیں ملتا تھا۔"

"کیا تم اسے اپنے گھر بھی لائے تھے۔" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک بار وہ بھی اس کی اپنی ضد پر۔" اس نے بتایا۔ "ورنہ ہم عام طور پر ہوٹلز میں ملا کرتے تھے۔ تم یقین کرو کہ اس دوران میں ہم نے شہر کا ہر ہوٹل چھان مارا ہے۔ اس سلسلے میں بھی اس کے اعلیٰ ٹیسٹ کی داد دینا پڑتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ فلاں ہوٹل کی کون سی ڈش اچھی ہوتی ہے۔ کھانوں کے معاملے میں بھی اس کا ذوق کمال کا ہے۔ میں تو اس کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہوں کہ قدرت نے اس میں کیسی کیسی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔"

"تم تو یار اس کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھک رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ وہ ہے ہی اسی قابل۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تمہیں یاد ہے مرزا غالب نے مومن کے ایک شعر کے لیے کہا تھا کہ مومن اپنا یہ شعر مجھے دے دیں۔ اس کے عوض میں اپنا پورا کلام ان کے حوالے کر دوں گا۔ وہی حال میرا ہے۔ میں اپنی پوری شاعری اس کے قدموں پر رکھنے کو تیار ہوں۔"

"میری جان۔ میں تمہارے عشق کی داستان سن رہا ہوں لیکن ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ تم پر یہ زوال کیوں آیا ہے۔ تمہاری یہ حالت کس طرح ہوئی ہے؟"

"میں اب وہی بتانے جا رہا ہوں۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھ گئے۔"

"یہی کہ ثمن ایک لالچی لڑکی ثابت ہوئی ہے۔ اس نے تم سے شاپنگ کروائی۔ تم سے پیسے لیے، تم اس پر خرچ کرتے رہے اور اب اس کے بعد تمہارا یہ حال ہو گیا ہے۔"

"نہیں میرے دوست ایسا مت کہو۔" فراز جیسے چیخ اٹھا تھا۔ "وہ اس معاملے میں بھی اعلیٰ کردار کی لڑکی ہے، اس نے آج تک مجھ سے ایک پیسے کی چیز قبول نہیں کی ہے۔ اس کا معاملہ دوسرا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟"

"دیکھو۔ اب میں تمہیں ایک قطعہ لکھ کر دے رہا ہوں۔" فراز نے کہا۔ "تم یہ قطعہ ثمن کو دے دینا اور خود بھی پڑھ لینا۔ اس سے ہر بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔"

"کمال ہے یار۔ چلو بتاؤ قطعہ کیا ہے۔"

فراز نے ایک کاغذ پر ایک قطعہ لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ "تم بھی پڑھ لو۔"

میں نے اس کا لکھا ہوا قطعہ پڑھا اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور جب آپ بھی قطعہ پڑھیں گے تو آپ بھی سمجھ جائیں گے۔ قطعہ یہ ہے۔

عہد وفا ہوا ہے نبھانا مجھے محال
ممکن نہیں وصال اسی مارک میں کرنا
ہوٹل بلا بلا کر تمہیں ہو گیا غریب
آئندہ ملاقات کسی پارک میں کرنا

جب قید میں ہو بلبل تو صیاد کے چہرے پر بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی ہے... جب پانسا پلٹ جائے تو مسکراہٹ کا یہی کھیل بلبل کے چہرے پر منتقل ہو جاتا ہے مگر ساتھ ہی اس میں ایسا جارحانہ پن نمایاں ہوتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔

مضبوط چال چلتے چلتے لڑکھڑا جانے والے شکاری کا تماشائے عبرت

دامِ صیاد

سلیم انور
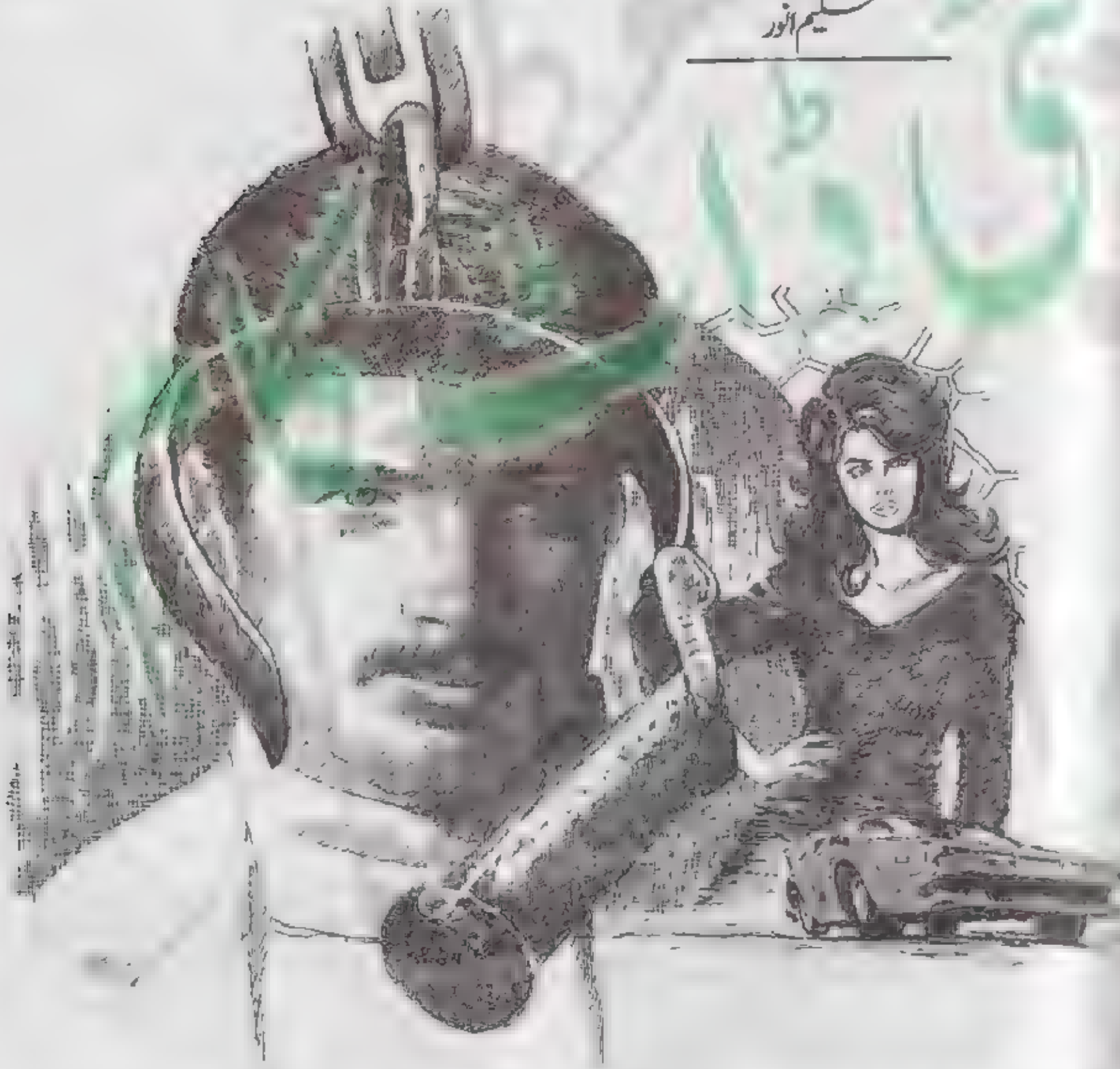
"تھینکس بیوٹی فل۔" میں نے مارتھا کو مضبوطی کے ساتھ اپنے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ یہ کار میری ماں کے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہوگی۔ اس کی طبیعت اب اکثر خراب رہنے لگی ہے اور اسے اپنے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لینے کے لیے بار بار آنا جانا پڑتا ہے۔ اسے کار کی اشد ضرورت ہے۔"

"اٹ از او کے جیسن۔" مارتھا نے سر ہلاتے ہوئے ملائمت سے جواب دیا۔

’’نہیں مارتھا۔ تم سمجھ نہیں رہی ہو کہ تم مجھ پر کتنا بڑا احسان کر رہی ہو۔‘‘ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’میری ماں کی کار مہینوں سے بار بار ورکشاپ میں جا رہی ہے اور اس کے باوجود وہ ٹھیک نہیں چل رہی ہے۔ میں ان سے کب سے کہہ رہا ہوں کہ وہ ایک نئی کار لے لیں لیکن مالی مجبوریوں کی بنا پر... ویل، چونکہ اب میرے پاس یہ نئی مرسڈیز کار آ گئی ہے تو میں نے سوچا کہ میں اپنی پرانی کار اپنی ماں کو دے دوں۔‘‘

’’اس بات سے تمہاری ماں سے انسیت ظاہر ہوتی ہے، جیسن!‘‘ مارتھا نے رسیلے لہجے میں کہا۔

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے یہ کار کس طرح پہنچاؤں؟ وہ میامی میں رہتی ہے۔‘‘ میں نے اپنے لہجے میں بے چارگی کا عنصر لاتے ہوئے کہا۔ ’’میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں۔‘‘

’’واقعی یہ میرے لیے ایسی بات نہیں کہ تم میرے شکر گزار بنو۔ یہ تم پر کوئی احسان نہیں ہوگا۔ نیوجرسی میں جتنی بارشیں ہو رہی ہیں اس سے ڈر ہے کہ کہیں مجھے شدید بخار نہ ہو جائے۔ اس طرح مجھے گرم موسم میں جانے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے علاوہ میں تمہاری ماں سے ملنے کے لیے بھی بیتاب ہوں۔‘‘ مارتھا نے جواب دیا۔

’’تمہیں اس سے مل کر واقعی خوشی ہوگی۔ وہ بہت ہی پیاری خاتون ہے۔ اور اسے اس کار کی شدید طور پر ضرورت بھی ہے۔ میں اسے مسلسل کہہ رہا ہوں جبکہ یہ ایک بڑی اسپورٹس یوٹیلٹی کار ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اسے ڈرائیو کرنے میں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔‘‘

اس بات پر مارتھا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنی بڑی پراعتماد براؤن آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’یقیناً نہیں۔ افسوس کہ تم ساتھ نہیں چل رہے ہو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ’’بہت لطف آتا۔ بس ہم دونوں ہوتے اور ایک لمبی ڈرائیو۔‘‘

’’کاش میں چل سکتا۔‘‘ میں نے اپنے لہجے میں بھرپور معذرت شامل کرتے ہوئے افسردگی کا اظہار کیا۔ ’’لیکن میں مجبور ہوں۔ ان لوگوں نے مجھ پر کام کا اتنا بوجھ لاد رکھا ہے کہ میرے لیے کسی وقت بھی چھٹی لینا ممکن نہیں ہے۔ میری ذمے داریاں ہی کچھ اس قسم کی ہیں کہ میں شہر سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تم سے یہ کام کبھی نہیں کہتا۔ لیکن میں اپنی ماں سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اس ماہ کے آخر تک اسے یہ کار مل جائے گی۔ وہ اب اتنی جوان نہیں رہی جتنی کہ کبھی ہوا کرتی تھی۔ وہ خود یہاں آ کر کار نہیں لے جا سکتی۔ تنہا اتنی لمبی ڈرائیو کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس تک کار پہنچانے کے لیے وہ مجھ پر انحصار کر رہی ہے اور میں اس سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔‘‘ میں نے اپنے لہجے میں ڈرامائی تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

مارتھا نے ہمدردی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اس کے گال پر ہلکا سا بوسہ لیا اور بولا۔ ’’میں جانتا ہوں کہ اٹھارہ گھنٹے کی ڈرائیو ایک طویل مسافت ہے اور تنہا سفر کرنا بھی ایک بڑا رسک ہے۔‘‘ میں نے اسے ایک بار پھر اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔ ’’میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کی تلافی کر دوں گا۔‘‘

’’میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی، جیسن۔‘‘ مارتھا نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میری بانہوں سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ’’یہ کار بحفاظت تمہاری ماں تک پہنچ جائے گی۔‘‘

میں نے کار کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں اور الوداعی بوسہ لیتے ہوئے بولا۔ ’’تم سے کل ملاقات ہوگی، بیوٹی فل!‘‘

وہ کار میں بیٹھی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ پھر ہاتھ لہراتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو تب میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ’’میرا سحر کام کر گیا!‘‘ میں نے بلند آواز سے کہا۔

بے شک میری شخصیت کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا تھا اور کیوں نہ بولتا؟ میں نے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا تو خود پر رشک آنے لگا۔ میں بے انتہا خوبصورت ہوں۔ میری بڑی بڑی نیلی آنکھیں، براؤن گھنگھریالے بال اور کسرتی جسم۔ مجھے عورتوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ مقامی جمنازیم میں روزانہ کی ورزش اور نوٹوں کی وہ گڈی جو میں ہمیشہ اپنے پرس میں رکھتا تھا، عورتوں کے لیے بے پناہ کشش کا باعث ہوتی تھی۔

اور ہاں مجھے اپنی گرل فرینڈز کو اس بات پر قائل کرنے میں کبھی کوئی مشکل درپیش نہیں آتی تھی کہ وہ مجھ پر ایک چھوٹا سا احسان کریں اور ایک وفادار بیٹے کی جانب سے ایک ضرورت مند ماں کو جو میامی میں رہتی ہے، ایک کار پہنچا دیں۔

ایک جنٹلمین ہونے کے ناتے میں نہ صرف اس دورے کے تمام اخراجات ادا کرتا تھا بلکہ واپسی کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی دیتا تھا۔ لہٰذا میری گرل فرینڈز بلا کسی تردد کے رضامند ہو جاتی تھیں۔

مارتھا کو بھی میں نے اپنی بڑی سی اسپورٹس یوٹیلٹی کار اپنی ماں کے پاس میامی پہنچانے کے لیے رضامند کر لیا تھا۔ البتہ یہ حقیقت اس کے گوش گزار نہیں کی تھی کہ جو کار وہ ڈرائیو کر کے میامی لے جائے گی اس کے سائڈ پینلز میں آٹھ سو پاؤنڈ ہیروئن چھپی ہوئی ہے اور مزید یہ کہ میامی میں اس سے جو اونڈلیڈی ہوٹل میں ملاقات کرے گی وہ فلوریڈا کے منشیات کے بڑے ڈیلروں میں سے ایک ہے۔

میں نے خود کو جیل سے دور رکھنے کا جو بہترین طریقہ ڈھونڈا تھا وہ یہی تھا کہ مال پہنچانے کا کام میرے بجائے کوئی اور سرانجام دے، اور پھر شپمنٹ کے اگلے روز جو لفافہ میرے دروازے پر پہنچایا جاتا تھا اس میں موجود رقم میری تیز رفتار کاروں، فینسی ریسٹورنٹس اور قیمتی سوٹوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بہت ہوتی تھی۔

میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ میری اس کارگزاری کا ریکارڈ بے داغ تھا... تقریباً بے داغ۔ بس ایک مرتبہ ایک چھوٹی سی چوک ہو گئی تھی۔ گوکہ اس کے لیے مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ میں جب اس وقت کو یاد کرتا ہوں، جب میری یہ حسین دنیا تقریباً ٹکڑے ٹکڑے ہونے والی تھی تو غصے سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میں نے اپنی مرضی کے خلاف اپنا کام سرانجام دینے کے لیے ایک لڑکی کا رسک لے لیا تھا۔ وہ الزبتھ نامی کالج کی ایک دلکش طالبہ تھی۔ میری اس سے ملاقات کمیونٹی کالج میں ہوئی تھی جہاں سے میں اکثر لڑکیوں کو اپنا کام نکالنے کے لیے چنا کرتا تھا۔ وہ موسم خزاں میں یونیورسٹی آف میری لینڈ واپس جانے سے قبل سمر بریک میں چند کلاسز لے رہی تھی۔

کمیونٹی کالج جو رات میں کمپیوٹر سائنس کلاسز پیش کیا کرتا تھا وہ ان نوجوان عورتوں سے ملاقات کرنے کی بہترین جگہ تھی جو رومانس کے لیے ہر وقت مائل رہتی ہیں۔

الزبتھ میرے کام کے لیے پرفیکٹ تھی یا میں نے اپنے طور پر یہی سوچا تھا۔ وہ بااعتماد لگتی تھی اور مجھ پر عنایت کرنے کے لیے بیتاب تھی۔ اس کی بیتابی دیکھ کر میں نے یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا اور اس کے دورے کے لیے اسے وہ قیمتی سامان خرید کر دیا جو ... میں نے اس سوٹ کیس کی لائننگ میں کئی ملین پونڈ کوکین پوشیدہ طور پر ... تھی جو کہ اگرچہ زیادہ مقدار نہیں تھی۔

لیکن اس لحاظ سے اچھی خاصی مقدار تھی کہ مجھے ایک طویل عرصے کے لیے جیل میں ڈال سکتی تھی۔ میں یہ رسک لینے کے لیے تیار ہو گیا لیکن آخر میں یہ رسک میرے لیے مالی طور پر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔

ہوا یوں کہ میامی میں جو میرا رابطہ تھا وہ ہوٹل کے بارے میں کچھ کنفیوز ہو گیا کیونکہ وہ الزبتھ کا روم نمبر بھول گیا اور کوکین کو بروقت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الزبتھ اور میرے رابطے کی آپس میں ملاقات نہ ہو سکی اور الزبتھ ہوٹل سے ائرپورٹ روانہ ہو گئی لیکن اس سے قبل کہ وہ جہاز میں سوار ہوتی، اسے میامی ائرپورٹ پر دھر لیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ میں اب اپنے مال کی انٹراسٹیٹ 95 کے راستے بھیجنے لگا اور میں نے ہوائی جہاز کے ذریعے مال روانہ کرنے کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔

خوش قسمتی سے میامی میں موجود میرا رابطہ ائرپورٹ پر بھی بہت کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نے الزبتھ کی حراست کے بارے میں مجھے بروقت خبر کر دی تھی۔ مجھے فوری طور پر وہاں سے نکل جانا تھا۔

میں نے گزشتہ چار برسوں میں جو کچھ بھی بنایا تھا وہ مجھے چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔ میرا اپارٹمنٹ، میری کار، پوش کنٹری کلب کی میری ممبر شپ، حتیٰ کہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس بھی۔

میں نے ایک ہی دن میں اپنا کاروبار نیویارک، نیوجرسی منتقل کر دیا اور وہاں ایک نئے نام کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر دی۔

نیو آرک اتنا چارمنگ نہیں جتنا کہ بالٹی مور تھا لیکن یہاں بھی مقامی کالج میں لڑکیوں سے ملاقات کرنے کے ویسے ہی بھرپور مواقع موجود تھے جو بالٹی مور میں دستیاب تھے۔

اکثر میرے ذہن کے پردے پر الزبتھ کی تصویر ابھر آتی تھی جو ائرپورٹ پر ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کے متعلقہ ایجنٹوں کو وضاحت پیش کر کے اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہ رہی تھی اور وہ ایجنٹ اسے سامان سمیت حراست میں لے کر جیل بھیج رہے تھے۔

لیکن یہ تین ماہ پہلے کی بات تھی اور اب یہاں نیو آرک، نیوجرسی میں میرا کاروبار ایک بار پھر اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔

اگلے روز میں مارتھا کو الوداع کہنے کے لیے اس کی قیام گاہ پہنچ گیا۔ اس کی میامی روانگی سے قبل میں اس بات کا اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ وہ صحیح طور پر وہ سب کچھ سمجھ گئی ہے جو اسے میامی پہنچنے کے بعد کرنا ہوگا۔ ٹرپ پر روانہ ہونے سے پیشتر میرے لیے ان باتوں کو چیک کرنا لازمی تھا۔

''تمہارے واپس آنے پر تم سے ملاقات ہو گی۔'' میں نے اس کا سوٹ کیس اس کار کی عقبی نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اسے خود سے چمٹا لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''میں تمہیں بے حد مس کروں گا۔''

''میں بھی تمہیں بے حد مس کروں گی۔'' وہ جذبات سے بھرپور لہجے میں گنگنائی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب سی ہو رہی تھیں۔

''مارتھا......'' میں نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''آئی لو یو!''

''اوہ، جیسن۔'' وہ آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''آئی لو یو ٹو!'' اس کی حسین آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ہم ایک طویل لمحے تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ پھر میں نے اس کا الوداعی بوسہ لیا اور وہ بالآخر کار میں سوار ہو گئی۔

جب وہ روانہ ہو گئی تو میں نے دل ہی دل میں ایک قہقہہ لگایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ جب بھی وہ کار لے کر روانہ ہونے لگتی ہیں تو میں ہر ایک سے یہ کیوں کہتا ہوں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ صرف موج مستی کے لیے!

آئندہ چند روز تک سب کچھ معمول کی رفتار سے جاری رہا۔

میں اگلی شپمنٹ کے لیے ایک اور نئی عورت کو تیار کر رہا تھا۔ یہ شپمنٹ مجھے اگلے ماہ کے شروع میں بھیجنی تھی۔ یہ سرخ بالوں والی ایک دراز قامت عورت تھی جس نے کمپیوٹرز ان بزنس میں داخلہ لے رکھا تھا۔ میں نے اس عورت کو بتایا کہ میں ایک بروکر ہوں اکثر میں اپنی تمام گرل فرینڈز کو یہی بتایا کرتا تھا۔ اس سے نہ صرف میری فراخ دلانہ طرز زندگی کی وضاحت ہو جاتی تھی بلکہ لڑکیاں مجھے راضی کرنے کے لیے اور بھی بیتاب ہو جاتی تھیں۔

''کیسا رہا؟'' میں نے جمعرات کو میامی میں موجود اپنے رابطے سے فون پر دریافت کیا۔

''نو پرابلم۔'' فون پر دوسری جانب سے سرسری لہجے میں جواب دیا گیا۔ ''سب کچھ ہمیشہ کی طرح رہا۔''

اب مجھے صرف اس وقت کا انتظار تھا جب مجھے ائرپورٹ پر مارتھا سے ملاقات کرنا تھی۔

میں نے یہی پروگرام بنایا تھا کہ جو رویہ میں نے اپنی ان تمام گرل فرینڈز کے ساتھ روا رکھا تھا جو میرا مال بہ حفاظت منزل تک پہنچانے کے بعد واپس لوٹتی تھیں، وہی رویہ میں مارتھا کی ائرپورٹ آمد پر اس کے ساتھ بھی روا رکھوں گا۔ اس کے احسان کے اعتراف کے طور پر میں اسے ایک شاندار ڈنر پر لے جاؤں گا۔ مجھے یقین تھا کہ اس شب مارتھا سونے سے پہلے پیے جانے والے مشروب کے لیے اپنی قیام گاہ پر مجھے ضرور مدعو کرے گی جہاں میں اس سے ایک بار پھر اپنی لازوال محبت کا دعویٰ کروں گا۔

اور پھر صبح ہونے پر میں اس کے روبرو اپنی اچھی نیت کا اظہار کرتا ہوں گا اور یہ کہنا ہوگا کہ مجھے کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ میں اپنے احساسات کی ترجمانی نہیں کر سکتا اور فی الوقت میں کچھ عرصے کے لیے اس سے لاتعلق رہوں گا۔

شاید مجھے اس کے آنسوؤں کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ غصے کا اظہار کرے۔ اس کا ناراض ہونا ایک لازمی امر ہوگا۔ لیکن اس انجام سے میں بہ خوبی واقف تھا۔ وہ یہ کہ میں مارتھا سے پھر دوبارہ کبھی نہیں ملوں گا۔

یہ میرے سخت ترین اصولوں میں سے ایک تھا اور میں اس پر سختی سے کاربند رہتا تھا۔ میری گرل فرینڈ کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو لیکن اس عورت کو اپنے مقصد کے لیے دوبارہ کبھی استعمال نہ کروں۔ یہ میرا اصول تھا اور میری کامیابی کا راز بھی۔

میں نے جونہی اسے ائرپورٹ ٹرمینل میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا، میں پکار اٹھا۔ ''مارتھا!'' ساتھ ہی اس کی طرف دوڑ پڑا اور اسے بازوؤں میں بھر کر ہوا میں گھماتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں بے حد مس کیا۔'' میرے لہجے سے خوشی عیاں تھی۔

''میں نے بھی تمہیں بے حد مس کیا۔'' مارتھا نے ہنستے ہوئے کہا اور ساتھ ہی مجھ سے چمٹ گئی۔

ہم اطراف میں ائرپورٹ کی مصروفیت سے بے خبر دیر تک ایک دوسرے سے چمٹے رہے۔ بالآخر میں نے ہچکچاتے ہوئے اسے اپنی بانہوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ ''تمہارا ٹرپ کیسا رہا؟ مجھے امید ہے کہ تمہیں بہت زیادہ تنہائی محسوس نہیں ہوئی ہو گی۔''

میں اس حد تک مارتھا کی رفاقت میں مگن تھا کہ مجھے ان دو ائرپورٹ سیکیورٹی افسران کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا جو ہمارے سر پر پہنچ چکے تھے۔ جب میں چونکا تو اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔

ان دونوں افسران نے مجھے دبوچ کر نیچے فرش پر گرا دیا۔

''چپ چاپ لیٹے رہو، رومیو!'' سرخ چہرے اور چمکیلی آنکھوں والے نے میرے چہرے کے سامنے چیختے ہوئے کہا۔ اس کے منہ سے بدبو آ رہی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے ان کی اس زیادتی پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''مجھ پر سے ہٹ جاؤ اور مجھے چھوڑ دو! تم لوگ آخر یہ کیا کر رہے ہو؟''

تب میری نظر مارتھا پر پڑی جو ایک طرف کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔

''یہ کیا...'' میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''مارتھا... میرے وکیل کو فون کرو۔''

''مجھے یقین ہے کہ آفیسر پیٹرز اس بات کا دھیان رکھے گا کہ تمہارے حقوق محفوظ رہیں، جیسن۔'' مارتھا نے دلکش انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں ایک افسر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال چکا تھا۔ مارتھا نے مجھ پر جھکتے ہوئے اپنا ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کا بیج میری آنکھوں کے سامنے لہرایا اور بولی۔ ''مجھے میامی کے ٹرپ پر بھیجنے کا شکریہ۔ میامی ہمیشہ کی طرح بے حد پیارا تھا۔ البتہ میں نہیں سمجھتی کہ میں نے تمہاری ماں پر کوئی اچھا تاثر چھوڑا ہوگا۔ لگتا ہے کہ اس نے بھی مجھے پسند نہیں کیا۔ وہ بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکی ہے جہاں تم جا رہے ہو۔ اور ہاں، تم نے اس ٹرپ میں میری تنہائی کے بارے میں پوچھا ہے تو میں بتاتی چلوں کہ میں اس سفر میں تنہا نہیں تھی۔ چونکہ تم میرے ساتھ نہیں آ سکتے تھے تو میں نے اپنی بہن کو بلوا لیا تھا۔ اس کے سیمسٹر آف تھے اور اس کے پاس فالتو وقت بھی تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بالٹی مور سے بذریعہ پرواز آ گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے جانتے ہو۔'' یہ کہہ کر مارتھا نے قدرے توقف کیا۔

میں نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''اس کا نام الزبتھ ہے۔''

پکا دھاگا

مرزا امجد بیگ

کبھی کبھی آئینے پر جمی گرد میں چہرے کے نقوش دھندلے دکھائی دیتے ہیں مگر قصور آنکھوں کا مانا جاتا ہے۔ یہی دستورِ دنیا ہے، جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا اور جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے... وہ بھی اسی کشمکش کا شکار ہو کر ایک عجیب فیصلہ کر بیٹھی تھی مگر کسی کی مستقل مزاجی اور کسی کے عہدو پیمان نے دنیا کی بھیڑ میں اسے کھونے نہیں دیا۔ ہجر اور رفاقت کے درمیان ہونے والی اس جنگ میں بیگ صاحب نے جب ثالثی کردار ادا کیا تو گلاب لمحے اس کا مقدر کیوں نہ ٹھہرتے... شادی شدہ جوڑوں اور ناخوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے والوں کے لیے سوچ کے در وا کرنے والی تحریر... شاید کسی کو اس آئینے میں اپنا دھندلا چہرہ صاف نظر آجائے۔

دفتری دیواروں کے درمیان حل ہوجانے والا ایک عجیب کیس

اگرچہ یہ کوئی فارمولا نہیں تاہم تجربہ بتاتا ہے کہ سال کے بعض مہینے اور ان مہینوں کے چند دن ایسے ہوتے ہیں کہ مصروفیت انسان کو سر کھجانے کی مہلت نہیں دیتی۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی تھا...... وہ بھی کچھ اسی قسم کا دن تھا۔

میں حسبِ معمول اپنے دفتر میں بیٹھا کلائنٹس کو نمٹا رہا تھا۔ میرے چیمبر سے ایک نکلتا تو دوسرا داخل ہوتا۔ میں عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہونے کے بعد لنچ کرتا تھا اور اس کے بعد اپنے دفتر میں آکر بیٹھ جاتا تھا جو سٹی کورٹ کے نزدیک ہی، ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں واقع ہے۔ مذکورہ بلڈنگ میں زیادہ تر وکلا ہی کے دفاتر ہیں۔

میں عموماً رات نو بجے آفس سے اٹھ جایا کرتا ہوں لیکن اس روز کلائنٹس نے کچھ ایسی یلغار کی تھی کہ یوں محسوس ہوتا تھا، آج کی رات یہیں پر گزرے گی۔ لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے میں نے اپنی سیکریٹری کو انٹرکام کیا۔

"ہیلو آمنہ! لابی کی کیا صورتِ حال ہے؟"

میں نے حال ہی میں آمنہ کو اپائنٹ کیا تھا۔ لابی سے مراد میرے آفس کا وہ حصہ تھا جہاں کلائنٹس بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

آمنہ نے بتایا۔ "سر! پانچ میل اور ایک فی میل موجود ہے۔"

"او کے...... میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے ریسیور کریڈل کر دیا۔ پانچ اور ایک، چھ...... کلائنٹس کو نمٹانے میں کم از کم ایک گھنٹا تو لگنا ہی تھا۔ لہٰذا یہ بات طے تھی کہ آج آدھے، پونے گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔ میں اللہ کا نام لے کر شروع ہو گیا۔

میرے چیمبر میں سب سے آخر میں جو کلائنٹ داخل ہوا وہ وہی فی میل تھی جس کے بارے میں مجھے آمنہ بتا چکی تھی۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس خاتون کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

اس نے رسمی علیک سلیک کے دوران میں مجھے اپنا نام سلطانہ بتایا تھا۔ وہ ایک پرکشش اور خوش شکل عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے آس پاس قائم کیا جو بعدازاں درست ثابت نہیں ہوا۔ وہ زندگی کی بیالیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ بڑی سدا بہار جوانی تھی اس کی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی جو ساڑھے نو کا وقت بتا رہا تھا۔ میں اپنے ٹارگٹ سے تھوڑا پیچھے تھا۔ اب تک مجھے تمام کلائنٹس کو نمٹا دینا چاہیے تھا۔ بہر حال، میں نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی شائستہ انداز میں پوچھا۔

"جی فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا

ہوں؟“

”آپ ایک وکیل کی حیثیت سے دفتر کھولے بیٹھے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اور مجھے قانونی مدد کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے تعاون سے ایک کیس دائر کرانا چاہتی ہوں اس لیے حاضر ہوئی ہوں۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ انداز میں سلطانہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جی..... کیس کی نوعیت کیا ہے؟“

بات ختم کرتے ہی میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ سلطانہ نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

”نوعیت..... ہے چھٹکارا!“

”آپ عدالت کے ذریعے کس غم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں؟“

”اس غم کا نام ہے رئیس شاہ!“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

اس کا مطمح نظر بڑی حد تک میری سمجھ میں آگیا تھا لیکن پھر بھی تصدیق کی خاطر میں نے پوچھنا ضروری جانا۔

”رئیس شاہ..... غالباً آپ کے شوہر کا نام ہے؟“

”آپ بالکل درست جگہ پر پہنچے ہیں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک قابل اور دور اندیش وکیل ہیں۔“

میں نے اپنی تعریف کو سنی ان سنی کرتے ہوئے سلطانہ سے استفسار کیا۔ ”لگے ہاتھوں اس درست جگہ کا حدود اربعہ بھی بیان کردیں جہاں میں بہ آسانی پہنچ گیا ہوں؟“

سلطانہ نامی وہ خاتون بڑی پُراعتماد اور نڈر محسوس ہوتی تھی۔ وہ بڑے کھلے ڈلے انداز میں مجھے اپنے مسئلے سے آگاہ کررہی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”نام تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ ہماری شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں۔ رئیس شاہ ایک نجومی ہے۔ زائچہ وغیرہ بنا کر لوگوں کی قسمت کا حال بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ قیمتی پتھروں کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ کسی وقت اس نے نجوم کی دکان ناظم آباد میں سجا رکھی تھی اور اس کی رہائش یوپی موڑ پر تھی۔ ان دنوں ہم نارتھ ناظم آباد میں رہتے تھے۔ پھر ہماری شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد ہم لوگ گلشن اقبال کے ایک پوش بلاک میں شفٹ ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی رئیس شاہ نے اپنا کاروبار بھی گلشن میں یعنی بنگلے کے اندر ہی منتقل کردیا۔ ناظم آباد کی ایک چھوٹی سی دکان میں جو کام ”آستانہ رئیسیہ“ کے بینر تلے جاری تھا وہ گلشن پہنچ کر ”شاہ کلینک“ میں بدل گیا۔

علاقہ اور ماحول بدلا تو شاہ صاحب ایک عام نجومی سے کنسلٹنٹ اور پروفیسر شاہ بن گئے اور ظاہر ہے، ان کی فیس میں بھی اضافہ ہوگیا.....“ اس نے چند لمحات کا توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”یہ ہیں اب تک کے حالات بیگ صاحب!“

اس نے بڑی بے تکلفی سے مجھے ”بیگ صاحب“ کہا تو میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”سلطانہ جی، آپ نے اپنے شوہر کا جو جغرافیہ اور تاریخ بیان کی ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ آپ لوگوں نے ہر گزرتے دن کے ساتھ ترقی کی ہے اور.....“

”آپ لوگوں نے نہیں بیگ صاحب!“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ”صرف رئیس شاہ کہیں!“

”خیر.....“ میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”کان سیدھی طرح پکڑیں یا ہاتھ گھما کر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رئیس شاہ کی ترقی، آپ ہی کی ترقی سمجھی جائے گی، آپ اس کی بیوی ہیں۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کروں گی بیگ صاحب!“ وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ ”اگر رئیس شاہ کی ترقی میری ترقی ہوتی تو پھر مجھے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس آنے کی ضرورت پیش نہ آتی!“ لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے، جب تک میں آپ کو رئیس شاہ کی عیاری، مکاری کی کہانی نہیں سناؤں گی، آپ میرے مسئلے کو سمجھ نہیں سکیں گے.....“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں، آپ کہانی شروع کردیں.....“ مجھے دیر تو ہو ہی چکی تھی۔ تھوڑا وقت سلطانہ کو مزید دے دیتا تو اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ جب تک میں اس کی کہانی نہ سنتا، کیس واضح نہیں ہوسکتا تھا۔

اس روز سلطانہ نامی اس خوب صورت عورت کی زبانی ان میاں بیوی کے جو حالات میرے علم میں آئے، ذیل میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہوجائیں۔ میں نے اس کہانی میں سے غیر ضروری باتوں کو دانستہ حذف کردیا ہے اور بہت سی باتیں اس لیے چھپالی ہیں کہ ان کا انکشاف مناسب موقعے پر ہی موزوں رہے گا۔“

☆☆☆

رئیس شاہ کی عمر اس وقت لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ وہ مناسب صحت اور متناسب بدن کا مالک ایک شاطر

انسان تھا۔ سلطانہ سے شادی سے قبل وہ یوپی موڑ، نیو کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے کسی زمانے میں شادی بھی کی تھی لیکن پہلی بیوی سلمٰی سے اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ جتنا عرصہ بھی میاں بیوی کی حیثیت سے ایک چھت کے نیچے رہے، صبح شام ان میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہا۔ اسی دوران میں ان کی ایک بچی بھی پیدا ہوگئی۔ رئیس شاہ ان دنوں باقاعدہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اگر کچھ کرتا بھی تھا تو وہ کام تھا ”ٹھیلا لگانا“.....اور آئے دن اس ٹھیلے کی نوعیت بھی بدلتی رہتی تھی۔ کبھی وہ سبزی کا ٹھیلا بن جاتا، کبھی چنا چاٹ کا، کبھی بریانی کا تو کبھی بن کباب کا اور کبھی بھوسی ٹکڑے کا۔ میاں بیوی کے بیچ اختلاف اور جھگڑے کے اور بھی بہت سے عوامل ہوں گے لیکن سب سے بڑا سبب معاشی تنگی ہی تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ یہ کہ اس زمانے میں وہ شخص رئیس ہوا کرتا تھا.....!

سب کچھ اسی ڈھب پر آگے بڑھتا رہا اور جب ان کی بیٹی صدف دو سال کی ہوئی تو ایک رات سلمٰی کا انتقال ہوگیا۔ رئیس شاہ کا کوئی بہن بھائی یا قریبی رشتے دار اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ دو سال کی بچی کی پرورش کوئی آسان کام نہیں تھا، لہٰذا صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے صدف کا ماموں اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اعجاز حسین اور نزہت کے اپنے بھی بچے تھے لہٰذا صدف ماموں زاد بہن بھائیوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگی۔ اس دوران میں ایک عجیب چیز دیکھنے میں آئی۔

ابتدا میں تو دنیا دکھاوے کے لیے رئیس شاہ اپنی بچی سے ملنے اعجاز حسین کے گھر جاتا رہا پھر اس نے رخ پھیر لیا۔ صدف کی جانب سے اس کی بے اعتنائی عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر اعجاز حسین اور اس کی بیوی نزہت، رئیس شاہ کے ذہن میں کلبلانے والے شک کے کیڑے سے بہ خوبی آگاہ تھے اور انہوں نے اس کی بے مروتی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ واضح رہے کہ رئیس شاہ کا مذکورہ شک سلمٰی کے کردار کے حوالے سے تھا۔ اس نے صدف کو اپنی اولاد ہی تسلیم نہیں کیا تھا۔ میاں بیوی کے مابین ہونے والے آئے روز کے فساد کی ایک نمایاں وجہ یہ بھی تھی۔ بہرحال، رئیس شاہ نے صدف کی جانب سے مکمل لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ پھر کچھ عرصے کے لیے وہ یوپی موڑ کے منظر سے بھی غائب ہوگیا۔

تین ماہ کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ اب پہلے والا رئیس نہیں رہا تھا۔ رئیس شاہ بن گیا تھا۔ اس نے داڑھی چھوڑ دی تھی اور رکھ رکھاؤ میں بھی بڑا سنجیدہ پن آگیا تھا۔ پتا چلا کہ وہ اب ٹھیلا نہیں لگاتا بلکہ محنت مزدوری والا کوئی بھی کام نہیں کرتا کیونکہ

وہ عامل کامل اور نجومی وغیرہ بن چکا تھا۔ یہ تین ماہ اس نے شیخوپورہ میں گزارے تھے اور وہاں کسی پہنچے ہوئے بابا سے اس نے عملیات اور نجوم کے بارے میں بہت کچھ سیکھا تھا۔

اس قسم کے تن تنہا لوگ عموماً اپنی اقامت گاہ ہی میں نشست کا بندوبست کرتے ہیں لیکن رئیس شاہ نے ذرا مختلف انداز میں اپنی پریکٹس کا آغاز کیا۔ رہائش تو اس نے یوپی موڑ پر ہی رہنے دی، البتہ آستانے کے لیے اس نے ناظم آباد کے علاقے کا انتخاب کیا۔ سیف اللہ کے اڈے کے نزدیک ہی رئیس شاہ نے ”آستانہ رئیسیہ“ قائم کرلیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ لوگوں کے زائچے بناتا، انہیں روحانی مشورے دیتا، بندش وغیرہ کا جوڑ توڑ کرتا، ان کے لیے مختلف پتھر اور نگینے تجویز کرتا اور الواح و طلسمات بھی دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دھندا چل نکلا اور اس کا آستانہ خواتین و حضرات سے آباد نظر آنے لگا۔

ہمارے ملک بلکہ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ یہاں دو پیشوں کے لیے کسی سند، ڈگری، ڈپلوما یا لائسنس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جس کا جی چاہے، وہ بڑے دھڑلے سے یہ کام شروع کرسکتا ہے۔ اول، پیشہ گداگری۔ دوم، پیشہ پیری۔ بس، آپ اپنا شیطان کرسی کسی جگہ جم کر بیٹھ جائیں۔ نہ بھیک دینے والوں کی کمی ہے اور نہ ہی اندھی عقیدت رکھنے والے جاں نثار مریدوں کا کال ہے مگر صاحب سلسلہ اور صاحب نسبت سچے اور کھرے، اہل علم و اہل ہنر کا میں دل سے احترام کرتا ہوں۔ رئیس شاہ کے پاس آنے والے سائلین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ سائلین اس کے کلائنٹس تھے۔ انہی لوگوں میں ایک خاتون تھی قمر النسا۔

قمر النسا کو وہم ہوگیا تھا کہ اس کی بیٹی زیب النسا پر کسی نے کچھ کردیا ہے۔ یعنی وہ کسی بندش کے زیر اثر ہے۔ جہاں بھی اس کے رشتے کی بات چلتی تھی، تھوڑے ہی دنوں میں معاملات بگڑ کر ختم ہوجاتے تھے۔ حالانکہ اللہ نے اس کی بیٹی کو شکل اور عقل سب کچھ دے رکھا تھا۔ عمر تیزی سے نکلی جارہی تھی اور وہ زیب النسا کی شادی کے لیے بہت پریشان تھی۔ اس لیے بھی کہ زیب النسا کا باپ عبدالقادر اس دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ اگرچہ نارتھ ناظم آباد میں ذاتی بنگلا تھا۔ عبدالقادر نے اپنی زندگی میں، مختلف مالیاتی اداروں میں اچھی خاصی رقم انویسٹ کررکھی تھی جہاں سے بڑا معقول منافع آجاتا تھا جو ان تینوں کی گزر بسر کے لیے بہت کافی تھا۔ تینوں سے مراد قمر النسا، زیب النسا اور زیب النسا کا چھوٹا بھائی فیصل۔ فیصل کی عمر پندرہ کے آس پاس تھی۔ وہ ایک نکما اور آوارہ نوجوان تھا۔

قمرالنسا نے اپنی کسی جاننے والی سے رئیس شاہ کی شہرت سنی تو ایک روز وہ فیصل کے ساتھ آستانہ رئیسیہ پر پہنچ گئی۔ رئیس شاہ اپنے پاس آنے والوں کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے ابتدائی چند سوالات ہی میں ان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کرلیا کرتا تھا۔ بہر حال، یہ رئیس شاہ کی چالاکی تھی یا اس کا طریقۂ واردات...... تاہم وہ اس ہنر میں بہت طاق تھا۔ قمر کے ساتھ بھی اس نے یہی حربہ آزمایا اور آخر میں کہا۔

''جی خاتون...... بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''میں اپنی بیٹی زیب (زیب النسا) کے سلسلے میں حاضر ہوئی ہوں شاہ جی۔'' قمرالنسا نے دھیمی آواز میں کہا، پھر اپنا مسئلہ بیان کردیا۔

رئیس شاہ نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی اور گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''لڑکی کا زائچہ بنانا پڑے گا۔''

''زائچہ بنائیں جی یا کوئی تعویذ وغیرہ دیں۔'' قمر عقیدت بھرے لہجے میں بولی۔ ''بس میرا کام ہونا چاہیے۔''

''جب آپ میرے آستانے تک آگئی ہیں تو سمجھیں کہ کام تو سو فیصد ہوگا۔'' رئیس شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تعویذ یا علاج معالجے کی باری تو بعد میں آئے گی۔ پہلے زائچہ بنا کر یہ تو دیکھ لوں کہ لڑکی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''زائچے کی تیاری کے لیے آپ مجھے چند چیزیں فراہم کریں گی ......!''

''جی...... کون سی چیزیں؟'' قمر نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مثلاً زیب کی تاریخ پیدائش، وقت پیدائش اور مقام پیدائش...... مقام پیدائش سے میری مراد پیدائش کا ضلع وغیرہ ہے، وہ علاقہ جہاں آپ کی صاحب زادی پیدا ہوئی تھی......؟''

قمر نے شاہ جی کو مطلوبہ معلومات فراہم کردیں۔

رئیس شاہ نے مختلف حسابات کے بعد کاغذ پر ایک چوکور ڈبا سا بنایا پھر اس کے اندر عمودی، افقی اور ترچھی لائنیں کھینچ کر چند تکونیں اور مربع واضح کیے۔ ان خانوں میں اس نے ستاروں اور سیاروں کی الٹی اور سیدھی چالیں درج کیں پھر چند منٹ کے غور و خوض کے بعد وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''آپ کی صاحب زادی تو ساڑھ ستی میں پھنسی ہوئی ہے۔''

''ساڑھ ستی؟'' قمر نے تعجب خیز نظر سے رئیس شاہ کو دیکھا۔ ''شاہ جی، یہ کیا بلا ہے؟''

''بالکل درست فرما رہی ہیں آپ!'' وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ''ساڑھ ستی ایک خوف ناک بلا ہی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے زحل کی نحوست سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔''

''ہاں ہاں......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے زحل کا نام سن رکھا ہے۔''

''یہ بہت ہی مشکل اور سخت سیارہ ہے۔'' رئیس شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ اپنے مخصوص دور میں انسان پر جو سختی اور پریشانی لاتا ہے اس میں بندہ بے بس اور مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ اس دور کو زحل کی بندش سمجھیں۔''

''یہ بندش اور نحوست ختم کیسے ہوگی شاہ جی؟'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''ہم کس لیے آستانہ کھولے بیٹھے ہیں۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم آپ کی صاحب زادی کی اور آپ کی مشکل حل کریں گے۔''

''اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' قمرالنسا نے پوچھا۔

''آپ کو بس ہماری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔''

''جو حکم ہو شاہ جی......'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولی۔

رئیس شاہ کوئی حکم دینے کے بجائے زیب کے زائچے میں غرق ہوگیا۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''آپ کی صاحب زادی جیسا کہ میں نے بتایا، پیدائشی طور پر ساڑھ ستی کا شکار ہے اور آج کل یہ منحوس زحل اس کے ساتویں گھر سے گزر رہا ہے جو شراکت داری سے منسوب ہے۔ بزنس پارٹنر شپ اور لائف پارٹنر شپ وغیرہ...... جبھی اس کی شادی کے سلسلے میں رکاوٹیں اور پریشانیاں آرہی ہیں۔ بہر حال......'' وہ لمحہ بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بہر حال، آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں زحل کی نحوست کو کاٹنے والی لوح آپ کو دوں گا جو آپ کی صاحب زادی کو اپنے پاس رکھنا ہوگی۔ اس کے علاوہ اسے ایک پتھر بھی پہننا ہوگا۔ بس، پھر دیکھیں کمال...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

قمر نے سکھ کی ایک گہری سانس لی پھر تشکرانہ لہجے میں

بولی۔ ''آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کردیا شاہ جی......!''

شاہ جی نے لوح زحل، قمر کے حوالے کی اور پوچھا۔ ''نگینہ آپ مجھ سے لیں گی یا لکھ دوں۔ آپ کسی جوہری سے خرید کر اور چاندی کی انگوٹھی میں جڑوا کر اپنی بیٹی کو پہنا دینا؟''

''اگر آپ کے پاس ہے تو آپ ہی دے دیں۔'' قمرالنسا نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''میں کہاں مارکیٹ میں ڈھونڈتی پھروں گی، پھر مجھے پتھروں وغیرہ کی پہچان بھی نہیں ہے۔''

''تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جواہرات کی مارکیٹ میں ایک سے بڑھ کر ایک فنکار بیٹھا ہوا ہے۔ میرے عقیدت مندوں میں دو تین ایسے کاروباری افراد ہیں جو تھائی لینڈ، برما، سری لنکا وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ میں ان سے نگینے منگوا لیتا ہوں۔ یہ اوپن مارکیٹ کی نسبت مجھے سستے بھی پڑتے ہیں اور اس بات کا بھی اطمینان ہوتا ہے کہ مال کھرا ہے۔''

قمرالنسا، شاہ جی کی اس تقریر دل پذیر سے بہت متاثر ہوئی اور پرس ٹٹولتے ہوئے بڑے احترام بھرے انداز میں پوچھا۔

''شاہ جی! میں کیا پیش کروں؟''

رئیس شاہ نے قمرالنسا کی پیشکش کے جواب میں حساب جوڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''زائچے کی فیس، لوح زحل اور نگینہ انگوٹھی سمیت کل ملا کر آپ پانچ ہزار ادا کردیں۔''

قمر سوچ میں پڑ گئی۔ اس زمانے میں پانچ ہزار کی رقم کوئی معنی رکھتی تھی۔ شاہ جی نے اس کے تذبذب کے پیش نظر نفسیاتی حربہ آزمایا اور قمر سے پوچھا۔

''کیا میں نے زیادہ پیسے بتادیے ہیں؟''

''نن...... نہیں!'' قمر نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ بات نہیں ہے شاہ جی!''

''پھر آپ کے چہرے پر پریشانی اور الجھن کیوں نمودار ہوئی؟'' رئیس شاہ نے قدرے شاکی انداز میں کہا۔ ''تین سو روپے تو میں زائچے کی فیس لیتا ہوں۔ لوح رد نحوست زحل کی قیمت پانچ سو لگائی ہے۔ چار قیراط کا نیلم میں چار ہزار میں آپ کو دے رہا ہوں۔ دو سو چاندی کی انگوٹھی کے لگائے ہیں۔ ایک خاص بات بتاؤں میں آپ کو......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''جو نیلم میں آپ کو دوں گا، نا اس کا رنگ مور کی گردن جیسا نیلا ہے اور دانہ بھی بالکل شفاف ہوگا۔ نیلم کی یہ قسم سب سے زیادہ قیمتی اور نایاب سمجھی جاتی ہے۔ بازار میں اس کی قیمت دو، ڈھائی ہزار روپے قیراط سے شروع ہو کر دس ہزار روپے قیراط تک جاتی ہے اور جہاں تک لوح کا تعلق ہے تو......'' وہ ایک مرتبہ پھر ٹھہرا اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

''خاتون! آپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ یہ لوح بنانے کے لیے برسوں موقعے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ زحل کو جب شرف ہوتا ہے یا جب یہ اوج پر ہوتا ہے تو مخصوص تاریخوں کے مقررہ اوقات میں یہ لوح بڑی احتیاط سے تیار کی جاتی ہے۔''

''شاہ جی! مجھے آپ پر مکمل بھروسا ہے۔'' اس کے خاموش ہونے پر قمرالنسا نے وضاحتی انداز میں کہا۔ ''آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔''

''جب مجھ پر بھروسا ہے تو پھر ہچکچاہٹ کیسی؟''

''وہ دراصل...... میں اس لیے گڑبڑا گئی تھی کہ اس وقت میرے پرس میں کوئی تین ہزار روپے رکھے ہوں گے......''

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔'' ایسے مواقع پر رئیس شاہ بڑی فراخ دلی سے کھیلتا تھا۔ ادھار کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔ ''انگوٹھی کی تیاری میں تو ویسے بھی دو تین دن لگ ہی جائیں گے۔ ابھی آپ لوح زحل لے جائیں اور انگوٹھی کا سائز دے جائیں۔ جب آپ دوبارہ آئیں گی تو باقی کی رقم ادا کرکے نیلم کی انگوٹھی لے جایئے گا۔''

''شکریہ شاہ جی!'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے تو میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کردیا ہے۔''

رئیس شاہ نے زبان سے کچھ نہ کہا، یک ٹک حریصانہ نظر سے قمر کے پرس کو دیکھتا چلا گیا۔ قمر نے تین ہزار کے نوٹ گن کر اس کی جانب بڑھا دیے۔ شاہ جی نے رقم وصول کرتے ہوئے رسماً پوچھ لیا۔

''واپسی کا کرایہ تو ہے نا آپ کے پاس...... چاہیں تو ان میں سے کچھ رکھ لیں۔ جب دوبارہ آئیں گی تو دے دیجیے گا۔''

''میرے پرس میں تین چار سو روپے رکھے ہیں۔'' قمر نے جواب دیا۔ ''پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! ذرا میرے بیٹے کا حساب بھی تو لگائیں۔'' اس کا اشارہ ساتھ آئے ہوئے فیصل کی طرف تھا۔

''برخوردار کا حساب میں لگا چکا ہوں۔'' رئیس شاہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"جی......؟" وہ سوالیہ نظر سے شاہ جی کو تکنے لگی۔

"جب یہ نوجوان میرے آستانے میں داخل ہوا تھا تو اس پر پڑنے والی پہلی نظر ہی سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سحری اثرات میں گرفتار ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔" وہ پرزور تائید کرتے ہوئے بولی۔ "یہ دو تین سال پہلے تک ایسا نہیں تھا۔ زیادہ خرابی ایک سال پہلے سے شروع ہوئی ہے۔ تعلیم کو خیرباد کہہ چکا ہے اور سارا دن آوارہ گردی میں گزارتا ہے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بول دوں تو چڑ جاتا ہے۔ زیب سے بھی دن رات اس کا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، میرے گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔"

"ایک قریبی رشتے دار کی۔" رئیس شاہ نے بڑے شاطرانہ انداز میں کہا۔ "اور وہ ایک عورت ہے......"

قمرالنسا چونک کر حیرت بھری نظر سے رئیس شاہ کو دیکھنے لگی۔

وہ اپنے طریقۂ واردات کو دراز کرتے ہوئے بولا۔ "وہ چھوٹے قد کی ایک سانولی عورت ہے جس کی ایک دبلی پتلی بیٹی بھی ہے......" رئیس شاہ کی نفسیاتی تک بندیاں جاری رہیں۔ "اور اس عورت کا تعلق تمہاری سسرال یعنی فیصل کی ددھیال سے ہے۔ آج کل تم لوگوں کا مذکورہ عورت سے ملنا جلنا بھی نہیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ نے تو...... میری نند...... نیلو کا نقشہ کھینچ ڈالا ...... ہے شاہ جی۔" قمر نے حیرت میں ڈوبی ہوئی سرسراتی آواز میں کہا۔

"کیا میرا کھینچا ہوا نقشہ درست ہے؟"

"بالکل درست ہے شاہ جی۔" قمرالنسا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "نیلوفر عرف نیلو میرے مرحوم شوہر کی چھوٹی بہن ہے۔ ادھر میٹروول کے علاقے میں اس کی رہائش ہے۔ اس کی ایک دبلی پتلی بیٹی فرحانہ بھی ہے جو لگ بھگ فیصل کی ہم عمر ہے۔ نیلو کا ارادہ تھا میں فیصل کے لیے فرحانہ کو پسند کرلوں لیکن میں نے دوٹوک الفاظ میں منع کر دیا۔"

"اور آپ کے اس انکار کے بعد ہی فیصل کی حالت میں منفی تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی تھی جو اس وقت عروج کی طرف بڑھ رہی ہے۔" رئیس شاہ نے ماہر شکاری کے مانند جال پھینک کر آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کیا۔

رئیس شاہ ان لوگوں سے بہت خوش ہوتا تھا جو اس کے کام کو سہل بنا دیا کرتے تھے یعنی پریشانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اسے ایسے نکات فراہم کر دیا کرتے تھے جن کی بنا پر وہ بہ آسانی اپنا کھیل، کھیل لیا کرتا تھا۔ قمر بھی ایک ایسا ہی شکار تھی۔

"شاہ جی! میں آپ کی علمیت اور کاملیت کو مان گئی ہوں۔" وہ عقیدت بھری نظر سے رئیس شاہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔"

"نیلو نے ایک ہندو عامل سے فیصل پر بڑا گندا عمل کروا رکھا ہے۔" رئیس شاہ نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اگر فوری طور پر اس کا توڑ نہ کیا گیا تو بچے کا دماغ بھی الٹ سکتا ہے۔"

"ڈرانے والی خطرناک باتیں نہ کریں شاہ جی۔" وہ خوف زدہ نظر سے رئیس شاہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے فیصل کا علاج کریں۔"

"بچے کا علاج میں ضرور کروں گا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس کے لیے جھلی پر زعفران سے سات فلیتے تیار کرنا ہوں گے جو نام مع والدہ کے حساب سے بنائے جاتے ہیں۔ آپ تین دن کے بعد جب انگوٹھی لینے میرے پاس آئیں گی تو مذکورہ فلیتے آپ کو تیار ملیں گے...... آپ اپنے بچے کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ میرے دیے ہوئے فلیتوں کے اثر سے نہ صرف یہ کہ فیصل پر سے سفلی کے اثرات جاتے رہیں گے بلکہ آئندہ کے لیے بھی بچہ گندے اعمال سے محفوظ ہو جائے گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ شاہ جی۔" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی، پھر پوچھا۔ "ان فلیتوں کا ہدیہ کیا ہوگا؟"

"سات فلیتے، سات سو روپے!" رئیس شاہ نے واضح الفاظ میں کہا۔ "لیکن آپ پیسوں کے لیے پریشان نہ ہوں، جب آپ کا بچہ ٹھیک ہو جائے تو دے دیجیے گا۔"

قمرالنسا نے رئیس شاہ کا ڈھیروں شکریہ ادا کیا پھر سلام کر کے آستانے سے نکل آئی۔

قارئین کی دلچسپی اور بھلائی کے لیے میں یہاں ایک اہم راز سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھتا ہوں۔ رئیس شاہ کے پاس ہر رنگ و نسل کے پتھر اور نگینے تو موجود تھے لیکن ان میں قیمتی جواہرات مثلاً نیلم، زمرد، پکھراج، ہیرا، یاقوت، گارنٹ وغیرہ اصلی نہیں تھے بلکہ یہ نگینے اس نے خود تیار کیے تھے۔

نگینوں کو رنگ کر مصنوعی جواہر تیار کرنے کا قدیم طریقہ ہے۔ موجودہ زمانے میں یہی کام مختلف کیمیکلز کی مدد سے کیا جا رہا ہے۔ اس وقت امیٹیشن اسٹون انڈسٹری اتنے عروج پر ہے کہ بعض اوقات تجربہ کار جوہری بھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

تین روز کے بعد قمرالنسا دوبارہ آستانہ رئیسیہ پر پہنچی

اور اس بار وہ اپنی بیٹی زیب النسا کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ یہیں سے کہانی میں ایک سنسنی خیز موڑ آیا۔

زیب النسا کی عمر چالیس کے اریب قریب تھی لیکن دیکھنے میں وہ تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ اس پر زیب کی دلکشی اور رعنائی نے رئیس شاہ کا پندرھواں طبق بھی روشن کر دیا تھا۔ وہ زیب کو دیکھتے ہی اس پر ریجھ گیا تھا۔ زیب کے صاف وشفاف سراپا اور خدوخال کی خوب صورتی نے شاہ جی کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی۔ اس اندرونی طوفان میں صرف ایک ہی صدا بلند ہو رہی تھی جو اس کے دل و دماغ پر مسلسل یہ ہتھوڑا برسا رہی تھی ...... مجھے زیب النسا کی ضرورت ہے۔ میں اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے ہوں گا، وغیرہ وغیرہ......

اس روز رئیس شاہ بڑے خاص انداز میں ان کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی تمام تر توجہ زیب پر مرکوز رہی۔ نیلم جڑی چاندی کی انگوٹھی زیب کی درمیانی انگلی میں پہنا دی گئی۔ مڈل فنگر سیارہ زحل سے منسوب ہے اور نیلم بھی اسی سیارے کا پتھر مانا جاتا ہے۔ فیصل کے لیے تیار کردہ فلیتے بھی قمرالنسا کے حوالے کر دیے جنہیں نوچندی جمعرات سے شروع کر کے ہر جمعرات کو عصر اور مغرب کے درمیان جلا کر اس کی دھونی فیصل کو دینا تھی۔ انہیں رخصت کرتے وقت رئیس شاہ نے چند ایسے شوشے بھی چھوڑے کہ زیب کو ہفتے میں ایک آدھ بار اس کے آستانے پر ضرور حاضری دینا پڑے۔ قمر، شاہ جی کی کاملیت پر ایمان لا چکی تھی لہٰذا وہ بلاچون وچرا اس کی ہر ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔ ایک طرح سے ان لوگوں کے درمیان فیملی ٹرمز پیدا ہو گئے تھے۔

رئیس شاہ نے قمرالنسا کے گھر میں سیندھ لگانے کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ اس کے گھر پر بھی نادیدہ اثرات کا پتا چلا لیا۔ یہ شاہ جی کی خوش قسمتی تھی یا قمر کی بدقسمتی کہ اس دوران میں رئیس شاہ کے مشوروں کے خاطر خواہ اثرات بھی مرتب ہونے لگے تھے۔ فیصل کے جنون اور چڑچڑے پن میں نمایاں کمی واقع ہوئی تھی اور ایک دو جگہوں پر زیب کے رشتے کی دوبارہ بات بھی چلی تھی لیکن شاہ جی نے علم نجوم کی روشنی میں ان رشتوں کو زیب کے لیے نامناسب قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔

قمر کے گھر کو نادیدہ اثرات سے پاک کرنے کے لیے شاہ جی نے ان کے گھر میں آمد و رفت بھی شروع کر دی تھی۔ اس طرح اسے زیب کے مزید قریب رہنے کا موقع مل رہا تھا۔ قمر اس بات پر بڑا فخر محسوس کر رہی تھی کہ جس شخص سے ملاقات کی خاطر لوگ اس کے آستانے پر قطار لگاتے ہیں، وہ خود چل کر ان کے گھر آتا ہے۔ نیت کا احوال تو صرف خدا ہی کو معلوم ہوتا ہے۔ قمر کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ شاہ جی تو اس کی خوب صورت بیٹی پر نیت لگائے رال ٹپکا رہا تھا۔ قمر کا تو یہ حال تھا کہ اگر رئیس شاہ رات کو دن اور دن کو رات کہے تو وہ ماننے کو تیار تھی۔

ذہین اور عقل مند خواتین کی میں بات نہیں کر رہا، تاہم یہ بات عمومی طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ آسانی اور فراوانی کے ساتھ رئیس شاہ جیسے لوگوں کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں۔

قمر اور فیصل وزیب کو اپنے شیشے میں اتارنے کے لیے رئیس شاہ نے چند ماہ صرف کیے اور پھر ایک روز اس نے اپنی دلی خواہش قمرالنسا کی سماعت کے سپرد کر دی۔ اس مشن میں قمر ہی اس کا خصوصی ٹارگٹ تھی۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ چور پر نہیں، چور کی ماں پر طبع آزمائی زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے...... اور اس کا یہ فارمولا صد فی صد درست ثابت ہوا تھا۔

رئیس شاہ اور زیب النسا کی شادی ہوگئی......!

شاہ جی کو لوگوں کے نام بدلنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے پاس آنے والے افراد میں سے اکثر کو نام تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ کسی کے نام کا عدد درست نہیں تو کوئی ستارے سے میچ نہیں کرتا...... الغرض، وہ لگ بھگ پچیس فیصد کلائنٹس کو نام بدلنے پر زور دیتے تھے اور ان کے نام بھی تجویز کرتے تھے۔ انہی پچیس فیصد افراد میں زیب النسا بھی شامل تھی۔ شادی سے چند روز پہلے ہی رئیس شاہ نے اس کا نام سلطانہ رکھ دیا تھا......!

جی ہاں...... وہی سلطانہ جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

میں بڑی توجہ سے سلطانہ کو سن رہا تھا اور ضروری مواقع پر اہم پوائنٹس بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بیگ صاحب! کسی انسان کی اصلیت اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب براہ راست آپ کا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ جب اسے پرکھنے اور برتنے کا موقع ملتا ہے......"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "بزرگ فرما گئے ہیں کہ اگر کسی کو آزمانا ہو تو اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ، اس کے

ساتھ سفر کر کے دیکھو اور اس سے معاملت کا تجربہ بھی کرو، یعنی اس کے ساتھ لین دین کر کے دیکھو، چند ہی روز میں اس کی اصلیت کھل جائے گی۔ میں نے پچھلے دو سال میں یہ تینوں کام کر کے دیکھے ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اور ہر محاذ پر رئیس شاہ کو لالچی، گھٹیا، ظالم، سفاک، دھوکے باز اور بے وفا پایا ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ میں اب اس کے ساتھ مزید زندگی گزار سکوں......"

سلطانہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تو میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ لحاتی توقف کے بعد وہ دکھی لہجے میں بتانے لگی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز اور رنج تھا۔

"اصولی طور پر تو مجھے بیاہ کر رئیس شاہ کے گھر جانا چاہیے تھا لیکن ہوا اس کے برعکس، وہ یوپی موڑ والے گھر کو چھوڑ کر اپنے ٹین ڈبے کے ساتھ ہمارے بنگلے میں آگیا۔ امی پوری طرح اس کی مٹھی میں تھیں لہٰذا میں نے نقطہ اعتراض نہیں اٹھایا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک میں رئیس شاہ کے خبیث باطن سے واقف نہیں تھی۔ میں نے اسے دل و جان سے اپنا مجازی خدا مانا تھا۔ اس کی اصلیت تک پہنچنے کے لیے تو مجھے ایک عرصہ لگا ہے۔ اگرچہ یہ شادی امی کی وجہ...... بلکہ ان کی مرضی اور منشا سے ہوئی تھی لیکن میں انہیں بالکل دوش نہیں دوں گی بلکہ اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھوں گی۔ امی اب بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ پچھلے سال ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اوہ!"

ہمارے درمیان چند لمحات بڑی خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں گزر گئے۔ پھر وہ دوبارہ لب کشا ہوئی۔ اس کے ایک ایک لفظ میں احتجاج کی گونج تھی۔

"بیگ صاحب! شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس شخص نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ نارتھ ناظم آباد والا بنگلا فروخت کر کے ہمیں گلشن اقبال شفٹ ہو جانا چاہیے۔ وہ اپنے کاروبار کو بھی گھر کے اندر ہی لانا چاہتا تھا۔ اس موقعے پر میں نے کہا۔ "شاہ جی! نارتھ ناظم آباد تو گلشن اقبال سے زیادہ قیمتی اور پُراثر علاقہ ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ آستانے کو گھر میں شفٹ کیا جائے تو آپ اسی بنگلے میں لے آئیں۔ آپ کے پاس آنے والوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو ناظم آباد اور آس پاس کے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے لیے گلشن کے بجائے یہاں زیادہ آسانی رہے گی۔ اس بنگلے کا سامنے والا پورشن خالی کر کے آپ کے آستانے کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔"

"دراصل، اب میں اس آستانے والے لیبل سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دنیا بدل رہی ہے، لوگوں کے رجحانات تبدیل ہو رہے ہیں۔ میں اس کام کو جدید بنیادوں پر آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

"اچھی بات تو یقیناً ہے کیونکہ یہ رئیس شاہ کا آئیڈیا ہے۔" وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرے خیال میں اس تجربے کے لیے سب سے موزوں جگہ گلشن اقبال کا علاقہ ہے۔ میں نے ستاروں کی چال اور سیاروں کی ڈھال کا بڑی باریک بینی سے حساب کیا ہے اور گلشن اقبال کے طول البلد و عرض البلد کا بھی جائزہ لے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے، وہاں جاتے ہی میرے بزنس کو کسی سپر سانک جنگی طیارے کے پر لگ جائیں گے۔"

جب رئیس شاہ کی گفتگو میں ستارے، سیارے، طیارے وغیرہ آتے تھے تو میں دانستہ خاموشی اختیار کر لیا کرتی تھی۔ اس نوعیت کے ثقیل الفاظ اور ان کے استعمال وافعال پر غور کرنے سے میرے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

چند روز کے بعد امی نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ نارتھ ناظم آباد والا بنگلا فروخت کر کے گلشن اقبال میں منتقل ہو رہے ہیں۔ رئیس شاہ نے اپنے مخصوص ہتھکنڈے آزما کر امی کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ وہ ویسے بھی شاہ جی سے بے حد متاثر اور مرعوب تھیں۔ پتا نہیں رئیس نے انہیں کیا پٹی پڑھائی کہ وہ جی جان سے اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئیں۔ وہ بنگلا امی کے نام تھا لہٰذا وہ اسے فروخت کرنے کا پورا حق رکھتی تھیں لیکن اس موقعے پر میں نے انہیں یہ مشورہ دیا۔

"امی! میں آپ کو بنگلا بیچنے سے تو نہیں روک سکتی لیکن میرا ایک مشورہ ہے۔"

"ہاں بولو......" انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیا مشورہ ہے؟"

"جب آپ گلشن اقبال میں گھر خریدیں تو وہ بھی آپ ہی کے نام ہونا چاہیے۔"

"ہوں......" انہوں نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "زیب! یہ بات تم کسی خاص سبب سے کہہ رہی ہو؟"

"سبب کا تو مجھے پتا نہیں۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "لیکن میری چھٹی حس مجھے بار بار کہہ رہی ہے کہ اگر نیا

گھر آپ کے نام نہ ہوا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"تم بھی شاہ جی کے ساتھ رہ کر نجومن بن گئی ہو۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولیں۔ "بڑی بڑی پیش گوئیاں کرنے لگی ہو۔"

"میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں اس کا تعلق علم نجوم سے نہیں ہے۔"

"پھر کس سے تعلق ہے؟"

"یہ میرے دل کی آواز ہے امی......!"

"اچھا ٹھیک ہے، میں اس معاملے کو دیکھ لوں گی۔" وہ تسلی آمیز انداز میں بات ختم کرتے ہوئے بولیں۔ "تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں امی کی تسلی کے بعد بے فکر ہو گئی۔

آئندہ ماہ نارتھ ناظم آباد والا بنگلا فروخت ہو گیا اور ہم گلشن اقبال کے ایک نسبتاً بڑے بنگلے میں آ گئے۔ بنگلے کی مالکانہ حیثیت کے حوالے سے امی نے ایک انوکھا ہی فیصلہ کیا تھا۔

اس بنگلے کے کاغذات تمہارے نام سے تیار ہوں گے زیب!" انہوں نے وکیل کی موجودگی میں انکشاف کیا۔ "میرا تو اب چل چلاؤ ہے۔ پتا نہیں، کب بلاوا آ جائے۔"

میں نے اس موقعے پر امی سے لڑنے کی کوشش کی لیکن امی بھی ضد پر اتر آئیں چنانچہ میں نے ان کی عمر، مرتبے اور خواہش کے احترام میں گردن جھکا دی، اس طرح گلشن اقبال والے بنگلے کی بلاشرکت غیرے میں مالکن بن گئی۔ بعدازاں ایک موقعے پر امی کے منہ سے روا روی میں ایک بات نکل گئی جسے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میری چھٹی حس غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ رئیس شاہ کا کوئی قصہ چل رہا تھا کہ امی نے کہا۔

"شاہ جی نے اگرچہ اپنی زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ان کے انداز سے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے گلشن والا یہ بنگلا وہ اپنے نام سے لینے کا ارادہ رکھتے تھے جبھی میں نے یہ بنگلا تمہارے نام سے خریدا ہے زیب...... میں نے شاہ جی سے بھی وہی کہا تھا جو تم سے کہہ رہی ہوں کہ میں اب اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہی ہوں۔ یہ سب دولت و جائداد تمہی لوگوں کی ہے۔ میں اس کا کیا کروں گی۔ تم بڑی ہو، مجھے یقین ہے، تم سے زیادہ فیصل کا خیال اور کوئی نہیں رکھ سکتا۔"

امی کا کہا سچ ثابت ہوا۔ گلشن اقبال والے بنگلے میں شفٹ ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ اس دنیا سے اس دنیا میں شفٹ ہو گئیں۔

رئیس شاہ کا کہا بھی درست ثابت ہوا۔ گلشن اقبال والے بنگلے میں کاروبار منتقل کرتے ہی اس پر ہن برسنے لگا اور اس کے بھی کئی اسباب ہیں۔ وہ اب رئیس شاہ یا شاہ جی نہیں رہا بلکہ "پروفیسر شاہ" بن گیا ہے۔ اس کا کاروبار آستانہ رحیمیہ سے نہیں بلکہ "شاہ کلینک" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اب وہ کوئی عام سا نجومی یا عامل کامل نہیں بلکہ کنسلٹنٹ بن گیا ہے اور اس کے اندر سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ وہ انتہائی سفاک، ظالم اور کاروباری ہو گیا ہے۔ پہلے وہ غریب غربا سے تھوڑی بہت رعایت کر دیا کرتا تھا۔ اب ایسی کوئی کہانی نہیں ہے۔ اس کے طلب کردہ پیسے پہلے جمع کراؤ، پھر کام ہوگا۔ پیسے نہیں ہیں تو گھر جاؤ۔"

"یہ تو بڑی خراب بلکہ بے ہودہ صورت حال ہے۔" وہ متوقف ہوئی تو میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

"واہیات کہیں بیگ صاحب۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہ جی کے ظلم و ستم کی شرم ناک داستان بیان کرنے لگی۔ "میں نے خوامخواہ ہی اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ پچھلے ایک سال میں، میں نے بڑے عبرت ناک نظارے دیکھے ہیں۔ دولت کی ہوس اور امارت کے لالچ نے رئیس شاہ کو بالکل اندھا کر دیا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کلائنٹس کو لوٹ رہا ہے۔ اپنے پاس آنے والی عورتوں کو وہ بتاتا ہے کہ ان کے شوہر بے وفائی کر رہے ہیں۔ وہ انہیں نظرانداز کر کے دوسری عورتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں پھر وہ عورتیں اپنے شوہروں کو راہ راست پر لانے کے لیے رئیس سے الواح و طلسمات بنواتی ہیں۔ اسی طرح وہ شوہروں کے ذہنوں میں بھی مختلف رنگ و نسل کے شک کے بیج بوتا ہے۔ کسی سے کہتا ہے کہ اس کی بیوی کا کردار ٹھیک نہیں، کسی کو بتاتا ہے کہ اس کی بیوی نے اسے مٹھی میں رکھنے کے لیے کسی عامل سے الو کا گوشت دم کرا کے اسے کھلا دیا ہے۔ ساسوں کو بہوؤں کے خلاف اور بہوؤں کو ساسوں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اس طرح اس کے نگینے اور الواح دھڑا دھڑ بکتے ہیں اور ان دونوں چیزوں میں اس کی بے ایمانی بھی عروج کی آخری منازل کو چھو رہی ہے۔"

"پچھلے دنوں شرف مشتری پڑا تھا۔ مشتری کی لوح سونے کے پترے پر بنائی جاتی ہے لیکن رئیس شاہ نے کسی سستی سی نرم دھات پر سونے کا پانی چڑھوا کر یہ الواح درجنوں کے حساب سے تیار کی تھیں جنہیں سونے کا کہہ کر اپنے کلائنٹس کو بیچا ہے۔ اسی طرح وہ بیس تیس روپے دانہ کے حساب سے خریدے ہوئے پتھروں کو ہزار، پانچ سو سے کم میں نہیں فروخت کر رہا۔ میرے لیے سب سے زیادہ دکھ اور اذیت کی بات یہ ہے کہ بعض سادہ لوح عورتیں رئیس شاہ کے

مطالبے پورے کرنے کے لیے اپنے زیورات تک فروخت کر دیتی ہیں۔ ان سب بے چاریوں کی پہلی اور آخری تمنا یہی ہوتی ہے کہ ان کے شوہر راہ راست پر آجائیں۔ ظلم و بربریت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی۔ رئیس شاہ کسی انسان نما درندے سے کم نہیں بیگ صاحب۔"

"واقعی، آپ بڑے آزمائشی حالات سے گزر رہی ہیں۔" میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔ "آپ کی روح ایک عذاب میں مبتلا ہے۔"

"بیگ صاحب! یہ سب تو چل ہی رہا تھا۔" وہ بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "پچھلے دنوں رئیس شاہ کی ایک ایسی حرکت میرے علم میں آئی ہے اور میں نے باقاعدہ اس کی تصدیق کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ مجھے پہلی فرصت میں رئیس شاہ کو اپنی زندگی سے نکال کر باہر پھینک دینا چاہیے۔"

"کون سی حرکت؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"رئیس شاہ دوسری شادی کی پلاننگ کر رہا ہے۔" اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "کیا کوئی موٹی مرغی اس کے جال میں آگئی ہے۔"

"بیگ صاحب!" سلطانہ نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "کیا آپ بھی علم نجوم میں مہارت رکھتے ہیں؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

"پھر آپ کو موٹی مرغی کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"میرا اندازہ سمجھ لیں......!" میں نے کہا۔

"آپ کا اندازہ زبردست ہے۔" وہ جوش بھرے انداز میں بتانے لگی۔ "وہ مرغی جسامت میں تو بڑی ڈشنگ اور اسمارٹ ہے لیکن دولت کے لحاظ سے آپ اسے موٹا کہہ سکتے ہیں۔"

"اس مرغی کا کوئی نام تو ہوگا؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"نام اس کا پیدائشی تو ماہ جبیں تھا۔" سلطانہ نے زہریلے انداز میں بتایا۔ "مگر یہ تجربے کی بات ہے کہ رئیس شاہ کے قریب آنے والے سب سے پہلے اپنے نام سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اب وہ ماہ جبیں، روبی بن چکی ہے۔ رئیس نے اسے احساس دلا دیا ہے کہ وہ ایک قیمتی یاقوت ہے لہٰذا اس کا نام روبی ہونا چاہیے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔

"روبی ہاکی اسٹیڈیم کے نزدیک ہی کمرشل مارکیٹ میں ایک بڑا بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔ اس کی رہائش فیز فائیو کے ایک لگژری بنگلے میں ہے۔ یہ عورت مطلقہ اور خود مختار ہے۔ مال و دولت کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں۔ آج کل روبی، رئیس شاہ کی مٹھی میں ہے۔ عنقریب وہ شادی کرنے والے ہیں۔"

"یہ ساری معلومات آپ تک کیسے پہنچیں؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

"رئیس شاہ کے ایک سابق دوست ریاست علی سے!" اس نے بتایا۔

"سابق دوست؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ریاست علی کی ادھر لیاقت آباد کی صرافہ مارکیٹ میں پتھروں اور نگینوں کی بہت بڑی دکان ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "کسی زمانے میں رئیس شاہ، ریاست سے نگینے خریدا کرتا تھا اور اپنے کلائنٹس کو بھی پتھروں کی خریداری کے لیے ریاست ہی کے پاس بھیجا کرتا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی اور ریاست اکثر ہمارے گھر بھی آیا کرتا تھا لیکن جب سے ہم گلشن اقبال میں شفٹ ہوئے ہیں، رئیس شاہ، پروفیسر شاہ بن گیا ہے اور اس نے پرانے دوستوں سے بھی جان چھڑا لی ہے۔ ریاست علی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ نگینوں کے معاملات پر تو ان دونوں کے بیچ ایک دو جھگڑا بھی ہوا تھا۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی، ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"پچھلے دنوں ریاست نے فون کرکے مجھے رئیس شاہ کے نئے لچھنوں کے بارے میں بتایا ہے۔ میں چونکہ رئیس شاہ کی رگ رگ سے واقف ہوں اس لیے مجھے ریاست کی اطلاع پر اسی وقت یقین آگیا تھا لیکن میں نے پھر بھی تصدیق ضروری جانی۔ ریاست کی ہدایت اور فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں جب میں نے خفیہ انداز میں تحقیق کی تو اس اطلاع کو درست پایا۔ رئیس شاہ واقعی روبی سے شادی کرنے والا ہے۔"

"کیا آپ اپنے شوہر سے صرف اس لیے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں کہ وہ روبی سے شادی کرنے جا رہا ہے؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔

"بنیادی وجہ تو وہی ہے جو میں آپ کو بتا چکی، رئیس شاہ اپنی فطرت، مزاج اور سوچ کے مطابق کسی جنگلی درندے سے کم نہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس قماش کے آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا کسی جہنم میں سانس لینے کے

مترادف ہے۔ پچھلے چھ ماہ سے ہمارے مابین ایک خاموش اعصابی جنگ جاری ہے اور جہاں تک روبی سے رئیس کی شادی کا سوال ہے تو......" وہ چند لمحات کی خاموشی کے بعد ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے اس بات سے قطعاً کوئی پریشانی نہیں کہ وہ روبی سے شادی کرتا ہے یا زمرد سے۔ الماس سے یا پکھراج سے...... میں اس امر کے لیے متفکر ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"آپ کو چھوڑ کر...... کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"روبی نے شرط عائد کی ہے کہ رئیس مجھے فارغ کرنے کے بعد اسے اپنائے گا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پچھلے چند دنوں سے رئیس کا رویہ بھی یہی پیغام دے رہا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔ ہماری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں اور ہماری کوئی اولاد بھی نہیں۔ دوسری شادی کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ محرومی میرے لیے مائنس اور رئیس کے لیے پلس پوائنٹ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے فارغ کر دے، میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی بھی قیمت پر طلاق کا طوق گلے میں نہیں لٹکانا۔ ادھر آپ نے میری جانب سے خلع کا کیس عدالت میں دائر کیا، ادھر میں بہ حکم عدالت دھکے مار کر رئیس شاہ کو اپنے بنگلے سے باہر نکال دوں گی۔ جب کیس عدالت میں ہوگا تو رئیس کو ایک شوہر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہنے کا حق بھی نہیں رہے گا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ ان معاملات کا کتنا زبردست بندوبست کرتے ہیں۔" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر نفرت بھرے انداز میں بولی۔

"میں چاہتی ہوں، جب رئیس شاہ، روبی سے شادی کرے تو اس کا اسٹیٹس ایک ٹھکرائے ہوئے، گھر سے بے دخل، بلکہ زندگی سے بے دخل کیے ہوئے شوہر کا ہو۔"

"ایسا ہو جائے گا۔" میں نے تیقن سے کہا۔ "میں عدالت کی طرف سے ایسا کامل بندوبست کروا دوں گا کہ رئیس شاہ کو خلع کے پیپرز کے ساتھ ہی گھر سے بے دخلی کا نوٹس بھی ملے گا۔ پہلے اسے گھر چھوڑنا ہوگا، اس کے بعد عدالت میں پیش ہو کر آپ کو بھی آزاد کرنا ہوگا۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی بیگ صاحب!"

"اس معاملے کے لیے آپ بے فکر ہو جائیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "لیکن خلع کے حوالے سے آپ کو چند اہم باتیں اپنے ذہن میں رکھنا ہوں گی۔"

اس نے گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "مثلاً کون سی باتیں؟"

میں نے حق وکیل ادا کرتے ہوئے کہا۔ "مثلاً یہ کہ...... خلع کا مطالبہ چونکہ آپ کی جانب سے ہوگا لہٰذا تنسیخ نکاح کے نتیجے میں آپ کو اپنے حقوق وغیرہ سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ مثلاً مہر کی رقم......"

"بیگ صاحب! مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "اس شاطر شخص نے تو امی کو مٹھی میں لے کر مجھے حاصل کر لیا تھا۔ امی چونکہ اس کی اندھی مریدنی بنی ہوئی تھیں لہٰذا نکاح کے وقت انہیں نظر ہی نہیں آیا کہ بیٹی کے حقوق کو تحفظ بھی دینا ضروری ہے۔ میرا مہر صرف پانچ ہزار روپے سکہ رائج الوقت پاکستان بندھا تھا۔ آپ خود ہی بتائیں، ان پانچ ہزار کو لے کر میں کون سی ارب پتی بن جاؤں گی اور جہاں تک نان ونفقہ کا تعلق ہے تو......" اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"اللہ کا شکر ہے بیگ صاحب! اگر میں اپنے بنگلے کا ایک پورشن کرائے پر بھی اٹھا دوں گی تو ہم دونوں بہن بھائی کی گزر اوقات بڑے آسودہ انداز میں ہو جائے گی۔ میں رئیس شاہ کی محتاج نہیں ہوں۔ میں اپنے بنگلے کو فروخت کرکے اس رقم میں تین شاندار فلیٹ بھی خرید سکتی ہوں۔ ایک میں خود رہوں اور باقی دو کو کرائے پر چڑھا دوں تو بھی زندگی بڑے سکھ چین سے گزرے گی۔"

"اوکے!" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں پہلی فرصت میں آپ کا کیس تیار کرکے عدالت میں لگاتا ہوں۔ آپ کل دوپہر کے بعد کسی وقت میرے آفس آکر ضروری کاغذات پر دستخط کر دیجیے گا اور دل میں یہ نقطہ بھی پختہ کر لیں کہ اب قدم پیچھے نہیں ہٹانا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیگ صاحب!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "میں اس دن کا بے تابی سے انتظار کروں گی جب میرے اگلے ہوئے کو وہ مطلقہ روبی نگلے گی۔"

"آپ نے روبی کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔" میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ مطلقہ کا لیبل کیوں لگا ہوا ہے؟"

"چند سال پہلے ماہ جبیں (روبی) نے احمد حسن نامی ایک مالدار شخص سے شادی کی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ ہی عرصے کے بعد احمد حسن اچانک غائب

ہوگیا۔ آج تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ماہ جبیں کا بیان ہے کہ احمد حسن اسے طلاق دے کر بیرون ملک چلا گیا تھا۔ ثبوت کے طور پر اس نے ایک طلاق نامہ بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ مطلقہ ہے، حقیقت کیا ہے یہ تو خدا ہی کو معلوم ہوگا۔"

"ویسے خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے ٹھکرائے ہوئے دو۔" میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "ایک مطلقہ، دوسرا خلع زدہ......"

سلطانہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "خلع کے کاغذات سلطانہ ہی کے نام سے تیار کیے جائیں نا؟"

"جی ہاں، بالکل۔" اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "نکاح نامے میں میرا نام سلطانہ ہی درج ہے۔ اس کیس سے نمٹتے ہی میں دوبارہ زیب النساء بن جاؤں گی۔ میں رئیس شاہ کے عطا کردہ اس آسیب (سلطانہ) سے بھی نجات حاصل کرلوں گی۔"

میں نے اپنی فیس وصول کرکے اس کی رسید سلطانہ کو تھما دی۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

ایک روز بعد میں نے سلطانہ کی جانب سے خلع کا کیس دائر کردیا۔

اس سلسلے میں، میں نے سلطانہ کو عدالتی معاملات کی اونچ نیچ سے اچھی طرح آگاہ کردیا تھا کیونکہ جب رئیس شاہ کو گھر سے بے دخلی کا نوٹس ملتا تو وہ سٹپٹا کر رہ جاتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ روبی سے شادی کرنے جارہا تھا اور اسے سلطانہ کی ذرا بھی پروا نہیں تھی لیکن کوئی بھی شخص "بڑے بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے" ایسی صورت حال سے حتی الامکان بچنے کی کوشش ہی کرتا ہے لہٰذا رئیس شاہ بھی اس سلسلے میں سلطانہ کو بہلانے پھسلانے کی سعی کرسکتا تھا۔ اس بات کے صرف ایک فیصد امکانات تھے کہ رئیس شاہ موجودہ صورت حال کو کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے سلطانہ کے گھر سے چلا جاتا...... نہ صرف چلا جاتا بلکہ عدالت میں حاضر ہوکر کیس کا سامنا بھی کرتا۔

عدالتی نوٹس کی ترسیل کے بعد سلطانہ مجھ سے ملنے کے لیے آئی۔ وہ خاصی پریشان اور الجھی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میں نے اسے آرام سے بٹھایا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے، آپ اتنی الجھی ہوئی کیوں ہیں؟"

"رئیس کو گھر سے بے دخلی کا نوٹس مل گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہ میری منتیں کررہا ہے......"

"بے دخلی کے نوٹس کے علاوہ اسے خلع کے حوالے سے بھی عدالت میں پیش ہونے کے احکامات موصول ہوئے ہوں گے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "وہ دونوں میں سے کس کے لیے آپ کی منت سماجت کررہا ہے؟"

"دونوں ہی معاملات کے لیے......"

"ہوں......!" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "اس نے کیا موقف اختیار کیا ہے؟"

"وہ قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کررہا ہے کہ روبی سے شادی کرنے کا اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔ وہ محض اس کے ساتھ بزنس پارٹنرشپ کا ارادہ رکھتا ہے۔" وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس کی التجا ہے کہ مجھے جو غلط فہمی ہوئی ہے، میں اسے اپنے دل و دماغ سے نکال دوں۔ اگر مجھے اس سے کوئی شکایت ہے تو وہ دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہمیں پیار و محبت سے مل کر ایک ساتھ رہنا چاہیے۔"

"اس کی وضاحت اور منت سماجت تو رہی ایک طرف۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے یہ کس نے بتایا ہے کہ آپ اس کی روبی سے ہونے والی شادی کے راز سے قبل از وقت آگاہ ہوگئی ہیں؟"

"یہ تو میں نے ہی اسے بتایا ہے......!" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

"یہ آپ نے غلط کیا۔" میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر آپ کی معلومات اس کے علم میں نہ آتیں تو زیادہ اچھا تھا۔"

"اب کیا ہوگا؟" وہ پریشان نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"جو بھی ہوگا، اچھا ہی ہوگا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "میں معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ آخری مرتبہ مجھے بتادیں کہ آپ کا خلع لینے کا فیصلہ اٹل ہے یا اس میں رئیس کی منت سماجت سے کسی لچک کا امکان ہے؟"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے بیگ صاحب!" وہ غیر متزلزل انداز میں بولی۔ "اب واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"دراصل، یہ بات میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میاں بیوی کا رشتہ بہت نازک، بہت حساس ہوتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اس میں کسی بھی مرحلے پر مفاہمت اور مصالحت کا امکان موجود ہوتا ہے۔"

"انشاء اللہ! ایسا نہیں ہوگا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا رئیس شاہ ابھی تک آپ کے بنگلے ہی میں رہ رہا ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ "اسے پہلی فرصت میں گھر سے نکال دیں۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ورنہ کوئی بھی پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے۔"

"اگر اس نے گھر چھوڑنے میں کسی پس و پیش سے کام لیا تو......"

"وہ ایسا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔" میں نے سلطانہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "وہ بنگلا آپ کا ہے ورنہ اب آپ کی جانب سے عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر ہوا ہے، وہ آپ پر اپنے شوہرانہ حقوق نہیں جتا سکتا۔ یہ کیس فائل ہونے کا واضح مطلب یہی ہے کہ آپ نے علی الاعلان رئیس شاہ کو مسترد کردیا ہے۔ آپ دونوں کے ازدواجی معاملات کا فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی اور اس فیصلے تک رئیس شاہ کو آپ سے دور رہنا ہوگا۔ اگر یہ بنگلا رئیس شاہ کی ملکیت ہوتا تو آپ کو جانا تھا۔ بنگلا چونکہ آپ کی پراپرٹی ہے لہٰذا ہر حال میں رئیس شاہ کو جانا ہے اور اگر......" میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ زیادہ ہوشیاری اور چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو آپ اپنے علاقے کے تھانے فون کرکے اسے گھر سے بے دخل کرسکتی ہیں۔ وہ عدالتی نوٹس وصول کرچکا ہے۔ آپ پولیس کو بتاسکتی ہیں کہ آپ دونوں کے حوالے سے عدالت میں کیس چل رہا ہے۔"

"یہ آپ نے ایک اچھا مشورہ دیا ہے۔" وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "اللہ آپ کا بھلا کرے!"

"اور آپ کا بھی!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند منٹ مزید بیٹھی پھر مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

اسی رات جب میں سونے کے لیے لیٹ رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس زمانے میں سی ایل آئی کی سہولت نہیں ہوا کرتی تھی۔ فون اٹینڈ کرنے کے بعد ہی پتا چلتا تھا کہ دوسری جانب کون ہے۔

"ہیلو......!" میں نے ریسیور کو کان سے لگانے کے

بعد ماؤتھ پیس میں کہا۔

''بیگ صاحب! یہ میں ہوں۔'' دوسری طرف ایک نسوانی آواز ابھری۔ ''سلطانہ!''

''خیریت تو ہے نا.....؟'' میں نے تشویش بھرے انداز میں دریافت کیا۔

سلطانہ کو میں نے اپنے گھر کا نمبر بھی دے دیا تھا۔ اس کا کیس کچھ اس نوعیت کا تھا کہ اسے کسی بھی وقت میری ضرورت پیش آسکتی تھی ورنہ میں عموماً کلائنٹس کے تمام تر معاملات آفس اور کورٹ ہی میں نمٹایا کرتا ہوں۔

''بالکل خیریت ہے جناب.....!'' سلطانہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''رئیس شاہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے لیکن اس کا سامان ابھی ادھر ہی رکھا ہوا ہے۔ وہ صرف ایک بریف کیس ساتھ لے کر گیا ہے جس میں قیمتی جواہرات اور الواح و طلسمات بھرے ہوئے ہیں۔''

''باقی سامان کے بارے میں اس نے کیا کہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہہ کر گیا ہے کہ پہلے اپنے رہنے کا بندوبست کرلے پھر آکر دیگر سامان بھی لے جائے گا۔'' سلطانہ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، آپ اس کے کمرے کو تمام تر سامان سمیت لاک کردیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''جب وہ سامان اٹھانے آئے تو اسے یونہی گھر میں گھسنے کی اجازت نہ دیں۔ آپ اس سے کہیں کہ محلے کے دو تین معزز افراد کو جمع کرے اور ان کی موجودگی میں اپنا سامان اٹھائے۔ یہ خبر آپ کے آس پڑوس کو ہونا چاہیے کہ اب آپ کا رئیس شاہ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ آپ نے کورٹ میں اس کے خلاف خلع کا کیس دائر کر رکھا ہے۔ آپ کی پوزیشن بہت مضبوط و مستحکم ہے لہٰذا گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگلے ہفتے پیشی بھی ہے۔ یہ کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دو پیشیوں کا کھیل ہے.....!''

''بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولی پھر اضطراری انداز میں کہا۔ ''ایک بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گئی۔''

''کون سی بات؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

سلطانہ نے بتایا۔ ''وہ آپ سے ملنے کو بھی کہہ رہا تھا۔''

''مجھ سے وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتا ہے؟''

''وہ آپ کو بتانا چاہ رہا ہے کہ روبی سے اس کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔'' وہ بولی۔ ''آپ مجھے سمجھائیں کہ میں کیس واپس لے لوں۔''

''کیا آپ نے خلع کا جو کیس فائل کیا ہے اس کی بنیادی وجہ رئیس شاہ کا روبی سے دوسری شادی کا ارادہ ہے؟'' میں سلطانہ سے یہ سوال پہلے بھی پوچھ چکا تھا لہٰذا اس بار میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''قطعی نہیں!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''رئیس شاہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دیگر نصف درجن وجوہات ہیں۔''

''بس، تو پھر آپ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''رئیس شاہ جو بھی کہہ رہا ہے اسے کہنے دیں۔ اگر وہ میرے پاس کوئی داد فریاد لے کر آیا تو میں اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑ کر روانہ کروں گا۔ آپ اس سلسلے میں بالکل ٹینشن نہ لیں۔''

اس نے الوداعیہ کلمات سے پہلے میرا بے حد شکریہ ادا کیا پھر ہمارے درمیان قائم ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہوگیا۔

میں نے برسوں سے جاری معمول کے مطابق تھوڑا مطالعہ کیا پھر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر نیند کے حوالے کردیا۔ جلد ہی، ریشمی آغوش کی حامل یہ طرح دار حسینہ مجھے اپنے ہمراہ خوابوں کی پُرکیف نگری میں لے گئی۔

☆☆☆

سلطانہ نے بالکل درست کہا تھا۔

میں نے رات کو سلطانہ سے ہونے والی گفتگو کو اپنی یادداشت میں زیادہ جگہ نہیں دی تھی لہٰذا اگلے روز دفتر میں جب میری سیکریٹری آمنہ نے مجھے بتایا کہ کوئی پروفیسر شاہ مجھ سے ملنے آئے ہیں تو فوری طور پر مجھے کچھ بھی یاد نہ آیا اور بے ساختہ میں نے پوچھا۔

''کون پروفیسر شاہ؟''

''وہ کسی سلطانہ نامی عورت..... کا حوالہ دے رہے ہیں۔'' آمنہ نے انٹرکام پر مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''جو آپ کی کلائنٹ اور پروفیسر صاحب کی بیوی ہے۔''

اس ریفرنس کے بعد چشم زدن میں مجھے یاد آگیا کہ وہ رئیس شاہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ میری اس شخص سے کوئی ذاتی رنجش تو نہیں تھی تاہم سلطانہ کو پیش آمدہ صورتِ حال کی روشنی میں دیکھا جائے تو رئیس شاہ کے لیے میرے دل میں کوئی خوشگوار جذبات نہیں تھے۔ میں نے آمنہ سے پوچھا۔

''اپائنٹمنٹ والے کلائنٹس میں سے کوئی باقی ہے؟''

''نہیں سر..... سب نمٹ گئے۔'' میری سیکریٹری نے بتایا۔ ''لابی میں اس وقت صرف ایک ہی شخص موجود ہے۔ پروفیسر شاہ!''

''ٹھیک ہے، پروفیسر صاحب کو میرے پاس بھیج دو۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کریڈل کردیا۔

اگلے ہی لمحے رئیس شاہ میرے چیمبر میں موجود تھا۔

شاہ جی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ کسی زمانے میں وہ شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ پہنا کرتا تھا۔ ناظم آباد سے گلشن اقبال شفٹ ہونے کے بعد تو اس کے تیور اور رنگ ڈھنگ سب بدل گئے تھے۔ اس وقت وہ نفیس قسم کے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور پروفیسر بننے کے بعد وہ ناریل ڈاڑھی سے فرنچ کٹ پر چلا گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی بیشتر انگلیوں میں بیش بہا نگینے جگمگا رہے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد ہمارے درمیان مختصر سی تعارفی گفتگو ہوئی پھر وہ اصل مقصد پر آگیا۔ اس نے بڑے قائل کرنے والے انداز میں مجھ سے کہا۔

''بیگ صاحب! سلطانہ کو شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوگئی ہے۔''

''کیسی غلط فہمی شاہ جی؟'' میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ میں اسے چھوڑ کر کسی اور عورت سے شادی کرنے والا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جبھی اس نے آپ کے توسط سے خلع کا کیس دائر کیا ہے۔''

وہ پبلک ڈیلنگ کا آدمی تھا لہٰذا بڑے طریقے سلیقے سے بات کرنے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ میں نے انجانے پن سے پوچھ لیا۔

''تو کیا آپ روبی نامی کسی عورت سے شادی کا ارادہ نہیں رکھتے؟''

''بالکل نہیں بیگ صاحب۔'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور یہی سلطانہ کی غلط فہمی ہے۔ روبی کے ساتھ تو میں پارٹنر شپ میں، اپنے بزنس کو آگے بڑھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

رئیس شاہ کی بزنس پارٹنر شپ کے حوالے سے سلطانہ نے بھی مجھے بتایا تھا۔ اپنی دلچسپی کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

''اس بزنس کے بارے میں آپ مجھے کچھ بتائیں گے؟''

''کیوں نہیں جناب.....!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ کو بتانا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ آپ اپنی موکلہ کو زیادہ بہتر انداز میں صورتِ حال کی نزاکت سے آگاہ کرسکیں.....'' یہاں تک بولنے کے بعد وہ چند لمحے کے لیے رکا، ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میرے پاس ہنر ہے اور روبی کے پاس دولت۔ جب ہنر اور دولت شانہ بشانہ آگے بڑھنے کا عزم کرلیں تو پھر کامیابیاں ان کے قدموں کی گزرگاہ بن جایا کرتی ہیں۔ سلطانہ کو میں نے سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، تابناک مستقبل کے لیے بہت ضروری ہے لیکن وہ اس موقع پر الٹی مت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ یہ منحوس خیال اس کے ذہن سے نکلنے کا نام نہیں لے رہا کہ میں روبی سے شادی کرنے والا ہوں...... اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ آگ کس بدبخت نے لگائی ہے۔''

''کس نے؟'' میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

''اس کمینے کا نام ہے...... ریاست علی۔''

''ذرا اس کمینے کا تاریخ اور جغرافیہ بھی بتادیں؟''

سب کچھ جاننے کے باوجود بھی تھوڑی دیر کے لیے میں انجان بن گیا حالانکہ سلطانہ کی زبانی ریاست علی نگینہ فروش کے تمام تر کوائف مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ رئیس شاہ نے اپنے اس سابق دوست کے بارے میں بڑے کڑوے انداز میں مختصراً مجھے بتایا پھر کہا۔

''سلطانہ آج کل اس شخص کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہے تو پھر آپ کی بیوی بہت غلط کر رہی ہے۔'' میں نے رئیس شاہ کی حمایت میں کہا۔ ''کسی کی باتوں میں آکر اپنے گھر کو آگ لگانا دانش مندی نہیں ہے۔''

''یہ نکتہ آپ سلطانہ کو سمجھائیں نا۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! اگر آپ یہ کام کردیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ میرا گھر برباد ہونے سے بچ جائے گا اور اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر بھی دے گا بلکہ......'' وہ رکا، معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا اور آواز دبا کر بولا۔ ''میں بھی آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے رئیس شاہ کو یہی تاثر دیا کہ میں اس کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''شاہ جی! خلع کے سلسلے میں میرے پاس جو بھی کیس آتے ہیں، میں ان عورتوں کو یہی سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ میری حتی الامکان یہ سعی ہوتی ہے کہ وہ اس نوعیت کی مقدمے بازی سے باز آجائیں۔ یہ نصیحت بہت کم عورتوں کی سمجھ میں آتی ہے۔ میں نے آپ کی بیوی کو بھی اس معاملے کے نشیب و فراز سے آگاہ کردیا تھا

لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے خیر...'' میں نے تھوڑا وقفہ دے کر ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کی فرمائش پر میں ایک اور کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ آپ دو تین دن کے بعد دوبارہ آ کر مجھ سے ملیں۔ ہوسکتا ہے، اللہ کوئی بہتر راہ نکال دے۔''

''تو اس کا مطلب ہے، آپ میرے لیے کام کرنے کو تیار ہیں؟'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

''میں سچائی، صداقت اور انصاف کے حصول کے لیے کام کرتا ہوں شاہ جی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اب جو بھی ان کا طلب گار ہو...... اور جہاں تک میاں بیوی کے ازدواجی معاملات کا تعلق ہے تو......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر رئیس شاہ کی آنکھوں میں دیکھا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ یہ معاملہ بگڑنے نہ پائے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، اس مسئلے کا بھی حل نکل ہی آئے گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد کرنے کے بعد بولا۔ ''آپ کی فیس کتنی ہے بیگ صاحب؟''

''میں اس کیس کی فیس آپ کی بیوی سے وصول کر چکا ہوں شاہ جی!''

''وہ معاملہ بگاڑنے کے لیے سلطانہ نے آپ کو دی تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں معاملہ بنانے اور سنبھالنے کے لیے دے رہا ہوں۔''

''ابھی یہ رقم آپ میری امانت جان کر اپنے پاس محفوظ رکھیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر اس کیس کا اونٹ آپ کے حسب منشا کروٹ بیٹھ گیا تو میں یہ رقم آپ سے لے لوں گا۔''

''اگر آپ اس اونٹ کی رسی کو طریقے سلیقے سے جھٹکا دیں گے تو اونٹ کیا، اس کا باپ بھی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیدھی کروٹ بیٹھے گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے بیگ صاحب!''

میں نے دونوں ہاتھ جھاڑ کر اسے دکھائے اور اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت تو سب کچھ آپ کے ہی ہاتھوں میں نظر آ رہا ہے۔''

اس نے چونک کر اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا پھر اپنی سوچ کی روشنی میں بات کو کہیں کا کہیں لے گیا، گہری سنجیدگی سے اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

''بیگ صاحب! آپ کا اسٹار کون سا ہے؟''

''آپ میرا اسٹار کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

''میں ایک ماہر علم نجوم ہوں۔'' وہ بڑے فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ مجھے اپنا اسٹار بتا دیں گے تو میں آپ کے بارے میں اہم پیش گوئیاں کر سکتا ہوں۔''

''دراصل...... مجھے علم نجوم سے دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''یہ الگ بات ہے......'' وہ برا مانے بغیر بولا۔ ''اگر آپ کو دلچسپی نہیں تو پھر میں آپ کو بور نہیں کروں گا لیکن آپ کو میری جانب سے ایک تحفہ تو ابھی قبول کرنا ہوگا۔''

''تحفہ...... کیسا تحفہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کا اسٹار کون سا ہے؟'' وہ سسپنس پیدا کرتے ہوئے بولا۔

میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم......''

وہ جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، پوچھا ''ڈیٹ آف برتھ تو یاد ہوگی؟''

میں نے اسے اپنی تاریخ پیدائش بتا دی۔

''آپ کا برتھ اسٹون ٹرکوائس اور ایمرالڈ ہے، یعنی فیروزہ اور زمرد!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت یہ دونوں پتھر میرے بیگ میں موجود ہیں۔ میں دکھاتا ہوں۔ آپ ان میں سے کوئی ایک پسند کر لیں...... اور آپ انکار نہیں کریں گے کیونکہ کسی کے تحفے کو ٹھکرانا اس کا دل توڑنے کے مترادف ہے۔''

میں نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ اس کے ہاتھوں کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ چند لحات تک اپنے ہینڈ بیگ کے ساتھ مصروف رہا پھر دو مستطیل لکڑیاں سی بیگ میں سے نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لیں جناب! پسند فرمائیں!''

مذکورہ مستطیل لکڑیوں میں سے ایک پر عمدہ قسم کا فیروزہ اور دوسری پر اعلیٰ نسل کا زمرد فکس تھا۔ میں نے آج تک پتھر اور جواہرات کو انگوٹھیوں اور زیورات میں جڑا ہوا دیکھا تھا۔ یہ انداز میرے لیے بڑا منفرد اور نیا تھا۔ جب یہی بات میں نے رئیس شاہ سے پوچھی تو اس نے ان الفاظ میں وضاحت کی۔

''یہ نگینے ایران سے منگوائے ہیں میں نے۔ وہاں جواہرات کو ڈسپلے کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ ایرانی جوہری اس بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں کہ نگینے کو چھو کر دیکھا جائے۔ آپ بھی ٹچ کیے بغیر ہی پسند کر لیں۔''

وہ دونوں نگینے نہایت ہی شفاف اور اعلیٰ معیار کے تھے۔ میں نے رئیس شاہ کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے زمرد کا تحفہ قبول کر لیا۔ ڈرتے ڈرتے اس لیے کہ میری معلومات کے مطابق شاہ جی، بڑے عمدہ نظر آنے والے آرٹی فیشل اسٹون بھی تیار کیا کرتے تھے۔

بہرحال، چار کیرٹ (قیراط) کا وہ ایمرالڈ بالکل اصلی پتھر تھا۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے ایک جوہری دوست سے اس کا ٹیسٹ کرایا تھا۔ میرے مذکورہ دوست کے مطابق، اس ایمرالڈ کی اوپن مارکیٹ میں قیمت دو ہزار روپے فی کیرٹ سے کم نہیں تھی یعنی شاہ جی کا تحفہ آٹھ، دس ہزار روپے مالیت کا تھا۔ آج سے چالیس سال پہلے دس ہزار روپے کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔

رخصت سے پہلے میں نے رئیس شاہ سے پوچھ لیا۔ ''شاہ جی! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ روبی کے ساتھ کیسی بزنس میں پارٹنر شپ کرنے جا رہے ہیں؟''

''بزنس تو یہی ہے جو میں آج کل کر رہا ہوں مثلاً...... علم نجوم، پتھر و جواہرات، الواح و طلسمات وغیرہ۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''روبی میری ایک کلائنٹ ہے اور میری معتقد بھی۔ وہ مجھ پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ یہ اسی کا آئیڈیا ہے کہ میں اپنے بزنس کو کراچی کے ساتھ ساتھ نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر لے جاؤں۔ اس کام کا آغاز ہم پاکستان یعنی نیشنل لیول پر کریں گے...... پاکستان کے چار بڑے شہروں کراچی، لاہور، ملتان اور راولپنڈی میں ہم دونوں مل کر تین، تین دن کلینک کیا کریں گے۔ جس شہر کا نمبر ہو، اپنی آمد سے دو روز پہلے وہاں کے مقامی اخبارات میں اشتہار کے ذریعے کلینک کی تاریخوں اور اوقات کا اعلان کر دیا جائے گا۔ قیام مذکورہ شہر کے اعلیٰ ہوٹل میں ہوگا اور ہوٹل ہی میں کلائنٹس سے ملاقات کا انتظام بھی کرایا جائے گا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ہم اس طریقہ کار کو بین الاقوامی سطح پر آزمائیں گے۔ عرب ممالک کے علاوہ ایران، عراق، انڈیا، سری لنکا وغیرہ کے دورے بھی کریں گے۔ تمام تر اخراجات روبی کے ذمے ہوں گے۔ سروس میں دوں گا۔ منافع میں ہم برابر کے حصے دار ہوں گے۔'' وہ رکا اور مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

''بیگ صاحب! آپ بتائیں، کیسا آئیڈیا ہے؟''

''بہت شان دار اور منافع بخش۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی......''

''کون سی بات؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''یہاں تک تو درست ہے کہ رہن سہن اور سفری اخراجات آپ کی بزنس پارٹنر روبی اٹھائے گی جس کے لیے وہ منافع میں برابر کی شریک ہے۔'' میں نے اپنے ذہن کی الجھن کو زبان تک لاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ ہر جگہ آپ کے ساتھ ساتھ کیوں جائے گی۔ آپ کے اس بزنس میں روبی کا اصل کردار کیا ہوگا؟''

''بہت اچھا سوال کیا ہے آپ نے بیگ صاحب!'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''روبی کو میرے پاس آتے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ وہ میری معتقد ہی نہیں بلکہ شاگرد بھی ہے۔ روبی بہت ہی ذہین عورت ہے، وہ بڑی تیزی سے علم نجوم میں مہارت حاصل کر رہی ہے۔ وقتی زائچے پرانے کا تو حاصل ہے۔ وہ میری اسسٹنٹ کے طور پر ساتھ جائے گی۔''

رئیس شاہ کی وضاحت کے بعد اس سلسلے میں مزید کسی سوال کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ سلطانہ نے میرے سامنے رئیس شاہ کی شخصیت کو جس انداز میں پینٹ کیا تھا، شاہ جی اس کے بالکل برعکس ثابت ہو رہا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران میں اس کی ذات کے حوالے سے میری رائے میں قدرے نرمی پیدا ہوتی جا رہی تھی یا تو وہ اس وقت مجھے متاثر کرنے کے لیے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کر رہا تھا یا پھر سلطانہ نے اس کے حوالے سے سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''شاہ جی! آپ اپنی بیوی کو بھی تو اسرار علم نجوم سکھا سکتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ آپ کے شانہ بشانہ ملکی اور غیر ملکی دوروں میں ایک اسسٹنٹ کی حیثیت سے سفر کر سکتی تھی۔ اس طرح سلطانہ کے دل میں کسی قسم کا کوئی شک پیدا نہ ہوتا اور آج آپ دونوں اس واہیات صورت حال کا شکار نہ ہوتے؟''

''آپ کیا سمجھتے ہیں، میں نے اسے سکھانے پڑھانے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟'' وہ الٹا مجھی سے مستفسر ہوا۔

''تو آپ کا مطلب ہے، آپ یہ کوشش کر چکے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں...... ایک بار نہیں، ہزار بار کوشش کر چکا ہوں لیکن ان تلوں میں ایک قطرہ تیل کا نہیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے

ہوئے بولا۔ ”آپ کو دراصل آسٹرولوجی (علم نجوم) سے دلچسپی نہیں ہے، اس لیے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا لیکن اتنا بتا دوں کہ سلطانہ زحل کی ماری ہوئی ہے۔ ساڑھ ستی کے دوران میں پیدا ہونے والے لوگ زندگی بھر عجیب و غریب ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار رہتے ہیں۔ ان کے دماغ پر ایک انوکھی سنک سوار رہتی ہے۔ زحل کے ناقص اثرات کے باعث ان کے ہر کام میں تاخیر واقع ہوتی ہے اور بنتے بنتے کام بگڑ جاتے ہیں جس کے لیے وہ دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ ان میں شک اور بداعتمادی کا مادہ بہ درجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ یہی حال سلطانہ کا بھی ہے......“ وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس زحل زدہ سے تو کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اللہ بخشے! اس کی ماں قمرالنسا کو۔ وہ میرا بڑا احترام کرتی تھی۔ میں اس کی درخواست کو رد نہیں کرسکا اور اس زحل کی ماری کو گلے لگا لیا ورنہ آج تک دروازہ کھولے رشتے کا انتظار کررہی ہوتی۔“

”لیکن شاہ جی......“ میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ آپ نے ایک خاص پلاننگ کے تحت قمرالنسا کو شیشے میں لے کر سلطانہ سے شادی کی تھی؟“

”یہ فلسفہ آپ نے سلطانہ ہی کی زبانی سنا ہوگا بیگ صاحب!“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اس نے آپ کو یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں ایک لالچی، ظالم اور سفاک انسان ہوں۔ میں اپنے پاس آنے والوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر انہیں لوٹتا ہوں۔ میری نظر صرف ان کی دولت پر لگی رہتی ہے، ان کی مجبوریوں کی میری نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں۔“

”ہاں، یہ سب کچھ تو اس نے مجھے بتایا ہے اور انہی اسباب کی بنا پر وہ آپ سے الگ ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا ایسا کچھ نہیں ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ”یہ سب سلطانہ کا دماغی فتور ہے، بیمار ذہن کی پیداوار......“

”حیرت ہے!“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سلطانہ نے آپ کی ذات کے حوالے سے مجھے جو کچھ بتایا ہے، آپ اس کے برعکس بیان کررہے ہیں۔“

”اس کا دماغ خراب ہوا ہے...... بلکہ خراب کردیا گیا ہے۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ”اگر آج قمرالنسا زندہ ہوتی تو آپ کو بتاتی کہ میں نے کسی لالچ میں آکر سلطانہ سے شادی کی تھی یا یہ میرا احسان تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ سلطانہ تعلیم یافتہ تھی، خوب صورت تھی، صاحب حیثیت فیملی سے تعلق رکھتی تھی لیکن یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ وہ زحل زدہ تھی۔ پانچ کیرٹ کا ایک عمدہ اور شفاف روبی، ایمرالڈ، سیفائر، ٹوپاز، ڈائمنڈ اگر ایک لاکھ روپے قیمت رکھتا ہو تو اس میں کریک آتے ہی وہ محض کانچ کا ایک خوش نما ٹکڑا رہ جاتا ہے۔ جس طرح پتھر کی قیمت اس کی کوالٹی کی بنا پر طے کی جاتی ہے اسی طرح انسان کی قدر و قیمت اس کی خوش بختی کی رہین منت ہوتی ہے۔ اگر سلطانہ خوب صورت، اسمارٹ، تعلیم یافتہ اور آسودہ حال تھی تو پھر اس کا رشتہ کیوں نہیں آتا تھا۔ اس لیے ناکہ اس کے مقدر کو پیدائشی زحل گرہن لگا ہوا تھا۔ اس آفت زادی کو سینے سے کس نے لگایا؟ میں نے......اور آج میں ہی سب سے برا ہوں اور جہاں تک ہوس اور لالچ کا تعلق ہے......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جب میری سلطانہ سے شادی ہوئی، میں کسی فٹ پاتھ پر نہیں پڑا ہوا تھا۔ میں صاحب حیثیت اور صاحب عزت تھا بیگ صاحب۔ میری کوئی ویلیو تھی تو ہزاروں دیگر لوگوں کی طرح قمرالنسا بھی میرے آستانے پر پہنچی تھی نا...... میں وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا حامی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ناظم آباد سے گلشن اقبال آنے کے بعد اپنے معاوضے میں اچھا خاصا اضافہ کردیا ہے لیکن آپ یہ تسلیم کریں گے کہ میں کسی کلائنٹ کو گھر سے بلا کر نہیں لاتا۔ ان کی ضرورت کھینچ کر انہیں میرے کلینک پر لاتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں گن پوائنٹ پر ان کی جیب سے پیسے نہیں نکلواتا۔ وہ اپنی ضرورت بیان کرتے ہیں، میں اس کام کا معاوضہ بتاتا ہوں۔ وہ مجھے ادائیگی کرتے ہیں اور میں ان کا کام کردیتا ہوں۔ جب سب کچھ باہمی افہام و تفہیم سے ہورہا ہے تو میں کہاں سے ظالم اور سفاک ہوگیا...... بتائیں نا بیگ صاحب؟“

”ہاں...... اس صورت میں تو آپ کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔“ میں نے منطقی انداز میں کہا۔

”آج میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک راز بتاتا ہوں بیگ صاحب!“ وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”یہ بات میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی لیکن پتا نہیں۔ کیوں...... آپ پر اعتماد کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ آپ بہت ہی گہرے انسان ہیں جناب۔ مجھے امید ہے آپ ہمارے کیس کو عدالت میں لے جائے بغیر اپنی عدالت ہی میں نمٹا دیں گے۔ سمجھ لیں کہ ایک میاں بیوی کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لگا ہوا ہے۔

آپ نے چند روز پہلے والی پیشی پر بیوی کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا ہے۔ آج آپ کے سامنے دوسرے فریق یعنی شوہر کا بیان ہو رہا ہے۔ تیسری پیشی پر آپ فیصلہ سنائیں گے اور فریقین کو اپنے فیصلے کی پابندی کا حکم بھی دیں گے...... آپ بتا چکے ہیں کہ آپ ہمیشہ سچائی، صداقت اور انصاف کے حصول کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں۔"

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "میں بھی اور عدالت بھی اور سب سے بڑھ کر قانون بھی اسی بات پر زور دیتا ہے کہ اگر متنازعہ معاملات کو مل بیٹھ کر مصالحت اور مفاہمت سے حل کر لیا جائے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں۔ عدالت اور مقدمے بازی تو آخری آپشن ہے اور اس سے بچنے ہی کی کوشش کرنا چاہیے۔ مجبوری کی بات دیگر ہے۔"

"میرا خیال ہے، ہمارا معاملہ ابھی مجبوری اور بے بسی کے فیز میں داخل نہیں ہوا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ اسے اپنی عدالت میں سماعت کر کے انصاف کے تقاضے نبھا سکتے ہیں۔"

"میں کوشش کروں گا...... !" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "مجھے یقین ہے، آپ کی یہ کوشش ضائع نہیں جائے گی۔"

"شاہ جی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ مجھے اپنی زندگی کے کسی اہم راز سے آگاہ کرنے جا رہے تھے......؟"

"جی، میں اسی طرف آ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ سے میں خلوص بھری درخواست کروں گا کہ میرے اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر دیجیے گا۔ آپ سے شیئر کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تاکہ میں اپنے ماتھے پر چسپاں لالچ، ہوس، لوٹ کھسوٹ اور ظلم وزیادتی کے متعدد لیبلز کو اتار سکوں۔ میں ہرگز ایسا نہیں ہوں جیسا کہ سلطانہ نے مجھے بنا کر پیش کیا ہے۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "آپ کی زندگی کا یہ قیمتی راز میرے دل میں محفوظ رہے گا۔"

"میری ابتدائی زندگی بڑی خراب اور ناقابل ذکر ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "میں نے سلطانہ سے پہلے بھی سلمٰی نامی ایک عورت سے شادی کی تھی۔ میں اپنی زندگی کے اس حصے کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مختصراً آپ یوں سمجھ لیں کہ میں ان دنوں ایک ناکام اور نامراد شخص ہوا کرتا تھا۔ پھر میری زندگی میں اچانک ایک انقلاب آ گیا۔"

یہاں تک بتانے کے بعد وہ تھما، ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"سلمٰی کی وفات کے بعد میں کچھ عرصہ تو یونہی مارا مارا پھرتا رہا پھر گھر پر تالا ڈال کر ملک کے دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ مختلف دیہاتوں، قصبہ جات اور شہروں سے ہوتے ہوئے میں شیخوپورہ پہنچ گیا۔ پنجاب کا یہ علاقہ جرائم کے لحاظ سے سرفہرست مانا جاتا ہے۔ شیخوپورہ کے بعد اوکاڑہ اور اوکاڑہ کے بعد گوجرانوالہ کا نمبر آتا ہے۔ بہرحال، جرائم کے گڑھ شیخوپورہ میں میری ایک اللہ والے سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ظلمت کی شب تاریک میں حق کا چراغ روشن کیے بیٹھا تھا۔ میں اس چراغ کی روشنی سے چمک کر رہ گیا۔ اس اللہ والے کی صحبت میں، میں نے چند ماہ گزارے اور علم وہنر کے خزانے سمیٹ کر واپس کراچی آ گیا۔ واپسی کے فیصلے میں انہی بزرگ کا ہاتھ تھا۔ میں ان کے حکم پر ہی واپس آیا تھا۔ میں تو بند کباب اور چنا پاپڑی کا ٹھیلا لگانے والا ایک ناقابل ذکر معمولی سا انسان تھا۔ آج میں جو کچھ ہوں، انہی بزرگ کے فیض سے ہوں۔ انہوں نے بوقت رخصت مجھے دو نصیحتیں کی تھیں۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"نمبر ایک، انہوں نے فرمایا تھا کہ رئیس تمہارے نصیب میں ازدواجی زندگی کا سکون نہیں لکھا ہوا۔ میرا مشورہ ہے کہ اب شادی نہ کرنا اور اگر کسی مخصوص حالات میں شادی ناگزیر بھی ہو جائے تو پھر ہر دکھ تکلیف اٹھا کر اس عورت کے ساتھ ساری زندگی گزار دینا۔ اسے خود سے اور خود کو اس سے الگ نہیں ہونے دینا...... یہی وجہ ہے بیگ صاحب......" وہ سانس لینے کے لیے توقف ہوا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"کہ آج میں اس شادی کو بچانے کے لیے آپ کی منت خوشامد کر رہا ہوں حالانکہ سلطانہ نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے قمر النسا کے آنسوؤں کی لاج رکھتے ہوئے سلطانہ سے شادی کا فیصلہ کیا تھا اور اب مجھے ان بزرگ کے فرمان کی لاج رکھنا ہے۔ اگر خلع کے سلسلے میں آپ نے سلطانہ کو نہ سمجھایا تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ آپ اسے کسی بھی طرح سمجھانے کی کوشش کریں کہ وہ احمقانہ خیال سے باز آ جائے۔ اس کے لیے میں اس کی ہر شرط، ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہوں۔ اگر اسے میری زبان کا بھروسا نہ ہو تو میں اسٹیمپ پیپر پر لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ آپ اپنی وکالت میں مجھ سے کسی نوعیت کا ڈاکومنٹ بھی سائن کروا لیں۔"

اس نے بڑی ٹھوس اور وزنی بات کی تھی جو اس کے سچے جذبات کی ترجمانی کرتی تھی۔ اگر وہ جھوٹا اور فراڈ قسم کا شخص ہوتا تو اتنی بڑی بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔ رئیس شاہ نے اپنی پہلی شادی کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بیٹی صدف کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا جسے سلطانہ کے بقول اس کا ماموں اعجاز حسین اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے بھی ماضی کے اس قصے پر مٹی ڈال دی۔ گڑے مردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ اہمیت اس بات کی تھی کہ جو زندہ ہیں ان کی زندگی کو آسان بنانے کی کوشش کی جائے اور میری پوری توجہ اسی نکتے پر لگی ہوئی تھی۔

"اور آپ کے مرشد نے دوسری نصیحت کیا کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نمبر دو...... !" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اپنی آمدنی کا پچاس فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا۔ اس سے اللہ میرے کاروبار میں برکت دے گا اور میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں اپنی شان جتانے کے لیے نہیں کہہ رہا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس وقت درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت اور تعلیم کی ذمے داری اٹھا رکھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ میرے لیے آمدنی کے مزید دروازے کھول رہا ہے۔ یہ روبی سے پارٹنرشپ والا پروجیکٹ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اللہ نے جب اپنے مفلس اور نادار بندوں کی مدد کرنا ہوتی ہے تو وہ مجھ جیسے گناہ گاروں کو اس نیک کام کا وسیلہ بنا دیتا ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"کیا یہ بات سلطانہ کے علم میں ہے کہ آپ درپردہ ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں!" اس نے بڑے قطعی انداز میں سر کو نفی میں جھٹکا اور بولا۔ "آج پہلی بار میں نے آپ کے سامنے یہ راز کھولا ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ بزرگ ہستی نے میری ناخوشگوار ازدواجی زندگی کی پیشگوئی کی تھی۔ مجھے اپنی ازدواجی زندگی کو بھی بچانا ہے اور اپنے مشن کو بھی جاری رکھنا ہے اور...... اس سلسلے میں آپ میری مدد کریں گے۔"

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "کیا اس بحران کے حوالے سے آپ نے اپنے مرشد سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا؟"

"وہ بزرگ ہستی اس دنیا سے پردہ فرما چکی ہے۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔ "میں کچھ عرصہ پہلے اپنے مسائل کے حل کے لیے شیخوپورہ گیا تھا تاکہ اپنی موجودہ صورت حال سے انہیں آگاہ کر سکوں اور تبھی پتا چلا کہ مجھے نشان منزل دکھانے والا چراغ گل ہو چکا ہے۔" وہ بڑے رنجیدہ انداز میں متوقف ہوا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"اب مجھے اپنے تمام بحرانوں سے خود ہی نمٹنا ہے۔ چاہے وہ سلطانہ کی بددماغی ہو یا ریاست علی کا پھیلایا ہوا شر......!"

"یہ ریاست علی تو کبھی آپ کا دوست ہوا کرتا تھا۔" میں نے اپنی معلومات کی خاطر پوچھ لیا۔ "پھر وہ ایسی خطرناک دشمنی پر کیوں اتر آیا ہے؟"

سلطانہ مجھے بتا چکی تھی کہ وہ ریاست علی کی فراہم کردہ معلومات پر ہی سرگرم عمل ہوئی تھی اور اپنی تحقیق سے اس نے یہ پتا چلا لیا تھا کہ رئیس شاہ عنقریب اسے طلاق دے کر روبی سے شادی کرنے والا ہے۔ اس کا مطلب تھا، وہ مسلسل ریاست سے رابطے میں تھی۔ اگر رئیس شاہ کے پیش کردہ دلائل پر ہمدردی سے غور کیا جاتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ سلطانہ، ریاست علی کے بہکاوے میں آ کر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اسی نکتے کی وضاحت کے لیے میں نے رئیس شاہ سے یہ سوال کیا تھا۔

"بڑی سیدھی اور آسان سی بات تو یہ ہے کہ وہ بدبخت مجھ سے اور میری ترقی سے جلتا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے جب اس سے نگینے لینا بند کیے اور اپنے کلائنٹس کو بھی اس کی دکان پر جانے سے روک دیا تو اس نے مجھ سے شدید ترین جھگڑا کیا تھا۔ بس تبھی سے وہ میرا دشمن ہو گیا تھا اور اب اس نادان سلطانہ کی ڈوریاں ہلا کر وہ اپنی دشمنی نکال رہا ہے۔"

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ نے ریاست علی سے کاروباری معاملات ختم کیوں کر دیے تھے؟" میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"کیوں نہیں بیگ صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "آپ میرے بھی وکیل ہیں۔ کہتے ہیں، وکیل اور معالج سے کبھی کچھ بھی چھپانا نہیں چاہیے ورنہ اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔"

"تو پھر بتائیں؟" میں نے کہا۔

اس نے بتایا۔ "میں نے ریاست علی کی بے ایمانی اور دھوکا دہی کی وجہ سے معاملات ختم کیے تھے۔ اس نے اپنی دکان کے پچھلے حصے میں ایک بھٹی لگا رکھی ہے جہاں وہ زیورات کی میکنگ کے علاوہ نقلی نگینے بھی تیار کرتا ہے۔ وہ اس

شیشے کا پرانا اور گھاگ آدمی ہے۔ سارے گورکھ دھندوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ عام کرسٹل کو مختلف طریقوں سے گزار کر اور بھٹی کی آگ دکھا کر وہ آرٹی فیشل نیلم، پکھراج، یاقوت، ہیرا اور زمرد تیار کرنے کا ماہر ہے۔ اس نے میرے ساتھ بھی فراڈ شروع کر دیا تھا۔ جب میں نے اس کی بدمعاشی پکڑ لی تو اس نے الٹا مجھی پر ملبا ڈال دیا۔ ایک تو اس نے یہ الزام لگایا کہ میں نے نگینہ بدل دیا ہے، اس کے ساتھ ہی پوری مارکیٹ میں میرے خلاف پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا کہ میں نقلی جواہرات تیار کر کے فروخت کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب چور کی چوری پکڑی جاتی ہے تو وہ کس طرح شور مچاتا اور بلبلاتا ہے۔ ریاست علی بھی زخمی سانپ کے مانند بس کھول رہا ہے۔"

"اچھا تو اصل صورت حال یہ ہے.....!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تو واقعی بڑی سنگین سچویشن میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"بیگ صاحب! میں نے آپ کو سب کچھ سولہ آنے سچ بتا دیا ہے۔" وہ بڑے مستحکم انداز میں بولا۔ "اگر کسی مرحلے پر میرا بیان کردہ ایک لفظ بھی غلط ثابت ہو تو آپ ایک جج کی حیثیت سے مجھے جو چاہیں، سزا سنا سکتے ہیں۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔"

"اچھا یہ بتائیں......" میں نے پوچھا۔ "اگر سلطانہ کسی بھی طرح اپنی ضد سے باز نہیں آتی اور آپ کی زندگی سے نکل جاتی ہے تو اس کے اس عمل سے آپ کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟"

"میرے لیے دنیاوی نقصان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس فیصلے کے بعد میری ساکھ کو یقیناً ایک دھچکا تو لگے گا لیکن مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔" وہ بے حد سنجیدہ انداز میں بولا۔ "میرے نزدیک سب سے مقدم اور قیمتی وہ عہد ہے جو میں نے اپنی بزرگ ہستی سے کر رکھا ہے یا یوں کہہ لیں کہ جو ان کی نصیحت تھی کہ اگر میں شادی کروں تو پھر اس عورت کے ساتھ زندگی کی آخری سانس تک نبھا کر دکھاؤں...... اپنی زندگی کی آخری سانس تک یا اس کی زندگی کی آخری سانس تک۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، بڑی اُمید بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

"اگر سلطانہ اپنی ضد سے باز نہ آئی تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی، میں اپنے مرشد کے سامنے خود کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا چاہے مجھے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کتنا ہی سنگین قدم کیوں نہ اٹھانا پڑے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں شاہ جی؟" میں نے متذبذب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں بیگ صاحب!" وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ "دس بیس ہزار کے عوض خطرناک سے خطرناک کام کرنے والے مل جاتے ہیں۔ سلطانہ کو پوری زندگی میرے ساتھ، میری بیوی کی حیثیت ہی سے گزارنا ہوگی۔ بصورت دیگر اس کے حق میں ڈگری ہونے سے پہلے ہی......!"

وہ سیدھا سیدھا سلطانہ کو اجرتی قاتل سے ٹھکانے لگانے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

"شاہ جی! آپ اتنے جذباتی نہ ہوں۔ انشاء اللہ! اس انتہائی اقدام کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں سلطانہ کو ہینڈل کر لوں گا۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ضد سے باز آجائے اور مجھے ندامت سے بچا لے۔" وہ یکدم نارمل ہوتے ہوئے بولا۔ "جب میں اس کی ہر خواہش، ہر ضرورت اور ہر مطالبے کو تحریری اور عملی شکل میں پورا کرنے کو تیار ہوں تو پھر وہ میرے دشمن کے بہکاوے میں آ کر اپنے آشیانے اور میری عاقبت کو خراب کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔"

"دیکھیں شاہ جی!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کا گھر اور زندگیاں برباد ہونے سے بچ جائیں لیکن......"

"لیکن کیا؟" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"لیکن یہ کہ اس سلسلے میں مجھے آپ کی طرف سے فری ہینڈ چاہیے ہوگا۔"

"کیسا فری ہینڈ؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"اس طرح کا فری ہینڈ کہ میں جس بھی قیمت اور جن بھی شرائط پر سلطانہ کو اس کی ضد سے دستبردار ہونے کے لیے تیار کروں، آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے نمائندے کی حیثیت سے اس سے بات کروں گا اور اس کی تسلی کرانے کے بعد اپنی بات منوا لوں گا۔"

"ڈن!" وہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ کہیں تو میری جانب سے اپنے لیے مختار نامہ تیار کر لیں۔"

"اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کی زبان پر بھروسا ہے۔"

"کاش! سلطانہ بھی مجھ پر ایسا ہی اعتماد کرنے لگے......!" وہ حسرت آمیز انداز میں بولا۔

"ایسا ہونے ہی والا ہے شاہ جی!" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "شاید قدرت نے کسی خاص مقصد کے تحت آپ لوگوں کو میرے پاس بھیجا ہے۔ میری حتی الامکان کوشش یہی ہوگی کہ اسی دفتر میں بیٹھے بیٹھے آپ لوگوں کا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔"

"آپ کے منہ میں گھی شکر بیگ صاحب!" وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ "آپ مجھے روبی اور ریاست علی کے مکمل ایڈریس اور فون نمبرز فراہم کر دیں۔ میں ایک اجنبی اور لاتعلق شخص کی حیثیت سے انہیں ٹٹولنے کی کوشش کروں گا تاکہ آپ دونوں کے بیانات کے بعض حصوں کو چیک کیا جا سکے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے بیگ صاحب!" وہ تعاون آمیز انداز میں بولا۔ "اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

وہ مزید پندرہ منٹ تک میرے پاس رکا پھر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

سلطانہ نے مجھے تصویر کا ایک رخ دکھایا تھا۔

رئیس شاہ نے دوسرے رخ سے پردہ اٹھایا تھا۔

اب گیند میری کورٹ میں تھی، جس طرح حالات اس کیس کو میری کورٹ میں لے آئے تھے۔ مجھے بڑی گہری سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان دونوں میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ دونوں ہی درست ہوتے یا دونوں ہی غلط ہوتے۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ دونوں کچھ کچھ صحیح اور کچھ کچھ غلط ثابت ہوتے۔

سلطانہ نے رئیس شاہ کو جس انداز میں پینٹ کیا تھا، وہ اس رئیس شاہ سے قطعی مختلف تھا جس سے میں نے طویل ملاقات کی تھی۔ اگر سلطانہ کا موقف ہی ٹھیک تھا تو پھر اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ رئیس شاہ نے میرے سامنے محض عمدہ اداکاری کا ایک نمونہ پیش کیا تھا لیکن اس نے جس کھلے انداز میں پیشکش اور دعوے کیے تھے اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ ایک ہم کھرا اور سچا ہے۔

آنے والے دو دنوں میں، میں نے اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے ماہ جبیں عرف روبی اور جوہری ریاست علی کے بارے میں نہایت ہی اہم معلومات حاصل کر لیں۔ ریاست علی سے تو میں ایک کلائنٹ کی حیثیت سے خود جا کر بھی ملا تھا اور شاہ جی کا تحفہ وہ ایمرالڈ اسے دکھا کر کہا تھا کہ میں اس زمرد کو فروخت کرنا چاہتا ہوں، کتنے پیسے مل جائیں گے؟ اس نے مذکورہ زمرد کو اپنی آنکھوں کے سامنے گھما پھرا کر بڑی بے دلی سے کہا تھا کہ یہ تیسرے درجے کا پتھر ہے۔ ہزار، بارہ سو سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔ اس فتوے سے ریاست کی بدنیتی کھل کر سامنے آگئی تھی۔ اگر میں نے اپنے ایک جوہری دوست سے اس ایمرالڈ کی قدر و قیمت کی تصدیق نہ کی ہوتی تو شاید میں رئیس شاہ ہی کو فراڈ سمجھتا۔ اس کے علاوہ میری تحقیق و تفتیش سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ وہ اللہ کا بندہ، بندے دا پتر نہیں تھا۔ سونے میں ملاوٹ کرنا اور کرسٹل کو قیمتی نگینوں میں تبدیل کرنا اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ علاوہ ازیں اس کے حوالے سے ایک یہ شکایت بھی عام سننے کو ملی کہ وہ فتنہ ساز، کینہ پرور اور بڑا حاسد قسم کا شخص تھا۔

انٹ شنٹ

ایک بیوی نے اپنے شوہر کو پہلی مرتبہ ای میل کی۔ جلدی میں وہ ڈیش لگانا بھول گئی۔ ای میل بھیجنے سے پہلے اسے یاد آیا تو جلدی میں جہاں جہاں کرسر جاتا، وہ ڈیش لگا دیتی، جو ای میل بھیجی گئی وہ کچھ یوں تھی۔

السلام علیکم!

عرض یہ ہے کہ میں نہایت خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں آپ کی۔ بہت یاد آتی ہے انور کی۔ شادی ہے ہماری بکری کی۔ ٹانگ ٹوٹ گئی ہے پھوپھو کی۔ دعا قبول کریں چوری کی واردات بھی ہوئی ہے ہمارے گھر۔ میرا دیور پکڑا گیا ہے محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ۔ نانی لاہور آئی تھیں بغیر بتائے۔ بھائی بھی کراچی چلے گئے ہیں انڈے دے کر۔ ہماری مرغی کڑک ہو گئی ہے سلیمان میاں سے مل کر۔ پتا چلا کہ آنٹی زہرہ نصیب ہو گئی ہیں غلطی سے۔ ایک لڑکا دیکھا ہے میں نے آپ کی مرغی کے لیے۔ نیا گھر اسلوا لیا ہے دادا ابو کے لیے۔ شوہری چپل لائی ہوں چھوٹی نند کے لیے۔ کچھ بھی نہ رکھی کبوتروں کے لیے۔ ایک الگ پنجرہ بنایا ہے اپنی ساس کا۔ روز سر دباتی ہوں دودھ والے کا۔ بل ادا کر دیا ہے آپ کا۔ انتظار کرتی ہوں شہباز کا۔ رشتہ طے ہو گیا ہے ہمی کے بچے کا۔ حادثے میں انتقال ہو گیا خالو کا۔ بیٹا بری سوسائٹی میں پڑ گیا ہے۔

آپ کی چہیتی۔

فاطمہ بٹ...... کراچی

دوسری جانب روبی کے حوالے سے جو رپورٹ مجھ تک پہنچی وہ بھی شاہ جی کے حق میں جاتی تھی۔ میں نے ڈیفنس فیز فائیو ہی میں رہنے والی اپنی ایک کلائنٹ کو روبی کے پیچھے لگایا تھا۔ اس کا تعلق مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ سے تھا اور اتفاق سے وہ روبی کو ذاتی طور پر بھی جانتی تھی لہٰذا میری ضرورت کی معلومات اگلوانے کے لیے اسے مشکل پیش نہیں آئی۔ روبی نے بڑے اعتماد سے میری کلائنٹ کو بتایا تھا کہ رئیس شاہ کی حیثیت اس کے لیے ایک استاد کی سی ہے۔ اگر پروفیسر صاحب کی بیوی ہماری شادی کے حوالے سے سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہے تو یہ اس کا پاگل پن ہے۔ بہرحال، اگر سلطانہ اس سے ملاقات کرکے کسی قسم کی تسلی کرنا چاہے تو وہ تیار ہے۔

اپنا ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد میں نے سلطانہ کو اپنے دفتر بلا لیا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس مختصر تفصیل میں رئیس شاہ کے مرشد کا ذکر بھی ہوا اور میں نے ازدواجی ناخوشگواریت کو ایڈٹ کرکے سلطانہ کو صرف اتنا بتایا کہ رئیس شاہ اپنے مرشد کی نصیحت کے مطابق بہت نیک کام کر رہا ہے۔ لحہ بہ لحہ اس کے چہرے کی حالت تبدیل ہوتی رہی اور میرے خاموش ہونے پر اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بیگ صاحب! رئیس شاہ نے اس کام کے لیے آپ کو کتنے پیسے دیے ہیں؟"

میں نے اس چوٹ کا ذرا برا نہیں منایا کیونکہ وہ حقائق سے واقف نہیں تھی۔ اس سچویشن میں وہ کوئی ایسی ہی سخت بات کر سکتی تھی۔ میں اس کا وکیل تھا ورنہ مخالف پارٹی کی حمایت میں بول رہا تھا۔ اس کا غصے میں آجانا ایک فطری امر تھا۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نہ تو دوغلا ہوں اور نہ ہی کانوں کا کچا۔ میں نے رئیس شاہ کے دعووں کی باقاعدہ تصدیق کی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے وہ صد فیصد درست ہے۔ آپ چاہیں گی تو میں اپنے دفتر میں روبی سے آپ کی ملاقات بھی کرا دوں گا۔ سچ جھوٹ آپ کے سامنے آجائے گا۔"

چند لمحات کے تذبذب کے بعد اس نے پوچھا۔ "اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میں اس سے جو شرائط لکھواؤں گی، بعد میں وہ اس تحریر کی پاسداری بھی کرے گا؟"

"آپ دونوں کے درمیان ہونے والا یہ تحریری معاہدہ پکے کاغذات پر، میری وکالت میں تیار کیا جائے گا۔ میں اس دستاویز کی ورڈنگ ایسی رکھوں گا کہ اس کے فرار کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

"تب تو ٹھیک ہے....." وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ "گواہوں کے ذیل میں، میں ایک نام روبی کا بھی ڈالوں گا تاکہ کام پکا ہو جائے جس معاہدے میں روبی کی حیثیت ایک گواہ کی ہو، وہ خود اس کی خلاف ورزی کیسے کر سکے گی۔"

"یہ تو آپ بڑا زبردست کام کر رہے ہیں بیگ صاحب!" وہ مطمئن لہجے میں بولی۔

"اب تو یقین آگیا نا..... میں آپ ہی کا وکیل ہوں؟"

"جی ہاں..... بالکل۔" وہ خجالت آمیز انداز میں بولی۔

"میں نے کہا۔ "میری اب تک کی تحقیق سے یہی سچائی سامنے آئی ہے کہ رئیس شاہ اتنا برا شخص نہیں جتنا ریاست علی نے اسے بنا کر آپ کے سامنے پیش کیا ہے جبکہ ریاست کا کردار بڑا منفی اور آگ لگانے والا ہے۔"

میرے اس تلخ مگر مبنی برحقیقت تبصرے پر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بڑے اضطراری انداز میں اپنے گلابی ہونٹوں کو کاٹنے لگی۔ مجھ سے یہ ظلم دیکھا نہ گیا تو میں نے جلدی سے کہا۔

"اب آپ وہ تمام شرائط اور مطالبات مجھے نوٹ کرا دیں جو آپ رئیس شاہ کے سامنے رکھنا چاہتی ہیں تاکہ میں پہلی فرصت میں ایک جامع قسم کا شرائط نامہ تیار کروا لوں۔"

وہ میرے سوال کے جواب میں سوچ سوچ کر اپنے تحفظات اور مطالبات مجھے نوٹ کرانے لگی۔ جب اس کی فرمائشی فہرست مکمل ہو گئی تو میں نے کہا۔

"اب یہ تو طے ہے کہ جو کیس خلع کے لیے عدالت میں آپ کی طرف سے دائر کیا گیا تھا، اسے ہم واپس لے رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے، اس ایگری منٹ کے بعد کیس چلنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے.....!" میں نے کہا۔ "کل صبح آپ عدالت میں آکر مجھ سے ملیں۔ معمولی سی قانونی کارروائی کے بعد ہم اس کیس کو واپس لے لیں گے۔"

"اگر یہ کیس ایگری منٹ کی تیاری اور دستخط وغیرہ کے بعد واپس لیا جائے تو کیسا رہے گا بیگ صاحب؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "چاہیں تو اس ایگری منٹ

کے ساتھ ہی آپ ہم سے ایک راضی نامہ بھی لکھوا لیں جسے عدالت میں پیش کرکے کیس کو خارج کروایا جا سکتا ہے۔"

"یہ آپ نے بڑی عقل مندی کی بات کی ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔"

وہ ننھے بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے ایگری منٹ سے پہلے کیس ڈس مس نہ کرنے کی بات کیوں کی تھی۔ اسے یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ کہیں کیس خارج ہوتے ہی رئیس شاہ اپنے وعدوں اور دعووں سے پھر نہ جائے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے مجھ پر بھروسا نہ ہو۔ کہیں وہ یہ سمجھتی ہو کہ میں رئیس شاہ کے ساتھ مل کر اسے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہرحال، اس کا مشورہ یا تجویز جو بھی سمجھ لیں مبنی بردانش مندی تھی۔

میں نے سلطانہ کو دو روز بعد اپنے پاس آنے کا کہہ کر رخصت کر دیا۔

اسی رات میں نے رئیس شاہ کو فون کرکے مبارک باد دے دی۔ وہ اپنے ایک عقیدت مند کے پاس پی ای سی ایچ سوسائٹی میں قیام پذیر تھا۔ اس نے میرا بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میرے لیے تو یہ ایک احسان کی حیثیت رکھتا ہے لیکن آپ کے نامۂ اعمال میں یہ کارنامہ ایک نیکی کی حیثیت سے درج ہوگا..... یقیناً آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔"

"کام چھوٹا ہو یا بڑا، اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ہو گیا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ خوش تو بہت ہو رہے ہیں لیکن ذرا سلطانہ کی شرائط بھی تو سن لیں، ہو سکتا ہے، یہ فہرست سماعت فرمانے کے بعد آپ کے کانوں میں سے دھواں خارج ہونے لگے، ریلوے کے کسی انجن کے مانند.....؟"

"بیگ صاحب! آپ بھی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔" وہ ایک کھوکھلا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "ایک طرف خوشی کی نوید سناتے ہیں اور دوسری جانب ڈراتے بھی ہیں۔"

"تو میں بولنا شروع کروں.....؟"

"جی ارشاد.....!"

میں نے سلطانہ کی پیش کردہ شرائط اور مطالبات ایک ایک کرکے رئیس شاہ کے گوش گزار کرنا شروع کر دیے۔ چھوٹی بڑی جکڑ بندیوں کے ساتھ جو سب سے سخت شرط عائد کی گئی تھی اسے سن کر رئیس شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور مایوسی بھرے انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے بیگ صاحب! گھر کو ٹوٹنے سے بچانا ہے تو یہ قربانی تو دینا ہی ہوگی۔"

وہ کڑی شرط کچھ اس طرح تھی کہ رئیس شاہ، روبی سے قطع تعلق کر لے گا اور اس کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا کوئی بزنس نہیں کرے گا، وغیرہ وغیرہ.....!

میں نے کہا۔ "شاہ جی! دو دن کے بعد آپ کو میرے آفس آنا ہے، اس معاہدے پر سائن کرنے کے لیے۔ میں نے سلطانہ کو بھی اسی روز بلایا ہے۔ اس ایگری منٹ کی تکمیل کے بعد ہی وہ اللہ کی بندی خلع کا دائر شدہ کیس واپس لے گی۔"

"او کے..... میں حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"لیکن آپ اکیلے نہیں آئیں گے شاہ جی!"

"پھر.....؟" اس کے سوال میں الجھن در آئی۔

"اپنے ساتھ روبی کو بھی لے کر آئیں گے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"وہ..... وہ کس لیے.....؟" اس کی الجھن دوچند ہو گئی۔

"گواہی کے لیے.....!"

"کیسی گواہی بیگ صاحب؟"

"جو تحریری معاہدہ آپ اور سلطانہ سائن کریں گے اس میں دو گواہوں کے دستخط بھی لازمی ہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ایک گواہ سلطانہ اپنے ساتھ لے کر آئے گی اور ایک گواہ آپ..... یعنی روبی کو۔ اب آپ اس کام کے لیے روبی کو کس طرح تیار کرتے ہیں، یہ آپ کا کام ہے....."

"اسے تو میں کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لوں گا بیگ صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ میرے تازہ ترین حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔ وہ میری سچی خیرخواہ اور عقیدت مند ہے۔ میری ازدواجی زندگی کی سلامتی کے لیے وہ اپنے تعلق کی قربانی پیش کر دے گی لیکن یہ تو بتائیں کہ سلطانہ اپنے ساتھ کس گواہ کو لے کر آرہی ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اگر وہ ریاست علی کو لے آئی تو.....؟" اس نے ازراہ مذاق پوچھا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں شاہ جی۔" میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ "میں نے ریاست علی کا اصلی چہرہ اس پر عیاں کر دیا ہے۔ اب وہ اس فراڈ جوہری سے شدید نفرت کرنے لگی ہے۔" پھر میں نے رئیس شاہ کو وہ واقعہ بھی سنایا جب میں

لالوکھیت کی صرافہ مارکیٹ میں ریاست کی دکان پر زمرد فروخت کرنے گیا تھا۔
''اللہ کا شکر ہے کہ سلطانہ کو عقل آ گئی ہے۔'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اب آگے بھی انشاء اللہ! سب ٹھیک ہی رہے گا۔''
''انشاء اللہ!'' میں نے پُر وثوق انداز میں تائید کی۔
وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! میں نے آپ کو اپنا گرو مان لیا ہے۔ آپ بڑے باتدبیر وکیل ہیں۔ بگڑی کو بنانے کا ہنر کوئی آپ سے سیکھے۔''
''شاہ جی! آپ کیوں مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''سب کی بگڑی بنانے والی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ میں نے تو آپ کے مختار یعنی اٹارنی کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ نے اس معاملے کو سیٹل کرنے کے لیے مجھے ''پاور آف اٹارنی'' دیا تھا یا نہیں؟''
''جی ، تا پھر گروؤں والی بات......!'' وہ چہک کر بولا۔
ہمارے درمیان الوداعی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ ستم گیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں گھر پہنچا تو فون کی گھنٹی نے میرا استقبال کیا۔
میں نے بریف کیس کو ایک صوفے پر رکھا اور ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگا لیا، پھر کہا۔ ''ہیلو......''
''ہیلو بیگ صاحب!'' دوسری طرف سے رئیس شاہ کی چہکتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ''آپ کیسے ہیں؟''
''اللہ کا کرم ہے۔ الحمدللہ! میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' میں نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''خیریت...... اس وقت آپ نے کیسے یاد فرمایا شاہ جی۔ آواز سے تو بہت خوش لگ رہے ہیں۔''
''آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔'' وہ تصدیقی انداز میں بولا۔ ''میں اس وقت واقعی بہت خوش ہوں۔''
''اپنی خوشی کے بارے میں ابھی فون پر بتائیں گے یا ایگری منٹ والے دن؟''
''ابھی اور اسی وقت۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''اور اب کسی ایگری منٹ شیگری منٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے بیگ صاحب......''
''کیا مطلب؟'' میں بری طرح چونک گیا۔
چشم زدن میں میرا ذہن رئیس شاہ کے اس جذباتی اظہار کی طرف چلا گیا تھا جب اس نے میرے سامنے بیٹھ کر اپنی دولت اور اجرتی قاتلوں کا ذکر کیا تھا۔ اس کی طرف سے ایسی کسی نامعقولیت کی توقع تو نہیں تھی لیکن انسانی سوچ پر پہرا تو نہیں بٹھایا جا سکتا نا۔ دماغ کو جیسے ہی کلیو ملا، وہ اپنی مرضی کی سمت میں چل پڑا لیکن اللہ کا شکر کہ رئیس شاہ نے میری توقع کا خون نہیں کیا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔
''میں اس وقت اپنے گلشن اقبال والے بنگلے سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ سلطانہ بھی میرے ساتھ ہے اور...... یہ الفاظ اسی کے ہیں کہ اب ہمیں ایک چھت کے نیچے زندگی گزارنے کے لیے کسی تحریری معاہدے کی ضرورت نہیں ہے......''
''تو گویا آپ اپنے گھر واپس آ گئے ہیں؟'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔
''جی ہاں...... بالکل یہی بات ہے۔''
''یہ انقلاب کس طرح برپا ہوا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''یہ سب انہی بزرگ کا کمال ہے۔'' رئیس شاہ نے بتایا۔ ''جن کی صحبت میں، میں نے تربیت حاصل کی تھی، میں شیخوپورہ والی روحانی ہستی کا ذکر کر رہا ہوں۔''
''لیکن آپ نے تو مجھے بتایا تھا کہ......'' میرا دماغ الجھ کر رہ گیا۔ ''ان بزرگ کا وصال ہو چکا ہے؟''
''میں نے آپ سے غلط نہیں کہا تھا بیگ صاحب!'' وہ گمبھیر سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن گزشتہ رات وہی بزرگ سلطانہ کے خواب میں آئے تھے اور انہوں نے اسے زندگی کے اسرار و رموز ، بالخصوص لڑکیوں کے بارے میں بہت سی اہم باتیں سمجھائی ہیں۔ جب صبح یہ بیدار ہوئی تو اس کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ یہ آج کا پورا دن مجھے مختلف جگہوں پر تلاش کرتی رہی۔ یہ چونکہ میرے اکثر عقیدت مندوں سے واقف بھی ہے لہٰذا اس نے بالآخر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ یہ زندگی کی حقیقت کو پا گئی ہے اور اسی کے پُرزور اصرار پر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایگری منٹ کا خیال دل سے نکال دیں اور ہمارے حق میں دعا کریں کہ آئندہ کبھی ایسی صورت حال سے سامنا نہ ہو۔'' وہ لمحے کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''انشاء اللہ! جلد ملاقات ہو گی......!''
''انشاء اللہ......!'' میں اتنا ہی کہہ سکا۔
جب میں نے ریسیور کریڈل کیا تو دو بڑی حقیقتیں میرے ذہن میں چمک رہی تھیں۔ اول، جو لوگ اللہ کے سچے دوست ہوتے ہیں انہیں موت نہیں آتی۔ دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی وہ اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ دوم، جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی......!

(تحریر: حُسام بٹ)

رخصتی

محنت آزاد

نظام کوئی بھی ہو جب بد نظمی کا شکار ہو جائے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھانے والی ذات فقط انسان کی ہی رہ جاتی ہے اور انسان بھی وہ... جو معاشرے کے کمزور طبقے سے تعلق رکھتے ہوں تو خود کو خوشی کی آس دلاتے دلاتے خودکشی کی آغوش میں پناہ لے کر زندگی کی بندشوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ان کے اعتماد کی زنجیر بھی جب توڑی گئی تو انہوں نے ہر رشتے کے طوق کو گلے سے اتار ڈالا...

معاشرتی [illegible] اور بد انتظامی کے معاملات پر مشتمل ایک دل سوز کتھا

سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے جب روٹ نمبر [illegible] والی ویگن سے محمد سلیم آب پارہ بس اسٹاپ پر اُترا۔ وہ اپنے [illegible] سے لوٹ رہا تھا۔ یہ اُس کے روز کا معمول تھا۔ وہ اسٹاپ کے قریب واقع سرکاری کوارٹروں میں سے ایک میں رہتا تھا [illegible] وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے چوک پر بنے دلدار ہوٹل کا رُخ کرتا تھا جہاں کڑک دودھ پتی چائے کی پیالی، زیرے والے بسکٹ، سائل اور اس کی جیب میں رکھے بڑے نوٹ اُس کے منتظر ہوتے تھے۔
محمد سلیم ایک سرکاری ادارے میں ہیڈ کلرک تھا۔ وہ پنشن سیکشن میں کام کرتا تھا۔ ریٹائر ہونے والے سرکاری

ملازمین کی فائلیں ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے لیے ابتدائی طور پر اس کے پاس ہی آتی تھیں۔ وہی ان فائلوں کو ترتیب دے کر اگلے مرحلے تک پہنچاتا تھا۔ ایسے تازہ تازہ ریٹائر ہونے والے سرکاری ملازمین جو اپنی پنشن اور دیگر فنڈز کے اجرا کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے تھے، انہیں وہ 'معاملات' طے کرنے کے لیے ولدار ہوٹل میں ہی بلاتا تھا۔ اکثر چائے کی پیالی ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کے مابین معاملات طے پا جاتے تھے۔ یہیں پر وہ اپنے سائلین سے 'نذرانے' بھی وصول کرتا تھا۔ نذرانوں کی وصولی کا یہ پہلا مرحلہ ضرور تھا مگر آخری نہیں، البتہ اس کے پاس آ کر معاملات آسان ہو جاتے تھے۔ جو ایسا نہیں کرتے، دفتر کے چکر لگا لگا کر جوتیاں گھس لیتے مگر...... تھک ہار کر ولدار ہوٹل ہی پہنچتے تھے اور پھر چائے کی پیالی پر اپنی پنشن جاری کروا کر بقایا زندگی 'سنوار' لیتے تھے۔

محمد سلیم کی پندرہ سالہ سرکاری ملازمت میں گزشتہ تیرہ سال سے یہ اس کا معمول تھا۔ اسی قابلیت کی بنا پر وہ بہت جلد اپنے اعلیٰ افسران کی نظروں میں بھی آ گیا تھا، ورنہ صرف ڈیڑھ سال میں جونیئر کلرک سے ہیڈ کلرک بننا کوئی آسان کام تو نہ تھا۔

محمد سلیم کے پاس قدرت کا دیا تو بہت ہی تھوڑا تھا البتہ اللہ کے بندوں سے وصول کیا ہوا بہت کچھ تھا۔ وہ چاہتا تو گاڑی بھی خرید سکتا تھا، سوٹ پہن سکتا تھا، کسی اچھے علاقے میں پلاٹ خرید کر گھر بنوا سکتا تھا یا کم از کم چھوٹا موٹا بنگلہ کرائے پر لے کر اس میں رہائش اختیار کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ بہت سمجھدار آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ اس نے ایسا کچھ کیا تو جلد ہی وہ تو نہ صرف لوگوں بلکہ افسران کی بھی نظروں میں آ جائے گا۔ وہ ذرا سے عیش کی خاطر کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے نہ چاہنے کے باوجود بھی دو کمروں کے چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ معمولی زندگی بسر کر رہا تھا اور بظاہر سب کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ "نہ جی نہ...... میں تو بس لوگوں کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا میری زندگی بھی عزت سے بسر کروا رہا ہے۔" یہ اس کا مخصوص جملہ تھا۔ اجنبی تو یہ سن کر تائید میں سر ہلا دیتے تھے مگر یہ اور بات کہ اُس کی پیٹھ پیچھے لوگ باگ کھل کر اُس کے 'اوصافِ خاص' کے بارے میں ناقابلِ اشاعت اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔

دو ہفتے پہلے اُس نے اپنی بیوی کے لیے سونے کے دو بھاری کنگن بنوانے کے لیے دیے تھے۔ ایک لاکھ روپیا تو سنار کو نقد ادا کر دیا تھا۔ یہ لاکھ روپیا بھی اس نے پنشن جاری کروانے کے لیے خوار ہونے والے اُن دو ریٹائرڈ کلرکوں سے اِس ہاتھ وصول کیا اور اُس ہاتھ سے سنار کو دے آیا تھا۔ اگلے روز سنار کو باقی کے تیس ہزار روپے دے کر کنگن وصول کرنے تھے۔ اس کی بیوی کی خواہش تھی کہ اگلے ہفتے جب وہ اپنے گاؤں جائے تو بھاری کنگنوں سے پورے گاؤں کی عورتوں کے دلوں پر بجلیاں گرا کر ہی لوٹے۔ اس روز اسے پینتالیس ہزار روپے ملنے کا یقین تھا۔ تیس ہزار سنار کو دینے کے بعد باقی بچے پندرہ ہزار روپے بیوی کے ایک ہفتہ میکے میں گزارنے کے لیے زادِ سفر کے تھے۔ وہ بھی آج اس کو دو بار دفتر میں فون کر کے یاد کروا چکی تھی کہ اگلے روز اتوار ہے اس لیے آج ہی پیسے وصول کر لینا۔

اس روز جو سائل آنے والا تھا، اس سے محمد سلیم نے ساٹھ ہزار روپے طلب کیے تھے لیکن وہ نائب قاصد کے گریڈ دو کی ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا، بے چارہ بہت ہی غریب تھا۔ اس لیے کافی رونے گانے کے بعد پینتالیس ہزار دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ محمد سلیم بھی پینتالیس ہزار روپے لینے پر بوجوہ راضی ہوا۔ ویسے بھی اس کے لیے روزانہ کوئی نہ کوئی شکار خود چل کر آ ہی جاتا تھا۔

محمد سلیم چاہتا تو اپنے پاس سے پینتالیس ہزار روپے نکال کر ضرورت پوری کر لیتا مگر وہ سچے دل سے اس بات کا قائل تھا کہ اپنی چمڑی جاتی ہے تو جائے پر دمڑی نہ جائے۔ بیوی بھی یہ بات خوب جانتی تھی اس لیے اپنی ضروریات بڑھاتی رہتی اور اسے زیادہ سے زیادہ 'فضلِ ربی' کی تلاش پر اکساتی رہتی تھی۔ آخر کو مہنگائی اور روپے کی کم ہوتی قدر بھی تو کوئی چیز ہے نا۔ یہی وہ جملہ تھا جو معاملات طے کرنے کے لیے وہ حرفِ آخر کے طور پر استعمال کرتا تھا، ورنہ نذرانے کی رقم میں ایک فیصد بھی کمی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ اس روز جو سائل آنے والا تھا، اس پر بھی محمد سلیم نے یہ مہر ثبت کر دی تھی۔ بے چارہ چند روز میں رقم کا انتظام کرنے کا کہہ گیا تھا۔ اب سلیم اُسی سے ملنے کے لیے ولدار ہوٹل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سائل اس کا منتظر ہوگا۔

"ابے شوکت...... کیا حال ہے بھئی؟" اندر داخل ہوتے ہی جب اس کی نظر بیرے پر پڑی تو اس نے خوش دلی سے کہا۔ "چل بھئی، ذرا جلدی سے دو کڑک دودھ پتی اور بسکٹ لے آ۔" یہ کہتے ہوئے وہ جواب کا انتظار کیے بنا ایک خالی میز کی طرف بڑھا اور بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھنے کے بعد چاروں طرف نظریں گھما گھما کر دیکھنے لگا، مگر اسے مایوسی ہوئی۔ "شوکت......" اس نے بیرے کو پکارا۔

"جی صاب" وہ پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھ کر کپڑے سے میز صاف کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی آیا تھا میرے لیے؟"

"نہیں...... ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔"

"اچھا......" یہ سن کر محمد سلیم نے قمیص کا کف ذرا سا اوپر کھسکایا اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تین بجے آنے کا کہا تھا مگر اب تو پونے چار ہونے والے ہیں۔" وہ ٹائم دیکھ کر بڑبڑایا۔

اتنی دیر میں شوکت چائے اور بسکٹ لے آیا۔ "یہ لو صاب...... مٹھا زیادہ، پتی زیادہ، دودھ زیادہ...... خالص چائے ڈیرہ بسکٹ کے ساتھ۔" وہ لوازمات میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"بات سن...... یہ ایک چائے واپس لے جا۔"

"کیوں باؤ جی!" شوکت نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا دوسرا بندہ نہیں پہنچا اب تک؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"فون کر لو۔"

"ابے چھوڑ نا...... اُس کے پاس موبائل نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چائے کا کپ اور بسکٹ کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

"تو پھر یہ دوسری چائے میری، تمہاری طرف سے۔" وہ اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی ہوٹل خالی ہے۔ چائے پینے کا مزہ آ جائے گا۔"

"پی لے بھئی...... مزے کر اُس کے کھاتے میں۔" سلیم نے بیرے کی بات سن کر ہنستے ہوئے کہا۔

شوکت کئی برسوں سے اس ہوٹل پر کام کر رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سلیم ہوٹل میں گھستے ہی دو چائے کا آرڈر دیتا ہے۔ دوسرا بندہ تو پہلے سے ہی اُس کے آنے کے انتظار میں دو تین کپ چائے اپنے معدے میں اُنڈیل چکا ہوتا تھا مگر پھر بھی وہ باؤ جی کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی چائے پینے پر مجبور ہوتا تھا۔ آخر کو وہ افسروں کی بستی کا ناکارہ پرزہ ہونے کے بعد اپنی واجب الادا رقم کے لیے اس کی خوشنودی کا جو خواہشمند ہوتا تھا۔

"یار...... یہ ابھی تک نہیں پہنچا، نہ جانے کہاں مر گیا ہے۔" چائے پی کر پیالی آگے کھسکاتے ہوئے اُس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ "عجیب لوگ ہیں۔ بھئی آنے میں دیر ہو رہی تھی تو کہیں سے فون ہی کر دیتا۔ اب چلا جاؤں گا تو کل پھر دفتر میں وقت خراب کرنے کو پہنچ جائے گا۔" اس کے چہرے پر بے چینی نظر آ رہی تھی۔ ویسے اس کے ساتھ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا کہ جب ضرورت مند وقت پر نہ پہنچتا ہو۔

"آ جائے گا بھئی، پریشان مت ہو۔" شوکت برتن سمیٹ کر میز کو صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ اسی دوران سلیم کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ "لو جی...... آ گیا اُس کا فون۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور سلیم جیب سے موبائل نکالنے لگا۔

"ہاں بھئی...... بولو کیا بات ہے؟" پہلے تو وہ سمجھا کہ شاید اُسی شخص کا فون ہوگا مگر جب اس نے نمبر دیکھا تو وہ اس کے گھر کا تھا۔

"کہاں ہو؟"

"میں اُدھر ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہوں۔ نہ جانے کیوں وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔" سلیم نے بے چینی سے دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"آ جائے گا۔ تم وہیں بیٹھے رہنا، پتا ہے نا کل سنار......" بیوی نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ وہ چڑ گیا۔ اس نے فوراً قطع کلامی کی۔

"جانتا ہوں، اب تم یاد مت دلاؤ۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔" اس نے تقریباً جھلاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سلیم نے بھی ایک بار پھر دروازے کی طرف نظر ڈالتے ہوئے فون جیب میں رکھ لیا۔

کافی دیر گزر چکی تھی لیکن سلیم کو جس شخص کے آنے کا انتظار تھا، نہ تو وہ خود اب تک پہنچا اور نہ ہی اس کا فون آیا تھا۔ اس کے چہرے پر بیزاری جھلکنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس وہ ایک بار اس کے سامنے آ جائے، پھر وہ اسے اتنی سنائے گا کہ اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ لیکن اُس شخص کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ سلیم چاہتا تو اٹھ کر گھر چلا جاتا لیکن اس وقت وہ خود تھوڑا سا مجبور تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ اسے نذرانہ دیے بغیر اس کی فائل ایک انچ بھی آگے نہیں کھسک سکتی تھی۔ رہے پیسے، وہ تو اسے ہر حال میں دینے تھے۔ مگر ایک چھوٹی سی پریشانی تھی۔ اس نے ملنے والی رقم کا مصرف سوچ رکھا تھا۔ اب اگر یہ رقم اسے وقت پر نہ ملتی تو پھر سنار کو پیسے اپنے پلے سے ادا کرنے پڑتے۔ سنار کو پیسے نہ ملتے تو کنگن نہ آتے لہٰذا پیر کی صبح والی گاڑی سے اس کی بیوی ہرگز میکے نہ جاتی۔ وہ تو پہلے ہی اپنی ماں اور بہنوں کے

سامنے کنگنوں کی تعریفیں کرکر کے شیخی بگھار چکی تھی۔ اب ان کے بغیر جانا اس کے لیے ناممکن تھی۔ ایسے میں صرف سنار کو ہی نہیں، بیوی کو بھی خرچ کے لیے پندرہ ہزار روپے اسے جیب سے دینے پڑتے اور...... سلیم ٹھہرا درجۂ اوّل کا کنجوس...... بس! اسی مجبوری کی بنا پر وہ پچھلے سوا گھنٹے سے ہوٹل میں بیٹھا اُس کے آنے کا انتظار کررہا تھا۔ ''ابے شوکت...... ادھر آ۔'' امید وبیم سے دوچار محمد سلیم نے کافی دیر بعد بیرے کو پکارا۔

''ہاں باؤ سلیم...... حکم؟''

''چل ایک چائے لے آ اور ساتھ میں کیک پیسٹری بھی۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کمبخت کا انتظار کرتے کرتے مجھے بھوک لگنے لگی ہے۔''

''ارے باؤ جی...... فکر کیسی۔ جو کھانا پینا ہے، کھاؤ۔ بِل کون سا تمہیں دینا ہے۔ دیر کی ہے تو بھگتے گا بھی خود ہی۔'' اس نے سلیم کی بات سن کر ہنستے ہوئے کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

''سُن...... ذرا آج کا باسی اخبار بھی لیتے آنا۔''

''باسی کیوں، دوپہر کا تازہ اخبار لاتا ہوں جی۔'' اس نے جاتے جاتے لقمہ دیا۔

کچھ ہی دیر میں بیرا چائے، سموسہ اور چٹنی لے کر آ گیا۔ اس کی بغل میں دوپہر کا اخبار بھی دبا ہوا تھا۔ سلیم پر تو بھوک کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس نے اخبار ایک طرف کیا اور پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں برتن خالی ہو چکے تھے۔ ''یہ برتن لے جا بھئی۔'' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ شوکت برتن اٹھا کر میز صاف کرنے لگا اور وہ وقت گزاری کے لیے دوپہر کا اخبار پڑھنے لگا۔

محمد سلیم نے سرسری انداز میں صفحۂ اوّل کی خبروں پر نظریں دوڑائیں۔ اچانک اس کی نظریں نیچے ایک باکس میں چھپی تین کالمی خبر پر جم گئیں۔ ''اوہو...... یہ کیا ہوا۔'' سرخی پر نظر پڑتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ خبر کے ساتھ ساتھ دو تصویریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر زندگی جبکہ دوسری مرنے کے بعد کی تھی۔ اس نے تفصیل سے خبر پڑھنا شروع کردی۔

''ریٹائرڈ نائب قاصد کی بیوی کے ساتھ خودکشی۔

پنشن کے لیے مہینوں سے مارا مارا پھر رہا تھا، پولیس کی تفتیش شروع۔ ریٹائرڈ نائب قاصد نے مالی پریشانیوں سے تنگ آ کر بیوی کے ہمراہ جراثیم کش دوا پی کر زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ تفصیلات کے مطابق متوفی بشارت نے کئی ماہ پہلے ملازمت سے از خود ریٹائرمنٹ لی تھی۔ وہ کئی ماہ سے جی پی فنڈ، پنشن اور دیگر واجبات کی ادائیگی کے لیے دفتر کے چکر لگا رہا تھا مگر اب تک اس کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ اہلِ محلہ کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ خودکشی کرنے والے میاں بیوی کی ایک ہی بیٹی تھی جس نے چند روز پہلے اپنی پسند سے شادی کرلی تھی۔ متوفی بشارت کی جیب سے پینتالیس ہزار روپے اور ایک خط بھی ملا ہے جس میں اس نے اپنی موت کا ذمے دار اپنے آپ کو قرار دیا ہے۔ متوفی نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ اس کے پاس موجود رقم اس کے پڑوسی بشیر کو واپس کردی جائے۔ اس نے یہ رقم اُس سے کل رات ہی بطور اُدھار لی تھی۔ پولیس نے لاش اسپتال منتقل کر کے ضابطے کی کارروائی شروع کردی ہے۔''

خبر پڑھتے ہوئے سلیم کے چہرے پر ایک رنگ جارہا اور ایک آرہا تھا۔ اس نے بے دلی سے اخبار ایک طرف رکھا۔ اُس کے چہرے پر تاسف نظر آنے لگا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور کچھ دیر تک خلاؤں میں تکتا رہا۔ اپنے اوسان بحال کرنے کے لیے اس نے نہایت مردہ آواز میں چائے کی ایک اور پیالی منگوائی۔ چائے پی اور پھر مرے مرے قدموں سے اٹھ کر باہر نکلنے لگا۔ ''سن...... پیسے حساب میں ڈال دے۔ اگلی پارٹی پرسوں آئے گی، اس سے وصول کرلینا۔''

''سمجھ گیا صاب'' شوکت نے سر ہلا کر کہا۔ ''وہ نہیں آیا؟''

''اب آئے گا بھی نہیں۔'' سلیم کی آواز بوجھل ہورہی تھی۔

خبر پڑھنے کے بعد محمد سلیم کی آنکھوں میں جو اندھیرا چھایا تھا، وہ اب کچھ کچھ صاف ہونے لگا تھا۔ ایک بار پھر وہ سنار اور اس خرچے کا سوچ رہا تھا جس کو پورا کرنے والا خود اپنا وقت پورا کر گیا مگر اسے مشکل میں ڈال گیا تھا۔ سوچ بچار میں وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر جارہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ چلتے چلتے وہ رک گیا۔

''ہیلو۔'' اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہو؟''

''گھر آرہا ہوں۔'' اس نے بیوی کو جواب دیا۔

''خیریت، بہت پریشان لگ رہے ہو؟'' بیوی نے اس کے لہجے کی افسردگی کو بھانپ لیا تھا۔ ''پیسے مل گئے؟'' اگلے ہی لمحے وہ مطلب پر آ گئی۔

''نہیں...... بس ملتے ملتے رہ گئے اور اب ملیں گے بھی نہیں۔''

''کیوں جی......'' اس نے فوراً تشویش سے پوچھا۔

''کیا بتاؤں......'' اس کی آواز بدستور بوجھل تھی۔

''ویسے اُس کا کیا بگڑ جاتا جو وہ کل کے بجائے آج رات مرجاتا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔ پینتالیس ہزار نہ ملنے کا دکھ اور سوا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''کل آپا فاطمہ آئی تھی۔''

''میں...... کس وقت آئی تھی؟'' بشارت نے پراٹھے کا نوالہ نگل کر چائے کا گھونٹ بھرا اور بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سخت سردیاں تھیں اور وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں بچھے ٹاٹ پر بیٹھ کر ناشتا کررہا تھا، تب اُس کی بیوی کلثوم نے موقع غنیمت جان کر بات شروع کی۔

''یہ کل دوپہر کی بات ہے۔ تم اس وقت دفتر میں تھے۔''

''خدا کی بندی، یہ بات تو تم رات میں بھی مجھے بتا سکتی تھیں۔''

''رات کو تم آئے تھے تو گیارہ بج رہی تھی۔ تم تھکے ہوئے تھے۔ اب وہ تمہارے سونے کا وقت تھا یا میں تمہیں کہانیاں سنا سنا کر پریشان کرتی۔'' کلثوم نے لگاوٹ سے جواب دیا۔

''ہاں بھئی کیا کروں...... کل رات صاب کی بیٹی کی مہندی جو تھی۔ سارے دفتر کے نائب قاصد وہیں پر لگے ہوئے تھے۔'' بشارت نے یہ سُن کر ایسے کہا کہ جیسے اُسے گزرے شب کے سارے دکھ اچانک یاد آگئے ہوں۔

''ویسے آج رات بھی میں دیر سے ہی گھر آؤں گا۔ صاب کے ہاں سے دلہا کی مہندی جائے گی۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب چپراسیوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب تک شادی اور ولیمہ نہیں ہو جاتا، دفتر سے چھٹی کر کے سیدھے وہیں پہنچ جایا کریں۔''

''لو جی...... شادی صاب کی بیٹی کی اور کام کریں سرکار کے ملازم۔ یہ بھلا کیا تُک ہے۔'' کلثوم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''لگتا ہے کہ افسر نہ ہوئے ہم غریبوں کے مالک ہوگئے۔ بس جیو تو اُن کی مرضی سے۔'' وہ شوہر کی بات سُن کر بدستور ناراض نظر آرہی تھی۔ ''یہ تو شکر ہے کہ ملک الموت کو ہماری روح قبض کرنے کے لیے اُن کی اجازت کی ضرورت نہیں، ورنہ ایسے سرکاری افسر تو ہم غریبوں کو مرنے بھی نہیں دیتے۔ ان کا بس چلے تو اُس وقت تک ہمیں زندہ رکھیں جب تک ہماری عمر ساٹھ سال نہ ہو اور سرکار کے یہ افسر ریٹائرمنٹ کی چٹھی ہمارے ہاتھ میں تھما کر، پیٹھ اور پیٹ پر لاتیں مار مار کر باہر نہ نکال دیں۔'' وہ بے تکان بولے جارہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ اسے اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔ ''تم نے بھی نا پوری زندگی خراب کی، اپنی بھی اور میری بھی۔ کوئی دُکان وُکان ڈال لی ہوتی تو زیادہ سکھ سے گزر بسر ہوتی۔''

''کیا کریں نیک بخت...... سرکار کی ملازمت ہے۔ اب سرکار کے نوکر ہیں تو افسر کے بھی تو غلام ہوئے نا۔'' اُس نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ پچیس سالوں سے سرکار کے 'عوامی خدا اموں' کی غلامی کرتے کرتے اُس کی روح بھی غلام بن چکی تھی۔ بشارت نے چائے پی کر کپ فرش پر رکھا اور گیس کے چولہے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ ''بڑی سخت سردیاں ہیں۔ کئی سال بعد اتنی سخت سردی پڑ رہی ہے۔'' اُس نے کچھ دیر تک دونوں ہاتھ تاپے اور پھر انہیں آپس میں رگڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اچھا سب چھوڑ...... یہ بتا آپا فاطمہ کیا کہہ رہی تھی؟

''کیا کہے گی...... تمہاری بڑی بہن ہے۔ وہ تو اب بھی تمہیں چھوٹا سا منا ہی سمجھتی ہے۔'' اُس کے لہجے میں ہمارے ہاں کی روایتی نند بھاوج کے درمیان ہونے والی کشمکش کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔

''ارے وہ میری سب سے بڑی بہن ہے۔'' یہ سُن کر بشارت نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''او نیک بخت...... اُس نے ہمیں گودوں میں کھلایا ہے۔ آخر کو بڑی بہن بھی تو ماں کے برابر ہی ہوتی ہے نا۔ ویسے اللہ خوش رکھے آپا کو۔ ماں کے بعد کبھی ماں کے نہ ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا اُس نے۔'' یہ کہتے ہوئے بشارت کی آنکھوں میں ایسی چمک دوڑ گئی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو۔

''خیر چھوڑ اس بات کو۔ یہ بتا کہ آپا کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا، کیا کہہ رہی تھی وہ؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''اپنے بیٹے رحمت کا بتا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ خدا کے فضل سے ایم ایس سی کرچکا ہے اور اب کسی کالج میں لیکچرار کی نوکری مل گئی ہے اُسے۔''

''ارے واہ...... یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔'' بشارت یہ سنتے ہی کھِل اٹھا۔

''یہ لو...... مٹھائی لائی تھی۔'' کلثوم نے برابر سے مٹھائی کا ڈبا اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وجاہت بھائی نے بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ دی ہے۔ اب دیکھ لو اپنی محنت کا پھل مل گیا انہیں۔'' بشارت نے گلاب جامن منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''صاب کی بیٹی کی

شادی ہوجائے تو پھر ہم چلیں گے آپا کے گھر مبارکباد دینے کے لیے۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں...... ہم سب چلیں گے۔ ویسے بھی وہ رشتے کی بات کرنے گئی ہے۔'' کلثوم اب مقصد کی بات پر آگئی تھی۔

''کس کے رشتے کی بات؟'' بشارت نے یہ سُن کر حیرت سے پوچھا۔

''اپنی صائمہ کا ہاتھ مانگ رہی ہے رحمت کے لیے۔''

''اچھا!'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوشی اور حیرت کے ملے جُلے جذبات کا عکس نظر آرہا تھا۔ ''ویسے عجیب بات ہے، مجھ سے تو کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''لو جی...... بھلا وہ تم سے یہ بات کیوں کہتی۔'' اُس نے میاں کی بات سُن کر منہ بنایا۔ ''شادی بیاہ کی باتیں مردوں سے نہیں کی جاتیں، چاہے وہ سگا چھوٹا بھائی ہی کیوں ... نہ ہو۔ یہ باتیں تو ہم عورتوں کے کرنے والی ہوتی ہیں۔'' بیوی نے فخر سے جواب دیا۔

''دیکھ، اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر زمانے بھر کی محبت اور طمانیت اُتر آئی تھی۔ ''کتنا فرق ہے ہم دونوں خاندانوں کی مالی حیثیت میں۔ دیکھ لیا ناں، وہ صرف میری بڑی بہن ہی نہیں، ماں ہے ماں۔ ارے اس کو اپنے پڑھے لکھے بیٹے اور اُس کما تے پیتے گھر کے لیے کوئی بھی اچھا رشتہ مل سکتا تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنے خون کو ہی گلے لگانے کی بات کی ہے۔'' بشارت اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے بھانجے کے رشتے کی بات سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ کل رات جب اُس کے صاحب کی بیٹی کی مہندی آئی تھی، تب وہ پل بھر کے لیے اپنی آنکھوں میں اپنی بیٹی کی مہندی کے آنے کے خواب بھی سجا بیٹھا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اللہ نے اتنی جلدی اس کو خوشی کا یہ موقع دے دیا ہے۔ ''ویسے یہ بہت اچھی خبر سنائی تو نے صبح ہی صبح۔ دل خوش ہو گیا۔'' بشارت جوش سے بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر......''

''مگر کیا؟'' کلثوم نے اٹکتے ہوئے کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا لیکن بشارت نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ ''مگر'' کا لفظ سن کر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

''آپا کہہ رہی تھی کہ تم سے بات کرلوں۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد شادی ہوجائے۔ بس...... چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔'' کلثوم نے اُداسی سے جواب دیا۔ یہ بات کہتے ہوئے دکھ کی جو لہر اس کے دل پر چھائی تھی اس کا بہت ہی کم حصہ اُس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ظاہر ہے ماں بیٹی کا رشتہ تھا دونوں میں۔ ویسے بھی جوان بیٹی ماں کے لیے صرف بیٹی ہی نہیں مددگار اور سہیلی بھی ہوتی ہے۔ جوان بیٹی، ماں کے لیے دکھ سکھ کی ساجھی بن جاتی ہے۔ ویسے بھی اُس کی کتنی اولادیں تھیں۔ لے دے کر ایک بیٹی ہی تو اُس کی کل جاگیر تھی۔ اب جب اُس کی رخصتی کا ذکر چل پڑا تو جیسے اُس کے دل پر جدائی کے صدمے کا پہاڑ ابھی سے ہی گر گیا ہو۔ آپا کے جانے کے بعد سے ہی اُسے یوں لگنے لگا تھا کہ بس اگلے ہی پل وہ بیٹی پرائی ہونے والی ہے، جس نے اُسے نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھا، اُس کی خاطر موسموں کے سرد و گرم خود برداشت کیے مگر اُسے بے آرام نہ ہونے دیا۔ اُسے پالنے سے لے کر اپنے پاؤں پر چلنے تک کی اس مسافت میں خود تمام تر تکلیفیں، پریشانی اور بے آرامی برداشت کرلی مگر اس کی راہ میں ایک کنکر بھی نہ آنے دیا...... مگر اب وہ سب کچھ بھلا کر، اُسے تنہا چھوڑ کر جا رہی ہے۔ شوہر نے بھی اس کی دلی کیفیت کو محسوس کرلیا تھا۔ ویسے بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ماں بیٹی کم اور سہیلیاں زیادہ ہیں۔

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ لو جی! خوامخواہ تو اس خوشی کی بات پر اُداس ہو رہی ہے۔'' بشارت نے بیوی کو تسلی دیتے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دل چھوٹا نہ کر، بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی امانت ہیں۔ ویسے بھی وہ کون سا غیر وں میں جا رہی ہے بیٹی کو۔ پھوپی کا گھر اپنا تھوڑا الگ ہوتا ہے۔'' بشارت سمجھا کہ کلثوم صرف اس لیے اُداس ہے کہ اکلوتی بیٹی اب بابل کا گھر چھوڑ کر پیا کے گھر جا رہی ہے۔ اس لیے اُس نے بیوی کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے اسے سمجھایا۔ ویسے وہ کچھ غلط بھی نہیں سمجھ رہا تھا مگر پھر بھی ایک بات ایسی تھی جسے صرف کلثوم کا دل ہی بہتر جانتا تھا۔ بیٹی کی جدائی کا دکھ اپنی جگہ، نند کی خواہش سننے کے بعد اُسے غم دوراں بھی لاحق ہو چکا تھا مگر بشارت اب تک اُس دکھ کو محسوس نہیں کر پایا تھا۔ بشارت اپنی دھن میں کافی دیر تک بولتا رہا لیکن کلثوم نے جواب میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ وہ خاموش بیٹھی شوہر کو تکتی رہی۔ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے یا نہ لانے کا فیصلہ کر رہی تھی۔ آخر وہ کب تک خاموش رہتی۔ اب اگر وہ شوہر سے یہ بات نہ کرتی تو کس سے کہتی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ اکلوتی بیٹی ہے ہماری۔'' کافی دیر بعد کلثوم نے لب کشائی کی۔ ''یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں بیٹی کے پرائے گھر جانے کی وجہ سے بہت دکھی ہوئی ہوں مگر میری پریشانی کی ایک اور وجہ بھی ہے۔''

’’وہ کیا ہے؟‘‘

’’وہ بات یہ ہے کہ......‘‘

’’ہاں ہاں، کھل کر بول۔‘‘ جب وہ بات کرتے ہوئے ایک بار پھر ہچکچائی تو بشارت نے اُسے حوصلہ دینے کی خاطر کہا۔

’’میں سوچ رہی ہوں کہ اپنے پلّے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اب یہ سب کچھ......‘‘

’’اوہ نیک بخت...... میں سمجھ گیا۔‘‘ بشارت اس کی اُدھوری بات سے ہی سمجھ چکا تھا کہ بیوی کس وجہ سے پریشان ہو رہی ہے۔ ’’دیکھ...... یہ بیٹی اوپر والے کی رحمت ہوتی ہے۔‘‘ اس نے بیوی کو سمجھانا شروع کر دیا۔ ’’یہ بیٹیاں تو اپنا نصیب ساتھ لے کر آتی ہیں۔ لے بھلا، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اوپر والے نے بیٹی کی رحمت ہم پر نازل کی ہے تو اس کا نصیب بھی دیا ہے۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر پھر بھی......‘‘ کلثوم اس کی بات سن کر بولی۔ وہ اب بھی فکرمند لگ رہی تھی۔

’’دیکھ فکر نہ کر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ’’چل بھئی، اب ایک کپ چائے اور پلا دے۔ آٹھ بج گئے ہیں۔ مجھے ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔‘‘ بشارت نے بیوی کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کب تک آ جاؤ گے؟‘‘ کلثوم نے پتیلی چولہے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

’’بھئی یہ بڑا ٹیڑھا سوال کیا ہے تو نے۔‘‘ بشارت خوشگوار موڈ میں تھا۔ بیٹی کی شادی کا سن کر وہ من ہی من میں بہت ہی خوش تھا۔ ’’جب تک شادی اور ولیمہ نہیں ہو جاتا، تب تک تو میری واپسی کا کوئی وقت طے نہیں ہے۔‘‘

’’تو آپا کی طرف کب چلیں گے؟‘‘ اُس نے پھر پوچھ لیا۔

’’دیکھ دو چار دن کی اور مصروفیت ہے۔ یہ نمٹ جائے تو پھر دونوں چلیں گے۔ ہاں مٹھائی یاد سے لے کر چلنا ہے۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ کلثوم نے چونکتے ہوئے کہا۔ ’’مٹھائی کس لیے......؟‘‘

’’ارے بھئی آپا کے بیٹے کی نوکری لگ گئی ہے۔ وہ بھی ڈائریکٹ سترہ گریڈ میں۔ تو بھانجے کی اس خوشی میں، میں خود اپنے ہاتھوں سے آپا کا منہ میٹھا کرواؤں گا نا۔‘‘ بشارت نے لہکتے ہوئے کہا۔

’’اوہ...... میں سمجھ رہی تھی کہ تم نے اُن کی بات مان لی ہے۔‘‘ کلثوم نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ’’دیکھو...... ہم بیٹی والے ہیں۔ اتنی جلدی ہاں نہیں کر لیتا۔‘‘

’’ایک تو تُو بھی نا......‘‘ بشارت ہنس دیا۔ ’’خیر جلدی سے چائے پلا۔ ویسے بھی یہ بیٹی کی شادی بیاہ کی باتیں ہیں۔ ذرا فارغ ہو جاؤں تو پھر اطمینان سے اس مسئلے پر بات کریں گے، تفصیل کے ساتھ۔‘‘ بشارت نے چائے کی پیالی تھامتے ہوئے کہا۔ ’’تو فکر نہ کر، انشاءاللہ سب کام اچھی طرح ہو جائیں گے۔‘‘

’’اللہ کرے ایسا ہی ہو۔‘‘ کلثوم نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اگلے کئی روز تک بشارت بے حد مصروف رہا۔ صبح کی تو سورج طلوع ہونے پر ہو جاتی تھی مگر شام کب آئے گی، کب وہ گھر جائے گا، کب فاطمہ آپا سے مل کر اُسے بیٹے کی ملازمت کی خوشی میں مٹھائی کھلائے گا اور کب وہ میاں بیوی بیٹھ کر اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کے بارے میں بات کریں گے...... ان باتوں کا اُسے کیا خاک خیال رہتا، وہ تو اپنے افسر کی بیٹی کی شادی میں ایسا پھنسا تھا کہ سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔

خدا خدا کر کے صاحب کی بیٹی گھر سے رخصت ہوئی مگر بشارت کے عذاب پھر بھی ختم نہ ہوئے۔ ولیمے کے دن صبح ہی صبح اُسے افسر کی طرف سے سب چپراسیوں کو بیٹی کے سسرال بھیج دیا گیا۔ گویا افسر صاحب کی بیٹی ہی رخصت ہو کر نہیں آئی تھی، ساتھ لانے والے جہیز میں وہ لشکر بھی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اب اس کی مجال کہاں کہ کسی ایک کو بھی ناراض کرے، صاحب کے عذاب کو سہنے کی ہمت اپنے میں پائے۔ سو، بشارت علی جو ماسٹرز وصف بندگی کے ساتھ اپنے اَن گنت دیوتاؤں کی خدمت میں، ریاضت کا ہر کڑا امتحان پاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا، تاکہ اُسے کسی نہ کسی طرح اپنے ’’افسر صاحب‘‘ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید خدمت گزاری میں بشارت کی لگن کچھ کم ہو سکتی تھی لیکن اب اُس کی نظروں کے سامنے ایک بہت ہی اہم مقصد تھا۔

بشارت اپنے دفتر کے اَن گنت سترہ گریڈ والے افسروں میں سے ایک معمولی سے افسر کا چپراسی تھا۔ وہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا افسر تھا اور یہ اُس کا چپراسی۔ دنیا بھر میں صرف کاروبار سرکار ہی نہیں، کاروبار جہاں بھی اس ٹیکنالوجی کے سہارے چل رہا تھا پر ہمارے ہاں جو حال انفارمیشن ٹیکنالوجی کا بشارت کے دفتر میں تھا، وہی اعلیٰ افسران کی ساری خدائی میں اُن دونوں کا تھا۔ یوں افسر اور چپراسی اس دفتر میں ایک جیسی بے توقیری کا شکار تھے۔ یہ افسر عہدے میں اس سے پندرہ گریڈ اوپر اور عمر میں تیس سال پیچھے تھا مگر عالم سرکار کی خدائی کا یہ دیوتا اتنا کمزور تھا کہ کبھی کبھار تو بشارت کو اپنے اور اس کے درمیان کوئی خاص فرق محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو پھر دعوتوں اور بعد از شادی کی رسومات کا جھنجٹ کئی روز تک چلتا رہا۔ آخر خدا خدا کر کے زندگی معمول پر آئی۔ بشارت نے سوچ رکھا تھا کہ جیسے ہی افسر صاحب معمول کے مطابق دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیں گے، وہ کسی مناسب موقعے پر اُن سے ملے گا۔ انہیں اپنی بیٹی کی شادی کے بارے میں بتائے گا اور جب وہ پوچھیں گے کہ شادی کب ہے تو وہ کہہ دے گا کہ اس کا ہاتھ تو خالی ہے اگر وہ سرکار کی طرف سے کچھ مدد کر دیں اور ساتھ ہی جی پی فنڈ سے اس کو کچھ رقم دلوا دیں تو فوراً ہی اس قرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ شادی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی خدمت کے باعث ان کے دل میں نرم گوشہ بنا چکا ہے، بس اسے مناسب موقع ملنے کا انتظار تھا۔ صاحب کا چپراسی بھی اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ بشارت نے اس سے بھی کہہ رکھا تھا کہ جس دن ان کا موڈ اچھا ہو، وہ اسے ملوا دے تاکہ وہ بات کر سکے۔

☆☆☆

’’ہاں بھئی، آپا کے ہاں کب چلیں۔ اب تو شادی سے فارغ ہو گئے ہو نا؟‘‘ اُس دن رات کے کھانے کے بعد جب وہ چولہے کے پاس بچھے ہوئے ٹاٹ پر چادر کی بُکل مارے بیٹھا ہوا تھا تو کلثوم نے اس کی طرف چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

’’ایسا کرتے ہیں، پرسوں اتوار ہے۔ دفتر کی تو چھٹی ہے، بس دس گیارہ بجے کے قریب نکلتے ہیں۔‘‘ اس نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔

’’مگر یاد رکھو...... رشتے کی بات اپنے منہ سے نہ کرنا۔‘‘ کلثوم نے شوہر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ’’بہن کو دیکھ کر تمہیں اپنی زبان پر ذرا سا بھی قابو نہیں رہتا ہے۔‘‘

’’ارے...... لے تو بھی کیسی باتیں کرتی ہے۔‘‘ بشارت نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ’’وہ میری بہن ہے اور رابعہ میری بیٹی۔ میں بیٹی کا باپ ہوں۔ وہ بڑی ہے، میں چھوٹا ہوں۔ وہ امیر ہے، میں غریب ہوں لیکن اب یہ رشتے کا معاملہ ہے۔ میں بیٹی کا باپ ہو کر ایسی بات کیوں کروں گا وہ بھی لڑکے والوں کے گھر میں بیٹھ کر۔‘‘ یہ کہہ کر وہ بیوی کو تکنے لگا۔

’’اپنی بات پر قائم رہنا۔‘‘ کلثوم نے یہ سن کر غیر یقینی لہجے میں کہا۔ ’’تم ہمیشہ میرے سامنے کچھ کہتے ہو اور اُن کے سامنے جا کر ہر بات بھول جاتے ہو۔ اب کی بار ایسا نہ ہو۔ اچھی طرح سمجھ لو، ہم لڑکی والے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... میں سمجھ گیا۔‘‘ اس نے مذاق میں اُس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

’’کیا ہوا اماں......‘‘ کلثوم اتنی زور سے ہنسی تھی کہ آواز سن کر رابعہ بھی باورچی خانے میں آ گئی۔

’’ارے تیری ماں کو تو ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ پاگل ہو گئی ہے یہ۔‘‘ بشارت نے مسکرا کر کہا۔ ’’تو سنا بیٹا...... کیا کر رہی ہے؟‘‘

’’وہ تار پر کپڑے سوکھنے کے لیے ڈالے تھے، وہی اتار کر رکھ رہی تھی۔‘‘

’’باہر اوس پڑ رہی ہوگی۔ چل جا کر بستر میں دُبک جا ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔‘‘ رابعہ کی بات سن کر اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

’’اچھا ابا جی......‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ باورچی خانے سے چلی گئی۔

’’ارے سُن......‘‘ رابعہ کے چلے جانے کے بعد بشارت اپنا منہ بیوی کے قریب لاتے ہوئے بولا۔

’’کہو...... کیا بات ہے۔‘‘ وہ سہم گئی کہ اچانک اُسے ایسی کون سی راز کی بات یاد آ گئی جو اتنی آہستہ آواز میں بول رہا ہے۔

’’ہم دونوں تو اِدھر رابعہ کی رحمت سے شادی کا سوچ رہے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہی نہیں ہے کہ خود اُس کے دل میں کیا ہے۔‘‘

’’لو بھئی......‘‘ یہ سن کر اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ’’اب بیٹی سے کیا پوچھنا، ہم کیا مر گئے ہیں۔ ماں باپ ہیں اُس کے۔ جو کریں گے سوچ سمجھ کر کریں گے اس کی بھلائی کے لیے۔‘‘

’’دیکھ...... پچھلے جمعے کو مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے اس موضوع پر۔‘‘ بشارت نے دبی دبی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ’’وہ کہہ رہے تھے قرآن پاک میں خدا نے فرمایا ہے کہ شادی طے کرنے سے پہلے لڑکے، لڑکی کی رضامندی لے لینی چاہیے اور اگر انہوں نے ایک دوسرے کو نہ دیکھا ہو، تو انہیں ملوا بھی دینا چاہیے۔ ایسا حکم کیا ہے ہمارے سوہنے رب نے۔‘‘ کلثوم خاموشی سے اسے تکتے جا رہی تھی۔

’’اب رحمت اور یہ تو دونوں ایک دوسرے کے دیکھے بھالے ہیں۔ اس لیے ملوانے کا مسئلہ ہی ختم مگر شادی کے لیے ہمیں اپنی بچی کی رضامندی لے لینی چاہیے۔‘‘

''کیوں لیں، بھلا ایسا کون کرتا ہے۔'' وہ اپنی بات پر قائم نظر آرہی تھی۔

''مگر یہ تو رب کا حکم ہے جو پاک کتاب میں لکھا ہوا۔ یقین نہ ہو تو خود مولوی صاحب سے جاکر پوچھ لے۔'' اس نے بیوی کو رائے تبدیل کرنے پر قائل کی کوشش کی۔

''جب میری شادی ہوئی تھی تو تب مجھ سے کس نے پوچھا تھا؟''

''مگر یہ تو...''

''اجی یہ اکیسویں صدی ہے۔ ویسے بھی ہم اپنی روایتوں اور رسموں کے آگے پاک خدا کے کتنے ایسے حکم ہیں جنہیں نظر انداز کردیتے ہیں۔'' وہ بدستور اپنی اس بات پر قائم نظر آرہی تھی کہ شادی بیاہ کے معاملے میں بیٹی کی رائے لینا تو ہمارے معاشرے کا رواج ہی نہیں ہے تو پھر وہ ایسا کیوں کریں۔

''اچھا چل بحث نہ کر۔'' آخر بشارت نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''کم از کم یہ بات تو اُسے بتادے کہ پھوپی فاطمہ کے ہاں سے رحمت کا رشتہ آیا ہے۔ اب اگر اس کو ناپسند ہوا تو خود ہی کہہ دے گی ورنہ...''

''تم تو اس کی طرف سے ہاں ہی سمجھو۔'' کلثوم نے قطع کلامی کی۔ ''میں نے بیٹی کی پرورش ایسے ہی تھوڑی کی ہے۔ تمہیں کیا پتا۔ تم نے کبھی گھرداری میں دلچسپی لی ہو تو سمجھو گے نا۔'' اس نے ایک بار پھر شوہر پر تنقید کا موقع نکال لیا تھا

''وہ تو میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ ہماری بیٹی جاہل تو ہے نہیں۔ ماشاءاللہ ایم اے میں پڑھ رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یونیورسٹی میں کوئی لڑکا...''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔'' کلثوم سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، اس لیے اس نے قطع کلامی کی۔ ''اگر اس طرح کی کوئی بات ہوتی تو وہ سب سے پہلے مجھے بتاتی۔''

''چل بھئی تو جیتی میں ہارا۔ جیسا تو سمجھتی ہے، ویسا ہی ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر کل چلیں گے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھائیں گے۔'' کلثوم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

بشارت ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آبا و اجداد جہلم کے ایک نواحی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا لیکن چھوٹی سی بارانی زمین کبھی انہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں دے پائی تھی۔ غربت کے باوجود بشارت نے کسی نہ کسی طرح مڈل تک تعلیم حاصل کرلی تھی۔ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اس کا سپنا بھی دوسرے غریب بچوں کی طرح خوابِ طفل ہی ثابت ہوا تھا۔ پیٹ کی آنچ سرد کرنے کے لیے وہ بچپن سے ہی محنت مزدوری میں لگ گیا تھا۔ وہ دو بھائی اور ایک بہن تھے۔ بھائی اس سے چھوٹا تھا اور لڑکپن میں بکریاں چراتے ہوئے سانپ کے کاٹنے سے مرگیا تھا۔ فاطمہ بڑی بہن تھی۔ وہ عمر میں اس سے آٹھ سال بڑی تھی۔ جب ماں کا انتقال ہوا تو اس وقت فاطمہ پندرہ سال کی تھی۔ باپ بچپن میں ہی فوت ہوچکا تھا۔ اس لیے ماں کے بعد دونوں بہن بھائی بے آسرا ہوچکے تھے۔ رشتے کے ایک چچا نے فاطمہ کا رشتہ اپنے بیٹے سے طے کردیا تھا۔ وہ راولپنڈی میں سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ شادی کے بعد بہن کے ساتھ ساتھ وہ بھی راولپنڈی چلا آیا اور اپنے بہنوئی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

بشارت کا بہنوئی ذہین اور محنتی آدمی تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک دکان کھول لی اور جب راولپنڈی کے ہمسائے میں اسلام آباد کے نام سے ایک نئے شہر کو بسایا جارہا تھا، تب اس نے ایک دکان وہاں بھی کھول لی اور پھر آڑھت بھی شروع کردی۔ دھن وجاہت پر بارش کی طرح برستا رہا مگر بشارت خوددار انسان تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، کسی کا ذرہ برابر احسان اٹھانا بھی اس نے گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ بہن اور بہنوئی کا بھی ایک آنے کا احسان مند نہیں تھا۔ اگر وہ اُن کے پاس رہتا تھا، تو اس کے بدلے مزدور کی طرح دن رات اُن کے لیے کام بھی کرتا تھا۔

شہر آہستہ آہستہ آباد ہورہا تھا۔ لوگ آتے جارہے تھے۔ سرکاری دفاتر منتقل ہوچکے تھے۔ رونقیں بڑھتی جارہی تھیں۔ بشارت کی دکان بھی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ اُن ہی دنوں ایک افسر اکثر و بیشتر سبزی ترکاری کی خریداری کے لیے اپنے ملازم کے ہمراہ اس کی دکان پر آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دن انہیں سبزیوں کے دام بتاتے بتاتے بشارت کے منہ سے غیر ارادی طور پر انگریزی کے ایک دو جملے نکل گئے۔ وہ ایک سبزی والے کے منہ سے انگریزی سن کر بہت حیران ہوئے اور جب انہیں پتا چلا کہ یہ لڑکا مڈل پاس ہے تو انہیں اور بھی زیادہ حیرت ہوئی۔ اُس دور میں مڈل تعلیم بھی فخر کی بات سمجھی جاتی تھی لیکن پھر بھی کلرک بھرتی ہونے کے لیے کم از کم تعلیمی معیار میٹرک تھا۔

دوسرے دن وہ آئے تو اس وقت دکان پر گاہک نہیں تھے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں کرید کرید کر اس کے حالاتِ زندگی معلوم کیے اور پھر اسے دوسرے دن اپنی تعلیمی

اسناد لانے کو کہا۔ بشارت نے حسبِ وعدہ انہیں کاغذات لاکر دے دیے۔

چند روز کے بعد ایک شام وہ آئے اور اسے کہا کہ اگر سرکاری نوکری کرنا چاہتا ہے تو کل صبح ان کے دفتر پہنچ جائے۔ یہ سن کر تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ دوسرے دن اس نے دکان وجاہت کے ملازم کے حوالے کی اور کوئی دن کے گیارہ بجے ان کے دفتر پہنچ گیا۔

وہ ایک بڑے افسر تھے۔ انہوں نے بشارت کو محکمے کے ایک ذیلی دفتر میں نائب قاصد کی ملازمت پر بھرتی کرادیا۔ بشارت نے گھر جاکر یہ خبر جب بہن بہنوئی کو سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن بشارت دکان کھولنے کے بجائے اپنی نئی ملازمت جوائن کررہا تھا۔

وہ اچھا دور تھا۔ نیا نیا شہر بس رہا تھا۔ چند مہینوں کے بعد اسے نچلے درجے کے سرکاری ملازمین کے لیے تعمیر کی گئی کالونی میں دو کمروں کا ایک مکان بھی الاٹ ہوگیا۔ مکان بالکل نیا تھا اور بشارت اس کا پہلا مکین۔ مکان ملنے کے بعد وہ بہن بہنوئی کے گھر سے اٹھ کر اپنے گھر منتقل ہوگیا۔ اب اس کے پاس رہنے کو گھر تھا اور گزر بسر کے لیے ملازمت۔ بشارت بہت خوش تھا۔ اس کی زندگی نے نیا رخ بدل لیا تھا۔ اب وہ سر اٹھا کر اپنی بہن کے گھر آجاسکتا تھا۔

بشارت کے پاؤں جمے تو فاطمہ کو اس کا گھر بسانے کی فکر لاحق ہوگئی۔ آخر انہوں نے اس کے لیے لڑکی پسند کرلی اور پھر چند مہینوں میں ہی کلثوم اس کی بیوی بن کر آگئی۔ وہ بھی غریب گھرانے کی صابر و شاکر عورت تھی۔ یوں کلثوم کے آجانے کے بعد دو کمروں کا سرکاری مکان اب بشارت کے گھر میں تبدیل ہوچکا تھا۔

شادی کو ڈیڑھ سال ہوا تھا جب ان کی پہلی اولاد اس دنیا میں آئی۔ انہوں نے بچی کا نام رابعہ رکھا۔ اس کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا لیکن وہ دو ماہ کی عمر میں ہی رضائے الٰہی سے انتقال کرگیا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لے دے کر ایک بیٹی ہی ان کی تمام تر خوشیوں کا محور تھی۔ بشارت خود تو زیادہ تعلیم حاصل نہ کرسکا تھا لیکن اس نے بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر اپنی محرومی کے ازالے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

دوسری طرف بشارت کی بہن کے ہاں دو بیٹوں نے جنم لیا۔ بڑا رحمت اور چھوٹا سعادت تھا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ فاطمہ مالی طور پر بہت خوش حال زندگی بسر کررہی تھی لیکن بیٹی کے نہ ہونے کا بہت دکھ تھا۔ جب فاطمہ چھوٹی تھی تو وہ اکثر اسے اپنے گھر لے جاتی اور کئی کئی دن تک اپنے پاس رکھتی۔ فاطمہ کی شکل میں اسے عارضی طور پر ہی مگر بیٹی کی محبت مل جاتی تھی۔ اب جبکہ وہ جوان ہوچکی تھی تب بھی وہ کبھی کبھار اسے اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ سگی بیٹی سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتی تھی۔ خود رابعہ کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی جھوٹے منہ بھی کہہ دے کہ پھوپی بیمار ہے تو وہ کسی کی پروا کیے بنا فوراً ان کے گھر چل دیتی۔

رحمت، رابعہ سے چند سال بڑا جبکہ سعادت اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ رابعہ کی طرح رحمت کو بھی بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ رابعہ کو ٹیچر بننے کا شوق تھا اور رحمت پروفیسر بننا چاہتا تھا۔ سعادت کو اپنے باپ کے کاروبار سے دلچسپی تھی۔ وجاہت نے بھی بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ توجہ دی تھی۔ وہ ان پر اپنی مرضی نہیں ٹھونسنا چاہتا تھا۔ اس لیے جب بشارت کو پتا چلا کہ رحمت لیکچرار ہوگیا ہے تو اس دن وہ یہ سوچ سوچ کر بہت خوش ہوا تھا کہ وہ بچہ جو کل اس کی انگلی پکڑ کر ٹہلتا تھا، آج زندگی میں اپنے خواب کی تعبیر پاچکا ہے۔

دونوں خاندانوں کے رہن سہن اور مالی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر یہ فرق ان کے خونی رشتوں کے بیچ کبھی تفریق کی دیوار نہ بنا۔ فاطمہ اور وجاہت اسلام آباد کے ایک مہنگے علاقے میں واقع بڑے سے بنگلے میں رہتے تھے۔ نوکر چاکر، مہنگی گاڑیاں، کاروبار...... دوسری طرف بشارت اور کلثوم تھے۔ دو کمروں کا سرکاری کوارٹر، گریڈ دو کا نائب قاصد مگر پھر بھی ان لوگوں کے مابین دنیاداری کے بجائے خون کا رشتہ بھاری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب فاطمہ نے کلثوم سے رحمت کے رشتے کی بات کی تو وہ دونوں خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔ یہ سن کر تو بشارت کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اسے خوشی تھی کہ اس کی پڑھی لکھی بیٹی اپنے پڑھے لکھے شوہر کے ساتھ آرام و سکون کی زندگی بسر کرے گی۔ یہی بات اس کی زندگی کا حاصل تھی۔

پھوپی کے گھر اکثر آنے جانے کے باعث رحمت اور رابعہ کی بھی بچپن سے ہی آپس میں بہت اچھی دوستی تھی۔ جب وہ بڑے ہونے لگے تو اس کے ساتھ بچپن کی دوستی کا رشتہ بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ جب وہ جوانی میں داخل ہوئے تو اس رشتے نے محبت کی شکل اختیار کرلی۔ محبت کی جوت دونوں دلوں میں روشن تھی۔ جب اس جذبے کو زبان ملی تو ان کے درمیان ساتھ جینے مرنے کے وعدے بھی ہوئے مگر اس بات سے دوسرے لاعلم تھے۔

کلثوم سے بات کرنے سے قبل جب فاطمہ نے رحمت کی رضامندی جاننا چاہی تو اس نے نہ صرف ہاں کردی بلکہ

اُس دن ماں کے سامنے اپنے دل کی بات بھی زبان پر لے آیا۔ اگرچہ بشارت اور کلثوم بیٹی کی مرضی جاننے کے معاملے پر آپس میں طویل بحث کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رابعہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ پھوپی نے اس کا ہاتھ مانگ لیا ہے۔ یہ بات رحمت نے اسے اُسی روز فون کرکے بتادی تھی جس دن فاطمہ کلثوم سے یہ بات کرنے گئی تھی۔ اگرچہ بیٹی کی ماں ہونے کے ناتے اس نے کھل کر فوراً ہامی بھرنے سے گریز کیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بات پر بہت خوش تھی۔ ویسے بھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رشتے کی یہ بات صرف رسم پوری کرنے کے لیے تھی ورنہ بشارت کی تو مجال ہی نہیں تھی کہ اُس کے آگے ناں کہہ سکتا۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔

کلثوم اور بشارت دن کے گیارہ بجے کے قریب بہن کے گھر جانے کے لیے نکلے۔ وہ پہلے ہی جاکر دو کلو مٹھائی کا ڈبا خوبصورت انداز میں پیک کروا کر لے آیا تھا۔ رابعہ گھر پر تھی۔ انہوں نے اسے بھی ساتھ چلنے کا کہا مگر اس نے یونیورسٹی کے فائنل امتحانات کے باعث پڑھنے کا بہانہ بنا کر جانے سے انکار کردیا۔ اس انکار کی ایک وجہ تو اس کی فطری شرم تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ پھوپی نے اس کا ہاتھ مانگا ہے۔ اس لیے اب اسے ان کے سامنے جاتے ہوئے شرم محسوس ہورہی تھی۔ دوسری بات یہ کہ کل رات رحمت نے اُسے فون کیا تھا۔ جب اس نے بتایا کہ اماں ابا دوپہر اس کے گھر آنے والے ہیں تو اس نے فوراً پروگرام بنالیا کہ موقع اچھا ہے۔ وہ ساتھ نہ جائے بلکہ ان کی غیر موجودگی میں وہ بھی کہیں گھومنے نکل جاتے ہیں۔ اس نے یہ بات مان لی۔ یوں اِدھر وہ دونوں نکلے، اُدھر رابعہ بھی گھر سے نکل گئی۔ گلی کے موڑ پر رحمت اپنی موٹر سائیکل پر کھڑا، اس کا انتظار کررہا تھا۔

فاطمہ اور اس کا شوہر ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ”بھئی اب تو میں شام کو ہی جاؤں گا اور دوپہر کو آپا کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا وہ بھی کئی ہفتوں کے بعد۔“ اس نے بہن کے گلے لگتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا۔ ویسے بھی وہ اس بار کئی ہفتوں کے بعد بہن سے مل رہا تھا۔

”یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔“ فاطمہ نے پیار سے کہا۔ ”ارے میرے گھٹنے ناکارہ ہوئے ہیں مگر ہاتھ سلامت ہیں۔ اپنے بھائی کے لیے خود کھانا بناؤں گی، اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔“

دوپہر کو سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ ملازمہ ان سب کے لیے چائے لے آئی تھی۔ اس وقت وہاں ان چاروں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر اچانک فاطمہ نے رابعہ کے رشتے کی بات چھیڑ دی۔

”آپا یہ جوتی لے اور اسے سو بار میرے سر پر مار۔ خدا کی قسم نہ تو تیرا ہاتھ روکوں گا اور نہ ہی ایک بار بھی اپنے منہ سے اُف کروں گا مگر یہ بات......“ یہ سنتے ہی بشارت نے فوراً جواب دیا لیکن فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”دیکھ، وہ میری بیٹی ہے۔“

”تو میں کب انکار کررہا ہوں۔“ یہ سنتے ہی اس نے کہا۔ ”میں خود تیرا اپنا ہوں۔ تو میری بڑی بہن نہیں، میری ماں ہے مگر تو خود سوچ نا۔ میں رابعہ کا باپ ہوں اور اس وقت تیری دہلیز پر بیٹھا ہوں۔“

”یہ تیرا گھر نہیں ہے کیا؟“ وجاہت نے مداخلت کی ورنہ وہ عموماً ان بہن بھائیوں کے بیچ نہیں بولتا تھا۔

”وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی جان مگر......“

”مگر کیا؟“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ... میں آج آیا ہوں رحمت کی ملازمت کا سن کر تجھے مبارک باد دینے کے لیے۔ اب تجھے رشتے کی بات کرنا ہے تو میرے گھر آ اور بھائی جان کو بھی اپنے ساتھ لا۔“ بشارت نے بہنوئی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ نا میری ماں، یہ رواج ہے۔ ہم بیٹی کے ماں باپ ہیں۔ ہم کیسے کچھ کہہ دیں۔ دنیاداری، رسم و رواج بھی تو کوئی چیز ہیں نا۔“

”یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ وجاہت نے بیوی کی طرف دیکھ کر اسے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔ ”ہم اس کے بڑے ہیں لیکن اس بات میں یہ بڑا ہے۔ رابعہ اس کی بیٹی ہے۔ ہمیں اس کے گھر پر جاکر جھولی پھیلانی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ ”دیکھو بھئی، ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر ہم تیری جگہ ہوتے تو یہی کہتے جو تو کہہ رہا ہے۔“

”بہت شکریہ بھائی جان۔“ بشارت نے تشکر بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو پھر ہم کب آپ کے گھر آئیں، ذرا یہ بھی بتادو۔“ فاطمہ نے برابر بیٹھے بھائی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بھائی کے گھر آنے کے لیے اجازت کی نہیں، حق کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ حق تیرے پاس پہلے سے ہی ہے۔“ بشارت نے نہایت سادگی سے کہا۔ ”جس وقت دل کرے آجاؤ۔“

”بھائی کے گھر آنے کے لیے اجازت اور دعوت کی ضرورت واقعی نہیں ہوتی مگر میں سمدھی کے گھر آنا چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر فاطمہ شرارت سے ہنسی اور بھائی کو گلے سے لگایا۔ ”اس کے لیے دعوت دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

اس دوران کلثوم بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے شوہر کو جو سمجھایا، اس بار اُس نے ویسا ہی کیا۔ کلثوم بھی اس رشتے سے بے انتہا خوش تھی۔ بس چاہتی تھی کہ سب کچھ اسی طرح ہو جیسے کہ دنیا کا رواج ہے۔ اب فاطمہ اور وجاہت رشتے کے لیے اُس کے گھر آنے پر تیار تھے۔

چند روز ہی گزرے تھے کہ بشارت کو فاطمہ نے فون کیا اور اگلے اتوار کو اُن کے ہاں آنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی کیا مجال تھی کہ کچھ اور کہتا۔ جب اس نے گھر آکر اپنی بیوی کو یہ بتایا کہ بہن بہنوئی آرہے ہیں تو اُس رات وہ تکیے میں منہ دے کر بہت دیر تک روتی رہی۔ بیٹی کی جدائی کا سوچ سوچ کر ہی اس کا دل بیٹھا جارہا تھا مگر دوسری طرف وہ خوش بھی بہت تھی۔ ماں باپ کے لیے تو ویسے ہی یہ بات دلی اطمینان کا باعث ہوتی ہے کہ بیٹی کا میاں سعادت مند اور سسرال دولت مند ہو۔ مگر جب بیٹی اکلوتی ہو تو اس کی شادی ماں باپ کے لیے ایسی ہی ہوتی ہے جیسے وہ گھر سے نہیں جہاں سے رخصت ہوکر جارہی ہو۔ یہی حال کلثوم کا تھا اسی لیے وہ اپنے آنسو روک نہ پائی تھی۔ بشارت کا حال بھی بیوی سے کچھ مختلف نہیں تھا مگر پھر بھی وہ مرد تھا جسے اپنے جذبات پر قابو پانا آتا ہے۔

فاطمہ اور وجاہت نہایت اہتمام سے اُن کے گھر آئے تھے۔ مٹھائی کا بڑا سا ٹوکرا، موسمی پھل، رابعہ کے لیے قیمتی سرخ جوڑا، سونے کی نہایت خوبصورت انگوٹھی...... اُس دن فاطمہ نے صرف رشتہ ہی نہیں مانگا بلکہ رسم بھی ادا کرگئی۔

اگلے دو دن تو بشارت اور کلثوم کے لیے بہت ہی خوشی کے تھے۔ جہاں تک رابعہ کا سوال ہے تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ خوشی کے دن بہت مختصر اور دکھوں کے دن اور راتیں نہایت لمبی ہوتی ہیں۔ جب بیٹی کی منگنی کا سحر ٹوٹا تو میاں بیوی کو شادی کی تیاریوں اور اس کے لیے رقم کی فکر لاحق ہونے لگی۔

بشارت سفید پوش بندہ تھا۔ جمع پونجی پاس نہیں تھی۔ فاطمہ کو بھائی سے جہیز کی طلب تھی اور نہ ہی دنیا کو دکھانے کی غرض سے شان و شوکت کی تمنا مگر پھر بھی وہ بیٹی والے تھے۔ دنیاداری کے لیے ہی سہی، بیٹی کو کچھ نہ کچھ تو دے دلا کر ہی اپنے گھر سے رخصت کرنا تھا۔ آخر ایک دن کلثوم نے اپنے

شوہر کے سامنے لاکر تمام جمع پونجی رکھ دی۔ کل ملا کر تین تولے سونے کے زیور اور بیس ہزار روپے کی نقدی تھی۔

”یہ تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔“ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بشارت نے تاسف بھرے لہجے میں بیوی سے کہا اور پھر رات گئے تک وہ دونوں اس سوچ و بچار میں رہے کہ رقم کا انتظام کیسے کیا جائے۔ وہ دونوں بہت ہی خوددار تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ فاطمہ کے آگے ہاتھ پھیلاتے۔ ایسا کوئی نظر بھی نہیں آرہا تھا کہ جس سے دو تین لاکھ روپے ادھار لے کر اس فرض سے سبکدوش ہوا جاسکے۔ وہ اپنے صاحب سے ملنا چاہتا تھا تاکہ ان سے سرکاری سطح پر کچھ مدد لی جاسکے مگر ان سے بھی بشارت کی ملاقات نہیں ہو پارہی تھی۔ کافی سوچ بچار اور صلح و مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ وہ کل صاحب سے ہر حال میں ملاقات کرکے درخواست کرے گا کہ اُس کے جی پی فنڈ یا جس طرح بھی ممکن ہو، اس کے لیے دو لاکھ روپوں کا انتظام کروادیں۔

اب یہ بشارت کی بدنصیبی تھی یا تقدیر کا لکھا کہ دوسرے دن جب وہ تیسری منزل پر واقع اپنے بڑے صاحب کے دفتر میں پہنچا تو پتا چلا کہ وہ چند روز کے لیے چھٹی پر ہیں۔ اُس نے یہ سوچ کر صبر کرلیا کہ چند روز کی ہی تو بات ہے۔ کچھ دن

گزر جانے کے بعد جب اس نے دوبارہ پتا لیا تو معلوم ہوا کہ صاحب تین ماہ کے لیے بیرونِ ملک چھٹیاں گزارنے کے لیے چلے گئے ہیں۔ وہ گریڈ بائیس کے سیکریٹری تھے۔ انہیں من مانی سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اُن کے لیے بیرونِ ملک سیر و تفریح تو ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص اپنے ملک کے کسی دوسرے شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے چلا جائے مگر بشارت کی توقعات تو اُن سے وابستہ تھیں۔ اسے خوش فہمی تھی کہ اُن کی بیٹی کی شادی میں اس نے جو خدمات انجام دی تھیں، وہ اُن کو یاد ہوں گی۔ وہ اس حوالے سے ہی اس کے کام آجائیں گے مگر جب اس نے اُن کے بیرونِ ملک جانے کی خبر سنی تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اب وہ بہت پریشان ہو رہا تھا کیونکہ فاطمہ رخصتی کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کے اصرار میں بھی شدت آتی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ کئی بہانے بنا چکا تھا کہ ایک دو مہینے اور ٹھہر جائیں مگر وقت تھا کہ گزرتا ہی جا رہا تھا۔ منگنی کی رسم کو بھی کئی مہینے بیت چکے تھے۔ فاطمہ نے کئی بار دبے چھپے لفظوں میں بھاوج کو پیشکش کی کہ وہ دونوں طرف کا خرچ اٹھا لیتے ہیں مگر دونوں میاں بیوی اس بات کے لیے رضامند ہی نہ تھے۔ فاطمہ اور وجاہت یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ بشارت کتنا خوددار انسان ہے۔ اس لیے وہ کلثوم کو رضامند کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ بھی تو بشارت کی ہی بیوی تھی۔ کس طرح اتنا بڑے احسان کا بوجھ سہار کر زندہ رہتی۔ فاطمہ اور وجاہت اچھی طرح جانتے تھے کہ شادی میں تاخیر کی وجہ صرف بشارت کا خالی ہاتھ ہونا ہے گر وہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ رابعہ اور رحمت تو دونوں ایک دوسرے کے پیار میں مرے جا رہے تھے۔ ان کے اوپر بھی یہ جدائی بہت ہی گراں گزر رہی تھی مگر بے چارہ بشارت کرے بھی تو کیا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا مگر پھر بھی...... نہ جانے تقدیر کو کیا منظور تھا۔

اسی ادھیڑبن میں کئی ماہ گزر گئے۔

ایک دن بشارت دفتر کے کام کاج میں مصروف تھا کہ اسے خبر ملی کہ پرانے صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ وطن واپسی کے بعد وہ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کو رپورٹ کریں گے۔ اُن کی جگہ نئے مقرر ہونے والے افسر دو چار روز میں اپنے عہدے کا چارج سنبھالیں گے۔ یہ سن کر تو اس کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ وہ بے چارہ نہایت معمولی سا نائب قاصد تھا۔ اُس کے پاس تو پچھلے صاحب سے ملاقات کے لیے، اُن کی بیٹی کی شادی میں ادا کی گئی خدمات کا ایک موہوم سا حوالہ موجود تھا مگر یہ نئے صاحب، اُن سے وہ کیسے مل پائے گا۔ اگر مل بھی لیتا تو یہ دفتری قواعد کی خلاف ورزی ہوتی جس کی وجہ سے اسے شوکاز نوٹس بھی جاری ہو سکتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے اس باب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

اب بشارت کے پاس جی پی فنڈ سے رقم کا حصول ہی مسئلے کا واحد حل تھا۔ بشارت نے کئی مہینے کوشش کی مگر آخر میں اسے یہ جواب ملا کہ قواعد کے تحت جتنی بار وہ جی پی فنڈ سے رقم لے سکتا ہے، وہ پہلے ہی استعمال کر چکا ہے۔ اس لیے اب وہ اس فنڈ کو مزید استعمال نہیں کر سکتا۔ جس دن اکاؤنٹنٹ نے اسے یہ اطلاع دی، وہ اس کے لیے بہت ہی صدمے کا دن تھا۔ اُس دن اسے اپنی دنیا ہی اندھیر لگنے لگی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے اُسے شدید سردی کے ساتھ بخار چڑھا اور پھر وہ کئی روز تک بستر پر پڑا رہا۔ پریشانی کے باعث اس کی بھوک پیاس تو پہلے ہی مر چکی تھی اب تو نیند بھی اس کی آنکھوں سے دور ہو گئی تھی۔ اوپر سے ہفتہ بھر کے بخار نے تو اسے پوری طرح لاغر کر ڈالا تھا۔

دس دن بعد جب بشارت کی طبیعت کچھ سنبھلی تو دفتر پہنچا۔ اس دن وہ اکاؤنٹنٹ سے جا کر ملا اور اسے اپنا سارا مسئلہ بتایا۔ اکاؤنٹنٹ بھلا مانس تھا۔ اسی لیے اُسے کچھ حوصلہ ہوا کہ وہ اس کے پاس جا کر اپنی مجبوری بیان کرے، ممکن ہے کہ وہ کوئی حل نکال دے۔ وہ تین افراد نے مسئلے کا حل نکال دیا تھا۔

”دیکھو بشارت...... کچھ اور تو ممکن نہیں بس اب ایک ہی راستہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تمہاری عمر ترپن سال ہے۔ اس طرح ریٹائرمنٹ میں ابھی سات سال باقی ہیں۔ تم ایسا کرو کہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لو۔“

”مگر اس سے کیا ہوگا؟“

”تم پنشن کی رقم اکٹھی وصول کر لینا۔ ساتھ ہی جی پی فنڈ بھی مل جائے گا اور اس طرح تمہارے تمام مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ اسے ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ اور کام کرنے کے بارے میں بھی مشورے دیتا رہا۔ کافی دیر بعد جب بشارت اس کے پاس سے اٹھا تو ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

دوسرے دن اُس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی اور پھر ضابطے کی کارروائی میں دو تین ہفتے لگ گئے۔ آخر ایک دن وہ اپنے دفتر پہنچا اور پھر چھٹی ہونے پر نہایت خاموشی سے آخری بار وہاں سے اُٹھ کر گھر آگیا۔ دوسرے دن کسی نے بھی اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ اس دفتر کا نائب قاصد بشارت علی کہاں ہے، البتہ دو چار لوگ یہ بات ضرور جانتے تھے کہ وہ کل شام ریٹائر ہو گیا ہے۔ یہ بات سب سے پہلے اُس کینٹین والے کو معلوم ہوئی تھی جہاں سے وہ اپنے صاحب کے لیے چائے بسکٹ لے کر آتا تھا۔ اس نے بشارت کی ریٹائرمنٹ پر افسردگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ اب بشارت کے صاحب کا نیا چپراسی اُس سے چائے لے کر جائے گا یا برابر والے کھوکھے سے۔ اس کے علاوہ کسی کو یہ جاننے سے کوئی غرض نہیں تھی کہ بشارت کہاں چلا گیا ہے۔

رات کو جب بشارت نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بارے میں بیوی کو بتایا تو وہ گھبرا کر رہ گئی۔ ”اب کیا ہوگا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”اب تو یہ مکان بھی چلا جائے گا۔“ وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔

”دیکھو......“ اس نے بیوی کو تسلی دینے کے لیے آگے کا سارا منصوبہ اسے سمجھانا شروع کیا۔ ”سب سے پہلے ہم رابعہ کا بیاہ کریں گے۔ اس کے بعد پنڈی میں کہیں کرائے کا مکان لے لیں گے اور تھوڑے پیسے لگا کر میں پان سگریٹ کا کھوکھا ڈال لوں گا۔ اس طرح سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ مکان؟“

”اکاؤنٹنٹ صاحب بتا رہے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں چھ ماہ تک اس مکان میں رہ سکتا ہوں۔“ اس نے بیوی کو تسلی دی۔ ”بس، اس دوران میں ہی ہم سب کام کر لیں گے۔“

”پیسے کب ملیں گے؟“

”شاید ایک مہینا لگ جائے گا۔“ یہ سن کر بیوی نے سکون کی سانس لی مگر یہ سکون عارضی ثابت ہوا۔

ریٹائرمنٹ کو ایک ماہ گزر چکا تھا۔

فاطمہ کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ رابعہ اور رحمت بدستور ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر ملتے رہے اور اب وہ دونوں بھی اس صورتِ حال سے خاصے پریشان تھے۔ اس مسئلے کو لے کر اُن دونوں میں بھی ہلکی پھلکی ناراضی ہونے لگی تھی مگر بے چاری رابعہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اب اپنے منہ سے تو ماں باپ کو یہ کہنے سے رہی کہ میرے ہاتھ پیلے کر دو۔ رہا بشارت تو وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اب پہلے سے کہیں زیادہ پریشان تھا اور ہر روز اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ مہینوں سے اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر کے چکر لگا رہا تھا لیکن پنشن کا اجرا تو دور کی بات، اب تک تو اس کی فائل ہی تیار نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ کلثوم الگ پریشان تھی۔ آخر ایک دن اُسے معلوم ہو ہی گیا کہ فائل کیسے تیار ہو گی اور واجبات کس طرح ملیں گے۔ اُسی شام وہ دلدار ہوٹل میں محمد سلیم کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ کافی دیر کی بات چیت کے بعد آخر معاملہ طے پا گیا۔ بشارت نے فی الحال پینتالیس ہزار اور تمام تر واجبات کی ادائیگی کے بعد پچاس ہزار روپے دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ تین دن بعد اسے نذرانے کی پہلی قسط ادا کرنا تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں شکرپڑیاں کی ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ پہاڑی پر واقع اُس تفریح گاہ سے اسلام آباد کا نہایت مسحور کن نظارہ نگاہوں کے سامنے تھا مگر وہ دونوں کسی اور ہی خیال میں گم تھے۔ ”یہ بہت مشکل ہے رحمت۔“ کافی دیر بعد رابعہ نے خاموشی کو توڑا۔

”مگر اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔“ اس نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ ”اب ڈیڑھ سال ہو رہا ہے مگر ماموں......“

”تھوڑا سا انتظار اور کر لیں تو......“

”کوئی فائدہ نہیں۔“ رحمت نے فوراً جواب دیا۔ ”اب تک بھی تو انتظار ہی کر رہے ہیں مگر کیا نتیجہ نکلا۔“

”لیکن یہ تو......“

”دیکھو...... زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے رابعہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ طریقہ نامناسب ہے مگر ہماری نیت درست ہے۔“

”لیکن......“

”تم ذرا سی ہمت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ رحمت نے قطع کلامی کی۔ اس کے لہجے سے قطعیت جھلک رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد رابعہ نے زمین پر نظریں گڑائے ہوئے جواب دیا۔

”بہت اچھا......“ اس کی رضامندی سنتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ ”دیکھنا، اب میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔“ اس کے بعد وہ تفصیل سے رابعہ کو سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔

رابعہ ایم اے کر چکی تھی اور اس نے لیکچرار شپ کے لیے کئی جگہوں پر درخواست دے رکھی تھی۔ اس شام وہ گھر پہنچی تو اس نے ماں باپ کو بتایا کہ اسے اور اس کی ایک سہیلی کو ای میل پر انٹرویو کال آئی ہے۔ انٹرویو لاہور میں دو دن بعد ہوگا۔ وہ سہیلی کے ساتھ کل صبح لاہور جائے گی۔ ماں باپ تنہا بھیجنے کے حق میں نہیں تھے لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ وہ

سہیلی کی خالہ کے گھر میں ٹھہرے گی اور یہیں سے وہ سہیلی کے ساتھ کار میں ان کے والد کے ہمراہ جائے گی تو وہ مطمئن ہو گئے۔ اگلی صبح رابعہ لاہور کے لیے گھر سے نکل گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا سفری بیگ بھی تھا جس میں چند جوڑے کپڑوں کے تھے۔

☆☆☆

بشارت کا پڑوسی بشیر محمد کہنے کو تو اس کی طرح کا ہی گریڈ دو کا نائب قاصد ہی تھا مگر اس کا رہن سہن اور مالی حالات اس سے لاکھ درجے اچھی تھی۔ بشیر سیکریٹریٹ میں تعینات تھا، جہاں وہ ایک جوائنٹ سیکریٹری کا چپراسی تھا۔ اس وجہ سے صاحب کے ماتحت افسران کے علاوہ وہاں آنے جانے والے بھی اس کا 'خاص خیال' رکھتے تھے۔ وہ بھی اپنا 'خیال' رکھوانے کا ماہر تھا۔ اس لیے اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ وہ دونوں اس کالونی میں آگے پیچھے ہی رہائش پذیر ہوئے تھے۔ اس لیے اُن میں خاصی پرانی دوستی تھی۔

اگرچہ بشارت، سلیم کو تین دن بعد رقم دینے کا وعدہ تو کر کے آ گیا تھا مگر اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی، البتہ اسے یقین تھا کہ وہ یہ رقم بشیر سے قرض لے کر اُسے دے دے گا۔ جب اس نے بشیر کو ساری صورتِ حال بتائی تو اس نے جھٹ سے اسے پینتالیس ہزار روپے قرض دے دیے۔ رقم ملنے کے بعد پہلی بار بشارت کو محسوس ہوا کہ واقعی اب وہ بیٹی کو رخصت کرنے جا رہا ہے مگر...... بیٹی تو رخصت ہوئے دوسرا دن تھا۔

جب بشارت رقم لے کر دوست کے گھر سے نکلا تو اسے یاد آیا کہ اس کے پاس سگریٹ ختم ہو چکی ہے۔ وہ دن بھر گھر پر رہا تھا، اس لیے کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ وہ گھر جانے کے بجائے بازار کی طرف چل دیا۔

''لا بھئی...... ذرا ایک ڈبی پکڑا دے۔'' کھوکھے والا اس کا واقف کار تھا۔ اس نے بے تکلفی سے کہا اور جیب سے پیسے نکالنے لگا۔ ''کیا دیکھ رہا ہے ایسے۔ کیا میں بدل گیا ہوں!''

جب بشارت نے دُکان دار کی طرف پیسے بڑھائے تو اس وقت ایسا لگا جیسے وہ اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہا ہو۔

''بھائی بشارت...... زمانہ بدل گیا ہے۔ لگتا ہے تمہیں واقعی کچھ علم نہیں۔'' اس نے سگریٹ کی ڈبی تھماتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی...... زمانے کو کیا ہو گیا ہے؟''

''یہ لو، خود ہی دیکھ لو۔'' اس نے برابر سے آج دوپہر کا اخبار اٹھایا اور موڑ کر ایک خبر پر انگلی رکھتے ہوئے اس کے سامنے بڑھا دیا۔ بشارت نے اخبار تھاما۔ وہاں رابعہ اور رحمت کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور ساتھ میں خبر تھی۔

''ایم اے پاس پریمی جوڑا شادی کے لیے عدالت پہنچ گیا۔

والدین شادی میں تاخیر کر رہے تھے، عدالت نے نکاح پڑھوا دیا۔''

''ایم اے پاس پریمی جوڑا عدالت پہنچ گیا۔ جہاں اُن کے بیانات سننے کے بعد عدالت نے نکاح کرنے کی اجازت دے دی۔ عدالت میں ہی نکاح پڑھوا دیا گیا۔ تفصیلات کے مطابق اسلام آباد کے رہائشی رحمت وجاہت اور رابعہ بشارت آپس میں کزن ہیں۔ گھر والوں نے ان کی شادی طے کر دی تھی لیکن لڑکی کے والدین گزشتہ دو برس سے رخصتی میں لیت و لعل سے کام لے رہے تھے جس پر نوجوان جوڑا مجبوری میں گھر سے فرار ہو کر سول جج راولپنڈی کی عدالت میں پہنچ گیا۔ عدالت میں نکاح کے بعد جوڑا نامعلوم مقام پر چلا گیا۔''

یہ خبر پڑھنے اور تصاویر دیکھنے کے بعد بشارت اخبار لے کر گھر پہنچا اور جب اس نے کلثوم کو یہ ماجرا سنایا تو جیسے اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ دونوں کئی گھنٹے تک ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتے رہے اور پھر آخر انہوں نے انتہائی اہم فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

بشیر دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر میز پر پڑی۔ ''اوہ...... یہ بھلو اپنا چشمہ یہیں بھول گیا۔ اب پورے گھر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہو گا۔'' یہ کہہ کر اس نے چشمہ اٹھایا اور اسے لوٹانے کے لیے بشارت کے گھر کی طرف چل دیا۔

وہ کافی دیر تک دروازہ بجاتا رہا مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے کچھ پڑوسیوں کو جمع کیا اور جب دیوار پھاند کے اندر کمرے میں پہنچا تو اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ سامنے بشارت اور کلثوم کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے نیلے پڑ گئے تھے۔ برابر میں ہی جراثیم کش دوا کی بڑی سی خالی بوتل فرش پر پڑی ہوئی تھی جس کے قریب ہی کل دوپہر کا اخبار پڑا ہوا تھا۔

بیٹی کی رخصتی کے بعد بشارت کے تمام مسائل ہی ختم ہو گئے تھے۔ اسے پنشن اور اپنے دیگر واجبات کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اسی لیے تو اُن دونوں نے اس دنیا سے ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔

● ●
● ●

نیا دور نیا خاندان

ڈاکٹر شیر شاہ سید

انسان جب اپنی حقیقت بھلا کر اوقات سے باہر ہو جاتا ہے تو قدرت ایسے راستے پیروں تلے بچھا دیتی ہے جن کی منزل تباہی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ہوتی... اور اس پر بھی اگر ادراک ہونے میں تاخیر ہو جائے تو ذلیل و رسوا ہو کر بھی زندگی مہلت نہیں دیتی... اور جب موت اپنی پناہ میں لے لے تو کتنے ہی لوگ زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔

ایک ہونی گزیدہ کا دلخراش انجام اور لہولہو رشتوں کی قیامت خیزیاں

رات دو بجے عذرا کا فون آیا تھا۔

''سر! وہ لیبر میں ہے، اسپتال آ گئی ہے۔ شائستہ...... وہی ایچ آئی وی والی عورت۔''

''کتنی دیر لگے گی تمہارے خیال میں؟'' میں نے پوچھا۔

''دو گھنٹے میں سب کچھ ہو جائے گا سر! ابھی وہ چھ سات سینٹی میٹر ہے اور بچے کا سر بالکل ہی نیچے آ چکا ہے۔ درد ٹھیک ٹھاک اٹھ رہا ہے۔ پروگریس کر رہی ہے۔'' عذرا نے جواب دیا تھا۔

میں نے کہا کہ میں آ رہا ہوں۔

شائستہ کے شوہر کا دوست اسے لے کر آیا تھا۔ جب سارے مریض ختم ہو گئے تو وہ دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ کچھ ڈرا ڈرا سا، کچھ گھبرایا گھبرایا سا پھر رک رک کر اس نے مجھ سے آنکھیں چار کیے بغیر کہا۔

''جی میں اپنے دوست کی بیوی کو لے کر آیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرا دوست، شائستہ کا شوہر تین ہفتے ہوئے مر گیا ہے۔ یہ حمل سے ہے...... شاید ساتواں مہینا ہے اس کا۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر بہ مشکل اپنی بات مکمل کی تھی۔

''اچھا...... تو کارڈ بنوانا ہے؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"جی کارڈ تو بنانا ہے مگر ایک مسئلہ اور ہے۔" اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"بولو کیا بات ہے، کیا مسئلہ ہے؟ مسئلے ہی تو حل کرنے بیٹھے ہیں ہم لوگ۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا تھا۔

"جی بات یہ ہے کہ شائستہ کے شوہر کو بڑی خراب بیماری تھی جی۔ خود مر گیا ہے وہ اس بیماری سے اور سب کچھ علاج پر ختم ہو چکا ہے، پیسہ بھی نہیں ہے ان لوگوں کے پاس۔ گھر میں تین بچے اور یہ اور نفیس کی ماں ہے...... اور کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے پھر آہستہ آہستہ مزید بتایا تو میں نے کہا۔

"دیکھو اس اسپتال میں تو پیسے لگتے نہیں ہیں، ابھی میں کارڈ بنوا دیتا ہوں، پھر دو مہینے کی بات ہے۔ بیچ میں ہم لوگ دیکھتے رہیں گے۔ آئرن کی گولیاں اسپتال سے ہی مل جائیں گی۔ جب درد اٹھے تو لے آنا۔ اگر آپریشن کی ضرورت پڑی تو وہ بھی ہو جائے گا جس میں کوئی پیسا ویسا بھی نہیں خرچ ہوگا۔ ویسے پہلے بچے تو نارمل ہی ہوئے ہیں نا۔ مریضہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ ساتھ ہی میں نے آیا سے کہا کہ ڈاکٹر عذرا کو بلاؤ۔

"جی مریضہ باہر ہے، بلا لوں اسے؟" اس نے پوچھا تھا۔

اس نے دروازہ کھول کر شائستہ کو اندر بلایا۔ دبلی پتلی سی عام شکل صورت کی لڑکی تھی وہ۔ شکل سے ہی اندازہ ہو گیا کہ لاغر ہے، ہیموگلوبن چھ گرام سے زیادہ نہیں ہوگا، اس پر سے حمل...... ایسی مائیں بچے جننے کی عمر میں عام طور پر موت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ یقینی طور پر مناسب غذا سے محروم رہی ہے وہ۔ شکل پر شدید اداسی، بہت ہی معمولی قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے۔ میں نے سوچا کہ جس کا شوہر تین ہفتے پہلے مرا ہوگا اس کی شکل پر اداسی نہیں ہوگی تو کیا ہوگا۔

دروازہ کھلا اور عذرا داخل ہوئی۔ "آپ نے بلایا ہے سر؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں، دیکھو یہ شائستہ ہے، شاید سات مہینے کے حمل سے ہے۔ اس کا کارڈ بنانا ہے۔ کارڈ بنا کر سارے ٹیسٹ بھیج دو اور کل بلا کر آئرن چڑھا دینا۔ میرے خیال میں چار وائل تو چڑھانا ہی ہوگا۔ ایک ایک دن چھوڑ کر۔" میں نے دیکھا، شائستہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پھر میں نے انگلش میں کہا۔ "عذرا، شائستہ کے شوہر کی تین ہفتے قبل موت ہو گئی ہے ذرا ائیل سی کی ضرورت ہے۔ سمجھتی ہونا...... ٹینڈر لونگ کیئر۔ ایسے میں عام طور پر عورتیں اپنا خیال نہیں رکھتی ہیں۔ ذرا اچھے طریقے سے بات کر لینا شائستہ سے پوری توجہ کے ساتھ۔ اس کو بہت زیادہ مدد کی ضرورت ہوگی۔ غربت، افلاس، بچے اور پھر میاں کی موت نے اس عورت کو پہلے ہی مار دیا ہے۔" مجھے پتا تھا عذرا اس مریضہ کا ہر ممکن خیال رکھے گی، نہ صرف خیال رکھے گی بلکہ اگر ضرورت ہوگی تو شاید ضرورت کی چیزیں بھی مہیا کر دے گی۔ اسی لیے میں نے اسے بلایا تھا۔

وہ شائستہ کو لے کر برابر والے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے نفیس کے دوست سے پوچھا۔ "کیسے مر گیا تمہارا دوست؟ حادثہ، کینسر کیا ہوا تھا اسے؟" میں نے جلدی جلدی پوچھنے کی کوشش کی۔

"جی اسے ایڈز ہو گیا تھا۔" اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

یہ سن کر مجھے جیسے جھٹکا سا لگا۔ میں فوراً اٹھ کر برابر والے کمرے میں گیا تھا۔ شائستہ ابھی کاؤچ پر لیٹی ہی تھی۔ عذرا اس سے سوالات پوچھ رہی تھی تاکہ اس کا کارڈ بنا سکے۔

میں نے عذرا کو اشارے سے دوبارہ اپنے کمرے میں بلایا۔

"دیکھو، شائستہ کا شوہر ایچ آئی وی ایڈز کی وجہ سے مرا ہے۔ ہمیں پتا نہیں ہے کہ شائستہ کا کیا اسٹیٹس ہے، اس کو انفیکشن ہو گیا ہے یا شاید وہ بچی ہوئی ہے۔ اب تم خیال کرنا۔ اس کے سارے ٹیسٹ کرا لو۔ ہر دفعہ تمہیں ہی شائستہ کو دیکھنا ہے۔ گلوز پہننے ہیں پابندی کے ساتھ، بہت خیال رکھنا ہے کہ اسپتال کے کسی بھی عملے کو شائستہ کا خون یا جسم کی رطوبت نہ لگے۔ دیکھو ہر ایک کو بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ شائستہ کی کیا کہانی ہے؟" عذرا یہ سب سن کر چونک گئی۔ اس کی آنکھوں میں پریشانی بھر گئی تھی۔

"نفیس کو ایڈز کیسے ہو گیا؟" میں نے اس کے دوست سے سوال کیا۔

"جی بات یہ ہے کہ ہم لوگ کھیپئے ہیں۔ آپ کھیپئے سمجھتے ہیں نا ڈاکٹر صاحب۔"

"نہیں مجھے نہیں پتا کہ کھیپیا کیا ہوتا ہے؟" میں نے دوبارہ سوال کیا۔

"بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ ہم لوگ ہر تھوڑے دنوں کے بعد بنکاک جاتے ہیں۔ وہاں سے سستا سامان کھیپ لے کر آتے ہیں۔ ائرپورٹ پر ہمارا انتظام ہے۔ کچھ لے دے کر مال کسٹم سے چھوٹ جاتا ہے پھر ہم اسے کراچی کے بازار میں بیچ دیتے ہیں۔ یہی کام ہے ہمارا اور ٹھیک ٹھاک کمائی ہے۔"

اس دن میری سمجھ میں آیا کہ کراچی کے بازاروں میں چاکلیٹ سے لے کر کپڑے، صابن، شیمپو سے لے کر برتن اور سگریٹ سے لے کر ڈیکوریشن پیس کیسے آ جاتے ہیں، اچھے بھی سستے بھی۔ کھوڑی گارڈن، کھارادر، گل بازار اور دوسری بہت سی جگہوں پر باہر کا سامان کہاں سے آتا ہے۔

"جی بڑا اچھا کام چل رہا تھا۔ ہم چار دوست مل کر یہ کام کر رہے تھے۔ پھر ایسا ہوا ڈاکٹر صاحب! کہ نفیس نے بنکاک میں عورتوں کے پاس بھی جانا شروع کر دیا، خراب عورتیں، گندی عورتیں۔ وہ عورتیں جو کبھی کسی کی ہوتی ہیں۔ پھر ایسی ہی کسی عورت کے ذریعے اس کو ایڈز ہو گیا جناب۔ ہم نے اسے بہت سمجھایا کہ بازاری عورتوں سے دوستی اچھی نہیں ہے۔ ایک سے ایک بیماریاں ہیں آج کل مگر وہ مانا نہیں کسی کی بات۔ پہلے تو ہم لوگوں کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ نفیس بار بار بیمار کیوں پڑ جاتا ہے مگر ایک دن ایک ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ کرائے اور پھر پتا لگا کہ نفیس کو ایڈز ہو گیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک نہ جانے خلا میں کیا تلاش کرتا رہا۔ میں بڑی توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب، پھر مرنے میں دیر نہیں لگائی تھی اس نے۔ بہت تیزی سے ختم ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک بیماریاں جانے کون کون سی ہوتی چلی گئیں اس کو؟ بچا نہیں سکے اسے ہم لوگ۔ نہ دوائیں نہ دعائیں۔ اسپتال میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر دوائیں منگواتے رہے۔ جو کچھ ہم سے بن پڑا ہم نے کیا۔ گھر والوں نے گھر کا سامان، بیوی نے زیور اور مکان تک بیچ دیا اور اچھے خاصے پکے مکان سے اٹھ کر کچی آبادی میں آ کر رہنے لگے۔ اس امید کے ساتھ کہ ایک دفعہ نفیس اچھا ہو جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مارکیٹ سے تو ادھار مل جاتا ہے۔ پھر بنکاک کے بازاروں سے کھیپیاں اٹھیں گی اور نہ صرف یہ کہ پچھلا قرض بھی اتر جائے گا بلکہ حالات بھی اچھے ہو جائیں گے مگر یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ گھلتا گیا۔ دھیرے دھیرے پگھلتا گیا۔ اس کی ہڈیاں باہر نکلتی گئیں۔ کھال نے جیسے چاروں طرف سے جکڑ لیا ہو۔ چہرہ ایسا ویران جیسے کوئی صحرا، جس میں نخلستان بنے ہی نہ ہوں۔ چہرے پر دو آنکھیں دھنسی ہوئی۔ اس کا جسم جیسے دیمک نے کھا لیا تھا پھر ایک دن وہ مر گیا۔ اس وقت شائستہ کا چھٹا مہینا تھا۔ گھر میں نفیس کی ماں اور تین بچے تھے ڈاکٹر صاحب۔ نہ گھر میں پیسے بچے تھے اور نہ ہی گھر بچا تھا۔ سب کچھ اٹھ گیا نفیس کی بیماری پر۔ اتنی مہنگی دوائیں کہ قرض دینے والوں نے بھی قرض دینا چھوڑ دیا تھا۔ بڑی مشکل سے گھر چلایا ہے دوستوں نے مل جل کر۔ مچھر کالونی کی کچی آبادی میں ایک جھگی ڈال لی تھی اب وہیں پر رہ رہے ہیں۔ نفیس کی ماں بھی کام کرتی ہے، شائستہ بھی کام کرتی ہے۔ بس کسی نہ کسی طرح سے کام چل رہا ہے۔"

مچھر کالونی میری دیکھی ہوئی جگہ تھی۔ ایک دفعہ ایک میڈیکل کیمپ لگایا تھا ہم لوگوں نے وہاں۔ کھارادر سے ہوتے ہوئے کراچی سرکلر ریلوے کے اسٹیشن وزیر مینشن کے پاس پٹری کے ساتھ ساتھ کوڑے کے ڈھیر پر یہ آبادی بس گئی تھی۔ کچے مکان، کچا راستہ، کچی گلیاں، کچے نالوں پر لاکھوں کی آبادی۔ نہ پینے کو صاف پانی اور نہ ہی سانس لینے کے لیے صاف ہوا۔ نالوں سے اُبلتی ہوئی بدبو اور فضا میں کروڑوں کی تعداد میں ہر وقت مچھر ہوتے ہیں۔ ان مچھروں کی ہی وجہ سے اس علاقے کا نام مچھر کالونی پڑ گیا تھا۔ مچھر کالونی میں مچھروں کی طرح کے ہی لوگ رہتے تھے۔ مچھر عورتیں، مچھر مرد، مچھر بچے بھن بھن کرتے ہوئے کوڑے کے ڈھیر پر اور گندی نالیوں کے اوپر۔ غریب لوگ بھی مچھروں کی طرح ہوتے ہیں نہ پیدا ہونے کی پلاننگ، نہ زندہ رہنے میں نخرے اور نہ مرنے میں کوئی مسئلہ۔

مجھے یاد تھا کیمپ کے ختم ہونے کے بعد میں کچھ گلیوں میں گھوما تھا۔ کچرے کے ڈھیر سے سڑاند اٹھ رہی تھی۔ ننگے بچے، ننگے پیر گلیوں میں رل رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں انسانوں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اسلام آباد سے ان لوگوں کو بلا کر یہ جگہ دکھاؤں جنہوں نے ایٹم بم بنایا ہے، جو میزائل داغ رہے ہیں، جن کی آنکھوں میں آبدوز کی چمک ہے، جن کی رات کی نیندیں ایف 16 لڑاکا جہازوں کی آواز کے بغیر بے کل ہو چکی ہیں، جو جہازوں میں بھر بھر کر سرکاری خرچے پر عمرہ کرتے ہیں، شاپنگ کے لیے پیرس جاتے ہیں، اپنے بچوں کو بھیج کر سرکاری خرچ پر امریکا اور یورپ میں پڑھاتے ہیں۔ جو قوم کی بقا کی بات کر رہے ہیں انہیں کیا پتا کہ قوم کس طرح سے رہ رہی ہے؟ مہذب ملکوں میں جانوروں کو بھی ایسے نہیں رکھا جاتا۔ کاش میں انہیں دکھا سکتا کہ جن کے ووٹوں کی گنتی سے وہ اسلام آباد پہنچتے ہیں اور جن کے محنت کی کمائی سے ٹیکس کاٹ کاٹ کر انہوں نے اسمبلی کی عمارت بنائی ہے، اپنے محل نما گھر بنائے ہیں، ان کی زندگی میں محرومی، بیماری، دکھ، غم اور پریشانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر یہ صرف خواہش تھی۔ نہ میں انہیں یہ سب کچھ دکھا سکتا تھا اور اگر وہ دیکھ بھی لیتے تو کیا کر لیتے؟ ان کے مسائل کچھ اور تھے، ان کی دنیا کہیں اور...... اس دنیا کو چلانے کے لیے وہ

سب کچھ کرنا پڑتا ہے، ایٹم بم، ایف 16، آبدوز، جہاز، ایوان صدر، قومی اسمبلی کی عمارت، موٹروے اور نہ جانے کیا کیا۔ اگر عوام جاہل رہ جاتے ہیں اور قوم بیمار رہتی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر ایسی کمزور عوام سے خطرہ بھی تو نہیں ہے مگر وہ ایک عجیب وغریب تجربہ تھا۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ مچھروں کے ڈنک سے شاید نامردی بھی ہو جاتی ہے۔ پورے ملک میں سارے عوام کو جیسے مچھروں نے ڈس لیا تھا۔ مچھروں سے ڈسے ہوئے نامرد عوام!

شائستہ جب بھی اسپتال آتی تو میں اسے ضرور دیکھتا اور اس کے آنے کے ساتھ ہی مچھر کالونی بھی اپنی بھیانک شکل صورت لے کر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی تھی۔

ہوا یہ کہ شائستہ کی بکنگ کے ساتھ ہی جو خون کے ٹیسٹ ہم نے کرائے۔ اس کے مطابق وہ بھی ایچ آئی وی پازیٹو نکل آئی تھی۔ شوہر نے بنکاک کا تحفہ پوری محبت کے ساتھ بیوی کو منتقل کر دیا تھا۔ ہم مشرقی لوگ کتنے باانصاف ہیں، کچھ بھی تو نہیں رکھتے اپنے پاس یہاں تک کہ بیماریاں بازار سے خریدتے ہیں اور بیویوں کو بھی خلوص ومحبت کے ساتھ دے دیتے ہیں۔ یہی کچھ ہوا تھا شائستہ کے ساتھ بھی۔

وہ پابندی سے اسپتال آ رہی تھی۔ اسے آئرن کے کئی انجکشن لگائے گئے۔ اسپتال میں موجود جو بھی وٹامن کی گولیاں میسر تھیں، اسے دی گئیں۔ دوستوں کے گھروں کے پرانے صاف ستھرے کپڑے جمع کر کے اسے اور اس کے بچوں کے لیے دیے گئے۔ کچھ دوستوں سے میں نے خاص طور پر اس کے لیے زکوٰۃ اور خیرات لے کر بھی جمع کیا کہ نہ جانے کب کتنی رقم کی ضرورت پڑ جائے۔ حمل خود ایک ایسا عمل تھا جس میں کسی وقت بھی کوئی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے کہا ہوا تھا کہ جب بھی شائستہ آئے اسے میں نے اور ڈاکٹر عذرا نے ضرور دیکھنا ہے اور اگر وقت پورا ہونے پر رات اور دن کے کسی بھی وقت وہ آئے تو مجھے بلایا جائے تاکہ میں خود ہی اس کی ڈلیوری کراؤں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جونیئر ڈاکٹر سب کچھ کریں۔ مجھے پتا تھا کہ ایچ آئی وی پازیٹو مریضہ کے ساتھ کیا کرنا ہے اور کس طرح سے اس کا علاج کرنا ہے تاکہ اس کے ذریعے مزید بیماری پھیل نہ سکے۔

شائستہ بھولی بھالی ہونے کے ساتھ سمجھ دار لڑکی بھی تھی۔ اسے پتا لگ چکا تھا کہ وہ ایچ آئی وی پازیٹو ہے اور کسی بھی وقت وہ خود بھی اس مرض کی بھینٹ چڑھ سکتی ہے۔ ہم سب کی دل جوئی کے باوجود، بار بار تسلی دینے کے باوجود اس کی آنکھوں میں خوف کا سایہ لہراتا رہتا تھا۔ ایک تشویش ہوتی تھی اس کے چہرے پر، ایک کھنچاؤ تھا اس کے ماتھے کی شکنوں میں۔ اس کے گورے چہرے پر تاریکی تھی گہری جو صاف نظر آتی تھی۔ وہ جب بھی آتی نہ چاہنے کے باوجود ہم لوگ اداس ہو جاتے تھے۔

عام طور پر اس کے تینوں بچے اور ساس ساتھ ہی آتے تھے۔ یہی سب کچھ سرمایہ تھا اس کا۔ نو سال کی بڑی بچی، چھ سال کا بڑا بیٹا اور پانچ سال کی ایک اور لڑکی۔ ایک بوڑھی ساس جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ بیٹے کے مرنے کے بعد ماں نے ساری محبت بیٹے کے بچوں پر نچھاور کر دی ہے۔ مائیں اور کیا کر سکتی ہیں، کچھ بھی نہیں۔ ان کے پاس دینے کے لیے ہوتا ہی کیا ہے، پیار۔ پیار کا ایک ایسا ذخیرہ جو مر کر بھی بانٹتی ہی رہتی ہیں، اپنے بچوں کو، بچوں کے بچوں کو.... ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

”ڈاکٹر صاحب بچہ پیدا ہونے کے کتنے دنوں کے بعد میں مروں گی؟“ ایک دن اس نے پوچھا تھا، ٹھہر ٹھہر کر کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ۔

”ضروری نہیں ہے کہ تم مرو، ضروری نہیں ہے کہ مرض تم کو بھی ہو جائے۔ کچھ بھی ضروری نہیں ہے۔ کافی چانس اس بات کا ہے کہ تمہیں کچھ نہ ہو۔ تم بچے کی پیدائش کے بعد بھی اسی طرح سے ٹھیک رہو۔ صرف ایچ آئی وی پازیٹو.... ویسی ہی۔“ میں نے تسلی دی تھی۔

”ڈاکٹر بچے کو تو بیماری نہیں ہوگی نا؟“ اس نے پھر پوچھا تھا۔

”نہیں ہوگی، بالکل نہیں ہوگی۔ امید تو یہی ہے مگر کبھی کبھار بچے کو بیماری لگ جاتی ہے اور پیدائش کے بعد خون کے ٹیسٹ سے پتا لگ جاتا ہے اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے کو بیماری تو نہیں لگتی ہے مگر بچہ صحیح نہیں رہتا، وہ بیمار رہتا ہے۔ ایچ آئی وی نیگیٹو ہونے کے باوجود اسے ادھر ادھر کی بیماریاں لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین سال کی عمر ہونے تک مر جاتا ہے مگر ضروری نہیں ہے کہ یہ سب تم کو اور تمہارے بچے کو بھی ہو۔ ہمیں اچھی امیدیں رکھنی چاہئیں۔“ مجھے پتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، صرف امید دلا رہا ہوں، اچھی امید دلا رہا ہوں۔ کیونکہ صرف امید ہی دلا سکتا تھا اور میرے بس میں تھا بھی کیا۔

میں اکثر اسے دیکھتا اپنے کمرے کی کھڑکی سے۔ وہ اپنے بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے دھیرے دھیرے اسپتال سے نکلتی تھی پھر میری کھڑکی کے پیچھے سے گزر کر اسپتال کی دیوار کے کونے سے لگے ہوئے چھولے، دہی بڑوں کے ٹھیلے پر کھڑے ہو کر بچوں کو چھولے، دہی بڑے کھلاتی۔ گولا گنڈا والے سے بچے گولا گنڈا لے کر کھاتے تھے۔ کبھی کبھی پکوڑے یا کوئی اور چیز۔ یہی چھوٹی موٹی خوشیاں تھیں اس کی زندگی میں۔ میں ان ماں بچوں کو دیوار سے لگے ہوئے چھولے کھاتے پیتے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو جایا کرتا تھا۔ کتنی معصوم خوشیاں ہوتی ہیں غریب لوگوں کی۔

اس دن درد شروع ہونے کے ساتھ ہی وہ اسپتال چلی آئی۔ عذرا سے بات کرنے کے بعد میں فوراً ہی اسپتال پہنچا تھا۔ لیبر روم میں وہی معمول کا عالم تھا۔ وہی شور وغل اور وہی رشتہ داروں کا ہجوم، وہی دوڑ بھاگ، وہی مارا ماری۔ خون لاؤ، نہیں لگی ہوئی ہے۔ جلدی کرو تھیٹر لے جانا ہے۔ اذان بعد میں دینا۔ ماں ٹھیک ہے بچہ بھی ٹھیک۔ ماں سیریس ہے، بچا نہیں کیا ہوگا۔ ہر طرح کی ملی جلی آوازوں میں دن تمام ہو جاتا ہے۔

بچے کی پیدائش میں کوئی خاص دیر نہیں لگی۔ معمول کے مطابق بچہ ہو گیا، نہ کوئی اوزار لگانے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی کچھ کاٹنا پڑا تھا۔ سرخ وسفید بچہ پیدا ہوا۔ دنیا کے سارے بچوں کی طرح لیکن شاید یہ بچہ بھی HIV پازیٹو ہو، یہ سوچ کر ہی جیسے میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

وہ عام بچوں کی طرح پہلی سانس پر چیخا بھی، رویا بھی۔ میں نے فوراً ہی آنول نال کاٹ کر اسے ماں کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اسے پکڑے رہی تھی۔ اس نے اسے چھوا ضرور تھا مگر پیار نہیں کیا۔ اسے بھینچا ضرور تھا مگر چھاتیوں سے نہیں لگایا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ احتیاط کر رہی ہے اپنی دانست میں مرض کو محدود رکھ رہی تھی اپنے پاس۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش بغیر کسی گھن گرج کے ہو رہی تھی۔ میرا دل بھی نہ جانے کیسے دھڑک رہا تھا۔ واہ رے مالک تو جانے اپنا حساب......! میں صرف سوچتا رہا، سوال کرتا رہا، گڑبڑاتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ یہ جانے بغیر کہ عذرا مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

تین دن کے بعد اسے اسپتال سے گھر بھیج دیا ہم لوگوں نے۔ بچہ ایچ آئی وی نیگیٹو تھا اور اس کے بچنے کے پورے چانسز تھے۔ ماں نے یہ خبر سنی تو اس کے چہرے پر جیسے نور کی بارش ہو گئی۔ آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر مسکراہٹ، چہرہ کسی شرمائی ہوئی دلہن کی طرح سرخ۔ میں وہی چہرہ یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

تھوڑے دنوں کے بعد ہی یکایک شائستہ بیمار پڑ گئی اور دیکھتے دیکھتے ہم لوگوں کے سامنے اس نے جان دے دی۔ ایسا بھی ہوتا ہے، ہم سب لوگوں کو پتا تھا کہ ایڈز کے ساتھ جان تیزی سے بھی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر ان چند حاملہ عورتوں میں حمل کے بعد یکایک مرض تیزی سے بڑھتا ہے۔

اس کے مرنے کے کچھ مہینوں کے بعد میں نے اس کے بچوں کو دیکھا تھا۔ بڑی بیٹی نو سالہ عامرہ نے چھوٹے پانچ ماہ کے بچے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ دادی نے دوسرے دونوں بچوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔ وہ لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے، چھوٹے بچے کی طبیعت خراب تھی۔

میں نے بچوں کے ڈاکٹر کو بلا کر اسے دکھوا دیا۔ معمول کے مطابق تو زائدگی کے زمانے کی عام بیماری تھی اسے۔ دوائیں دے کر رخصت کر دیا تھا انہیں۔

چھوٹے سے خاندان کی پرورش کی ذمے داری دادی اور پوتی پر آن پڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اسلام آباد میں رہنے والے حکمرانوں نے ابھی سے اس بیماری پر توجہ نہیں دی تو نہ جانے کتنی دادیاں اسی طرح اپنے ٹوٹے ہوئے خاندان کا بوجھ اپنے بوڑھے کاندھوں پر اٹھائیں گی۔ بڑھاپا، پھر جوان بیٹے اور بہو کی موت کا غم، خالی گھر، چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیاں، نہ نوکری نہ کوئی آزارہ الاؤنس، نہ کوئی آمدنی کا ذریعہ۔ دنیا بنانے والے تو نے یہ دنیا بنائی، کیا تیرے من میں سمائی۔ میں صرف سوچتا ہی رہ گیا۔ اپنی جیب سے کچھ روپے نکال کر میں نے عامرہ کے چھوٹے سے تھیلے میں رکھ دیے۔ ”کوئی بھی مسئلہ ہو، کبھی بھی کچھ ہو، میرے پاس آ جانا عامرہ۔“ یہی کہہ سکتا تھا میں۔ ”ضرور مدد کروں گا تمہاری جو بھی ممکن ہو سکے گا۔“ دادی اور پوتی کی آنکھوں میں تشکر بھرا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اسپتال سے فارغ ہو کر میں باہر نکلا اور اپنی گاڑی میں اسپتال کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے جب کارنر پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ زمین پر دیوار کے ساتھ ساتھ عامرہ نے تینوں بچوں کو سنبھالا ہوا تھا۔ چھوٹا بچہ گود میں اور باقی دونوں بچے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے عامرہ کو کسی ایسے پرندے کے بچوں کی طرح دیکھ رہے تھے جو اپنے گھونسلے میں اپنی چونچ کھول کھول کر اپنی ماں سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ دادی چھولے والے کے پاس کھڑی ہوئی آلو چھولے اور دہی بڑے بنوا رہی تھی۔ پینسٹھ سالہ دادی کے چہرے پر بچوں والا بھولپن تھا اور نو سالہ عامرہ کے چہرے کو سنجیدگی کی تہوں نے کہیں گہرا تھا۔ وہ بچے کو تھپکیاں دے رہی تھی۔ دادی پوتوں پوتیوں کی انوکھی گارڈین۔ نئے دور کے نئے خاندان کی سربراہ۔

محفل شعر و سخن

❁ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی......خوشاب
نزاکت ختم ہے ان پر، ہوا ہے درد سر پیدا
ذرا ماتھے کو چوما تھا، پڑے ہیں کل سے سر باندھے

❁ ذیشان افتخار ڈھلوں......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
میں خوش نصیبی ہوں تیری مجھے بھی راس ہے تو
تیرا لباس ہوں میں اور میرا لباس ہے تو
عجیب شے ہے محبت بھی دور ہیں لیکن
ترے قریب ہوں میں مرے آس پاس ہے تو

❁ عبدالغفور خان......چھب، ضلع اٹک
صبح ہوتے ہی میرے سر پہ ہاتھ رکھ دیا کر ماں
نہ جانے کس موڑ پہ میری زندگی کی شام ہو جائے

❁ این ایس آر مدثر......بلدیہ ٹاؤن، کراچی
سال کی پہلی کرن کے ساتھ جاگا ہے دل
پھر وہی طلب میری اب کے برس مل جائے تو

❁ ڈاکٹر وسیم خالق گھیاں...... گجرات
شدتِ غم میں بھی ہوں زندہ تو حیرت کیسی
کچھ دیے تند و تیز ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں
اب کوئی کیا میرے قدموں کے نشاں ڈھونڈے گا
تیز آندھیوں میں تو خیمے بھی اکھڑ جاتے ہیں

❁ راجا ضیاالحسن کیانی......رتی ٹبی، ساہیوال
جن پہ میرے پرکھوں کی روایات رقم ہیں
وہ سارے صحیفے کسی جزدان میں رکھنا
آنکھوں کی یہ شمعیں اسی چوکھٹ پہ رہیں گی
تم جاؤ پر دیس تو یہ دھیان میں رکھنا

❁ سنیہ منظور......یوحنا آباد، لاہور
سنتا ہوں بڑے شوق سے افسانہ ہستی
کچھ اصل ہے، کچھ خواب ہے، کچھ حسن بیاں ہے

❁ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
فرعون کے لہجے میں ہم سے بات مت کرو
ہم تو پاگل ہیں دیوتاؤں سے الجھ پڑتے ہیں

❁ ریاض شاہد پینٹر......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
نظر اٹھا کر جہاں چار سو دیکھوں
ہر اک شخص کی دنیا لہو لہو دیکھوں
محبتوں کے سفر پہ گامزن ہیں جو لوگ
خدا کرے کہ ان سب کو سرخرو دیکھوں

❁ رائے نعیم احمد بھٹی......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اب کیا ڈھونڈتی ہو راکھ کے اس ڈھیر میں
عنوان جس کا تم تھیں فسانہ ہی جل گیا

❁ عمران حیدر بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
طنز کرتے ہیں جو لوگ ان کو دکھانے کے لیے
لوٹ آؤ نا میرے یار زمانے کے لیے
اس لیے بھی تیری تصویر جلا دی میں نے
اور کچھ تھا ہی نہیں دل کو جلانے کے لیے

❁ عاصم اقبال حسپال......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

❁ عامر رسول سموٹ......راولپنڈی
محبت کو کوئی سمجھے تو آخر کس طرح سمجھے؟
یہ ظالم انتہا تک ابتدا معلوم ہوتی ہے

❁ حکیم سید محمد رضا شاہ......نور رنگ میانوالی
زندگی تیرے تعاقب میں ہم
اتنا چلتے ہیں کہ مر جاتے ہیں

❁ مسز احمد حسن عرضی......قبولہ شریف
کوئی مصلحت ضرور ہے ورنہ خدا گواہ
پیاسا جو لٹ رہا ہے سمندر اسی کا ہے

❁ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
ان کے سینوں میں کبھی جھانک کے دیکھو تو سہی محسن
کتنے افسردہ ہیں اوروں کو ہنسانے والے

❁ ایم ڈبل اے......شنکیاری، مانسہرہ
نہ دو کسی کو اپنی زندگی کا اتنا حق ساگر
کہ کچھ نہ رہے باقی، اس کے روٹھ جانے سے

❁ جنید نواز......بہاولپور
بہت اسرار پوشیدہ ہیں اس تنہا پسندی میں
یہ مت سمجھو کہ دیوانے جہاں دیدہ نہیں ہوتے

❁ حبیب الرحمٰن......سینٹرل جیل، کوٹ لکھپت
دیکھنے سے شوق پیدا شوق سے پیدا طلب
دل کی دشمن آنکھ تھی دل دشمن جاں کا بن گیا

❁ طاہرہ یاسمین......ماڑی لک، سرگودھا
نام خدا لے کر اٹھ جاتے ہیں جو لوگ
منزل کے پاس وہ نہیں منزل ان کے پاس آتی ہے

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
محبت، عداوت، وفا، بے رخی
کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

❁ جعفر حسین......تحصیل بھوآنہ، چنیوٹ
شاید ابھی پہنچی نہ ہو باب قبولیت تک میری دعا
ساقی اک اور جام دے تو یہ سفر میں ہے

❁ صوبیدار انوار بخش (ر)......ملیر کینٹ، کراچی
صبح صادق میں بہت دیر نہیں ہے، لیکن
ابھی عجلت میں، چراغوں کو بجھا مت دینا

❁ حسنین عباس بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
زخموں سے بدن گلنار سہی تم اپنے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے
جب پرچم جاں لے کر نکلے، ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تلک جلاد پہ لرزہ طاری ہے

❁ تکمیل الرحمٰن، سائرہ......کھاتاں
گدڑی کے پھٹے ٹکڑے ساغر اجسام تخیل کیا ڈھانپیں
فریاد کے نقطے حیراں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
ہم نے دیکھا تھا فقط شوقِ نظر کی خاطر
یہ نہ سوچا تھا کہ تم دل میں اتر جاؤ گے

❁ ظفر اقبال ظفر......کامرہ شرقی
پھرتے ہیں ساتھ ساتھ ہم تمام رات مگر
اس کو چاند اور مجھ کو آوارہ کہتی ہے دنیا

❁ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص
میں بھیگی ریت سے پوچھوں گا
کیا بات ہوا نے لکھی ہے
یہ بات نہیں معلوم تجھے
وہ کن سوچوں میں ڈوبی ہے

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
سوچتا ہوں کہ اب انجام سفر کیا ہوگا
لوگ بھی کانچ کے ہیں، راہ بھی پتھریلی ہے

❁ مریم......گلبرگ، لاہور
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی کو ڈھونڈتی ہے ابھی

❁ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
ظاہر میں جو کرتا ہے بڑے پیار کی باتیں
اندر سے وہی شخص ہمارا نہیں ہوتا

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
کیا برا ہے کہ میں اس سے اقرار محبت کر لوں
لوگ ویسے بھی تو کہتے ہیں گناہ گار مجھے

❁ اطہر حسین......کراچی
پھر اس کے بعد یہ بازار دل نہ لگے گا
خرید لیجیے صاحب یہ غلام آخری ہے

❁ شوکت علی......گلبرگ، لاہور
کوئی منزل کوئی سایہ تو نظر آنے دو
پھر شوق سے تم جدا ہو جانا

❁ محمد قاسم......نور پور تھل، ضلع خوشاب
وہی بے بسی، وہی بے کلی، وہی بندشیں، وہی چاہتیں
میں ابھی تلک نہ سمجھ سکا تو نصیب ہے کہ نصاب ہے

❄ ادریس احمد خان ... ناظم آباد، کراچی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

❄ امتیاز چودھری ...... بہاولنگر

آگ کے شہر میں تنکے کی حقیقت کیا تھی
دشت پہ بادل کا سایہ تھا، محبت کیا تھی؟

❄ شیث بن آباد ...... الخبر سعودی عرب

میں ترے در کے سوا سر کو جھکاتا کیسے
شوقِ سجدہ نے بڑھا دی میرے سر کی قیمت

❄ احمر علی ...... گوجرانوالہ

کیوں نہ آواز اٹھاؤں کسی ظالم کے خلاف
کیا یہاں فکر بھی آزاد نہیں ہے میری

❄ حذیفہ بن اکرم ...... میلسی

میں آج تک سفر میں ہوں اس اعتماد پر
ابھریں گی منزلیں مرے قدموں کی دھول سے

❄ شعیل متین ...... ڈیلس، یو ایس اے

بابِ رحمت تو کھلا ہے آج بھی کس کی طرح
پُرخطا ہیں مانگنے والے دعا کیسے کریں

❄ حمران ناصر ...... صدر، کراچی

رہنما کے ہوش گم ہیں یا الٰہی خیر ہو
کارواں گمنام منزل کی طرف جائے گا

❄ راجا افتخار علی افتی ...... ہو آسن شاہ

جتنی خوشیاں ہیں وہ رکھ لو مری جانب سے وصی
مری آنکھوں میں چھپے غم مجھے واپس کر دو

❄ راشد حبیب تابش ...... ضلع اٹک

ہے شوقِ سفر اتنا کہ اک مدت سے ہم نے
منزل بھی نہیں پائی اور رستہ بھی نہیں بدلا

❄ سحر علی ...... کراچی

میری ہستی عبارت ہے دکھوں سے
خوشی کی ترجمانی میں نہیں ہوں

❄ نادر شیخ ...... ملتان

یہ کیسی دھوپ نفرت کی پڑی ہے
محبت بھاپ بن کر اڑ گئی ہے

❄ نعیمہ سہیل ...... لاہور

ٹوٹتا ہوا لہجہ ڈوبتی ہوئی سانسیں
میں نے پا نہیں دیکھا بے بسی کے چہرے میں

❄ ارم کلثوم پاس ...... کورنگی، کراچی

پہلے ہی ستم کب تھے کم وفا کی راہوں میں
اور اب کریں گے وہ دل کی آزمائش بھی

❄ طاہر وجدانی ...... فیصل آباد

تصور میں بھی تو اونچی اڑانیں بھول جائے گا
میری چاہت کو اپنے پاؤں کی زنجیر بننے دے

❄ زرش آصف ...... کراچی

سفر تھا دھوپ کا اور راستہ بھی شیشے کا
بدن تھا موم کا سو مختصر گزار آئی

❄ ندیم ابراہیم ...... دبئی

پربت پربت گونج رہی ہے میرے عشق کی شہنائی
اڑتے پنچھی دور افق سے گیت سنانے آتے ہیں

❄ احتشام اکبر ...... ملتان

حیرت ہے وہ برسوں کی ہوا باندھ رہے ہیں
ہم کو تو بھروسا نہیں آتے ہوئے دم کا

❄ احسان کامل ...... دادو

سوچ کی یہ بل کھاتی لہریں دیکھتی ہیں پاتال کے خواب
تیرنے والے جان نہ پائے عشقِ سمندر کی گہرائی

❄ محمد زریان سلطان ...... اردو بازار، کراچی

عشق و محبت نے اے یارو! کب ہم کو آباد کیا
دیکھے جتنے خواب سہانے اتنا ہی ناشاد کیا

❄ حاجی محمد اسحاق انجم ...... کنگن پور

سندر ہاتھ سنہری زلفیں کوئی تو ان کو چھوتا ہوگا
پھول سے لب کچھ کہتے ہوں گے قسمت والا سنتا ہوگا

عکسِ ماضی

رضوانہ منظر

بے شک انسان گزرا ہوا وقت بھول جاتا ہے مگر... بیتے لمحوں کا حصار کبھی انسان کو اپنی قید سے آزاد نہیں کرتا... گزر جانے کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں ڈھل کر اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ وہ بھی ماضی کے آئینوں میں اپنی صورت دیکھ کر خوفزدہ تھے اور یہ کیسا جادو تھا کہ آئینے چیخ چیخ کر ہر ایک کی داستان بیان کر رہے تھے اور ان داستانوں نے کتنی قیامتیں برپا کیں، کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

ماضی کا تعاقب کرتے چند قیامت خیز لمحات کی تباہ کاریاں

کامران شاہ کی بعض اچھی عادتیں مجھے بہت بری لگتی ہیں۔ ان میں سے ایک عادت سحر خیزی کی بھی ہے بعض اوقات وہ بانگِ مرغ سے پہلے اٹھ جاتا ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے خوابِ سحری کا جو مزہ آتا ہے وہ اور کسی نیند کا نہیں آتا لیکن اس کی کھٹ پٹ اچھی خاصی نیند کا مزہ خراب کر دیتی ہے۔

ایک صبح چائے کے برتنوں کی کھنکھناہٹ کے درمیان مجھے کچھ نسوانی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس وقت میں نہایت پُرسرور نیند کے مزے لے رہا تھا، اس لیے چند لمحوں تک میں ان آوازوں کو خواب ہی سمجھتا رہا لیکن بالآخر مجھے یقین کر لینا پڑا کہ وہ آوازیں اصلی تھیں اور نشست گاہ کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔

اتنی صبح کسی عورت کی موجودگی کا کیا مطلب تھا؟ لیکن شامی اور عورت! یہ بات میرے لیے سنسنی خیز انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہوں! گویا سب کچھ میرے سونے اور جاگنے کے درمیان ہوا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ بچو، آج پکڑے گئے، یوسف ثانی اتنا بھی غافل نہیں سوتا۔ میں جلدی سے اٹھا اور چند منٹ میں باتھ روم سے فارغ ہو کر نشست گاہ کی طرف بڑھا۔

وہاں ایک نہیں دو عورتیں تھیں۔ میں پردے کی اوٹ میں رک کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ ایک بھاری جسم کی ادھیڑ عمر عورت لگتی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ دوسری سترہ اٹھارہ سال کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی۔ دبلا جسم، سرخ بال، گہری سیاہ آنکھیں اور رنگت سرخ و سفید تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے کانوں میں گھنگھروؤں کی آواز گونجنے لگی۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے سراغ رساں ہونا ضروری نہیں تھا کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ اس طبقے کی عورتوں کے چہروں کو صبح کے وقت دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ صبح کے وقت ان کے چہروں پر ایسی ویسی چیزیں برس رہی ہوتی ہیں مگر اس لڑکی کا چہرہ پھولوں کی طرح تر و تازہ و شگفتہ تھا۔

"اب اندر بھی آجاؤ۔" میرے کانوں میں شامی کی آواز آئی۔ "کب تک پردے کے پیچھے کھڑے رہو گے۔"

میری حالت اس بچے کی سی ہوگئی جو مٹھائی چراتے ہوئے پکڑا گیا ہو، میں پردہ ہٹا کر اندر چلا آیا۔ دونوں خواتین سر گھما کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے اور بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔

ڈرائنگ روم میں پڑے ہوئے تکیے اور چادریں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ خواتین نے رات وہیں گزاری تھی۔ واضح طور پر وہ میرے سونے کے بعد وارد ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے یوسف؟" شامی نے پوچھا۔ "تم کچھ پریشان لگ رہے ہو، آج تم جلدی کیسے بیدار ہوگئے؟"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، صبح کے سات بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے جبکہ میں عموماً آٹھ بجے کے بعد اٹھتا تھا۔

"میرا ارادہ تو نہیں تھا۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ... کچھ عجیب وغریب آوازیں سن کر آنکھ کھل گئی۔"

لڑکی بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ میرے خیال میں اسے اپنی عمر کے لحاظ سے اتنی بے باکی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ عورت نے آنکھیں نیچی کرلی تھیں، اس کے چہرے پر فکرمندی پائی جاتی تھی۔

"شامی صاحب، آپ ان کا تعارف نہیں کروائیں گے؟" لڑکی نے کہا۔

"یہ یوسف ثانی ہے۔" شامی نے کہا۔ "مشہور ادیب، صحافی اور دانشور......"

"اوہ...... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" لڑکی نے کہا۔ "میں نے زندگی میں پہلی بار کسی دانشور کو اتنے قریب سے دیکھا ہے۔ مجھے لوگ کہتے ہیں، ستارہ جبیں۔"

"اس لحاظ سے تم خوش قسمت ہو۔" شامی نے کہا۔ "یہ کراچی کا واحد دانشور ہے جو قریب سے بھی اچھا لگتا ہے۔" جلدی اٹھنے کی وجہ سے میرا ناشتے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں نے ایک کپ چائے لینے کا ارادہ کیا۔

"لائیے، میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" ستارہ جبیں نے بڑے شوق سے کہا۔ "آپ کے لیے توس اور انڈا بناؤں؟"

"شکریہ، فی الحال میں صرف چائے پیوں گا۔" میں نے کہا اور آنکھیں گھما کر شامی کی طرف دیکھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے آج کی رات گھر والی کا مع ساس کے کہاں سے انتظام کرلیا لیکن تنہائی میں ایک سوال مناسب نہیں تھا، لہٰذا میں نے پوچھا۔ "شامی، وہ اپنے چھوہارے کب تقسیم ہو رہے تھے؟"

"چھوہارے اس وقت تقسیم ہوتے ہیں جب بندہ زلفِ یار کو چھوڑ کر دل مار بیٹھتا ہے۔"

"لیجیے۔" ستارہ نے چائے کا کپ میری طرف بڑھایا۔ "یہ چھوہاروں کا یہاں کیا ذکر آگیا؟"

"یوسف چھوہاروں کا ناشتا کرتا ہے۔ رات کو دودھ میں بھگو دیتا ہے اور صبح کو کھا لیتا ہے۔ پرانا صدری نسخہ ہے، چھوہارے اعضائے رئیسہ کو تقویت پہنچاتے ہیں۔"

"شامی صاحب، آپ نے ابھی تک ہمارا مسئلہ نہیں سنا۔" عورت نے کہا۔

"یوسف، یہ زہرہ بیگم ہیں، ستارہ کی آنٹی۔ یہ کسی مسئلے کے سلسلے میں کراچی آئی ہیں۔ ان کی ٹرین لیٹ ہوگئی تھی۔ جب یہ یہاں پہنچیں تو تم سو چکے تھے، میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ہم نے سنا تھا کہ کراچی میں لوگ آدھی رات تک جاگتے رہتے ہیں۔" زہرہ بیگم نے کہا۔ "اس لیے ہم ٹرین سے اتر کر سیدھے ادھر آگئے، اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ جلدی سو جاتے ہیں تو ہم ہوٹل میں رات گزار لیتے۔ یہ شامی

صاحب کی بڑی نوازش ہے کہ انہوں نے ہمیں روک لیا۔"

"جی ہاں، ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کا مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے پیشے کی پوری تفصیل بیان کردی۔ جیسے کوئی بھیڑ بکریوں کا بیوپاری اپنے کاروبار کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ ستارہ کے چہرے پر بھی کوئی تبدیلی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ نہ تو اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا اور نہ [illegible]۔

وہ نیلم پور کی رہنے والی تھی۔ یہ چھوٹی سی بستی کراچی سے دو سو میل شمال کی طرف واقع ہے۔ بقول زہرہ بیگم، وہ علاقے کے خوشحال لوگوں کو تفریح فراہم کرتی تھی۔ اس کے پاس علاقے کے تمام صاحب حیثیت لوگ آتے تھے۔ تفریح کے لیے اس نے نصف درجن خوبصورت "بچیاں" پال رکھی تھیں جو اپنے فن میں ماہر تھیں۔ اس کے ہاں راگ رنگ اور رقص و سرود کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ اداس دلوں کو سکون فراہم کیا جاتا تھا۔ کچھ رند مشرب کھلم کھلا آتے تھے اور کچھ پردہ نشین رات کی تاریکیوں کا سہارا لیتے تھے۔ ہوم سروس کا انتظام بھی تھا۔ زہرہ بیگم کا سینہ شرفائے شہر کے رازوں کا امین تھا اور یہ کام بلا روک ٹوک چل رہا تھا۔

اس کے پردہ نشین گاہکوں میں مقامی ٹاؤن کمیٹی کا چیئرمین بھی تھا۔ اس کا نام فضل حسین بھٹی تھا۔ وہ خاصا با اثر شخص تھا اور پورے علاقے میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی عمر پچپن چھپن سال کے لگ بھگ تھی اور وہ زہرہ بیگم کے مستقل گاہکوں میں سے تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں زہرہ بیگم کی حویلی میں جاتا اور تاریکی میں ہی واپس لوٹ آتا تھا۔

زہرہ بیگم جس حویلی میں رہتی تھی وہ اس کے بوڑھے اور جاگیردار شوہر نے اسے بنوا کر دی تھی۔ وہ کوٹھے سے آئی تھی اور باعزت زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے شادی کے دو سال بعد ہی اس کے بوڑھے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ شوہر کے رشتے داروں نے اس سے حویلی کے سوا سب کچھ چھین لیا۔ حویلی محض اس لیے بچ گئی کہ وہ شہر کے با اثر لوگوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ پھر انہی با اثر لوگوں کے دباؤ کی وجہ سے وہ حویلی کو مرکزِ عشرت بنانے پر مجبور ہوگئی۔ جب اس کی عمر ڈھلنے لگی تو اسے نوجوان سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ تجربہ کار تھی اور اوپر والوں کی حمایت بھی اسے حاصل تھی اس لیے اسے سہارا حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اب اس کے پاس نصف درجن حسینائیں تھیں جو علاقے کے خوش حال لوگوں کی خوش حالی میں مزید اضافہ کرتی تھیں۔

فضل حسین بھٹی کچھ مختلف قسم کا آدمی تھا۔ وہ پردے میں رہ کر تماشا دیکھتا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار حویلی آتا اور ایک آدھ گھنٹے کی تفریح کے بعد واپس چلا جاتا تھا۔ چند روز پہلے عجیب واقعہ پیش آیا۔

فضل حسین بھٹی حسب معمول رات کے دس بجے عقبی دروازے سے حویلی میں داخل ہوا اور اپنے مخصوص کمرے میں پہنچ گیا۔ زہرہ بیگم نے معمول کے مطابق اشیائے خورد و نوش سے اس کی تواضع کی پھر اس کے لیے علیحدہ راگ رنگ کی محفل کا انتظام کرنے کے لیے اندر چلی گئی لیکن جب وہ واپس آئی تو اس نے بھٹی کو کچھ پریشان سا پایا۔

"بھٹی صاحب، کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔ "طبیعت خراب ہے۔ تو کوئی گولی لا دوں؟"

بھٹی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر اسی وقت واپس چلا گیا۔

بعد میں زہرہ بیگم کو پتا چلا بھٹی ایک نووارد کو دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ شاید بھٹی نے اسے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مذکورہ شخص نوجوان تھا اور زہرہ بیگم کے نئے گاہکوں میں سے تھا۔ زہرہ بیگم کو اس کی شکل کچھ مانوس سی معلوم ہوئی۔ فضل حسین یقیناً اس نوجوان کو دیکھ کر پریشان ہوا تھا۔ زہرہ بیگم کو یاد آیا کہ نوجوان نے اپنا نام فرید بھٹی بتایا تھا۔ فرید حسین بھٹی! اس کے ساتھ ہی ساری بات اس کے ذہن میں واضح ہوگئی۔ فرید، فضل حسین کا بیٹا تھا، اس کی شکل بھی اپنے باپ سے بہت ملتی جلتی تھی۔

اس عشرت کدے میں تفریح کرنے والے شخص نے جب اپنے نورِ نظر کو وہاں دیکھا تو شرم سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور سر چکرانے لگا۔ اگلے روز علاقے کے تھانیدار نے زہرہ بیگم کی حویلی پر دستک دی۔ اس کا نام اسلم خان تھا اور وہ زہرہ بیگم کے کرم فرماؤں میں سے تھا لیکن آج وہ خلافِ معمول وردی میں تھا۔ زہرہ بیگم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور رسمی کلمات کے بعد چائے پانی کا پوچھا۔

"زہرہ بیگم، میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ اڈا فوراً بند ہوجانا چاہیے۔" اسلم خان نے کہا۔

"کیا بات ہے، خان صاحب؟" زہرہ بیگم نے پوچھا۔ "آج آپ کچھ ناراض نظر آرہے ہیں، کیا ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟"

اسلم خان کچھ دیر چپ بیٹھا رہا، پھر بولا۔ "زہرہ بیگم،

بات یہ ہے کہ بستی کے ایک با اثر اور معزز شخص کو تمہارے اڈے کا پتا چل گیا ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ یہ اڈا ہر صورت میں بند ہونا چاہیے ورنہ وہ یہ بات حکام بالا تک لے جائے گا۔ تم جانتی ہو کہ ایسی صورت میں میری بدنامی ہوگی۔"

"خان صاحب، کیا میں اس معزز شخص کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"نہیں، میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔" تھانیدار نے کہا۔ "اور بتا بھی دیا تو تمہیں کچھ فائدہ بھی نہیں ہوگا۔"

زہرہ بیگم نے تلخی سے کہا۔ "میں اس معزز شخص کا نام بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم فضل حسین بھٹی کی بات کر رہے ہونا؟"

تھانیدار اسلم خان نے حیرانی سے پوچھا۔ "تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"تھانیدار صاحب، جس طرح آپ بستی کے بدمعاشوں کا حال جانتے ہیں اسی طرح میں بستی کے شرفا کو اچھی طرح جانتی ہوں، جس طرح آپ میرے مہربان ہیں اسی طرح کل تک بھٹی صاحب بھی میرے مہربان تھے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو، زہرہ بیگم؟" تھانیدار نے کہا۔ "بھٹی صاحب تو بڑے شریف آدمی ہیں۔"

"خان صاحب، بس پردہ ہی رہنے دیں۔ بھٹی صاحب آپ سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔"

"کیا بھٹی صاحب بھی ... ادھر آتے جاتے ہیں؟"

"ہاں، آتے جاتے تھے۔" زہرہ بیگم نے جواب دیا "لیکن اب شاید نہ آئیں، کل انہوں نے جوان بیٹے کو اپنے نقش قدم پر چلتے دیکھ لیا تھا۔ یہ بات انہیں اچھی نہیں لگی، لہٰذا انہوں نے آپ کو بھیج دیا۔"

تھانیدار کچھ دیر تک سر ہلاتا رہا، پھر بولا۔ "زہرہ بیگم، اس کے باوجود تمہیں یہ اڈا ختم کرنا پڑے گا۔ تم ایسا کرو، یہ حویلی بیچ دو اور کسی دوسرے علاقے میں ٹھکانا بنالو یا خاموشی سے کوئی اور مکان خرید لو۔"

زہرہ بیگم نے جواب دیا کہ وہ اس کے مشورے پر غور کرے گی۔

اسی روز وہ فضل حسین بھٹی سے اس کے دفتر میں ملی اور انجان بنتے ہوئے کہا کہ تھانیدار نے اسے اڈا ختم کرنے کی دھمکی دی ہے اور یہ کہ وہ مدد کے لیے اس کے پاس آئی ہے۔

"میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" فضل حسین نے خشک لہجے میں کہا۔ "تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہ علاقہ چھوڑ دو۔ تمہاری وجہ سے بستی کے نوجوان تباہ ہو رہے ہیں۔"

"بھٹی صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" زہرہ بیگم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس کام سے بزرگ تباہ نہیں ہوئے اس سے نوجوان کیسے تباہ ہو سکتے ہیں؟ ہم کسی کو اپنے ہاں آنے پر مجبور تو نہیں کرتے۔"

"زہرہ بیگم، اس معاملے میں سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم عزت سے بوریا بستر لپیٹ لو۔"

زہرہ بیگم نے منت کرتے ہوئے کہا۔ "بھٹی صاحب، ہم سے اگر کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ہم اس کی معافی چاہتے ہیں۔ آیندہ ہم کسی ایسے شخص کو حویلی میں قدم نہیں رکھنے دیں گے جو آپ کو پسند نہیں ہوگا۔"

اس نے یہ بتانے سے احتراز کیا کہ وہ اس کے بیٹے کو پہچان گئی تھی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" فضل حسین نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اور میرا وقت ضائع نہیں کرو، میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ بڑی عمر کے لوگوں کی بات اور ہے۔ جو شخص اپنی منزل پر پہنچ چکا ہو، اس کے بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا لیکن اگر نوجوان نسل بھٹک جائے تو قوم کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ تم جلد از جلد اپنے ٹولے سمیت اس بستی سے کوچ کر جاؤ۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"بھٹی صاحب، ایک بات اچھی طرح سوچ لیں، ہم جو کچھ بھی ہیں آپ سب جانتے ہیں۔ ہمارا ظاہر و باطن ایک ہے۔ ہمیں اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں لیکن آپ کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اگر مجھے یہاں سے جانا پڑا تو میں لوگوں کو آپ کا اصل چہرہ ضرور دکھاؤں گی اور پھر ہو سکتا ہے کہ باپ بیٹا ایک دوسرے سے منہ چھپاتے پھریں۔ اس لیے اپنے فیصلے پر ایک بار پھر غور کر لیں۔"

اس بات نے فضل حسین کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک طویل توقف کے بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ بولا۔ "ابھی تم جاؤ، میں کل کسی وقت تمہاری حویلی پر آؤں گا۔"

زہرہ بیگم پرامید وہاں سے اٹھ کر چلی آئی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا واسطہ ایک بہت ہی کمینے شخص سے پڑا تھا۔ اسی رات پولیس نے اس کی حویلی پر چھاپا مارا اور تین غیر معروف گاہکوں سمیت حویلی کے تمام افراد کو گرفتار کر لیا۔ زہرہ بیگم حیران تھی کہ اس رات اس حویلی میں کوئی معزز آدمی کیوں نہیں آیا تھا؟ چھاپا پڑنے کے بعد وہ سمجھ گئی کہ پولیس نے معززین کو پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ پولیس نے ایف آئی آر کاٹے بغیر انہیں دو روز حوالات میں رکھا۔ پھر مبینہ طور پر

بعض لوگوں کی مداخلت پر معاملہ پنچایت کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ زہرہ بیگم نے بھی پنچایت کا فیصلہ تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ عدالت میں نہ صرف پیسا اور وقت ضائع ہوگا بلکہ معاملے کی بہت زیادہ تشہیر بھی ہوگی لیکن جب وہ پنچایت میں پیش ہوئی تو اسے پتا چلا کہ فضل حسین بھٹی پنچایت کا سربراہ تھا۔ پنچوں میں اس کے دو مستقل گاہک بھی شامل تھے۔ ایک چودھری فیض محمد تھا جو خاصا بڑا جاگیردار تھا۔ دوسرا ایک ٹرانسپورٹر تھا۔ اس کی کئی بسیں چلتی تھیں۔ اس کا نام غلام نبی پراچہ تھا۔ تیسرا ایک رشوت خور سرکاری افسر تھا جو کبھی کبھی زہرہ بیگم کی حویلی میں آتا تھا۔ باقی دو میں ایک اسکول ٹیچر اور ایک پیش امام تھا۔ زہرہ بیگم کا خیال تھا کہ چودھری فیض محمد، غلام نبی پراچہ اور سرکاری افسر اس کے حق میں ووٹ دیں گے، مگر انہوں نے اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔

پنچایت نے تیسرے روز میں فیصلہ سنا دیا۔ انہوں نے زہرہ بیگم کو پندرہ دن کے اندر بستی خالی کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ اگر اس نے پندرہ دن کے اندر بستی خالی نہ کی تو اس کا سامان نیلام کر دیا جائے گا۔

"آج اس فیصلے کا پانچواں دن ہے۔" زہرہ بیگم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "دس دن باقی ہیں۔ میں مدد کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کوئی ایسی ترکیب کریں کہ مجھے اس بستی سے نکلنا نہ پڑے۔"

"اور دھندا جوں کا توں چلتا رہے؟" شامی نے کہا۔

"دھندا نہیں کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے؟" زہرہ بیگم نے کہا۔ "یہ جو لوگ ہمیں نکالنے پر تلے ہوئے ہیں، انہی لوگوں کی وجہ سے میں یہ کاروبار کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔"

"انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔" شامی بے پروائی سے بولا۔ "کبھی آپ نے یہ نہیں سنا ہوگا کہ کوئی آدمی معاشرے کے ظلم و ستم سے تنگ آکر متقی یا پرہیزگار بن گیا ہو، حالانکہ یہ راستہ زیادہ نفع بخش ہے۔ سوری زہرہ بیگم، میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ شہد بھی لیں نا، جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔"

"شامی صاحب، یہ جنت کی نعمتیں تو دنیا میں عام مل جاتی ہیں۔" زہرہ بیگم نے کہا۔ "آپ مجھے اس جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ بتائیں۔ میں آپ کو اس کی فیس بھی دوں گی۔"

"آپ کا ذہن اس معاملے میں واضح نہیں ہے۔ آپ پہلے یہ فیصلہ کریں کہ آپ جہنم سے نکلنا چاہتی ہیں یا جہنم

میں رہنا چاہتی ہیں؟'' شامی نے بابا اور ستارہ کی طرف سیب بڑھایا۔ ''یہ بھی جنت کا میوہ ہے۔''

ستارہ جبیں شوخ نظروں سے شامی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں پھل سپلائی کرنے کا ٹھیکا آپ ہی کے پاس ہے۔ ہم آپ کے کسی ٹوکرے میں چھپ کر جنت میں پہنچ جائیں گے۔''

''ہم جہنم سے نکلنا چاہتے ہیں۔'' زہرہ بیگم نے کہا۔

''آپ کی حویلی میں کتنے کمرے ہیں؟'' شامی نے پوچھا۔

''تقریباً سات کمرے ہیں۔'' زہرہ بیگم سوچتے ہوئے بولی۔ ''نن...... نہیں، نو ہیں، دو اوپر بھی ہیں۔''

''ونڈرفل...... آپ چار کمرے رہائش کے لیے استعمال کریں اور پانچ کمروں میں انڈسٹریل ہوم کھول لیں۔ ان بچیوں کو بھی ساتھ لگائیں۔ انہیں اداؤں سے نہیں بلکہ ہنر سے پیسا کمانا سکھائیں۔''

''آپ مذاق کررہے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا؟''

''پیسوں کا انتظام بھی ہوجائے گا۔ آپ کی حویلی میں کُل کتنے آئینے ہوں گے؟ خصوصاً خواب گاہوں میں۔''

زہرہ بیگم نے الجھی ہوئی نظروں سے شامی کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ''بڑے سائز کے بارہ تیرہ آئینے ہوں گے۔''

''ان آئینوں کی مجموعی قیمت کتنی ہوگی؟'' شامی نے پوچھا۔

''وہ بہت قیمتی ہیں لیکن ان آئینوں کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق ہے؟''

شامی اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''گویا بارہ تیرہ آئینوں کی قیمت بہت زیادہ مل سکتی ہے۔ اگر آپ کو ان آئینوں کے پچاس ہزار روپے مل جائیں تو کیا آپ کا کام چل جائے گا؟''

''پچاس ہزار روپے سے کام تو یقیناً چل جائے گا، لیکن اتنی رقم دے گا کون؟ آئینوں کے فریم سونے چاندی کے نہیں ہیں۔''

''پیسے وہی لوگ دیں گے جنہوں نے آپ کو دھندا کرنے پر مجبور کیا تھا اور آئینوں کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوگی اس میں سے پچاس ہزار آپ کے ہوں گے اور اوپر کے پیسے ہمارے، یہی ہماری فیس ہوگی۔''

ستارہ جبیں نے شامی سے نظریں بچا کر کنپٹی کے قریب انگلی گھمائی، پھر بولی۔ ''ہم آئینوں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیں؟ آپ ہمارے پارٹنر بن جائیں۔''

''آپ لوگ جتنے آئینے توڑ چکے ہیں اتنے ہی کافی تھے، میں آپ کو مزید آئینے توڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''سچ پوچھیں تو آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' زہرہ بیگم نے کہا۔ ''بہرحال، آپ کی شرط ہمیں منظور ہے، اب آپ یہ بتائیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟''

''آپ واپس جائیں اور انڈسٹریل ہوم کھولنے کی تیاری کریں۔ سولھویں دن جب پنچایت آپ کا سامان نیلام کرنے آئے تو آپ حویلی کے تمام دروازے کھول دیں اور ان کے کام میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ کریں۔ ہاں، نیلامی کرنے والے کو چند شرطیں ضرور بتادیں۔ سب سے بڑی شرط یہ رہیں کہ نیلامی بند ہونے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر فروخت شدہ سامان کی قیمت واجب الادا ہوگی۔ اگر ایک گھنٹے کے اندر قیمت ادا نہ کی گئی تو سودا منسوخ سمجھا جائے گا۔ آخری آئینہ میں خریدوں گا لیکن آپ کو اس کی قیمت ادا نہیں کروں گا اور آخری بات یہ ہے کہ میں ذرا مختلف حلیے میں وہاں آؤں گا۔ ممکن ہے کہ آپ مجھے پہچاننے میں ذرا سی دقت محسوس کریں لیکن آپ میرے اور یوسف کے ساتھ نہ دوستانہ بات کریں گی اور نہ ہی کسی شناسائی کا مظاہرہ کریں گی۔''

''میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا۔ اگر ہم نے سامان نیلام کروانا ہوتا تو آپ کے پاس کیوں آتے۔''

''فی الحال اس بات کی تفصیل آپ کے لیے سودمند نہ ہوگی۔ آپ وہی کریں جو میں نے کہا ہے اور آج ہی واپس چلی جائیں۔ ہم پرسوں آپ کی بستی پہنچیں گے اور کام شروع کردیں گے۔''

ستارہ نے خوش دلی سے کہا۔ ''اگر آپ چاہیں تو ہم ایک رات اور یہاں گزار سکتے ہیں۔''

''آج رات تمہیں کل سے زیادہ بوریت ہوگی یہاں محفل سرود...... کا کوئی شوقین نہیں ہے۔'' ستارہ آنکھیں جھپکا کر رہ گئی۔

☆☆☆

نیلم پور ایک خوبصورت اور پر بہار قصبہ تھا۔ وہاں ایک فور اسٹار ہوٹل تھا جس میں زیادہ تر کاروباری لوگ یا ٹورسٹ ٹھہرتے تھے۔ جب ہم نے ہوٹل کی لابی میں قدم رکھا تو ہوٹل کا مالک کم منیجر بنفس نفیس ہمارے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ وہ ساٹھ باسٹھ سال کا ایک خوش شکل اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس کی خوش اخلاقی ظاہر کرتی تھی کہ اس کا کاروبار زیادہ اچھا نہیں تھا۔

کامران شامی اس وقت خاصے عجیب گیٹ اپ میں تھا۔ بہترین تراش کا براؤن سوٹ، سر پر فلیٹ ہیٹ، ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی، آنکھوں پر کمانی دار سنہرا چشمہ، چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی اور منہ میں پائپ۔ اس نے کاؤنٹر سے چار قدم دور رکتے ہوئے پائپ کا کش لیا اور چھت کا جائزہ لینے لگا۔

ہمارے ساتھ دو نوجوان اور بھی تھے۔ ایک نے شامی کا بریف کیس اور دوسرے نے دو سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے۔ ان کے چہروں پر پائی جانے والی مستعدی ہماری ہیبت میں اضافہ کررہی تھی۔ درحقیقت وہ دونوں ویڈیو فوٹو گرافر تھے جنہیں شامی خاص مقصد کے لیے ساتھ لایا تھا۔ ہوٹل کا مالک شامی کو غیرملکی سیاح ہی سمجھا تھا۔

''گڈ مارننگ سر۔'' اس نے شامی سے کہا۔

''گڈ مارننگ۔'' شامی نے پائپ منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم ڈاکٹر کیمرون شوناتی فرام سنگاپور۔ بٹ ڈونٹ کال یور سیلف ود انگلش، آئی کین ناٹ اسپیک پرفیکٹ...''

''اوہ...... اٹس اے پلیزنٹ سرپرائز۔'' اختر علی یعنی مالک نے کہا۔ ''فرمائیے، آپ کو کتنے کمرے درکار ہوں گے...؟''

''چار ڈبل بیڈ رومز۔'' شامی نے جواب دیا۔ ''ہمارے چار آدمی شام کو پہنچیں گے۔ ہم آپ کے ہوٹل میں ایک میجک شو کرنا چاہتے ہیں۔''

''ضرور، ضرور۔ ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ اس قصبے میں ایسے شو بہت کم ہوتے ہیں۔''

اسی لمحے ایک نوجوان جوڑا ہوٹل میں داخل ہوا۔ ان کی عمریں پچیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ لباس اور رکھ رکھاؤ سے وہ خوش حال خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے مختصر سا سامان اٹھا رکھا تھا۔ دونوں شامی کو دیکھ کر رک گئے اور دھیمی آواز میں ایک دوسرے کو کچھ بتانے لگے۔

پھر دونوں آگے بڑھے اور نوجوان نے شامی سے کہا۔ ''ایکسکیوزمی سر، کیا آپ ڈاکٹر کیمرون شومنائی ہیں؟ میں نے ایک انگلش رسالے میں آپ کے بارے میں فیچر پڑھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ آپ آئینے میں......''

''کانٹ یو سی جنٹلمین۔'' شامی نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اس شریف آدمی سے مصروف گفتگو ہوں۔''

نوجوان کھسیانا سا ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شامی کا آدمی تھا لیکن شامی نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

اگلے روز پوری بستی میں میجک شو کے اشتہارات چسپاں کردیے گئے۔ اشتہار کے جلی عنوانات میں سے ایک عنوان ''ڈاکٹر کیمرون شومنائی'' کے بارے میں بھی تھا، لکھا تھا۔

''عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر کیمرون شومنائی کی حیرت انگیز ایجاد

آئینے کے عکسوں کی بازگشت دیکھیے۔''

میرا خیال ہے کہ بستی کا کوئی شخص بھی ''عکسوں کی بازگشت'' کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ شامی نے جن شعبدہ بازوں کا انتظام کیا تھا ان میں دو غیرملکی لڑکیاں بھی تھیں۔ اشتہار میں ان کی تصویریں نمایاں طور پر دی گئی تھیں اور شو کے زیادہ ٹکٹ انہی لڑکیوں کی وجہ سے فروخت ہوئے تھے۔ شعبدہ باز اپنے اپنے فن میں ماہر تھے۔ انہوں نے عمدہ کام پیش کیا اور تماشائی ان کے کام سے محظوظ ہوئے۔ شو تین راتوں کا تھا۔ پہلی دو راتوں کے اشتہار میں یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ ڈاکٹر کیمرون شومنائی تیسری رات اپنا فن پیش کریں گے۔ بعض لوگوں نے اسے پبلسٹی اسٹنٹ سمجھا تاکہ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ فروخت کیے جاسکیں اور ہوا بھی یہی۔ تیسری رات جب شو شروع ہوا تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حسب معمول شروع میں شعبدہ بازوں نے مختلف کھیل پیش کیے۔

پھر اسٹیج سیکریٹری مائیک ہاتھ میں پکڑے سامنے آیا اور حاضرین کو مخاطب کرکے بولا۔ ''خواتین و حضرات، اب آپ کے سامنے عالمی شہرت کے حامل ڈاکٹر پروفیسر کیمرون شومنائی اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ ڈاکٹر شومنائی جو چیز آپ کے سامنے پیش کریں گے وہ اس صدی کی سب سے محیرالعقول ایجاد ہے۔ نیویارک ٹائمز لکھتا ہے کہ اگر ڈاکٹر شومنائی کی ایجاد عام ہوگئی تو لوگ اپنے غسل خانوں میں آئینے رکھنے بند کردیں گے۔ خواتین و حضرات، اگر آج سے ایک ہزار سال پہلے کسی شخص کو یہ کہا جاتا کہ وہ اپنے گھر کے اندر رکھے ہوئے ایک ڈبے کے ذریعے پندرہ ہزار میل دور ہونے والے کھیلوں کا مشاہدہ کرسکتا ہے تو وہ کہنے والے کو پاگل قرار دے دیتا لیکن آج ٹی وی کے ذریعے یہ بات ممکن ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر شومنائی کا کہنا ہے کہ آئینہ ان تمام چیزوں کے عکسوں کو ریکارڈ کرلیتا ہے جو اس کے سامنے آتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر شومنائی ان ریکارڈ شدہ عکسوں کو اس طرح...

ری پلے کیا جا سکتا ہے جس طرح وی سی آر کے ذریعے ریکارڈ شدہ فلم دیکھی جا سکتی ہے۔ خواتین و حضرات! اس مختصر تعارف کے بعد میں عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر، سائنسدان اور پروفیسر جناب کیمرون شوستائی کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر تشریف لا کر آپ کے سامنے اپنی بے مثال ایجاد کا مظاہرہ کریں۔"

شامی تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر نمودار ہوا اور وسط میں رک کر تالیاں تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے جو ڈبل بریسٹ لمبا کوٹ پہن رکھا تھا وہ پندرھویں صدی کے کسی برطانوی لارڈ کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے فلیٹ ہیٹ کو اتار کر اونچی کیا اور سر کو خم کر کے لوگوں کی تالیوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اسٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے ایک معزز شخص سے کہا۔ "کیا میں آپ کی خواب گاہ کے ڈریسر کا آئینہ یہاں منگوا لوں؟"

معزز شخص نے دائیں بائیں دیکھا اور گھبرا کر بولا۔ "میرا گھر بہت دور ہے۔"

شامی ایک اور شخص کی طرف متوجہ ہوا، بولا۔ "کیوں جناب، آپ کے باتھ روم میں کس سائز کا آئینہ لگا ہوا ہے؟"

وہ شخص ذرا کھسیانا ہو گیا، بولا۔ "سوری، وہ پرانا آئینہ ہے۔"

"پرانا ہی بہتر رہے گا۔" شامی نے کہا۔ "پرانے میں زیادہ مناظر ریکارڈ ہو چکے ہوں گے۔"

مذکورہ شخص نے بھی معذرت کر لی۔ شامی نے چند اور لوگوں سے پوچھا مگر کوئی شخص آئینہ مہیا کرنے پر تیار نہیں ہوا۔

"مجھے معلوم تھا کہ یہی جواب ملے گا۔" شامی نے کہا۔ "اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ لوگ آئینے کے سامنے کیسی کیسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ کو محتاط ہو جانا چاہیے، نوجوان تم ادھر آؤ۔"

اس کا اشارہ دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک نوجوان کی طرف تھا۔ نوجوان اسٹیج پر پہنچ گیا۔ شامی نے اپنے بریف کیس سے ایک سفید کاغذ نکالا اور اس کی دس یکساں پرچیاں بنا لیں۔ پھر نوجوان سے کہا کہ وہ ان پرچیوں پر ایک سے دس تک نمبر لکھ دے۔ نوجوان نمبر لکھتا گیا اور شامی انہیں تہ کرتا چلا گیا۔ تمام پرچیاں تہ کرنے کے بعد وہ پیچھے مڑا اور بڑی تیزی سے داہنی طرف میز پر رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹوکری میں کھول دیا۔ اس کا بایاں ہاتھ غیر محسوس طریقے پر جیب میں چلا گیا۔ جب باہر نکلا تو اس میں ایک سفید رومال نظر آیا، جس سے اس نے اپنی پیشانی صاف کی۔ دیکھنے والے یہی سمجھے تھے کہ اس نے جیب سے رومال نکالا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ نوجوان کی لکھی ہوئی پرچیاں اس کی جیب میں چلی گئی تھیں۔ ٹوکری میں پہلے سے دس پرچیاں موجود تھیں، جن پر ایک ہی نمبر یعنی سات لکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک بچے کو اسٹیج پر بلایا اور اسے ٹوکری میں سے ایک پرچی نکالنے کے لیے کہا۔ بچے نے ایک پرچی نکال کر شامی کو دے دی۔

"خواتین و حضرات۔" شامی نے پرچی والا ہاتھ بلند کیا۔ "ہوٹل میں مقیم مہمان ہوشیار باش! اس پرچی پر جو بھی نمبر لکھا ہوا ہے، میں اس نمبر کے کمرے کا آئینہ یہاں منگوا لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ہوٹل کی انتظامیہ مجھے ایسا کرنے کی اجازت دے دے گی۔" اس نے پرچی کھولی اور بچے سے کہا۔ "بیٹے، ذرا دیکھنا تو اس پر کیا نمبر لکھا ہے؟"

بچے نے پرچی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "سات نمبر۔"

"سات نمبر۔" شامی نے اسٹیج کے پیچھے کھڑے ہوئے نوجوان سے کہا۔ "کمرا نمبر سات کے باتھ روم کا آئینہ نکال لاؤ۔ منیجر سے پوچھ لینا اور اگر اس کمرے میں مہمان ٹھہرے ہوئے ہوں تو ان سے بھی اجازت لے لینا اور دیکھنا کہیں آئینہ ٹوٹ نہ جائے۔"

نوجوان کے جانے کے بعد شامی اپنا ایک واقعہ سنانے لگا جو اسے "البانیہ" میں پیش آیا تھا۔

دس منٹ بعد نوجوان آئینہ لیے ہوئے اسٹیج پر پہنچ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور آئینے کی دونوں سمتیں حاضرین کو دکھائیں۔ اس کا سائز تقریباً پندرہ ضرب پندرہ انچ تھا۔ دوسرا نوجوان ایک میز اٹھا لایا اور دونوں مل کر آئینے کو میز پر سیٹ کرنے لگے۔ انہوں نے لکڑی کا باکس، جس کا سائز آئینے سے ایک انچ کم نظر آتا تھا، آئینے کے پیچھے بظاہر سہارا دینے کے لیے رکھ دیا پھر آئینے کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔

اس اثنا میں ہوٹل کا منیجر اسٹیج پر نمودار ہوا اور سیدھا شامی کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے وہ نوجوان جوڑا بھی تھا جو پہلے روز ہمیں ہوٹل کی لابی میں نظر آیا تھا۔ ان کے چہروں پر فکرمندی پائی جاتی تھی۔ منیجر تیز لہجے میں شامی سے باتیں کرنے لگا۔ شامی چند لمحوں تک اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ پھر مائیک میں بولا۔ "منیجر صاحب کہتے ہیں کہ آئینے میں بلیو فلم کاری پلے نہ دکھائیں، آپ حضرات کیا کہتے ہیں؟"

ہال میں پرشور آوازیں بلند ہوئیں۔ "دکھائیں.. دکھائیں، ضرور دکھائیں۔" شور مچانے والے سب نوجوان تھے۔

جب شور تھما تو شامی نے کہا۔ "جو لوگ بلیو فلم دیکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے گھر کے باتھ روم سے آئینے نکال

لائیں۔'' نوجوان کھسیانے ہوگئے، بڑی عمر کے لوگوں نے قہقہے لگائے۔

''شکریہ.... شکریہ۔'' شامی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''نوجوانوں کی خاموشی ثابت کرتی ہے کہ انہیں بزرگوں کی عزت کا بہت خیال ہے۔'' اب جو قہقہہ لگا اس میں نوجوانوں کی آواز نمایاں تھی۔

''خواتین و حضرات، کسی کی عزت اچھالنا میرا مقصد نہیں ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''میں آپ کو فقط اپنی ایک ایجاد سے متعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی نامناسب منظر سامنے آیا تو اسے فاسٹ فارورڈ کر دیا جائے گا۔''

منیجر اور نوجوان جوڑا اس کی یقین دہانی پر واپس چلا گیا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور اندر سے ٹرانسفارمر سے ملتی جلتی ایک چھوٹی سی مشین نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر ایک شفاف پردہ نکال کر آئینے کے اوپر ڈال دیا۔ اس پردے کے اوپر والے کناروں پر دو تار لگے ہوئے تھے۔ ان تاروں کے دوسرے سرے اس نے ٹرانسفارمر سے منسلک کر دیے۔ پھر اس کے اشارے پر اسٹیج اور اس کے آس پاس کی لائٹیں بجھا دی گئیں۔

شامی ٹرانسفارمر کے بٹن اوپر نیچے کرتے ہوئے بولا۔ ''اس مشین پر سالوں، دنوں اور گھنٹوں کی ایڈجسٹمنٹ کی جاسکتی ہے، ہم آپ کو چودہ سو ساٹھ دان اور گھنٹے پیچھے لیے چلتے ہیں یعنی تقریباً چار سال پہلے۔''

آئینے پر لہریں سی نمودار ہوئیں، جو آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ پھر وہ ٹی وی اسکرین کی طرح روشن ہوگیا اور اس میں ایک سفید دیوار اور دروازے کا کچھ حصہ نظر آنے لگا، ہال میں اب مکمل سناٹا طاری تھا، لوگ پوری محویت کے ساتھ اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، چار پانچ منٹ تک کچھ نہیں ہوا۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر غیر ملکی خاتون اسکرین پر نمودار ہوئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں بوجھل سی لگ رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو پیچھے کیا اور گردن لمبی کر کے آگے کی طرف دیکھنے لگی۔

''خواتین و حضرات۔'' شامی کی آواز گونجی۔ ''یہ خاتون آپ کو نہیں آئینے کو دیکھ رہی ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں یہ صبح کا وقت ہے۔''

عورت نے اچانک اپنے ڈریس کے بٹن کھولنے شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی شامی اسکرین کے سامنے آگیا اور اس کے اوپر پردہ ڈال دیا۔ نوجوان شور مچانے لگے۔ شامی نے کچھ بٹن آگے پیچھے کیے اور پردہ ہٹا دیا۔ اب اسکرین پر سفید دیوار اور دروازے کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ شامی ٹرانسفارمر کو ایک ایک سال پیچھے کرتا چلا گیا اور اسکرین پر مختلف چہرے نظر آتے رہے۔ کچھ دھندلے، کچھ نمایاں، کچھ خوبصورت اور کچھ بدصورت۔

''خواتین و حضرات، کچھ مدت کے بعد فلمیں بنانے کے لیے کیمروں کے بجائے آئینے استعمال ہوا کریں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ گھروں، دفتروں، فیکٹریوں، بینکوں اور شاہراہوں کی نگرانی کے لیے بھی آئینوں سے کام لیا جائے گا اور اب ہم آپ کو صرف پانچ روز پہلے کا منظر دکھاتے ہیں۔''

اسکرین پر پہلے وہ نوجوان دکھائی دیا جو کمرا نمبر سات میں مقیم تھا۔ وہ مختلف انداز میں منہ بنانے لگا۔ اس نے بنیان اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ شیو بنانے لگا۔ شیو بنانے کے دوران میں اس کے ہونٹ بھی ہل رہے تھے۔ غالباً وہ گنگنا رہا تھا۔ شامی نے حاضرین کو بتایا کہ ابھی وہ آواز کیچ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ نوجوان شیو کر کے واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی اسکرین پر نمودار ہوئی اور میک اپ کرنے لگی۔

آخری منظر نے حاضرین کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا کیونکہ وہ تھوڑی دیر پہلے نوجوان جوڑے کو اسٹیج پر دیکھ چکے تھے۔ پروگرام ختم ہوتے ہی لوگوں نے ڈاکٹر کیمرون شومنائی کو گھیر لیا اور اس سے مختلف سوالات کرنے لگے۔ ان لوگوں میں فضل حسین بھٹی، چودھری فیض محمد، غلام نبی پراچہ اور دیگر معززین بھی شامل تھے۔ کئی لوگوں نے شامی کی دعوت کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کسی کی دعوت قبول نہیں کی۔

☆☆☆

دو روز بعد ہم زہرہ بیگم کی حویلی میں موجود تھے جہاں پنچایت کے زیرِ انتظام حویلی کے سامان کی نیلامی کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ وہاں بستی کے تمام بڑے اور قابلِ ذکر لوگ موجود تھے۔ زہرہ بیگم اپنی لڑکیوں کے ہمراہ برآمدے میں موجود تھی۔ شامی، جو ڈاکٹر کیمرون شومنائی کے گیٹ اپ میں تھا فوراً لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس سے سب سے پہلا سوال یہی کیا گیا کہ کیا وہ کچھ خریدنے کے لیے وہاں آیا تھا یا تفریح کرنے؟

''میں اس علاقے کی زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' شامی نے جواب دیا اور پائپ سلگانے لگا۔ اس نے کبھی تمباکو نوشی نہیں کی لیکن اس کے پائپ سلگانے اور پینے کے انداز سے اس بات کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔

ابھی تک کسی کو ہماری وہاں موجودگی کی حقیقت کا علم نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب شامی برآمدے میں رکھے ہوئے آئینوں کا معائنہ کرنے لگا تو بیشتر لوگوں کے چہرے یوں اتر گئے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز مر گیا ہو۔ کچھ لوگ ادھر ادھر ہو کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ چودھری فیض محمد جلدی سے زہرہ بیگم کے قریب گیا اور اس سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ میں بظاہر بے خیالی میں ٹہلتے ہوئے ان کے قریب جا ٹھہرا اور دوسری طرف منہ کر کے فرنیچر کا معائنہ کرنے لگا۔ چودھری فیض محمد زہرہ بیگم کو آئینے نیلام کرنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن زہرہ بیگم مسلسل انکار کر رہی تھی۔

''میں تمہیں منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔'' چودھری فیض محمد کہہ رہا تھا۔ ''تم بولو تو سہی کہ تمہیں کتنی رقم چاہیے۔ دراصل.... بات یہ ہے کہ مجھے یہ آئینے پسند آگئے ہیں، قیمت بتاؤ۔''

''چودھری، میں اپنی خوشی سے یہ سب کچھ نیلام نہیں کر رہی۔'' زہرہ بیگم نے تلخی سے کہا۔ ''مجھے اس کام کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ تم بھی تو پنچوں میں شامل تھے، آئینے ہر صورت میں نیلام ہوں گے۔''

چودھری فیض محمد، تھانیدار کے پاس گیا اور دونوں کچھ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر دونوں فضل حسین بھٹی کے پاس گئے اور اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد بھٹی زہرہ بیگم کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ انہوں نے نیلام کا پروگرام وقتی طور پر منسوخ کر دیا ہے۔

''یہ میرا سامان ہے۔'' زہرہ بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔ ''کسی کے باپ کا نہیں ہے۔ میں اسے آج ہی نیلام کروں گی۔''

''زیادہ تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، زہرہ بیگم۔'' فضل حسین بھٹی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ زیادتی ہوگئی ہے۔ ہم اس معاملے پر دوبارہ غور کر سکتے ہیں۔''

شامی ٹہلتے ہوئے دونوں کے قریب پہنچا اور بولا۔ ''میڈم، نیلامی کب شروع ہوگی؟''

''ابھی شروع ہو رہی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔'' زہرہ بیگم نے کہا، پھر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک دبلے پتلے شخص سے کہا۔ ''حامد علی، نیلامی شروع کرو۔ میں آرہی ہوں۔''

''حامد علی، آج نیلامی نہیں ہوگی۔'' تھانیدار نے تند لہجے میں کہا۔ ''تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''میڈم، اس آئینے کی کیا قیمت ہوگی؟'' شامی نے ایک قدِ آدم آئینے پر ہاتھ رکھا۔

''ایسے نہیں، بولی لگے گی۔'' زہرہ بیگم نے کہا پھر ایک نوجوان کو اپنے قریب بلا کر پوچھا۔ ''نیلامی کر لو گے؟''

یہ نوجوان ہمارے ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ شامی کی ہدایت پر دو روز پہلے زہرہ بیگم سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ شامی کو اس بات کا پہلے ہی اندیشہ تھا کہ اسے دیکھ کر نیلامی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

نوجوان، جس کا نام نفیس احمد تھا، چہک کر بولا۔ ''کر لوں گا جی لیکن مفت نہیں کروں گا۔''

''پیسے میں دوں گی، تم نیلامی شروع کرو۔'' زہرہ بیگم کرسی پر پیسے وصول کرنے کے لیے بیٹھ گئی اور آئینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''پہلے اس آئینے کی بولی شروع کرو۔''

حویلی کے دو ملازم آئینہ اٹھا کر سامنے لے آئے۔

نفیس احمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بڑی سریلی آواز میں بولا۔ ''حضرات، ذرا میری طرف متوجہ ہو جائیں۔ اس آئینے کی قیمت لگائیں۔ عمدہ چیز ہے، ٹھوس ساگوان کی لکڑی کا فریم ہے۔ سستا جائے گا۔ سرکاری بولی ......''

چودھری فیض محمد نے محض توقع سے بڑھ کر بولی لگا دی۔ ادھر ڈاکٹر شومنائی نے اس سے دگنی قیمت لگا دی۔ گویا مقابلہ زوروں پر تھا۔

''او یار، مسئلہ ہی ختم کرو۔'' چودھری فیض محمد نے کہا۔ ''ایک ہزار روپے کر دو۔ ایک دو تین۔'' اچانک چودھری نے جھلا کر کہا۔

''ایک ہزار روپے۔ چودھری فیض محمد کے ایک ہزار روپے..... جی، کیا کہا پندرہ سو؟ ڈاکٹر شومنائی کے پندرہ سو روپے۔ پندرہ سو ایک.... دو ہزار، پراچہ صاحب کے دو ہزار، دو ہزار ایک دو ہزار دو....'' ڈاکٹر نے تین ہزار کہہ دیا۔

نفیس احمد نے شامی کی طرف دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں۔ ''ڈاکٹر صاحب کے تین ہزار...... تین ہزار۔''

بولی میں اچھی خاصی گرمی پیدا ہوگئی تھی، چودھری فیض محمد نے غلام نبی پراچہ کے کان میں کچھ کہا اور بولی ایک دم پندرہ ہزار کر دی۔ شامی نے سترہ ہزار کر دیے۔ چودھری فیض محمد بیس ہزار پر پہنچ گیا۔

''چودھری فیض محمد کے بیس ہزار...... بیس ہزار ایک، بیس ہزار دو.... بولو ڈاکٹر صاحب، بیس ہزار میں جاتا ہے۔''

''جانے دو۔'' شامی نے کہا۔ ''دوسرا نکالو۔''

''بیس ہزار تین..... ''نفیس احمد نے بولی ختم کردی۔
''چودھری صاحب، رقم جمع کرائیں۔''

چودھری فیض محمد کے چہرے پر سخت ناخوشگواری نظر آرہی تھی۔ اس نے بٹوے سے ہزار روپے والے بیس نوٹ نکال کر بڑے غصے سے میز پر پھینکے اور بولا۔ ''رسید کاٹو، یہ ڈاکٹر شومنائی چیز کیا ہے!''

ایک خوش پوش شخص شاہی کے قریب آیا۔ سلام کرنے کے بعد پوچھا۔ ''ڈاکٹر، آپ ان آئینوں کا کیا کریں گے؟''

''ویڈیو کیسٹ۔'' شاہی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''میں ان کیمرا کاسٹ کے بلیو فلمیں بنا سکتا ہوں۔ میرے لیے ایک ہی آئینہ کافی ہے۔ دس پندرہ سال میں بہت کچھ ریکارڈ ہو چکا ہوگا۔''

''وہاٹ این آئیڈیا۔'' خوش پوش شخص چہکا۔ ''میرا نام ثنا اللہ بخاری ہے، میں ایک کاروباری شخص ہوں اور ایسے ہی کسی کاروبار کی تلاش میں تھا۔ آپ مجھے اپنا پارٹنر بنا لیں، میں فوری طور پر دس لاکھ روپے انویسٹ کر سکتا ہوں۔''

''فارگیٹ اٹ۔'' شاہی نے بے پروائی سے کہا۔
''دس سال پہلے تم کہاں تھے؟''

''دس سال پہلے!'' ثنا اللہ بخاری نے بھویں سکیڑیں۔ ''ان دنوں میں جنوبی افریقا میں تھا لیکن آپ''

''دس سال پہلے مجھے ریسرچ کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔'' شاہی نے ابھی تک اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ''آج مجھے پرانے آئینوں کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس قسم کے عشرت کدوں کے آئینوں کی۔ اینڈ مائنڈ یو، ٹوینٹیتھ سنچری والے میرے ساتھ پچیس لاکھ ڈالرز کا معاہدہ کرنے پر تیار ہیں۔ پچیس لاکھ ڈالر کا مطلب ہے تقریباً چار کروڑ پاکستانی روپے۔ یو آر اے ویری اسمال فرائی، مائی بوائے..... ناؤ گیٹ لاسٹ!''

میں نے دیکھا چودھری فیض محمد، فضل حسین بھٹی، غلام نبی پراچہ اور اسلم خان تھانیدار وغیرہ حیرت سے شاہی کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی آنکھیں جھپکتی چلی جا رہی تھیں۔

''سر، آپ میری بات تو سنیں۔'' بخاری، شاہی کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ ''آپ مجھے اپنا سول ڈسٹری بیوٹر.....''

شاہی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اس اگلے آئینے کے پانچ ہزار۔''

چودھری فیض محمد، جو ویڈیو کیسٹ کا نام سن کر خوفزدہ ہو چکا تھا، تیزی سے بولا۔ ''سات ہزار.....''

''آٹھ ہزار۔'' ثنا اللہ بخاری نے تیزی سے کہا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ایک آدھ آئینہ اس کے ہاتھ لگ گیا تو وہ شاہی سے سودے بازی کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوگا۔

''او یار، یہ مصیبت کہاں سے ٹپک پڑی۔'' چودھری فیض محمد نے کہا۔ ''رنگ میں بھنگ.....''

''بولو برادر.....'' نفیس احمد کہہ رہا تھا۔ ''آٹھ ہزار میں خاص ساگوان کے فریم والا اینٹیک آئینہ..... آٹھ ہزار ایک..... آٹھ ہزار دو..... جی، کیا کہا دس ہزار؟ ڈاکٹر شومنائی کے دس ہزار..... دس ہزار..... بارہ ہزار..... پراچہ صاحب کے بارہ ہزار..... جی آپ نے کیا کہا؟ پندرہ..... پندرہ ہزار، بخاری صاحب کے پندرہ ہزار..... پندرہ ہزار ایک، پندرہ ہزار دو اور پندرہ ہزار ڈن..... لائیے صاحب، پیسے جمع کرائیے۔''

بخاری نے پندرہ ہزار روپے جمع کرا دیے اور شاہی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''اوئے، یہ ایک ایک آئینے کا چکر نہیں چلے گا۔'' چودھری فیض محمد نے کہا۔ ''پورے لاٹ کی بات کرو۔''

''لے آؤ پورا لاٹ۔'' ثنا اللہ بخاری نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر شومنائی، آپ ایک طرف ہو جائیں، میں آپ کی طرف سے بولی لگاتا ہوں، یہ سارے آئینے آپ کے ساتھ ہی جائیں گے۔''

''ڈونٹ بی سوشیور، مائی ڈیئر۔'' شاہی نے کہا۔ ''تمہارے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔''

پھر وہ آگے بڑھا اور دھیمی آواز میں زہرہ بیگم سے کچھ کہا۔ زہرہ بیگم نے نفیس احمد کے کان میں سرگوشی کی۔ چودھری فیض محمد نے فکرمندی سے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ تھانیدار چیئرمین بھٹی کی طرف دیکھنے لگا۔

''زہرہ بیگم، ڈپلومیسی یا خفیہ بولی نہیں چلے گی۔'' بھٹی نے کہا۔ ''بات سب کے سامنے ہونی چاہیے۔''

''میں شریف اور خاندانی عورت ہوں بھٹی صاحب۔'' زہرہ بیگم نے واشگاف الفاظ میں چوٹ کی۔ ''جو کچھ کرتی ہوں سب کے سامنے کرتی ہوں، بزدلوں کی طرح پردے کے پیچھے بیٹھ کر تاک جھانک نہیں کرتی۔ ڈاکٹر شومنائی نے ادائیگی کے لیے دو گھنٹے کی مہلت مانگی ہے لیکن میں نے انہیں صاف کہہ دیا ہے کہ میں ایک گھنٹے سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتی۔ اگر نیلامی ختم ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر ادائیگی نہ ہوئی تو سودا ختم سمجھا جائے گا۔''

''تو حضرات، آپ نے سن لیا۔'' نفیس احمد نے اپنی اونچی سریلی آواز میں کہا۔ ''نیلام ختم ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر رقم جمع کرانی لازمی ہوگی۔ اگر ایک گھنٹے کے اندر رقم جمع نہ کرائی گئی تو سودا منسوخ سمجھا جائے گا اور پیشگی رقم ضبط کر لی جائے گی۔ تھانیدار صاحب یہاں موجود ہیں۔ یہ سب کام ان کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔''

اس اثنا میں ملازموں نے پانچ قدِ آدم آئینے اور چار سنگھار میزیں حاضرین کے سامنے اس طرح لگا دیں کہ سب لوگ اپنے عکس ان میں دیکھ سکتے تھے۔

''لیجیے حضرات، آپ کی خواہش پر پورا لاٹ حاضر ہے۔'' نفیس احمد نے کہا۔ ''یہ چار سنگھار میزیں اور پانچ قدِ آدم آئینے ہیں۔'' وہ تھوڑا سا ہنسا۔ ''قدِ عورت اس لیے کہ ان میں زیادہ تر عورتیں دیکھتی ہیں، یا آئینہ عورتوں کو دیکھتا ہے، جی صاحب.....''

شاہی نے جیب سے پرس اور ڈائری نکالی۔ اس کے پرس میں پانچ سو روپے کے نوٹوں والی گڈی دبی ہوئی تھی۔ اس نے پرس جیب میں رکھ دیا اور ڈائری کے اندراجات دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں نفیس احمد نے پچھتر ہزار تین کر دیا۔

''وہاٹ؟'' شاہی نے بظاہر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اسی ہزار۔''

''سوری، سر۔'' نفیس احمد نے کہا۔ ''بولی ڈن ہو گئی ہے۔ لائیے صاحب، رقم جمع کرائیے۔''

چودھری فیض محمد، غلام نبی پراچہ اور تین دیگر افراد اپنی جیبوں سے نوٹ نکالنے لگے۔ واضح طور پر ان سب نے آپس میں مل کر وہ چوٹ برداشت کی تھی۔ پانچ آدمیوں نے چند منٹوں کے اندر پچھتر ہزار کی رقم جمع کر کے زہرہ بیگم کے سامنے رکھ دی۔ وہ بڑے خوش نظر آرہے تھے اور خوش تو زہرہ بیگم بھی نظر آتی تھی۔

شاہی قدرے لٹکے ہوئے چہرے سے چودھری فیض محمد کے پاس گیا اور بولا۔ ''ایک لاکھ۔''

چودھری فیض محمد نے فاتحانہ نظروں سے شاہی کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ یہ نیلامی آپ کے پیپ شو سے پہلے نہیں ہو گئی۔ اب آپ کسی اور بستی میں جا کر قسمت آزمائیں۔''

ملازم برآمدے میں رکھا ہوا سامان ادھر ادھر کر رہے تھے کہ سامان کے عقب سے ایک اور قدِ آدم آئینہ نکل آیا۔ ملازمین میں سے ایک شخص نے کہا۔ ''لو جی، ایک آئینہ اور نکل آیا۔''

چودھری فیض محمد اور اس کے ساتھیوں نے احتجاج کیا

اور کہا کہ وہ آئینہ ان کا ہے کیونکہ انہوں نے پورے لاٹ کا سودا کیا تھا لیکن زہرہ بیگم نے ان کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ شامی کے علاوہ کچھ دیگر افراد بھی زہرہ بیگم کے موقف کی حمایت کرنے لگے۔ نصف گھنٹے کی بحث کے بعد اس آئینے کو بھی نیلام کے لیے پیش کر دیا گیا۔ بولی پانچ ہزار سے شروع ہوئی۔ چند منٹوں کے اندر بولی پچیس ہزار تک پہنچ گئی۔ شامی بڑی مستقل مزاجی سے بولی بڑھاتے جا رہا تھا۔ مخالف گروپ کے چہروں پر پریشانی نظر آنے لگی۔ ان کی الجھن دوہری تھی۔ پہلی الجھن یہ معلوم ہوتی تھی کہ اگر وہ آئینہ ''ڈاکٹر شومنائی'' کے ہاتھ لگ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے اور دوسری الجھن یہ نظر آتی تھی کہ قیمت بہت بڑھتی جا رہی تھی۔ جس انداز سے شامی بولی بڑھا رہا تھا۔ اس انداز سے قیمت ایک لاکھ سے بھی تجاوز کر سکتی تھی۔ جب رفتہ رفتہ بولی پینتیس ہزار تک جا پہنچی تو ان کی الجھن مزید گہری ہو گئی۔ انہوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور بولی بڑھانی بند کر دی۔ نفیس احمد نے ایک دو تین کرکے بولی ختم کر دی۔

شامی نے رقم ادا کی اور بولا۔ ''میڈم یہ آئینہ احتیاط سے اندر رکھوا دو ہم کل صبح اسے اٹھوا لیں گے''

''شکریہ، ڈاکٹر صاحب یہ آپ کی امانت ہے۔'' زہرہ بیگم نے کہا۔ ''جب چاہیں اسے اٹھوا کر لے جائیں۔''

☆☆☆

اگلی صبح ہم حویلی پہنچے تو زہرہ بیگم بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس وقت شامی اپنے اصلی حلیے میں تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ اور ململ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ زہرہ بیگم ہمیں ناشتے کی میز پر لے گئی اور لڑکیوں کو شاہی ناشتا تیار کرنے کے لیے کہا۔ ستارہ جبیں اور دیگر دو لڑکیاں، جن کے نام کرن اور روحی تھے، آٹوگراف بکس لے کر شامی کے پاس پہنچ گئیں۔

روحی نے پوچھا۔ ''شامی صاحب کل وہ ہیٹ، ڈاڑھی اور خوفناک کوٹ والے صاحب آپ ہی تھے؟''

شامی نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ''وہ میرے لکڑ دادا تھے۔ عالم ارواح سے تشریف لائے تھے۔''

''واقعی، ایسا ہی لگ رہا تھا۔'' ستارہ جبیں نے کہا۔ ''اس حلیے میں آپ بہت کیوٹ لگ رہے ہیں۔''

''تمہاری بات سن کر مجھے نانی یاد آ گئیں۔'' شامی نے کہا۔ ''وہ بھی یہی کہا کرتی تھیں۔''

لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ ستارہ بولی۔ ''اونہہ...... منہ کا مزہ خراب کر دیا۔ آپ کو موسم کی پہچان بالکل نہیں ہے۔''

زہرہ بیگم نے کہا۔ ''شامی صاحب، آپ کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ آپ کے جانے کے فوراً بعد چودھری فیض محمد میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ آئینہ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے آپ کے کہنے کے مطابق تھانیدار کو پانچ ہزار روپے دے دیے تھے اور اسے کہا تھا کہ وہ ہمارے آس پاس موجود رہے۔''

ہمارا اندازہ تھا کہ چودھری فیض محمد یا تو آخری آئینہ چوری کروانے کی کوشش کرے گا اور یا اسے کسی اور طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے زیادہ عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زہرہ بیگم سے کہا کہ وہ آئینہ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ یعنی فریم کے اندر سے پرانا آئینہ نکال کر اس کی جگہ نیا آئینہ لگا دے گا۔

''چودھری، میری ایک شرط ہے۔'' زہرہ بیگم نے شامی کی ہدایت کے مطابق کہا۔ ''میں اس بستی میں رہنا چاہتی ہوں، اگر تم لوگ مجھے اس حویلی میں رہنے کی اجازت دے دو تو میں تمہیں آئینہ تبدیل کرنے کی اجازت دے دوں گی ورنہ نہیں۔''

چودھری کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، پر یہ [illegible] طرح پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''چودھری [illegible] کا آدمی ہے۔ وہ بھی یہاں آتا جاتا ہے۔ [illegible] دن ہوگی جس دن اس نے [illegible] دیکھا۔ او [illegible] یہ دھندا چھوڑنے کا فیصلہ [illegible] ہے۔ اب [illegible] گزارتا [illegible] ہم سے [illegible] کا فیصلہ [illegible] اب تمہارا [illegible]''

[illegible] نے ہمیں بتایا کہ [illegible] بھی موجود تھا۔ چودھری فیض محمد نے اس سے علیحدگی میں بات کی اور اسے بھی راضی کر لیا پھر وہ اندر گئی اور نوٹوں کا ایک بنڈل لا کر شامی کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ رہی آپ کی امانت۔'' اس نے کہا۔ ''پینتیس ہزار تو آپ کے اپنے ہیں اور یہ آپ کے حصے کا پرافٹ۔''

اس اعتبار سے وہ عورت خاصی ایماندار تھی۔ اس نے ایک پیسے کی بھی ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔

جب ہم ناشتے کے بعد حویلی سے رخصت ہوئے تو حویلی کے دو ملازموں نے اخبار میں لپٹا ہوا آئینہ ہوٹل کی گاڑی میں رکھ دیا۔

جاتے جاتے یہ بھی بتا دوں کہ شامی نے میجک شو میں جو کرشمہ دکھایا تھا وہ فقط وی سی آر کا کمال تھا۔

بعض اوقات یکساں مناظر دیکھتے دیکھتے دل اوب سا جاتا ہے... وہ بھی اکتاہٹ سے گھبرا کر یکسانیت کے خول سے باہر نکلنا چاہتی تھی... مگر یہ کیا... اس سے انجانے میں جو کچھ بھی سرزد ہوا... وہ ایک دم چونکا دینے والا تھا۔ اس بریکنگ نیوز نے کتنے ہی ہونٹوں کو مسکراہٹ کے حصار میں قید کر ڈالا۔ شاید یہی زندگی ہے... انسان ہنستے ہنستے روتا ہے اور روتے روتے اسے بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

چند بھرے بھرے انسانوں کی بے زاری کا عبرت اثر انجام

انجام بخیر

ثمر عباس

آڈرے میلون نے میز پر گھونسا مارا اور پھر اس کے منہ سے مغلظات کا ایسا دھارا بہنے لگا جو گودی پر کام کرنے والے کسی بدزبان مزدور کو بھی شرمندہ کر سکتا تھا۔ میں اس کے ذخیرۂ الفاظ پر متحیر رہ گیا اور اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ برسوں کے تجربے نے مجھے بتا دیا تھا کہ اسے خاموش ہونے میں پانچ منٹ سے لے کر کئی دن لگ سکتے ہیں۔ بہرحال آڈرے ایک عملی عورت تھی۔

میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا۔ میں اپنے کام کے بیشتر اوقات میں اپنی تنگ سی کار میں بیٹھا کولڈ کافی پیتا رہتا تھا۔ میں یہاں سے لے کر سرحد تک کے درمیان میں واقع ہر

گھٹیا موٹیل کی لوکیشن سے واقف تھا۔ اس میں موٹیل کے ڈیسک کلرک کے نام سے لے کر اس کی ریٹنگ شامل تھی۔

یہ ذہن کو بے حس اور شدید آزار کی حد تک بور کر دینے والا کام تھا۔ لیکن یہی میرا ذریعۂ معاش ہے۔ ہائی اسکول کی تعلیم ترک کر دینے والوں کے لیے اس ملک میں چند ہی بیش قیمت مواقع میسر آتے ہیں اور میرا شمار ان چند خوش قسمتوں میں ہرگز نہیں تھا۔

میرا موجودہ جاب جون میلون پر اپنی پیشہ ورانہ نگاہ رکھنا تھا جس کے بارے میں اس کی بیوی آڈرے میلون کو شبہ تھا کہ وہ کسی اور عورت کے ساتھ غیر اخلاقی ناجائز تعلقات استوار کیے ہوئے ہے۔

بے شک اس کا مطلب پہلے بیان کردہ ان موٹیلز میں سے ایک کے سامنے پارکنگ لاٹ میں انتظار کے ان گنت گھنٹے گزارنا تھا...... لیکن کس چیز کا انتظار؟

یہ بات عیاں تھی کہ جون فلرٹ کر رہا تھا اور اس کی بیوی کا شبہ درست تھا۔

میں جون میلون کی لیکس کا تعاقب کرتے ہوئے نائٹ انگیل نامی اس موٹیل تک آ گیا تھا جہاں وہ اور اس کی ہم سفر خاتون کمرا نمبر دو سو گیارہ میں چلے گئے تھے۔ نائٹ انگیل نامی یہ موٹیل فوڈ کوالٹی کے لحاظ سے اونچے درجے میں شمار نہیں ہوتا تھا لیکن وہ دونوں یہاں صرف ناشتے کے لیے تو ہرگز نہیں آئے تھے۔

موٹیل تک ان کا پیچھا کرنے کا میرا واحد مقصد ان کی موٹیل میں آمد اور وہاں سے رخصت ہونے کے وقت کو ریکارڈ کرنا تھا۔ آڈرے میلون نے مجھے اسی کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس دوران میں وہ موٹیل میں کیا کرتے تھے، اس بات کا فیصلہ میں نے آڈرے پر چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے تصویریں حاصل کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

بہر حال میں نے ان کی موٹیل میں آمد کا وقت نوٹ کر لیا تھا۔ وہ رات آٹھ بج کر ستر ہ منٹ پر موٹیل کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ اگر اس نوعیت کے واقعات کی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو میرے اندازے کے مطابق انہیں رات ساڑھے نو بجے تک کمرے میں رہنا چاہیے تھا۔ دس منٹ تفریحی سرگرمیوں کے لیے، مزید دس منٹ شاور وغیرہ کے لیے اور باقی وقت آرام کرنے کے لیے۔ میرے خیال کے مطابق اس خاتون کو آرام کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن جون میلون کی عمر پینتالیس برس سے بھی زیادہ تھی اور وہ تندرست و توانا بھی نہیں تھا۔

میرے اندازے میں گیارہ منٹ کی غلطی ہو گئی۔ موٹیل کے کمرے کا دروازہ نو بج کر انیس منٹ پر کھل گیا۔ وہ خاتون جس کے نام سے میں ابھی تک واقف نہیں تھا، کمرے سے پہلے باہر نکلی۔ اس نے تین انچ کی ہیل پہنی ہوئی تھی اور بڑی نزاکت سے چل رہی تھی۔ جون اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لگ رہا تھا جیسے اس نے بھی تین انچ کی ہیل پہن رکھی ہے لیکن حقیقت میں وہ سرا سر تھکن کا شکار تھا اور ڈگمگاتی چال چل رہا تھا۔ مگر میں نے اس حقیقت کو اس کی بیوی کو دینے والی رپورٹ سے خارج رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں اس سے نمٹ لوں گی!" آڈرے نے کہا۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے فرش پر ٹہل رہی تھی۔ آنکھیں غصے سے انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ برسوں سے اس کاروبار سے وابستہ شب و روز نے مجھے یہ قدیم مقولہ سکھا دیا تھا کہ "خاموشی زریں ہوتی ہے۔" اور موقع کی مناسبت سے مجھے یہی کرنا چاہیے تھا اور اگر تجربہ کوئی معنی رکھتا تھا تو میں جانتا تھا کہ اس کے منہ سے ادا ہونے والا اگلا جملہ یہ ہوگا۔

"کیا وہ دلکش ہے؟"

حقیقت میں وہ یہ جاننا نہیں چاہتی تھی اور میں بھی اسے بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن معاملہ ایسا تھا کہ اس سے گریز بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسے اشارتاً بتانا چاہا کہ وہ معمولی ہے جو کہ یقیناً ایک سنگین خرابیت ہوتی۔ اس لیے کہ حقیقت میں وہ ... کی خاتون تھی۔ صرف یہ آڈرے نے مجھے یہ چھوٹا سا ... جھوٹ بولنے سے بچا لیا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔ "مجھے اس کے ذوق کا علم ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عورتوں کے لیے خدا کی دین ہے۔ وہ خوب صورت سے کم پر بھی راضی نہیں ہوتا۔ چاہے اس کے لیے اسے کچھ ادا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک حقارت آمیز قہقہہ بلند کیا۔ "اور یقین کرو وہ اس سنہری موقعے سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھا رہی ہوگی۔ میں شرط لگا سکتی ہوں کہ وہ طوائف اسے بہت ہی مہنگا جل دے رہی ہوگی۔" اس نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ بہ آواز بلند تھا جس میں غصے کا عنصر بھی شامل تھا۔ "مجھے امید ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب حاصل کر لے گی اور اسے یوں چھوڑ کر چلی جائے گی کہ اس کی پتلون اس کے ٹخنوں میں پڑی رہ جائے گی۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے باندھتے ہوئے کہا اور غصے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

کچھ دیر توقف کے بعد آڈرے نے پوچھا۔ "وہ کون

ہے؟"

"مجھے ابھی تک اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے بھی اس کی پروا نہیں کہ وہ کون ہے اور یہ کوئی پہلی عورت نہیں ہے جس کے ساتھ وہ رنگ رلیاں منا رہا ہے لیکن یہ یقینی بات ہے کہ یہ اس کے لیے آخری عورت ثابت ہوگی...... کم از کم جب تک وہ میرا شوہر ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو اس کے بعد چاہے وہ کوئن آف شیبا سے تعلق استوار کر لے، مجھے پروا نہیں ہوگی۔"

میں اس کے برابر میں خاموش کھڑا تھا کیونکہ میں اس گفتگو میں مزید کچھ اضافہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اب اس کے اگلے حکم کا انتظار تھا اور ایک بار پھر تجربے نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ حکم کیا ہوگا۔

"مجھے تصویریں چاہئیں۔" آڈرے نے کہا۔

"اندرونی یا بیرونی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"کیا کمرے میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت کی تصویریں کافی ہوں گی؟ یا تم چاہتی ہو کہ......" میں نے جملہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ البتہ مجھے اس کا جواب پہلے سے معلوم تھا۔

"ہر قسم کی تصویریں اتارنا ہوں گی۔" اس نے کہا۔

مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔ لوگ حقیقی مناظر کی تصویریں چاہتے ہیں۔ جس سے ذہن میں لذت آزاری کا تصور ابھرتا ہے یا پھر طلاق کی عدالت میں جج کے روبرو ثبوت کے طور پر پیش کرنے کے لیے! مجھے اس سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ میرے بل کی ادائیگی کر رہی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ حقیقی مناظر کی تصویریں اتارنے میں خطرہ بھی تھا اور میں نے یہ بات آڈرے کے گوش گزار کر دی تھی۔

"اس کام کے لیے میں اضافی فیس......"

آڈرے نے میرا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ "مجھے پروا نہیں کہ اس کام پر کیا اضافی لاگت آئے گی۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔ "رقم میری نہیں جون کی ہے۔" اس نے تمسخرانہ قہقہہ لگایا۔ "یہ قدرتی انصاف ہے کہ اس کی قیمت اسے خود ہی چکانا ہوگی۔" اس نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "اور وہ قیمت چکائے گا۔" پھر وہ غصے سے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے سامنے سیدھ میں نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کا ایک پیر

اوپر نیچے مسلسل حرکت کر رہا تھا۔

میں خاموش کھڑا اس سے رخصتی کی اجازت کا منتظر تھا۔ اپنے غصے اور صدمے کی کیفیت میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ غالباً وہ دیوار پر غصے سے کسی تکتے کو گھور رہی تھی۔ بالآخر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تصویریں!" اس نے کہا۔ "ڈھیر ساری تصویریں۔ میں اسے بانس پر لٹکا کر چھوڑوں گی۔"

بالآخر میں نے اس سے رخصت کی اجازت لے لی۔

☆☆☆

میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔ یہ ایک سابقہ بینک کی عمارت میں تیسری منزل پر ایک فون بوتھ سائز کا کمرا تھا لیکن اس کا کرایہ کم تھا اور یہ میرے مقصد کے لیے مناسب تھا کیونکہ میں کچھ ہی وقت اس دفتر میں گزارتا تھا۔

میرا دوسرا دفتر میرا اپارٹمنٹ تھا جو چند بلاک کے فاصلے پر اور پیدل کی مسافت پر واقع تھا۔

میں بہ ذات خود فوٹو گرافی نہیں کرتا تھا۔ نہ تو مجھ میں یہ صلاحیت موجود تھی اور نہ ہی میرے پاس فوٹو گرافی کے آلات تھے۔ مجھے اس کا شوق بھی نہیں تھا کہ رنگین مزاجوں کے خلاف مواد کے حصول کے لیے خواب گاہوں اور دیگر پرائیویٹ مقامات میں داخل ہوتا پھروں۔

جو سینڈرز کو نہ صرف اس کام سے رغبت تھی بلکہ وہ اس میں مشاق بھی تھا۔ وہ ایک قابل اعتماد، چوکس اور سستا فوٹو گرافر ہونے کے ساتھ ساتھ میرا دوست بھی تھا۔ بھلا ایک پرائیویٹ سراغ رساں کو اس سے زیادہ اور کس چیز کی ضرورت ہو سکتی تھی؟

میں اس کا نمبر ڈائل کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے دفتر کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور عمدہ لباس پہنے ہوئے ایک شخص سکندر اعظم کے سے عزم کے ساتھ چلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس شخص نے بغیر کسی تعارف کے اپنی دونوں مٹھیاں میز پر جما دیں اور ان پر زور ڈالتے ہوئے آگے کی جانب اس طرح جھک گیا کہ اس کی آنکھیں براہ راست میری آنکھوں سے ٹکرانے لگیں۔

"میں تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں اس سے مصافحہ کرنے کے ارادے سے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن وہ گھوم گیا اور چلتا ہوا کھڑکی کے پاس جا پہنچا۔ اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے باہر کی طرف جھانکا اور غراتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی بیوی کے بارے

میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"معلومات؟" میں نے دہرایا۔ اگرچہ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"وہ کسی احمق کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟"

میں انتظار کرنے لگا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ اس نوعیت کی گفتگو میں بہتر یہی ہوتا ہے کہ متاثرہ پارٹی کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ وہ کھڑکی کے پاس سے پلٹ گیا اور میرے مختصر سے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ تین چار چکر کاٹنے کے بعد وہ رک گیا اور میرے مقابل آ گیا۔ اس مرتبہ اس کی پیشانی کے بل اور بھی زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ شخص کون ہے۔ مجھے اس کا نام اور پتا چاہیے اور میں تصویریں بھی چاہتا ہوں۔"

"تمہاری بیوی کا کیا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"علاوہ ازیں تمہارا کیا نام ہے؟"

تب اس شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی جھلک نمودار ہوئی۔ "فلپس۔" اس نے کہا۔ "جیسن فلپس!"

"مسٹر فلپس، کیا تمہارے پاس اپنی بیوی کی کوئی تصویر ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کے حلق سے غراہٹ آمیز ایک بلند آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اس کی جیب میں رینگ گیا۔ پھر اس نے اپنی جیب میں سے ایک رنگین تصویر نکالی اور میری میز پر اچھال دی۔ تصویر میز کی چکنی سطح پر پھسلتے ہوئے ٹیلی فون کے پاس جا کر رک گئی۔

"اس کا نام جولی ہے؟"

میں نے تصویر اٹھائی اور اس پر نظر ڈالی تو میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس تصویر میں مسکراتی ہوئی وہ عورت کوئی اور نہیں بلکہ وہی تھی جس سے جون میلون نے ناجائز تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔

مجھے یہ اعتراف ہے کہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ تصویر میں اس کی معصوم مسکراہٹ اور ہنستی ہوئی آنکھیں اس بات کا کوئی اشارہ نہیں دے رہی تھیں کہ وہ ایک بے وفا بیوی ہو سکتی ہے۔ وہ سراپا باوفا دکھائی دے رہی تھی۔

کون کہتا ہے کہ تصویریں جھوٹ نہیں بولتیں؟

میں اس مثالی صورت حال سے دوچار تھا جس میں مجھے دو میں سے کسی ایک ناموافق کا انتخاب کرنا تھا اور اس مجبوری کے باوجود اس کا نتیجہ ہر ایک صورت میں برا ہی نکلنا تھا۔ گویا مجھے ایک آزمائشی صورت حال درپیش تھی۔

مجھے پہلے ہی علم تھا کہ جولی کسی شخص کے ساتھ رسوخ بڑھا رہی تھی۔ چند دنوں میں میرے پاس اس کے تصویری ثبوت بھی موجود ہوں گے لیکن یہ سب معلومات مجھے آڈرے میلون کے معاوضے کے بدلے میں حاصل ہو رہی تھیں۔ مجھے رقم کی ادائیگی وہی کر رہی تھی اور میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے رہا تھا کہ میں یہ معلومات جیسن فلپس پر ظاہر کروں اور نہ ہی میں ان معلومات کے لیے اس سے کوئی فیس لے سکتا تھا جن کا مجھے پہلے ہی سے علم تھا۔ اتنے برسوں سے اس کاروبار سے وابستہ ہونے کے دوران مجھے اس قسم کی صورتِ حال سے کبھی دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔

میرا پہلا خیال یہی تھا کہ تصویر جیسن فلپس کو واپس کر دوں اور اس سے کہہ دوں کہ میں یہ کیس نہیں لے سکتا لیکن مجھے کیس نہ لینے کی وضاحت بھی کرنی پڑتی جو اس کٹھن صورتِ حال کو مزید پیچیدہ بنا دیتی۔ مجھے اس کے حل کے لیے وقت درکار تھا۔

"مسٹر فلپس!" میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک اپائنٹمنٹ ہے اور مجھے دیر ہو گئی ہے۔ اس لیے مجھے فوری طور پر یہاں سے جانا پڑ رہا ہے۔ کیا تم کل صبح آ سکتے ہو؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کل صبح کس وقت؟"

"صبح دس بجے!"

جیسن فلپس کے حلق سے وہی مخصوص غراہٹ ابھری۔ اس نے شانے اچکاتے ہوئے گھور کر اپنی بیوی کی تصویر کو دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میز پر پڑی ہوئی وہ مسکراتی تصویر اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں ٹھیک ہے!" اور قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں مزید ایک روز انتظار کر سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور تیز تیز قدموں کے ساتھ میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی اس کے غصے کی تپش کمرے میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں دھم سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی بیوی کی تصویر اٹھا کر اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر میرے منہ سے ایک آہ بلند ہوئی۔ "اپنے چہرے پر سے یہ معصوم مسکراہٹ مٹا دو فریبی عورت!" میں نے بلند آواز سے کہا اور تصویر پلٹ کر واپس میز پر رکھ دی۔

☆☆☆

میرے پاس اپنے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے صرف اٹھارہ گھنٹے کا وقت تھا۔ میں جیسن فلپس کو یہ کہہ کر انکار کرسکتا تھا کہ اس میں مفادات کا ٹکراؤ ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں اس میں تضاد کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ مجھے کسی کے مفاد کا تحفظ نہیں کرنا تھا۔

میں جیسن فلپس کو آڈرے میلون سے متعارف کراسکتا تھا اور باقی معاملات طے کرنا ان پر چھوڑ دیتا۔

نہیں، یہ ایک اچھا آئیڈیا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر میں انہیں آپس میں ملا دیتا تو مجھے اعتبار نہیں تھا کہ وہ سمجھ داری سے کام لیتے کیونکہ دونوں نہ صرف بہت غصے میں تھے بلکہ دونوں ہی کو صدمہ بھی تھا، غصے اور صدمے کی کیفیت میں عقلمندی کا مظاہرہ مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ میں آڈرے سے بات کرسکتا تھا۔ اس سے اس بات کی اجازت طلب کرتا کہ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ جیسن فلپس کے علم میں لے آؤں۔ گو یہ سب سے زیادہ مناسب حل تھا لیکن میں اس حل سے مطمئن نہیں تھا۔ یقینی طور پر آڈرے، جیسن سے ملنے کو کہتی اور یہ ایک ایسی بات تھی جس سے میں گریز کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاں، اگر ان دونوں کی خود آپس میں ملاقات ہو جاتی ہے تو یہ اور بات تھی لیکن میں اس معاملے میں فریق نہیں بننا چاہتا تھا۔ ان کی آپس میں ملاقات کا جو بھی مجرمانہ حل نکلتا وہ میرے مزاج کے خلاف تھا۔

پھر میں نے اپنی توجہ کا رخ ان بدچلنوں کی جانب کر دیا۔ کیا کوئی ایسی راہ نکل سکتی ہے کہ میں ان کے روبرو آجاؤں اور انہیں ان کے متعلقہ رفیق حیات کے شبہات سے باخبر کر دوں؟ ایسی بھی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس آگاہی سے وہ نہ صرف خوف زدہ ہو جاتے بلکہ ان کے رویوں میں بھی تبدیلی آجاتی، لیکن گھوڑے تو اپنے تھان سے نکل چکے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ آڈرے اور جیسن دونوں ہی کسی طور پر اپنے اپنے شریک حیات کو معاف کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔

میں نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک گہری سانس لی، نہ چاہنے کے باوجود میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں آڈرے کو جیسن کے بارے میں بتا دوں، اس کیس کے بارے میں جیسن کو معلومات فراہم کرنے کی اجازت طلب کروں اور آڈرے کو اپنی فیس کا کچھ حصہ واپس کر دوں۔ اس کے نتیجے میں جیسن سے اس رقم کے مساوی فیس لے لوں جو میں آڈرے کو واپس کروں گا۔ پس حساب کتاب برابر ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ میں دو کیسوں کو ایک ساتھ ہی نمٹانا چاہتا تھا۔ گو یہ عمل ادھورا اور نامکمل ہی سہی لیکن اس سے بہتر میں اور کوئی طریقہ استعمال میں نہیں لاسکتا تھا۔

اس طرح نہ صرف میرا ضمیر صاف رہتا بلکہ میرا لائسنس بھی کلیئر رہتا۔

یہ آئیڈیا آڈرے میلون کو پسند آیا لیکن وہ اس سے بھی کہیں آگے جانا چاہتی تھی۔ وہ جیسن فلپس سے ملنا چاہتی تھی۔

اور یہ ٹن وہی تھا جو میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ اس لیے کہ اس کا نتیجہ ... کی شکل میں ظاہر ہوتا۔ گو مشکلات میرے لیے انہیں نہیں تھیں لیکن میں ان کا سبب نہیں بننا چاہتا تھا۔

آڈرے کو انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”مجھے یہ بہت درست لگے گا۔“ آڈرے نے کہا۔ ”وہ مجھے اپنی بیوی کے بھید بتا سکتا ہے اور میں اسے جون کے رازوں سے آگاہ کرسکتی ہوں۔ ذرا سوچو تو سہی۔“ اس نے جگمگاتی آنکھوں سے کہا۔ ”ہم انہیں تڑپنے اور پیچ و تاب کھانے پر مجبور کر دیں گے۔ کیا مزیدار بات ہوگی، زبردست!“

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو اب میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اگر میں ان دونوں کو آپس میں نہ ملواتا تو وہ یقینی اور اپنے طور پر بھی آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر لیتے۔

سو میں نے جیسن فلپس سے اس بارے میں بات کرنے کا آڈرے سے وعدہ کر لیا کہ آیا وہ اس پر رضامند ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ پھر میں وہاں سے چل پڑا۔

☆☆☆

”تو تمہیں پہلے سے پتا ہے کہ وہ شخص کون ہے؟“ جیسن فلپس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بات یہ ہے کہ تم سے پہلے اس کی بیوی نے میری خدمات حاصل کی تھیں کہ میں اس کا تعاقب کروں۔“ پھر میں نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے گردن پر باندھ لیے اور جیسن فلپس کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ خاموش تھا۔

”تم میری مشکل کو سمجھ سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس افیئر کا علم صرف اس بنا پر ہے کہ اس چھان بین کا معاوضہ مجھے کسی اور نے ادا کیا ہے اور یہ انصاف کی بات نہیں ہوگی کہ میں یہ راز تم پر افشا کروں جبکہ اس کی ادائیگی وہ عورت کر چکی ہے۔“

”لعنت ہو!“ جیسن نے اپنی جیب سے ایک چیک بک نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اس کی ادائیگی کرسکتا ہوں۔“ اس نے ایک پین نکال کر چیک بک پر لکھنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

”میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں ایک ہی کام کا دو مرتبہ معاوضہ نہیں لوں گا۔“ میں نے کہا۔

اس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ لہراتے ہوئے اسے خاموش کر دیا۔ ”ہم حساب کتاب بعد میں کسی وقت کرلیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”وہ شخص ہے کون؟“ جیسن نے پوچھا۔ چیک بک اب بھی اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔

”میں تمہیں یہ فی الوقت نہیں بتا سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں اپنی کلائنٹ سے بات کر چکا ہوں اور وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے جو شاید تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔“

”کیا آئیڈیا ہے؟“

”میں اس سے کہوں گا کہ وہ اپنا آئیڈیا تمہیں بتا دے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بھی اس صورت میں اگر تم اس ملاقات کے لیے رضامند ہو۔“

جیسن فلپس اس پیشکش پر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔ میری پیشانی پر بھی بل پڑ گئے لیکن یہ فکرمندی کے سبب نہیں بلکہ اس خوف کے سبب نمودار ہوئے تھے کہ جب دو زخمی پارٹیاں آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں گی تو پھر کیا ہوگا؟

میں اپنی اس تشویش کا اظہار کرنے ہی والا تھا کہ جیسن نے اپنا ہاتھ میری میز پر مارا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”کیوں نہیں؟“ اس نے کہا۔

میں اسے بتا سکتا تھا کہ ”کیوں نہیں“ لیکن میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ اس کے بجائے میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور فون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا نام آڈرے ہے۔“

پھر میں نمبر ڈائل کرنے لگا۔

جیسن اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یہ نام پسند آیا ہے اور مجھے یقین تھا کہ اسے آڈرے کا چہرہ بھی پسند آجائے گا۔ گو آڈرے اتنی خوب صورت نہیں تھی جتنی جولی فلپس حسین تھی لیکن چہرے کے نقوش کے لحاظ سے وہ کسی طور بھی کمتر نہیں تھی۔

میں نے اگلے روز ان دونوں کی اپنے دفتر میں ملاقات کا انتظام کر لیا۔

آڈرے مقررہ وقت سے پہلے ہی میرے دفتر آگئی۔ کسی انجانے خیال سے اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی تھی۔ وہ میری چھوٹی سی گدی دار کرسی پر بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

میں نے خود کو اپنے ان کلائنٹس کی فائلوں میں مصروف کر لیا جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ جیسن فلپس بھی جلدی آجائے گا۔ میں مختصر گفتگو کے معاملے میں کبھی اچھا ثابت نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میں اس کیس کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، اس لیے خود کو کام میں مصروف ظاہر کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد جیسن بھی دندناتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ درد آمیز غصہ اب بھی اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس نے سرسری انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا اور آڈرے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے تیزی سے بولا۔ ”کیا تم ہی ......؟“

”ہاں، میں ہی ہوں۔“ آڈرے نے اثبات میں

سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

میں ان کی اس گفتگو پر حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کی ملاقات ابھی ابھی ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو پہلے سے سمجھ گئے تھے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اچھا شگون تھا یا برا۔ چونکہ بدچلن شریک حیات کی ان دونوں کے درمیان قدر مشترک تھی۔ شاید ایک دوسرے کو سمجھ لینے کے لیے یہی بات کافی تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے تعلق جوڑنے کے لیے مزید کسی وجہ کی ضرورت نہیں تھی۔

میں اس امکانی تباہی کے تصور سے کانپ گیا جسے اس قسم کی صورت حال ہوا دے سکتی تھی۔

بہرحال، سانچا ڈھل چکا تھا۔ اب میں معاملات کا انچارج نہیں رہا تھا اور صرف ایک طرف کھڑے ہو کر مزید احکامات کا منتظر رہ سکتا تھا۔ البتہ کسی بھی غیر قانونی قدم کو ویٹو کرسکتا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں خود کو اس معاملے سے فارغ کردوں، آڈرے کو اس کی رقم لوٹا دوں اور اس پورے مذموم معاملے سے کنارہ کرلوں۔

لیکن یہ ایک راہِ فرار تھی۔ ان کو یکجا کرنے کا ذمے دار میں تھا اور اب جو کچھ بھی ہونا تھا وہ میری بھی اتنی ہی غلطی قرار پاتی جتنی کہ ان دونوں کی۔ اس کے علاوہ آڈرے نے مجھے جو رقم بطور فیس دی تھی وہ میں پہلے ہی خرچ کر چکا تھا اور میرا بینک اکاؤنٹ اس بات کا اشارہ نہیں دے رہا تھا کہ میں وہ رقم اسے لوٹا سکوں گا۔

جیسن اور آڈرے فوری طور پر باہم یک دل ہوگئے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ان کے فوری شیر و شکر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں ہی اپنے اپنے شریک حیات کی بے وفائی کا شکار تھے یا اگر حالات مختلف ہوتے تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے باعث کشش تھے؟

میں اپنی کرسی پر بیٹھا انہیں اپنے مشترک مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن تھے اور مجھ پر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے جیسے میں ان کے درمیان موجود ہی نہیں ہوں۔

"کیا وہ ایک اچھی سیکس پارٹنر ہے؟" آڈرے پوچھ رہی تھی۔

جیسن کے حلق سے غراہٹ سی بلند ہوئی۔ "میں ایسا سوچا کرتا تھا، لیکن اب میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

آڈرے کے ہونٹوں پر کمزور سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"جون کو بھی پسند تھا کہ....." اس نے کہنا شروع کیا لیکن پھر شرما گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

جیسن نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور آڈرے کا بازو ہمدردی سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "آؤ، کہیں لنچ کرنے چلتے ہیں، وہیں اس بارے میں مزید بات بھی کرلیں گے۔"

☆☆☆

جب جیسن اور آڈرے لنچ کرنے گئے ہوئے تھے تو میں نے ایک مشکل فیصلہ کر ڈالا۔

میں اپنے ضمیر کے ساتھ اس بدمزگی کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا جو یقینی طور پر پیدا ہوگئی تھی۔ اگرچہ انہیں اکٹھا کرنے میں میری مرضی شامل نہیں تھی لیکن اس کا ذمے دار میں ہی تھا اور ان کی میٹنگ کے نتیجے میں جو کچھ بھی ہوتا اس کی ذمے داری بھی میں محسوس کر رہا تھا۔

اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس معاملے میں مزید ملوث ہونے سے خود کو الگ کرلوں۔

مجھ پر جیسن کی ذمے داری کا کوئی بوجھ نہیں تھا کیونکہ میں نے اس کا کیس لینے پر کسی قسم کی رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا اور جہاں تک آڈرے کا تعلق تھا۔ مجھ سے جس کام کا معاہدہ کیا گیا تھا وہ میں نے سرانجام دے دیا تھا۔ میں نے اس کے شوہر کا تعاقب کیا، اس پر نگاہ رکھی اور اس کے چال چلن یا اس کیس میں بدچلنی کی رپورٹ پیش کردی۔ میں حتمی رپورٹ لکھ کر خود کو کیس سے سبکدوش کرلوں گا۔

کیس ختم!

آڈرے میلون اور جیسن فلپس اب اپنے ذمے دار آپ تھے۔

اکثر شریک حیات اسی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جیسا آڈرے نے کیا تھا۔ آنسو بہانا، ایک دوسرے پر الزام تراشی اور آخر میں عام طور پر اس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔ میں ان معاملات سے مستثنیٰ ہوچکا تھا۔ میں جذباتی طور پر خود کو ملوث کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

آڈرے نے یہ خبر سن کر شانے اچکا دیے۔ ظاہر ہے کہ اب میں اس کے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ خاص طور پر جب اسے جیسن مل گیا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے ایک آخری درخواست کی۔ "کیا تم کسی فوٹوگرافر کی سفارش کرسکتے ہو؟"

میں نے اسے جو سینڈرز کا نام اور پتا دے دیا اور ساتھ ہی اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے اسے رخصت کردیا۔ میرے دفتر سے نکلتے وقت اس کی خوشی

دیدنی تھی۔ میں نے اس سے پہلے اسے اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

چند ہفتے مزید گزر گئے۔

میں نے اس کیس کو پس پشت ڈال دیا تھا اور اسے تقریباً بھول چکا تھا۔ بہرحال یہ بھی معمول کا ہی ایک کیس تھا جس میں دو کلائنٹس کا ایک ہی مسئلہ نمٹانا تھا۔ کاروبار میں برسوں کی وابستگی نے مجھے اس نوعیت کی عشق بازی اور بدنصیبی کے کیسوں کا عادی بنا دیا تھا اور مجھے ان کے درمیان کوئی خاص تفریق نظر نہیں آتی تھی۔

میں اس وقت کافی کا دوسرا کپ پی رہا تھا جب میری نگاہ اخبار کی اس خبر پر پڑی جو اس واقعے سے متعلق تھی جو گزشتہ شب نائٹ انگیل موٹیل میں پیش آیا تھا۔ نائٹ انگیل موٹیل وہی موٹیل تھا جہاں جولی فلپس اور جون میلون کی عشرت گاہ تھی۔

وہ خبر یوں تھی۔

"گزشتہ شب نو بج کر پندرہ منٹ پر نائٹ انگیل موٹیل پر پولیس کو طلب کیا گیا۔ موٹیل کے منیجر نے چوری کی ایک رپورٹ کے سلسلے میں پولیس کو فون کیا تھا۔ پولیس جب وہاں پہنچی تو انہوں نے موٹیل کی لابی میں خوف سے بوکھلائے ہوئے ایک مرد اور ایک عورت کو بیٹھے ہوئے پایا۔ دونوں کے جسموں پر تولیا کے علاوہ اور کوئی لباس نہیں تھا۔ 43 سالہ مرد نے اپنا تعارف جون میلون کی حیثیت سے کراتے ہوئے اس بات کی رپورٹ کی کہ جب وہ اور خاتون شاور لے رہے تھے تو کوئی اندر ان کے کمرے میں گھس آیا اور ان کے کپڑے چرا کر لے گیا۔ جولی فلپس نامی 38 سالہ خاتون نے موٹیل کا وہ کمرا اسی شام بک کرایا تھا۔

لباس کی چوری سے آگاہ ہونے کے بعد مسٹر جون میلون نے خود کو ایک بڑے تولیا میں لپیٹا اور اپنی کار کی جانب چل دیے تاکہ اس میں رکھا ہوا اضافی جوڑا لے آئیں لیکن پتا چلا کہ ان کی کار بھی چوری ہوچکی ہے۔ جب وہ اپنے کمرے کی طرف لوٹ رہے تھے تو اندھیرے میں سے ایک فوٹوگرافر سامنے آگیا اور ان کی تصویریں اتار لیں۔

تب مسٹر جون میلون نے منیجر کو چوری کی رپورٹ کی جس نے پولیس کو فون کردیا۔

جب دونوں یعنی جون میلون اور جولی فلپس کے متعلقہ شریک حیات آڈرے میلون عمر 40 سال اور جیسن فلپس عمر 42 سال، سے رابطہ کیا گیا تو دونوں نے چوری کی اس واردات سے لاتعلقی اور لاعلمی ظاہر کردی۔"

میں نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ اخبار نیچے رکھ دیا۔

میں تصور میں اس عشق باز جوڑے کو موٹیل کے دفتر میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ ان کے جسموں پر ڈھانپنے کے لیے تولیا کے سوا اور کوئی لباس نہیں تھا جبکہ پولیس اور اخباری رپورٹرز ان سے سوالات کر رہے تھے۔

میری نگاہ میں یہ ایک حقیقی انصاف تھا۔

مجھے یقین ہے کہ ملبوسات کی اس چوری میں میرا فوٹوگرافر دوست جو سینڈرز ملوث تھا۔ وہ ایک ماہر قفل شکن تھا۔ اس کے پیشے میں یہ ایک لازمی مہارت شمار ہوتی تھی۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اس واقعے کے محرک آڈرے میلون اور جیسن فلپس ہی تھے۔

میرے شبہے کی تصدیق اگلے دن ہی ہوگئی جب اخبار نے یہ خبر دی کہ جون میلون کی کار شہر کے ایک ایسے پس ماندہ علاقے میں کھڑی ہوئی ملی جہاں اس کے سوشل اسٹیٹس کے لوگ کبھی نہیں جاتے۔ کار کے چاروں ٹائر، اسٹیریو، جی پی ایس اور دیگر قیمتی اشیا غائب تھیں۔ البتہ کار کی ڈکی سے چند لباس بھی برآمد ہوئے جن میں کسی خاتون کا پرکشش زیر جامہ اور لباس بھی شامل تھے۔ ان کے بارے میں یقین کیا جا رہا ہے کہ یہ جولی فلپس کے ملبوسات ہیں۔

میں نے اخبار سے تمام متعلقہ خبریں تراش لیں اور انہیں آڈرے میلون کی کیس فائل میں لگا دیا۔

میں نے سوچا کہ میں پولیس کو فون کرکے انہیں تمام حقیقت سے آگاہ کردوں۔ بہ طور ایک فرض شناس شہری یہ میری ڈیوٹی تھی۔ لیکن مزید غور کرنے پر میں نے یہ فیصلہ بدل دیا۔

اصل نقصان صرف کار کا ہوا تھا اور یہ کار جتنی جون کی ملکیت تھی اتنی ہی آڈرے کی ملکیت بھی تھی۔ ان کے وقار اور مرتبے پر داغ لگنے کے علاوہ ان دونوں میں سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔

اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ جون میلون اور جولی فلپس اصل حالات سے باخبر ہوچکے تھے، لیکن وہ اسے ثابت نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے ہلکے سروں میں سیٹی بجاتے ہوئے آڈرے میلون کے کیس کا فولڈر فائل کیبنٹ میں رکھ دیا اور دراز بند کردی۔

میری دانست میں یہ دُہری بے وفائی کے اس کیس کا ایک خوشگوار انجام تھا۔

اناڑی

قسط: 69
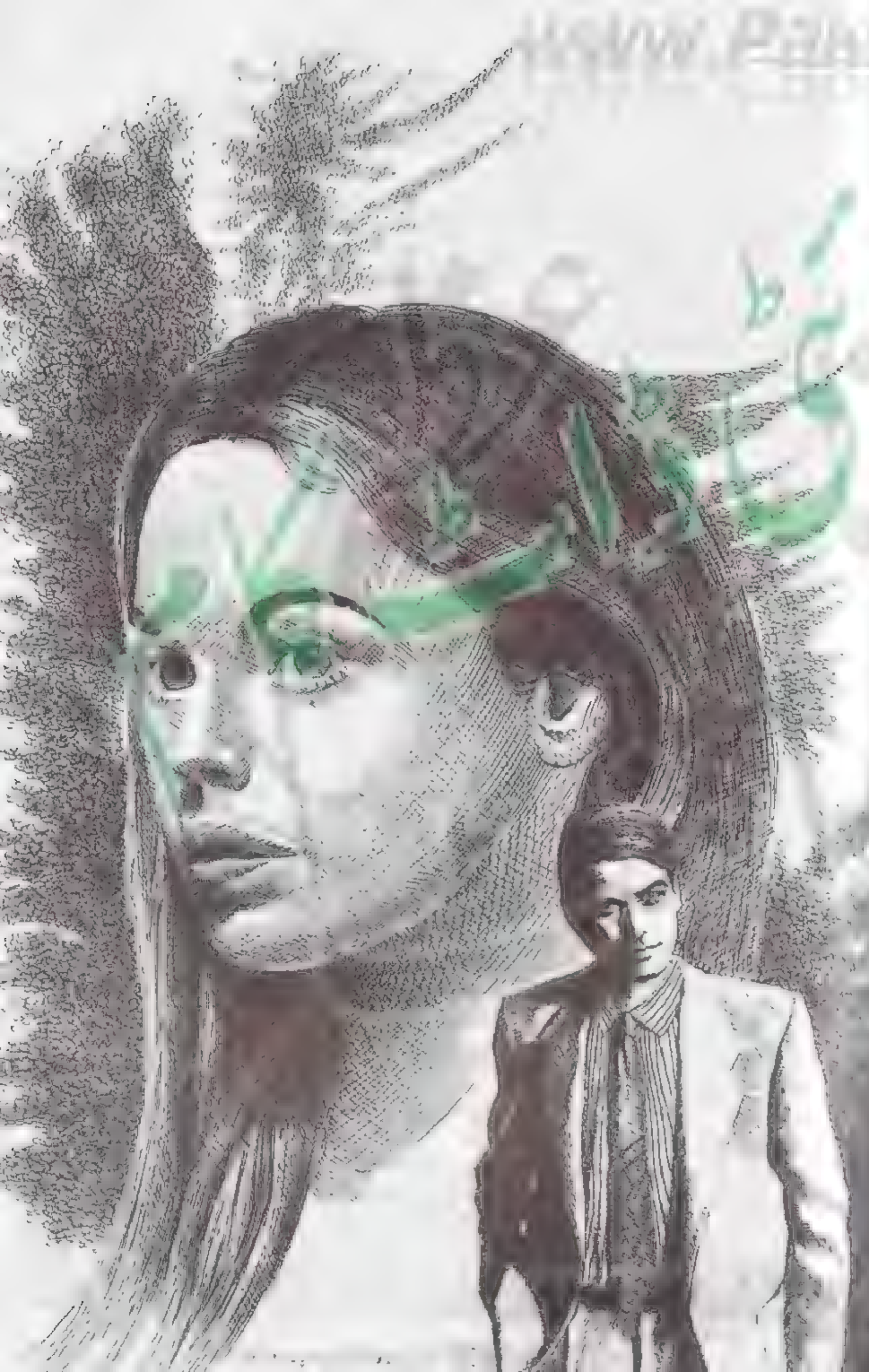
قسمت کے پھیر میں الجھی ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہائو اسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد... وہ لوٹا... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دورِ حاضر کے تقاضوں اور حالات کی عکاسی ایک داستان رنگ بہ رنگ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

گردو پیش کا احوال۔ منظر کشی کا کمال۔ ایک داستان لازوال، آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ اور سحر آفریں انداز تحریر نے تخلیق کیا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ بچ جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے زخمی حالت میں میرے پردادا کے پردادا نے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر بحفاظت رہتاس کے قلعے میں انگریزی چھاؤنی تک پہنچا دیا۔ انعام کے طور پر انگریز حاکم نے اجازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا چکر بیل گاڑی دوڑا کے لگا سکے وہ ان کے نام کر دی جائے گی۔ یوں ست بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آباؤ اجداد نواب کہلائے۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا لگی اور ان کے جوان بیٹے باری باری مختلف حادثات کا شکار ہو کے مر گئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن خراب موسم کے باعث جہاز [illegible] میں گر گیا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی تین بیویوں کو مارا اور پھر خودکشی کر لی...... حویلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لندن [illegible] کالج سے ریٹائر ہوئے... میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میرا تعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہو گیا۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بہانے امریکا بھیج دیا۔ ہارورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لارڈ ارنسٹ کی بزنس فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی ایلیشا مجھ پر فریفتہ ہو گئی اور اپنا نام تک بدل کر عائشہ بن گئی... مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا کیونکہ میں فریال کو چاہتا تھا۔ فریال پہلے ماڈل اور ایکٹریس تھی اور اپنی بے وقوفی کے باعث ایک عیاش اور فحش فلمساز چودھری سلطان سے منگنی بھی کر بیٹھی تھی..... میں نے اور فریال نے چھ سال تک اس کی عداوت کا مقابلہ کیا۔ اچانک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پردادا نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور دماغ کے سوا ان کا سارا جسم مفلوج تھا... ان کی معلومات کے مطابق میں ان کا رشتے دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ یہ وہی ساتویں بیٹے تھے جن کا جہاز لندن جاتے ہوئے سمندر میں گر گیا تھا..... وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بیہوشی میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کسی سراغرساں ادارے کی مدد سے انہیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہٰذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔

اب مجھے لوٹ کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان مگر منحوس سمجھی جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ [illegible] سے غیر آباد پڑی تھی۔ ریاست جی ٹی روڈ پر لاہور اور جہلم کے درمیان دینہ جانے والی سڑک پر رہتاس کے تاریخی قلعے کے کھنڈر [illegible] کے فاصلے پر تھی۔ حویلی کے تہ خانوں، بند تجوریوں اور مقفل الماریوں سے مجھے قیمتی ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن، [illegible] گاڑیاں بھی شامل تھیں اتنا بڑا خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اربوں تک پہنچ چکی تھی۔

اپنے چند دوستوں کی حمایت سے میں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ [illegible] فروغ، فرنیچر بنانے اور ایکسپورٹ کرنا اور دریائے کہان سے پن بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ [illegible] تھا۔ [illegible] دوستوں [illegible] کا جدی پشتی جاگیردار میرا دشمن ہو گیا۔ میری انسان دوستی اور غربا پروری کی شہرت پھیلی تو [illegible] صوبائی اسمبلی کی سیٹ [illegible] جسے وہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔ ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا نامور صحافی دوست راجا [illegible] ڈاکٹر شہباز کے علاوہ میری چچازاد بہن رابعہ اور میرے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا نامی گرامی ڈاکو میرا حامی اور دوست بن گیا۔ شامی بادشاہ [illegible] نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ معافی ملنے کے بعد ست بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما رچا کے سب کو راستے میں مار ڈالا...... زخمی شامی بادشاہ کو اس کی بیوی گولی نکال کر لے گئی۔ شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک و مختار بنانے والا برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی رابعہ سے شادی کر لیتا تو حق تلفی کا ازالہ ہو سکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا کسی کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے رابعہ کو بہن کا درجہ دیا اور وہ ست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دوبار دھوکا کھایا۔ بدقسمتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے رفتہ رفتہ رابعہ بھی مجھے حق تلفی اور اپنے والدین کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے محافظ کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی داشتہ تھی۔ بردہ فروشی سے منشیات فروشی تک ہر کاروبار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی لیکن نور جہاں جیسی حسین عورت نہیں دیکھی۔ اس نے مجھ سے مراسم استوار کرنے میں جائز و ناجائز کو نہیں دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہد و پیمان کے باوجود میں نور جہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نام نہاد شوہر کو بھی قتل کر دیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ فریال میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکاچوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نور جہاں کے معاملے نے اسے جواز فراہم کر دیا اور وہ لوٹ کر شوبزنس میں چلی گئی جہاں چودھری سلطان کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملتے ہی اس نے چودھری سلطان کو قتل کرا دیا اور اپنے اعلیٰ سطحی مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔ نور جہاں نام نہاد شوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر ماہ نور بن گئی۔ ایک نئے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا حصول مشکل نہ تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تاکہ وہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی واپس آجائے۔ میں اسے لارڈ ارنسٹ کی مدد سے برطانوی شہریت بھی دلوانا چاہتا تھا۔ دو سال بعد لندن پہنچ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ عائشہ دوبارہ ایلیشا بن چکی ہے اور ڈپریشن کے باعث نشہ کرتی ہے۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور باپ

سیاسی اور کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ عائشہ کا عشق مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا، اس نے نور کو اغوا کرا کے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ نور کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ ڈراما بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا اس کی وارث صرف عائشہ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس کی بزنس ایمپائر کو چلا نہیں سکتی، اس نے مرنے سے پہلے اپنی ایک سو بیس ملین پاؤنڈ کی جائداد اور وسیع کاروبار کا مالک مجھے بنا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد عائشہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ میرے انکار اور ماں باپ کی موت نے عائشہ کے احساس جرم کو شدید تر کر دیا اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ترک دنیا کر کے چرچ میں نن ہو گئی۔ قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری لاٹری میرے لیے ایک آزمائش بن گئی۔ نور یہاں اکیلی رہنے پر راضی تھی اور نہ میں یہاں رہتا یا واپس جاتا۔ پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ اچانک مجھے وہ شخص مل گیا جو چیف کہلاتا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلاوطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بنا لوں تو آئندہ انتخابات میں اپنے حریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر اس کی پیشکش قبول کر لی۔ ست بدھائی کے اسپتال کو وسعت دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے، اس فیملی کی تیسری رکن مینا بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور پھر شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب وحید مان لیا اور کسی حد تک نارمل بھی ہو گئی۔ وحید ایک لاابالی مصور تھا جو لندن میں عریاں تصویریں بنا کے اپنا فن اونے پونے بیچ رہا تھا اور استحصال کا شکار تھا...... مینا سے اپنی جان چھڑانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا، وہ ہوبہو میری کاربن کاپی تھا۔ میں نے اس کے تمام قرض بے باق کیے تھے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ چیف نے مجھے بھی ٹپ دی کہ میں وحید کو اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ [illegible] اصل نام [illegible] علی تھا۔

اگرچہ میں [illegible] کر سکتا تھا کہ ست بدھائی کو رابعہ کے سپرد کر دوں تاکہ اس کا حق تلفی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید پھیلاؤں۔ مگر نور [illegible] سمجھتی [illegible] میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں [illegible] کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ارنسٹ کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ [illegible] ملازمت چھوڑ گئے [illegible] سابق شوفر اور باڈی گارڈ نے میری راستوں سے ناواقفیت کے باعث مجھے ایک ویران احاطے میں لے جا کر قتل کرنے کی کوشش کی [illegible] میں نے غلام علی کو طلب کیا اور خود ایلیشا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ غلام علی نے احاطے میں کھڑا ٹریکٹر چلا کر ریت کے ڈھیر میں لاشوں کو دبا دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے وہ گرفتار ہو گیا..... میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتا دیا جو غلام نے اعتماد میں مجھے بتایا تھا۔ چارلی کے مددگار اپنی جان بچانے [illegible] اغوا کر لیا گیا۔ مگر سرغنہ کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ [illegible] چیف کی ایک نفسیاتی کمزوری کی بدولت میں نے یہ جان لیا کہ سرغنہ اصل چیف نہیں بلکہ اس کا ڈپلی کیٹ ہے۔ ادھر لندن پولیس کی مہارت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے چیف اور اس کے گرگے گرفتار کر لیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک معمر انگریز جوڑے کی مدد سے اپنے گھر پہنچا۔ پھر میں نور کے ساتھ مل کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں اور نور تمام امور سے نمٹ کر مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک ایلیشا برقعے میں ملبوس پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی جائداد کی واپسی کا مطالبہ کر رہی تھی مگر مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ تھا لہٰذا میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے پستول نکال لیا اور دیوانگی کی حالت میں مجھ پر فائر کر دیا۔ پولیس اسے لے گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ایلیشا نے جواباً مجھ پر الزامات کی بوچھار کر دی لیکن وہ اب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لارڈ ارنسٹ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے ایلیشا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز سختی سے مسترد کر دی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں ست بدھائی رابعہ کے نام کر دوں اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں۔ میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہرحال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ نور بڑی مشکل سے تنہا لندن میں رہنے پر راضی ہوئی۔ ایئرپورٹ پر میرا بریف کیس چوری ہو گیا جس کے باعث فلائٹ سے میری روانگی خطرے میں پڑ گئی۔ اسی کشمکش میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بے ہوش کر دیا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اغوا کار کون ہیں پھر جب رابعہ میرے سامنے آئی تو میں بھونچکا رہ گیا اور مزید یہ کہ اس نے میرے حریف زوہیب کے ساتھ مل کر یہ ڈراما رچایا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ جاگیر اس کے نام کی جائے۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کے دوران ایک بات پر مشتعل ہو کر اس نے ریوالور سے مجھ پر فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ اسی اثنا میں اس کے کارندے داخل ہوئے اور اسے لے کر چلے گئے۔ ایک دن میرے کمرے میں ٹی وی رکھ دیا گیا جس کے ذریعے راجہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ مسلسل قید اور ذہنی اذیت کے باعث میں اتنا بے زار تھا کہ میں نے اس کا مطالبہ منظور کر لیا۔ معاملہ یہ طے پایا کہ میں جاگیر رابعہ کو گفٹ کر دوں گا۔ بعد ازاں راجہ نے مجھ سے رابطہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی میں نے انکار کیا تو وہ اپنی ناکامی پر دوبارہ مخالفت پر کمربستہ ہو گئی۔ یہاں مجھے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وکیل اور راجا کے درمیان میں آجانے سے جان کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

قید کے دوران ایک دن میری نگرانی پر مامور افراد میں سے ایک کے دل میں آخرہم نیکی کا جذبہ بیدار ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں رخنہ ڈال کر مجھے رہائی دلا دی۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی متروک گیسٹ ہاؤس تھا۔ ویرانے میں مجھے ایک دیہاتی جوڑا نظر آیا جو مجھے ایک سابق فوجی خلیل صاحب کے گھر تک لے گیا جہاں خلیل صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجا سے رابطہ کرنے اور وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ رابعہ کی پراسرار گمشدگی پریشان کن تھی۔ راجا مجھے ایک اسپتال لے گیا تاکہ میری صحت پر منفی اثرات زائل ہوں۔ پھر مجھے ریشم کے ہاں ولادت اور مینا کے ساتھ وحید کی شادی کی خوشخبری ملی۔ اچانک رابعہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہی مگر راجا نے اسے جھڑک دیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اطلاع دی کہ کسی عورت کی لاش پاس کے علاقے میں ملی ہے۔ میں نے اسپتال جا کر دیکھا تو لاکٹ اور دیگر نشانیوں سے وہ رابعہ ثابت ہوئی جس کا چہرہ مسخ تھا۔ میں افسردہ واپس آرہا تھا کہ میرے عقب میں آتی گارڈز کی گاڑی دھماکے سے تباہ ہو گئی اور ایک خونی معرکے کے بعد میں حویلی واپس پہنچا تو نور نے فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آرہی ہے لہٰذا میں اسے لینے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے میں مولاداد نامی ڈاکو نے مجھے اغوا کر لیا۔ مولاداد کے ڈیرے پر نیلم نامی لڑکی نے مجھے اس کے عزائم سے آگاہ کیا اور میری مدد کی۔ یہاں میں

کہا۔ ''میں کچھ دیر تازہ ہوا کھانا چاہتا ہوں۔''

جمال خان شیروانی کا ایک ملازم لاؤنج سے کرسیاں اٹھالایا۔

اسی وقت دو سپاہی غنی اور احمد شاہ کو وہاں لے آئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑی ہوئی تھی۔

غنی اور احمد شاہ کو اس حالت میں دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔

ایس ایس پی نے میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''ان دونوں کی ہتھکڑی کھولو۔''

ایک سپاہی نے فوراً ہی ان کی ہتھکڑی کھول دی۔

ہتھکڑی کھلتے ہی احمد شاہ اور غنی نے فوجی انداز میں مجھے سلام کیا اور غنی بولا۔ ''سر! پولیس والوں نے ہماری کوئی بات سنی ہی نہیں۔ بس ہمیں گرفتار کرلیا۔''

''آپ ہی کی ہدایات ہیں سر کہ ہمیں پولیس والے پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔'' احمد شاہ نے کہا ''اور قانون کا احترام کرنا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ پھر میں ایس ایس پی سے مخاطب ہوا۔ ''ان دونوں کے سیل فون اور دوسری چیزیں کہاں ہیں؟'' میں نے جان بوجھ کر ریوالور کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

''وہ تمام چیزیں پولیس کی تحویل میں ہیں۔'' ایس ایس پی نے مزید کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ان دونوں کے پاس ان ہتھیاروں کے لائسنس بھی ہوں گے جو ان کی جیبوں سے برآمد ہوئے ہیں۔''

''ابھی تم نے سنا نہیں آفیسر!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کہ میرے آدمی نے کیا کہا ہے کہ قانون کا احترام کرنا، وہ کوئی غیر قانونی کام کیسے کر سکتے ہیں؟ تم کہو گے تو وہ لائسنس بھی دکھادیں گے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے نواب صاحب!'' ایس ایس پی نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ان کا اسلحہ غیر قانونی نہیں ہوگا۔'' پھر وہ غنی سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں، اب بتاؤ تم نے ثمرہ کو کیسے بازیاب کرایا؟''

غنی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے خفیف سا اشارہ کیا کہ ایس ایس پی جو پوچھ رہا ہے، بتادو۔

غنی نے میری ہدایت کے مطابق اسے وہی کہانی سنادی۔

''ان لوگوں سے تمہارا مقابلہ کہاں ہوا تھا؟'' ایس ایس پی نے پوچھا۔

''ملتان روڈ کی ایک سنسان اور ذیلی سڑک پر!'' غنی نے جواب دیا۔ ''وہ ٹویوٹا ممکن ہے اب بھی وہاں موجود ہو۔''

''ممکن سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' ایس ایس پی نے پوچھا۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ مجرموں کے ساتھیوں نے وہ گاڑی اور لاشیں وہاں سے غائب کردی ہوں۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' ایس ایس پی نے کہا۔

''میں امکان ظاہر کر رہا ہوں۔'' غنی نے کہا۔ ''مجرموں کے اور ساتھی بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''ناصر صاحب!'' ایس ایس پی نے کہا۔ ''آپ کہہ رہے تھے کہ مجرموں کا ایک ساتھی آپ کے قبضے میں بھی ہے۔''

''میں کہہ رہا تھا؟'' ناصر نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''میں نے ایسا کب کہا ہے؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ غنی اور احمد شاہ کا مقابلہ کہاں ہوا ہے؟''

غصے سے ایس ایس پی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ناصر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اسی وقت اسے حراست میں لے لیتا۔

''تم دونوں میرے ساتھ چل کر اس جگہ کی نشان دہی کرانا جہاں تمہارا مجرموں سے مقابلہ ہوا تھا۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو غنی نے کہا۔ ''ہم اس جگہ کی نشان دہی ضرور کریں گے۔''

ایس ایس پی نے ایک سب انسپکٹر اور چار سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ جاؤ اور جائے واردات کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے رپورٹ دو۔

غنی اور احمد شاہ پولیس والوں کے ساتھ چلے گئے۔ ایس ایس پی نے ان کے ریوالور، نقدی اور سیل فون سب کچھ لوٹا دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے بھی شیروانی صاحب سے کہا۔ ''شیروانی صاحب اب مجھے بھی اجازت دیں۔''

''نواب صاحب! ایسے کیسے جاسکتے ہیں آپ؟ کچھ چائے وغیرہ تو پی لیں۔''

''آپ کی چائے اور وغیرہ ڈیو رہی، پھر کسی وقت سہی، اس وقت تو مجھے دوسرے ضروری کام ہیں۔''

جمال خان شیروانی مجھے رخصت کرنے گاڑی تک آیا

اور آہستہ سے بولا۔ ''نواب صاحب! آپ نے کہا تھا کہ وہ ویڈیو اب آپ کے پاس ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ ویڈیو واقعی میرے پاس ہے۔ آپ چاہیں گے تو میں آپ کو دکھا بھی دوں گا لیکن میرا مشورہ ہے کہ آپ وہ ویڈیو نہ ہی دیکھیں تو اچھا ہے۔''

''نواب صاحب! اس ویڈیو میں ایسا کیا ہے؟'' جمال خان شیروانی نے پوچھا۔

''اس میں وہ کچھ ہے کہ کوئی بھی غیرت مند باپ اپنی بیٹی کی ایسی شرم ناک ویڈیو نہیں دیکھ سکتا۔'' پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس ایس ایس پی کو ڈیوٹی سے ہٹادیں۔''

''میں نے آئی جی صاحب سے کہا تھا۔'' جمال خان شیروانی نے کہا۔ ''انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ زاہد کو وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے افسر کی ڈیوٹی لگادیں گے۔''

''چوبیس گھنٹے تو بہت ہوتے ہیں شیروانی صاحب۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، آئی جی صاحب کسی دوسرے افسر کو یہاں بھیجیں گے تو ایس ایس پی زاہد کو ہٹائیں گے۔''

''آپ ان سے کہیں کہ زاہد کو فوری طور پر یہاں سے ہٹادیں۔ دوسرا افسر بعد میں آتا رہے گا۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' شیروانی نے کہا۔ ''میں ابھی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں کہ زاہد کو فوری طور پر یہاں سے ہٹادیں۔''

''ہاں، ثمرہ نیند سے جاگے تو ایس ایس پی کو اس سے بھی مت ملنے دیجیے گا۔''

''ثمرہ اس وقت بھی جاگ رہی ہے۔'' شیروانی نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ یہ ایس ایس پی اس سے الٹے سیدھے سوالات کرے۔''

''میں بعد میں آؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس وقت تک یہ ایس ایس پی یہاں سے جاچکا ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں گاڑی میں سوار ہوگیا۔

اس وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف غنی تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگانے کے بعد کہا۔

''ہاں غنی!''

''سر! یہاں تو نہ وہ گاڑی ہے، نہ ان لوگوں کی لاشیں۔

کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ایسے آثار بھی نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ یہاں مسلح تصادم ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسے آثار تو ہیں۔'' غنی نے جواب دیا۔ ''جھاڑیاں کئی جگہ سے کچلی ہوئی ہیں۔ دو تین جگہ خون کے دھبے بھی ہیں اور پولیس کو کئی جگہ سے کارتوسوں کے خول بھی ملے ہیں لیکن آدمی کوئی نہیں ملا۔ البتہ وہاں دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ضرور ہیں۔ ان میں سے ایک تو ہماری گاڑی کے نشانات ہیں، دوسرے نشانات اس ٹویوٹا کے ہیں۔''

''تم لوگ وہاں سے سیدھے گھر پہنچو۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہاری گاڑی بھی اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔''

''اوکے سر!'' غنی نے کہا۔

''ناصر!'' میں نے سلسلہ منقطع کرتے ہوئے ناصر سے کہا۔ ''گاڑی واپس لے لو، ہمیں وہاں سے اپنی ڈبل کیبن پک اپ بھی لینا ہے۔''

''تجھے اس گاڑی کا خیال پہلے نہیں آیا کیسے پتر؟'' راجا نے کہا۔

''آیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال تھا کہ اسے غنی اور احمد شاہ لے آئیں گے۔ غنی اور پولیس پارٹی کو وہاں کچھ بھی نہیں ملا ہے۔ نہ ان اغوا کنندگان کی گاڑی ہے، نہ ان میں سے کسی کی لاش ہے۔ پولیس ایک مرتبہ پھر غنی اور احمد شاہ کو پریشان کرسکتی ہے۔''

''اس صورت میں تو گاڑی وہاں سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''گاڑی میں تو بہت سا اسلحہ بھی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ سب ممنوعہ بور کا اسلحہ ہے۔ اگر گاڑی سے وہ برآمد ہوگیا تو غنی اور احمد شاہ کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی پریشانی کھڑی ہوجائے گی۔''

ناصر نے فوراً گاڑی کو یوٹرن دے دیا۔ ہم اس وقت وہاں سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ دو منٹ بعد ہم پھر شیروانی کے بنگلے پر پہنچ گئے۔

اس وقت مجھے ایس ایس پی نظر آیا۔ وہ پولیس کی ایک جیپ میں کہیں جارہا تھا۔

ہماری پک اپ اب بھی وہیں کھڑی تھی جہاں میں نے پہلے دیکھی تھی۔

''گاڑی کی چابی غنی کے پاس ہوگی۔'' ناصر نے کہا۔

''ایک چابی میرے پاس بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

”گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ایک کی رنگ ہے۔ اس میں ان تمام گاڑیوں کی ڈپلی کیٹ چابیاں موجود ہیں جو ہمارے استعمال میں ہیں۔“

ناصر نے ڈیش بورڈ کھولا تو اس میں چابیاں موجود تھیں۔

ہمیں دوبارہ وہاں دیکھ کر ڈیوٹی پر موجود پولیس اہلکار مستعد ہوئے۔ ایک پولیس والے نے بنگلے کا گیٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ ہم صرف اپنی گاڑی لینے آئے ہیں۔

میں نے راجا سے کہا کہ تم وہ پک اپ لے کر ہمارے ساتھ ساتھ چلو۔

راجا نے چابیوں کا گچھا لیا اور دو چابیاں لگانے کے بعد تیسری چابی سے گاڑی کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر وہ اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ پولیس والوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

”بال بال بچ گئے۔“ میں نے وہاں سے نکلنے کے بعد کہا۔ ”اس گاڑی میں ممنوعہ بور کا اسلحہ تو تھا ہی، غنی نے شاید دستی بم بھی رکھ لیا ہو تو کچھ بعید نہیں۔“

”واقعی سر!“ ناصر نے کہا۔ ”فضول کی پریشانی گلے پڑ جاتی۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ شیروانی صاحب نے آئی جی صاحب سے بات کرلی ہے اور ایس ایس پی زاہد کو وہاں سے ہٹادیا ہے۔“

”شیروانی صاحب کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔“ میں نے کہا۔ ”اب ہمیں نور کو بازیاب کرانا ہے۔ میں نے اسی لیے اپنا میک اپ ختم کرایا ہے کہ دشمن سامنے ہی نہیں آرہے تھے۔“

”سر! دشمن تو ہمارے سامنے ہی ہیں۔“

”یہ تو چھوٹے موٹے کرائے کے لوگ ہیں۔ اب تو میرا ٹارگٹ رانا زوہیب، دلاور اور مسکین شاہ ہیں۔“

”مسکین شاہ تو کل پرسوں اپنی موت آپ مرجائے گا۔“ ناصر نے کہا۔ ”میں اور ناصر ل کر ابھی اس کے خلاف خبر بناتے ہیں، اس خبر سے ملک میں ایک بھونچال آجائے گا۔ مسکین شاہ عوامی حلقوں میں بہت نیک نام ہے۔ جب اس کے چہرے سے نقاب اترے گا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا۔“

میں نے سوچا، ممکن ہے مسکین شاہ کو نور کے بارے میں کوئی علم ہو۔ اس پر دباؤ ڈال کر نور کے بارے میں معلوم بھی کیا جاسکتا تھا۔

میں نے اسی خیال کا اظہار ناصر سے کیا تو۔۔

”ہاں، مسکین شاہ سے اس بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایسا کریں، اس کے خلاف جو تحریری ثبوت ہیں، ان کی ایک ایک فوٹو کاپی اور آڈیو کیسٹس کی ایک ایک نقل اس کے پاس پہنچ جائیں۔ پھر اس کا ردعمل دیکھیں۔“

”میں اس سے سودے بازی تو ہرگز نہیں کروں گا۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”وہ چاہے نور کے بارے میں بتائے یا نہ بتائے۔ میں اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا کر لوں گا۔ اس کی سیاسی موت تو پہلے واقع ہوجائے گی۔“

”ہم بھی اسے چھوڑیں گے نہیں۔“ ناصر نے کہا۔ ”میں تو صرف اس پر دباؤ ڈالنے کی بات کررہا ہوں۔“

باتوں کے دوران ہم گھر پہنچ چکے تھے۔

میں نے چونک کر ناصر سے کہا۔ ”یار، تمہاری باتوں میں مجھے اپنے عقب میں توجہ دینا ہی یاد نہیں رہا۔ ممکن ہے وہاں سے کسی نے ہمارا تعاقب کیا ہو؟“

”آپ فکر نہ کریں۔“ ناصر مسکرا کر بولا۔ ”میری پوری توجہ اس طرف بھی تھی۔ کسی بھی گاڑی نے ہمارا تعاقب نہیں کیا ہے۔“

پورچ میں غنی کی ڈبل کیبن پک اپ بھی کھڑی تھی۔ گویا وہ ہم سے پہلے ہی گھر پہنچ چکا تھا۔

حیرت تو نے غنی اور احمد شاہ کو دیکھ کر ہوئی۔ غنی نے بتایا کہ پولیس کی جو پارٹی جائے واردات کا جائزہ لینے آئی تھی، انہی لوگوں نے ہمیں گلبرگ چھوڑ دیا تھا۔ ہم وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر سیدھے یہاں پہنچ گئے۔

”تم پہلا کام تو یہ کرو غنی کہ پک اپ میں سے تمام اسلحہ نکال کر کہیں چھپادو۔“

”اسے گھر میں مت چھپانا۔“ ناصر نے کہا۔ ”ممکن ہے پولیس تمہارا بیان لینے کو ایک مرتبہ پھر یہاں پہنچے اور......“

”نواب بھائی!“ شامی نے کہا۔ ”اسلحے سے زیادہ خطرناک وہ لڑکی ہے جو اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم!“ میں نے کہا۔ پھر راجا سے بولا۔ ”کیا خیال ہے راجا، اس لڑکی کو ست بدھائی بھجوادوں؟“

”ست بدھائی کیوں؟“ شامی نے پوچھا۔ ”کیا لاہور میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟“

”ممکن ہے یہ ٹھکانا بھی دشمن کی نظروں میں آگیا ہو؟“ میں نے کہا۔ ”اس موقعے پر میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

”ست بدھائی میں تو خطرہ اس سے بھی دوگنا ہے۔“ شامی نے کہا۔ ”پولیس اور ہمارے دشمن لڑکی کی تلاش میں سب سے پہلے ست بدھائی ہی کا رخ کریں گے اور وہاں کا رخ تو وہ کر بھی چکے ہیں۔“

”تو پھر کیا کروں؟“ میں نے کہا۔ ”کیا اس لڑکی کو یہیں رہنے دوں؟“

”میرے پاس لاہور میں اب بھی کئی محفوظ ٹھکانے ہیں۔“ شامی نے کہا۔ ”اگر مجھ پر اعتبار کرتے ہو تو اب بھائی تو اس لڑکی کو میرے ساتھ بھیج دو۔ گولی چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہے گی۔ آپ چاہیں تو اپنا بھی کوئی آدمی وہاں چھوڑ دیں۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو شامی بادشاہ؟“ میں نے برا مان کر کہا۔ ”مجھے تم پر اعتبار نہیں ہوگا؟ تمہاری یہ بات سن کر بہت افسوس ہوا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا نواب بھائی!“

”شامی بادشاہ!“ راجا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ لڑکی کو لے کر ابھی نکل جاؤ۔ تمہارے اور گولی کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی کی کیا ضرورت ہے۔“

”تم میری گاڑی لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”احمد شاہ اور غنی لڑکی کو اس محفوظ مقام پر چھوڑ کر واپس آجائیں گے۔“ پھر میں نے غنی سے کہا۔ ”پک اپ کا اسلحہ بھی میری گاڑی میں منتقل کردو۔ وہ اسلحہ بھی شامی کے اسی ٹھکانے پر چھوڑ آنا۔“

غنی فوراً ہی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں ذرا ارم سے مل لوں۔ نہ جانے اس کا کیا حال تھا؟

میں نے نیلم کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ”نیلم! ارم کا اب کیا حال ہے؟“

”اس کا حال بہت برا ہے صاحب جی!“ نیلم نے کہا۔ ”وہ ڈھنگ سے کھاتی ہے نہ سوتی ہے۔ وہ تو کپڑے بھی نہیں بدلتی۔“

”چلو میرے ساتھ!“ میں نے کہا۔ ”میں ایک نظر اسے دیکھ لوں۔“

میں ارم کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے شدید دھچکا لگا۔ جب میں اسے یہاں لایا تھا تو وہ گلاب کی طرح تروتازہ تھی لیکن اس وقت بالکل مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ وہ خلا میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے شدید شرمندگی محسوس ہوئی کہ میری وجہ سے پھول سی ایک بچی ان حالوں کو پہنچ گئی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ارم!“

میری آواز پر سر گھما کر اس نے مجھے دیکھا، پھر تیزی سے اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”انکل! آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے گھر چھوڑ دیں گے۔ آپ تو خود ہی پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔“

”فکر مت کرو بیٹا؟“ میں نے کہا۔ ”اب میں آگیا ہوں نا! اب میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔ بس ایک دو دن کی بات اور ہے۔“

وہ بری طرح رونے لگی۔ ”انکل! خدا کے واسطے مجھ پر رحم کریں۔ مجھے...... مجھے میرے گھر چھوڑ دیں...... مجھے گھر چھوڑ دیں انکل...... پلیز!“ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میرا ضمیر اس وقت مجھے شدید ملامت کررہا تھا کہ اگر کسی نے نور کو اغوا کرلیا ہے تو اس میں ارم کا کیا قصور ہے؟ ہماری اس دشمنی اور چپقلش کی بھینٹ یہ معصوم کیوں چڑھ رہی ہے؟

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ارم بیٹا! میں تو تمہیں ابھی چھوڑ دوں لیکن تمہارا باپ......“

”انکل، پلیز میری بات کرائیں ڈیڈی سے...... پلیز انکل! میں ان سے کہوں گی کہ اگر انہوں نے فوراً ہی آپ کی بات نہ مانی تو پھر میں بھی ان کے پاس نہیں آؤں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں انکل! پھر میں ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس رہوں گی۔ باپ تو بیٹیوں کے لیے اپنی جان تک قربان کردیتے ہیں۔ یہ کیسا باپ ہے جسے میری ذرہ برابر پروا نہیں ہے۔ یہ کیسا باپ اور کیسی ماں ہے جسے بالکل فکر ہی نہیں ہے کہ ان کی جوان بیٹی دوسروں کے قبضے میں ہے۔“ وہ اب ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔

”بیٹا! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟“ میں نے کہا۔

”یہ تو میں جانتی ہوں انکل!“ ارم نے کہا۔ ”ڈیڈی کو نہیں پتا کہ میں کیسے لوگوں کے درمیان ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ چین سے سو کیسے جاتے ہیں؟“

”اچھا تم زیادہ ٹینشن مت لو۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے آنسو پونچھ لو۔ میں ابھی تمہارے باپ سے بات کرتا ہوں۔“ پھر میں نیلم سے مخاطب ہوا۔ ”نیلم! ارم کو پانی پلاؤ اور ہمارے لیے کافی اور سینڈوچز وغیرہ لے کر آؤ۔ آج میں اپنی بچی کے ساتھ کافی پیوں گا۔“

”میرا کچھ بھی کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے انکل!“ ارم نے کہا۔

”بیٹا! زندگی میں بہت سی باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتی ہیں۔ پھر کھانا تو ایسی چیز ہے کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا ہی پڑتا ہے۔“ پھر میں نیلم سے مخاطب ہوا۔ ”ایک کام کرو۔ کافی لانے سے پہلے ارم کو ذرا اچھے سے صاف ستھرے کپڑے پہنا دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

”انکل!“ ارم نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں، آپ پھر چند دنوں کے لیے کہیں چلے جائیں گے۔ آپ پہلے بھی اسی طرح بتائے بغیر اچانک کہیں چلے گئے تھے۔“

”سوری بیٹا!“ میں نے کہا۔ ”اس وقت کچھ ایمرجنسی تھی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ تم شاور لے کر جلدی سے کپڑے بدلو، پھر ہم ایک ساتھ کافی پییں گے۔“

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آگیا۔

”گاڑی تیار ہے سر!“ غنی نے کہا۔

”ابھی ارم واش روم میں ہے۔“ میں نے کہا۔

”جلدی کر فیکے پتر!“ راجا نے کہا۔ ”اس وقت میری چھٹی حس کام کر رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔“

”غنی!“ میں نے اس سے کہا۔ ”نیلم سے کہو، ارم جوں ہی باتھ روم سے نکلے، اسے بے ہوش کر دے۔“

”نیلم کیسے بے ہوش کرے گی فیکے پتر!“ راجا نے کہا۔ ”اس کے بے ہوش کرنے سے ارم کہیں مر ہی نہ جائے۔“

”پھر یہ کام تجھے کرنا پڑے گا راجا!“ میں نے کہا۔

غنی وہاں سے جا چکا تھا۔ فوراً ہی اس نے آ کر بتایا کہ ارم کپڑے بدل چکی ہے اور آپ کو بلا رہی ہے۔

”فیکے پتر! تو اسے بے ہوش کر کے گاڑی تک پہنچا دے۔ تو یہ کام بہت آسانی سے کر سکتا ہے۔“

میں ارم کے کمرے میں پہنچا تو وہ پہلے کے مقابلے میں نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔

”ارم بیٹا!“ میں نے کہا۔ ”میں نے ابھی تمہارے باپ کو فون کیا تھا لیکن اس کا سیل فون بند ہے۔“

”آپ ایک مرتبہ پھر ٹرائی کریں انکل!“ ارم نے کہا۔

”میں کئی دفعہ کوشش کر چکا ہوں بیٹا!“ میں نے کہا۔ ”تھوڑی دیر بعد پھر کوشش کر لوں گا۔“ پھر میں نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”ارم بیٹا! اگر تمہیں کوئی تکلیف ہے تو مجھے بتاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے غیر محسوس طریقے پر اس کی دونوں کنپٹیاں دبا دیں۔

دوسرے ہی لمحے وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔

غنی نے ارم کو گاڑی میں منتقل کیا۔ پھر غنی، ہشامی اور گولی ارم کو لے کر روانہ ہو گئے۔

میں نے احمد شاہ کو دوسری گاڑی میں ان کے پیچھے بھیج دیا تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو وہ غنی کو مدد دے سکے۔

میں نے نیلم سے کہا۔ ”ارم کے کمرے کی اچھی طرح صفائی کر دو اور خود اس کمرے میں منتقل ہو جاؤ۔“

اس سے فارغ ہو کر میں نے سیل فون کی سم تبدیل کی اور آفتاب خان کا نمبر ملا لیا۔

آفتاب خان نے دوسری ہی گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہیلو!“

”آفتاب خان! میری دی ہوئی مہلت ختم ہو چکی ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی کی انگلیاں تمہیں ارسال کر دوں؟“ میرا لہجہ سرد اور خطرناک تھا۔

”میں تو تم سے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگ سکتا۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”جب تک تمہیں نور نہیں ملے گی، تم کوئی بات بھی سننے پر آمادہ نہیں ہوتے اور نور اب میری پہنچ سے بھی دور ہے... اس لیے... اس لیے... میں... تم سے ایک درخواست کر سکتا ہوں کہ... میری بیٹی کو... اذیت دے کر مارنے کے بجائے... ایک ہی دفعہ میں مار دینا... میں... تم سے رحم کی... بھیک نہیں مانگ رہا ہوں... اگر میری بیٹی کی جان لینے سے... تمہاری پرابلم حل ہو جائے تو... ضرور اس... کی جان لو... بس... تم سے ایک ہی درخواست ہے کہ...“

وہ مسلسل ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں؟ میں نے نہ صرف سلسلہ منقطع کیا بلکہ سیل فون بھی بند کر دیا۔

”کیا کہہ رہا تھا آفتاب خان؟“ راجا نے پوچھا۔

”وہ تو اپنی بیٹی کی زندگی سے پوری طرح مایوس ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”رو رو کر مجھ سے درخواست کر رہا تھا کہ اس کی بیٹی کو اذیت دے کر نہ ماروں، بس ایک بار میں ختم کر دوں تاکہ اس معصوم کو تکلیف نہ ہو۔“

”اوہ!“ راجا نے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ واقعی مجبور ہے اور نور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”ایک کام ہو سکتا ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”ہم آفتاب خان کو اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں۔“

”آفتاب خان کو؟“ میں نے پوچھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”ہاں، ہم اسے اپنے ساتھ تو ملا سکتے ہیں لیکن اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔“

”میں اس پر اعتبار کرنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ ناصر نے کہا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس کی ہمدردیاں حاصل کر لوں۔ اپنی بیٹی کی وجہ سے وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔“

”ہاں، لیکن اسے نور کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔“

”نور کے بارے میں نہیں تو وہ دلاور کے بارے میں، اس کے ٹھکانوں کے بارے میں ضرور جانتا ہوگا۔“

میں نے سیل فون کی سم دوبارہ تبدیل کی اور اس میں وہ سم ڈالی جو عموماً میرے استعمال میں رہتی تھی۔

”ایک بات اور!“ میں نے کہا۔ ”ارم! اب اپنے باپ سے بھی برگشتہ ہو گئی ہے۔ وہ ابھی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اب اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔ وہ......“

میرے سیل فون کی بیل بجی تو جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے سیل فون کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ اس پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے سیل فون دوبارہ میز پر ڈال دیا۔

کچھ وقفے کے بعد پھر اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس دفعہ بھی وہی نمبر تھا۔ دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد میں نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو!“

”نواب صاحب!“ دوسری طرف سے کوئی بولا۔

”بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں اکبر...... بول رہا ہوں...... اکبر سندھو!“

”اکبر سندھو!“ میں نے دہرایا، پھر مجھے یاد آ گیا کہ اکبر سندھو کون ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ہاں اکبر بولو، کوئی خاص بات؟“

”نواب صاحب! میں نے معلوم کر لیا ہے کہ دلاور اس وقت کہاں ہے۔“

”وہ اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”وہ اس وقت گلبرگ کے ایک بنگلے میں موجود ہے۔ آپ پتا لکھیں۔“ پھر اس نے گلبرگ کے اس بنگلے کا پتا لکھوایا اور بولا۔ ”نواب صاحب! میں اس وقت چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ دلاور کے آدمی میری تاک میں ہیں۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس وقت حسن آباد کے ایک فلیٹ میں موجود ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ دلاور کو میرے اس ٹھکانے کا علم ہو گیا ہے اور اس کے آدمی فلیٹ کے باہر موجود ہیں۔“

”تم مجھے اپنا پتا لکھواؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی تمہیں وہاں سے نکال لوں گا۔“

”نواب صاحب!“ اکبر آہستہ سے بولا۔ ”ہم جیسے لوگوں کو موت اسی طرح آتی ہے، آپ مجھے بچا لیں گے لیکن......“

”وقت ضائع مت کرو اکبر!“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ۔ تم جیسا آدمی بھی ایسی مایوسی کی باتیں کر رہا ہے؟“

”اس لیے کہ دلاور میرے دو قریبی ساتھیوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ اب وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔“

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”دلاور نہ ہوا، موت کا فرشتہ ہو گیا۔ جب تک تمہاری زندگی ہے اکبر، دلاور تو کیا دنیا کی سپر پاور بھی اگر تمہاری جان لینا چاہے تو نہیں لے سکتی۔ اپنا ایڈریس بتاؤ۔“

اکبر نے حسن آباد کا پتا بتایا جو میرے اشارے پر راجا نے لکھ لیا۔

”کون تھا؟“ راجا نے پوچھا۔

”یار اکبر سندھو تھا۔ وہی اکبر سندھو جو......“

”ہاں ہاں، مجھے یاد آ گیا۔“ راجا نے کہا۔ ”وہ دلاور کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟“

”اس نے گلبرگ کے ایک بنگلے کا پتا لکھوایا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ دلاور اس پتے پر موجود ہے۔“

”سر! یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔“ ناصر نے کہا۔

”ہاں، میں اس پہلو پر بھی غور کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ دلاور کی چال بھی ہو سکتی ہے۔“ پھر میں چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ”میں وہاں خود نہیں جاؤں گا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ ناصر نے کہا۔ ”کہ آپ وہاں خود نہ جائیں، وہاں میں جاؤں گا۔“

”تم تنہا مت جانا۔“ میں نے کہا۔ ”غنی کو ساتھ لے جانا۔“

”غنی تو آپ کا ٹریڈ مارک ہو گیا ہے سر!“ ناصر ہنس کر بولا۔ ”آپ کے دشمن بھی اسے اچھی طرح پہچاننے لگے ہیں،

میں احمد شاہ کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، تم احمد شاہ کے ساتھ چلے جانا۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "یار! ہم اکبر کو بھی تو وہاں بھیج سکتے ہیں۔"

"اکبر وہاں کیوں جائے گا؟" راجا نے منہ بنا کر کہا۔ "ابھی تو خود ہی کہہ رہا تھا کہ وہ دلاور کو موت کا فرشتہ سمجھتا ہے۔"

"اسے ایک دفعہ اس نیٹ سے نکلنے تو دو۔" میں نے کہا۔

احمد شاہ اور غنی ارم کو دوسرے ٹھکانے پر چھوڑ کر واپس آچکے تھے۔

"یار، میرا خیال ہے کہ پہلے آفتاب خان سے ملاقات کی جائے۔" میں نے اچانک کہا۔ "میں ارم کو اب زیادہ دیر تک قید نہیں رکھ سکتا۔"

"تو جذباتی ہو کر سوچ رہا ہے فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ کسی لڑکی کو غوا کر کے قید میں رکھا جائے لیکن یہ ہمارا پیشہ نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ اگر ہم نے اس موقعے پر ارم کو چھوڑ دیا تو دلاور یہی سمجھے گا کہ ہم نے اس کے خوف سے ارم کو آزاد کر دیا۔"

"اس کی دی ہوئی مہلت تو کب کی تمام ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر میں آفتاب خان سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی ارم کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔"

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔" ناصر نے پرخیال انداز میں کہا۔ "آفتاب خان اس وقت ذہنی طور پر بہت مضطرب ہوگا، دلاور سے بھی اسے کسی مدد کی توقع نہیں ہے۔ مسکین شاہ تو وہ پہلے ہی اپنا مخالف ثابت کر چکا ہے۔ اب ہمارا ساتھ دینا اس کی بھی مجبوری ہے۔"

"تو پھر میں آفتاب خان سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور سیل فون نکال کر اس کے نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن آفتاب خان نے کال ریسیو نہیں کی، میں جھنجلا کر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ اس نے کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو!"

"کیا اب تم دن دہاڑے نشہ کرنے لگے ہو آفتاب خان؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اچھا، تم ہو۔" آفتاب خان نے طویل سانس لی۔ "تم کسی دوسرے نمبر سے کال کر رہے ہو؟"

مجھے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے اپنے نمبر سے کال کر دی تھی۔

"نمبر سے کیا فرق پڑتا ہے آفتاب خان؟" میں نے کہا۔

"کیا تم نے ارم کو مار دیا؟" اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

"میں اسے اب تک مار چکا ہوتا لیکن...... وہ بہت معصوم ہے، تم اگر اب بھی زبان کھول دو تو میں اسے رہا کر سکتا ہوں۔"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے نور کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔" آفتاب خان نے کہا۔

"دلاور کو تو معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اسے معلوم ہے لیکن وہ مجھے کیوں بتائے گا؟"

"تم نے ان لوگوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اب تم پر برا وقت آیا تو یہ تمہارا ساتھ چھوڑ گئے۔"

"یہ تو دنیا کا دستور ہے۔" آفتاب خان کا لہجہ تلخ تھا۔ "دلاور نے مجھے جھوٹی تسلی دی ہے کہ میں نے ارم کے بارے میں معلوم کر لیا ہے، اگر اس نے ارم کو نہ چھوڑا تو میں خود اسے جا کر لے آؤں گا۔ اب وہ بس آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے۔ میرا فون تک ریسیو نہیں کرتا۔"

"آفتاب خان!" میں نے اچانک کہا۔ "تم مجھ سے مل سکتے ہو؟"

"تم سے۔" آفتاب خان نے حیرت سے دہرایا۔ "کہاں؟"

"تم جمال خان شیروانی کے بنگلے پر پہنچ جاؤ، میں تمہیں وہیں ملوں گا۔"

"مجھے ان کا ایڈریس بتا دو۔" آفتاب خان نے کہا۔ "میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے اسے جمال خان شیروانی کا پتا بتایا اور اس سے کہا۔ "ایک گھنٹے بعد میں تمہیں وہیں ملوں گا۔ ان کے بنگلے پر پولیس کا پہرا ہے لیکن تم ڈیوٹی انسپکٹر سے صرف یہ کہنا کہ مجھے شیروانی صاحب سے ملنا ہے، وہ تمہیں اندر پہنچا دے گا۔ ہاں، وہاں مسلح ہو کر مت آنا ورنہ پولیس کو فضول میں شبہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچتا ہوں۔"

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور راجا سے کہا۔ "میں شیروانی صاحب کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔"

"وہ تو ہم نے سن ہی لیا ہے۔" راجا نے کہا۔ "لیکن فیکے پتر! ذرا یہ بھی بتا دے کہ اب تیرا پلان کیا ہے؟"

"پلان بتایا تو ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آفتاب خان سے کہوں گا کہ وہ ارم کو لے جائے لیکن ابھی اس کا تذکرہ دلاور یا کسی اور سے نہ کرے۔"

"اور وہ تیری بات مان لے گا؟" راجا نے کہا۔

"ضرور مانے گا۔" ناصر نے کہا۔ "دلاور نے اس کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے، پھر اسے یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ دلاور، رانا زوہیب کا خاص آدمی ہے اور رانا زوہیب، مسکین شاہ کا دوست ہے۔ دوست کیا، وہ اس وقت الیکشن جیتنے کے لیے مسکین شاہ کے اشاروں پر ناچ رہا ہے، ممکن ہے کہ یہی دلاور اور زوہیب، آفتاب خان ہی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تم لوگ گھر ہی میں رہنا۔" میں نے کہا۔ "گھر میں نہ بھی رہو تو کم سے کم اپنے سیل فون آن رکھنا۔" یہ کہہ کر میں برآمدے سے اتر کر پورچ میں آ گیا۔

غنی اور احمد شاہ لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

"غنی!" میں نے کہا۔ "تم اور احمد شاہ میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

غنی نے فوراً میرے لیے گاڑی کی عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور احمد شاہ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں سے یہ پوچھنا فضول تھا کہ وہ دونوں مسلح ہیں یا نہیں۔

"شیروانی صاحب کے بنگلے پر چلو۔" میں نے کہا۔

"یس سر!" غنی نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

میں نے کافی کی پیالی خالی کر کے رکھی ہی تھی کہ جمال خان شیروانی کے ایک ملازم نے آ کر بتایا۔ "سر! باہر کوئی آفتاب خان ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے اندر بھیج دو۔" جمال خان شیروانی نے کہا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "نواب صاحب! میرے خیال میں یہاں میری موجودگی غیر ضروری ہے، آپ اطمینان سے بات کریں، میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر شیروانی وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد آفتاب خان نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ جمال خان شیروانی بہت سخت گیر افسر ہے۔

"آؤ آفتاب خان!" میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

اس کی حالت ابتر تھی، چہرے پر عجیب سی ویرانی تھی، وزن بھی خاصا کم ہو گیا تھا۔

"بیٹھو!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "کیا پیو گے؟ چائے، کافی یا پھر کولڈ ڈرنک؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مذاق مت اڑائیں نواب صاحب!" آفتاب خان نے کہا۔

"میں تمہارا مذاق کیوں اڑاؤں گا؟" میں نے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کسی ملازم کو طلب کرتا، شیروانی کا ایک ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، ٹرالی میں کافی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا لیکن میرے اصرار پر آفتاب خان نے صرف کافی لینے پر اکتفا کیا۔

"آفتاب خان!" میں نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ "اگر میں ارم کو تمہارے حوالے کر دوں تو مجھے کیا دو گے؟"

"میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں۔" آفتاب خان کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"تم مجھے دلاور کے ٹھکانوں کے بارے میں بتا سکتے ہو، رانا زوہیب کے بارے میں بتا سکتے ہو اور......"

"میں دلاور کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ آج کل گلبرگ کے بنگلے میں مقیم ہے۔"

"یہ اطلاع تمہیں کہاں سے ملی؟" میں نے پوچھا۔

"میں ابھی اتنا بے دست و پا نہیں ہوا ہوں۔" آفتاب خان نے کہا۔ "میرا ایک آدمی یہ ساری اطلاعات لاتا ہے۔"

"تم اپنے اس آدمی سے یہ بھی تو کہہ سکتے ہو کہ وہ دلاور کی نقل و حرکت پر نظر رکھے اور دلاور جہاں بھی جائے، تمہیں اطلاع مل جائے۔ تم اپنے اس آدمی کو بھاری انعام کا لالچ دے سکتے ہو۔"

"لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟"

"تم نے سوال کی ترتیب بدل دی، یہ پوچھو کہ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"چلیے یوں ہی سہی۔"

"تمہیں ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمہاری بیٹی فوری طور پر گھر پہنچ جائے گی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ مسکین شاہ کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔"

"ہمیشہ کے لیے؟" آفتاب خان حیران ہو کر بولا۔

"ہاں، ہمیشہ کے لیے۔" میں نے کہا۔ "اور تم خود بھی اپنی سیکیورٹی کا دھیان رکھو، مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ

اب تک مسکین شاہ نے تمہارے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟"

"اصل میں در پردہ ہم دونوں میں صلاح ہو چکی ہے۔" آفتاب خان نے آہستہ سے کہا۔ "جب قدوائی کو بھی شاہ جی کے دشمنوں نے راستے سے ہٹا دیا تو شاہ جی کو فکر پیدا ہوئی، ان کے کئی خاص آدمی یا تو ہلاک ہو چکے ہیں یا پھر غائب ہو گئے ہیں۔"

"خیر، یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر صلح ہو بھی چکی ہے تو ابھی یہ خبر میڈیا میں نہیں آنی چاہیے ورنہ شاہ جی کے ساتھ ساتھ تم بھی حالات کی چکی میں پس جاؤ گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم صرف یہ کرو کہ مجھے دلاور کی نقل و حرکت سے باخبر رکھو۔"

"جب تک دلاور لاہور میں ہے، مجھے معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ کہاں ہے اور کس سے مل رہا ہے۔ ہاں اگر وہ لاہور چھوڑ کر کراچی یا بیرون ملک چلا گیا تو پھر اس کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔"

"تم اکبر سندھو کو جانتے ہو؟" میں نے اچانک پوچھا۔

آفتاب خان چونک اٹھا اور بولا۔ "آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اکبر سندھو کبھی کبھی میرے لیے کام کرتا رہتا ہے۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ آفتاب خان!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "ایک گھنٹے بعد ارم گھر پہنچ جائے گی۔"

آفتاب خان دیوانہ وار اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ پھر اس نے جھک کر میرے پیر پکڑنے کی کوشش کی۔

"یہ کیا کر رہے ہو بھئی!" میں نے کہا۔

"میں نے آپ کے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ۔۔۔کہ۔۔۔"

"کیا سوچا تھا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ ۔۔۔۔آپ۔۔۔ ارم کو۔۔۔۔ بے آبرو کر چکے ہوں گے اور ۔ وہ کبھی مجھے زندہ۔۔۔۔۔ نہیں ملے گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگا۔ "لیکن میں بھی کیسا بدبخت ہوں۔ آپ کے بارے میں کتنا غلط سوچ رہا تھا۔"

"اب میری ایک بات اور دھیان سے سنو۔" میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دن تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ارم واپس گھر پہنچ چکی ہے۔"

"نہیں معلوم ہوگا۔" آفتاب خان نے کہا۔ "کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔ میں اسے اپنی بہن کے پاس کراچی بھیج دوں گا اور اسے بھی سختی سے ہدایت کر دوں گا کہ وہ کراچی میں بھی جا کر یہ نہ بتائے کہ وہ میری بیٹی ہے جب تک آپ نہیں کہیں گے میں اسے کراچی میں رکھوں گا۔" پھر وہ ندامت بھرے انداز میں بولا۔ "کاش! کاش میں ۔۔۔نور کو اسی وقت آپ تک پہنچا دیتا جب اسے یہاں لایا گیا تھا۔"

"ان باتوں کو چھوڑو آفتاب خان!" میں نے کہا۔ "اب تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ارم ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

آفتاب خان نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ آفتاب خان اس پژمردہ اور زندگی سے بیزار آفتاب خان سے بالکل مختلف تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا، رخصت ہوتے وقت اس کے چہرے پر تازگی بھی تھی اور آنکھوں میں جینے کی امنگ بھی۔

آفتاب خان کے جانے کے بعد جمال خان شیروانی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"آپ کی ملاقات خاطر خواہ رہی نواب صاحب؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، فی الحال یہی لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اصل میں آفتاب خان جیسے لوگ نا قابل اعتبار ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان پر بھروسا کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"نواب صاحب!" شیروانی نے آہستہ سے کہا۔ "وہ ۔۔۔۔ویڈیو۔۔۔ آپ کے پاس موجود ہے؟"

"آپ کو اب تک اس بات کا یقین نہیں آیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اگر آپ بضد ہیں تو وہ ویڈیو میں آپ کو دکھا دوں گا لیکن میں پھر کہوں گا کہ آپ نہ دیکھیں تو اچھا ہے۔"

"تم مجھے اتنی ویڈیو تو دکھا سکتے ہو جتنی میں دیکھ سکوں؟"

"ہاں، اس ویڈیو کا ابتدائی حصہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں کل ہی وہ ویڈیو یہاں لے آؤں؟"

"برا مت مانیے گا نواب صاحب!" جمال خان شیروانی نے کہا۔ "آپ بھی سوچ رہے ہیں کہ کیسا بے اعتبار آدمی ہے۔ میری بات کا یقین ہی نہیں کر رہا ہے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"میں سمجھتا ہوں شیروانی صاحب!" میں نے کہا۔ "اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی اس وقت تک یقین نہ آتا جب تک وہ ویڈیو میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتا۔ میں کل کسی وقت وہ ویڈیو لے آؤں گا۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "ثمرہ کہاں ہے؟ پولیس نے دوبارہ تو آپ کو تنگ نہیں کیا؟"

"نواب صاحب!" جمال خان شیروانی نے کہا۔ "پولیس ہمیں تنگ نہیں کر سکتی، میں نے سرے سے ثمرہ کے اغوا کی رپورٹ ہی درج نہیں کرائی تو پولیس ثمرہ کو پریشان کیسے کرتی؟"

"اور وہ جو میرے آدمیوں کے ہاتھوں کچھ لوگ مارے گئے ہیں؟"

"کون سے لوگ؟" جمال خان شیروانی مسکرایا۔ "جب ہماری کوئی ایف آئی آر ہی نہیں ہے تو کیسا قتل!" پھر وہ چونک کر بولے۔ "اگر آپ ثمرہ سے ملنا چاہتے ہیں تو میں اسے یہاں بلواؤں؟"

"نہیں، بس آپ اس سے اتنا کہہ دیں کہ وہ کچھ دن تک بہت محتاط رہے اور بغیر سیکیورٹی کے گھر سے نہ نکلے!" پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔ کل کسی وقت میں ویڈیو لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے جمال خان شیروانی سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گیا۔ غنی اور احمد شاہ دونوں پورچ میں گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر مستعد ہو گئے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شامی کی طرف چلو۔"

غنی نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

میں اطمینان سے عقبی نشست پر نیم دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔

پھر غنی کی آواز پر میں چونکا۔ شاید مجھے نیند آ گئی تھی۔

"سر! ہم شامی کے گھر پہنچ چکے ہیں۔"

میں نے گاڑی سے اتر کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی محل نما کوٹھی تھی۔

اچانک دو آدمی نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئے اور بولے۔ "آپ کو شامی صاحب سے ملنا ہے؟"

"ہاں، مجھے شامی سے ملنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آئیے میرے ساتھ۔" ان میں سے ایک بولا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔

ہم لوگ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ دوسرا آدمی وہیں رہ گیا تھا۔

احمد شاہ نے بہت دھیمے لہجے میں غنی سے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم یہاں سے گئے تھے تو یہاں کوئی سیکیورٹی نہیں تھی، یہ اچانک سیکیورٹی گارڈز کہاں سے آ گئے؟"

"یہ تو شامی بادشاہ ہی سے معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہاں تو ارم کیا، ہوائی جہاز بھی چھپایا جا سکتا تھا۔"

شامی کو شاید پہلے ہی ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ ہمارے استقبال کے لیے برآمدے میں نکل آیا تھا۔

"نواب بھائی! خیریت تو ہے؟"

"ہاں شامی بادشاہ! سب خیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس لڑکی کو لینے آیا ہوں۔"

"لڑکی کو لینے آئے ہو؟" شامی نے حیرت سے کہا۔ "کیا مجھ پر بھروسا نہیں رہا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے شامی!" میں نے کہا۔ "اصل میں لڑکی کے باپ سے ایک معاہدہ ہو گیا ہے۔ میں اسے واپس چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے نواب بھائی!" شامی نے کہا۔ "کیا نور کا سراغ مل گیا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اب ارم کو اپنے پاس رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"آپ نے یہ فیصلہ کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔" شامی نے کہا، پھر چونک کر بولا۔ "آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آئیے نا!"

"شامی بادشاہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ٹھکانا تو بہت زبردست ہے۔ یہاں ایک کیا، بیس لڑکیاں بھی چھپا لی جائیں تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

"یہ کوٹھی تو اصل میں ابوظہبی کے ایک شیخ کی ہے۔" شامی نے کہا۔ "لیکن یہاں کا سپروائزر میرا خاص آدمی ہے، میں نے دو چار دفعہ شیخ کے لیے بھی کام کیا ہے اس لیے میں ضرورت پڑنے پر اس کوٹھی کو استعمال کر لیتا ہوں۔ شیخ صاحب تو یہاں سال میں ایک آدھ بار ہی آتے ہیں۔"

کوٹھی کے اندر بہت سے کمرے تھے، ان میں سے دو کمرے شامی نے اپنے لیے مخصوص کر لیے تھے۔

"ارم کا کیا حال ہے؟" میں نے کمرے میں داخل ہو کر گولی سے پوچھا۔

"وہ بے چاری تو جب سے یہاں آئی ہے مسلسل رو رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ انکل نے ایک بار پھر مجھے دھوکا دے دیا!"

"میں اس کو لینے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ

بھی چلنے کی تیاری کرو۔ میں ارم سے بات کرلوں۔''

ارم بیڈ پر گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھی تھی۔ باہر کچھ خنکی تھی لیکن کمرے میں ہیٹر چل رہا تھا۔

''ارم!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر روتے ہوئے بولی۔ ''انکل! آپ نے پھر مجھے چیٹ (Cheet) کیا، آپ تو کہہ رہے تھے کہ.....''

''میں تمہیں لینے ہی آیا ہوں بیٹا!'' میں نے کہا۔ ''اب جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاؤ۔ کیا اسی طرح اپنے ڈیڈی کے پاس جاؤ گی؟''

وہ خوشی کے مارے ایک دفعہ پھر رونے لگی۔

''اب کیوں رو رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔'' وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

''جلدی کرو بیٹا! تمہیں یقین تو اس وقت آئے گا جب میں تمہیں تمہارے گھر پہنچاؤں گا۔''

''مجھے کیا کرنا ہے؟'' وہ اپنا جائزہ لے کر بولی۔ ''کپڑے تو میں نے آج ہی بدلے ہیں، ہاں منہ ہاتھ دھو کر بال بنا لیتی ہوں۔''

وہ دس منٹ کے اندر اندر تیار ہو گئی۔ اس وقت تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ارم ہے جو بات بات پر آنسو بہانے لگتی تھی۔

وہ تیار ہو کر بولی۔ ''چلیے۔''

میں اسے لے کر باہر نکلا تو وہ بولی۔ ''انکل! وہ نیلو باجی کہاں ہیں؟''

''نیلو باجی؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''آپ نیلو باجی کو نہیں جانتے۔ وہ بے چاری تو میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔''

مجھے خیال آیا کہ وہ نیلم کو نیلو کہہ رہی ہے۔ ''نیلو باجی یہاں نہیں ہیں۔ ہم تمہیں دوسری جگہ لے آئے تھے نا!''

''لیکن وہ آنٹی تو یہاں بھی موجود ہیں۔''

اسی وقت گولی اور شامی بھی کمرے سے نکل آئے۔ میں نے شامی سے کہا۔ ''اگر کوئی چادر ہے تو وہ ارم کو اوڑھا دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اسے پہچان کر ہمارے پیچھے لگ جائے۔''

گولی نے اپنی بڑی سی گرم شال اتار کر ارم کے سر پر ڈال دی۔

''اسے اچھی طرح اپنے جسم اور چہرے پر لپیٹ لو۔'' میں نے کہا۔

ارم نے وہ شال اپنے جسم اور چہرے پر اس طرح لپیٹی کہ مجھے اس کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گاڑی میں جگہ کم تھی اس لیے شامی نے کہا کہ وہ اور گولی دوسری گاڑی میں گھر آجائیں گے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر حسب معمول غنی تھا، اس کے ساتھ احمد شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ ارم میرے ساتھ پچھلی نشست پر تھی۔ میں وہاں آتے وقت سو گیا تھا اس لیے مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ شیخ کا وہ محل لاہور کے کس علاقے میں ہے۔ جب گاڑی مین روڈ پر آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ اس وقت [illegible] کے علاقے میں ہیں۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر غنی نے ہمیں آفتاب خان کے گھر پہنچا دیا۔

غنی نے گیٹ کے پاس پہنچ کر ہارن دیا تو ملازم کے بجائے آفتاب خان خود باہر نکلا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے چوکیدار کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔

ارم حیرت اور خوشی سے [illegible] کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ گاڑی سے اتری اور [illegible] آفتاب خان سے لپٹ گئی۔ پھر وہ دونوں باپ بیٹی اس طرح [illegible] کہ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے [illegible] آفتاب خان [illegible] خاموش [illegible] کوئی [illegible]

''سوری نواب صاحب!'' آفتاب خان نے کہا۔ ''اتنے عرصے بعد بیٹی ملی ہے نا! میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا۔''

''اب کسی کو معلوم نہ ہو کہ ارم تمہارے پاس واپس آچکی ہے۔''

''ہرگز معلوم نہیں ہوگا۔''

''بس اب میں چلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ایسے کیسے جاسکتے ہیں آپ؟'' آفتاب خان نے کہا۔ ''اندر آکر ایک کپ کافی تو پی لیں۔''

''کافی پھر کسی وقت سہی۔'' میں نے کہا۔

''انکل پلیز!'' ارم نے کہا۔ ''اتنے دن تک آپ نے اور نیلو باجی نے مجھے کھلایا پلایا ہے۔ آپ کم از کم ایک کپ کافی ہی پی لیں۔''

''ارم بیٹا! میں تمہارے گھر کافی بھی پیوں گا اور کھانا بھی کھاؤں گا لیکن اس وقت نہیں، اس وقت تو.....''

''انکل پلیز!'' ارم نے کہا۔

اس کے لہجے میں ایسی خوشامد تھی کہ پھر مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔

''چلو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں صرف کافی پیوں گا۔''

''نواب صاحب!'' آفتاب خان نے کہا۔ ''اپنے ڈرائیور کو بھی بلا لیں۔''

''وہ میرا ڈرائیور نہیں بلکہ چیف سیکیورٹی آفیسر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ باہر رہ کر ہی میری حفاظت کرتا ہے۔''

ہم اندر داخل ہوئے تو کوئی ملازم نہیں تھا۔ شاید آفتاب خان نے تمام ملازمین کو چھٹی دے دی تھی۔ صرف ایک چوکیدار تھا۔ وہ بھی بنگلے کے گیٹ تک محدود تھا۔

ڈرائنگ روم میں بھی کوئی نہیں تھا۔

''آفتاب خان!'' میں نے کہا۔ ''تمہاری بیگم بھی نظر نہیں آرہی ہیں۔''

''میری بیگم اور چھوٹی بیٹی پنڈی چلی گئی ہیں۔ پنڈی میں میرے دونوں سالے رہتے ہیں۔ میرے ایک سالے کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ میری بیگم تو جانے کے موڈ میں نہیں تھی لیکن میں نے اسے زبردستی پنڈی بھیج دیا۔ وہ اچانک ارم کو دیکھتی تو مارے خوشی کے پاگل ہو جاتی، اگر آپ ارم کی آمد خفیہ رکھنے کی ہدایت نہ دیتے تو میں اپنی بیگم کو کبھی پنڈی نہ بھیجتا۔'' پھر وہ ارم سے بولا۔ ''ارم بیٹا! اس وقت گھر میں کوئی ملازم ہے نہ تمہاری مما! تم نے انکل کو کافی کے لیے روک تو لیا ہے، اب.....''

''انکل کے لیے میں کافی بناؤں گی ڈیڈی۔'' ارم چہک کر بولی۔

وہ دس منٹ کے اندر اندر کافی بنا لائی۔ اس کے ساتھ کچھ بسکٹ اور سینڈوچز بھی تھے۔ میں نے جلدی جلدی کافی پی اور آفتاب خان کو ایک دفعہ پھر ہدایت کی کہ ہو سکے تو ارم کو آج ہی کراچی بھجوا دے پھر میں نے آفتاب خان سے ہاتھ ملایا، ارم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل آیا۔

ہم واپس آ ہی رہے تھے کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو!''

''ہیلو صاحب جی!'' دوسری طرف سے نیلم کی آواز آئی۔ ''میں نیلم بول رہی ہوں۔'' اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں نیلم! خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے صاحب جی!'' اس نے کہا۔ ''آپ کے جانے کے بعد راجا صاحب اور ناصر صاحب بھی کہیں چلے گئے۔ اچانک گھر میں کچھ لوگ گھس آئے۔ مالی نے انہیں روکا تو انہوں نے ریوالور نکال لیے اور مالی پر فائر کر دیا۔ اس نے بھی اپنا ریوالور نکالا اور ان لوگوں پر فائر کر دیا۔ پھر وہ مالی کو مارنے کے بعد اندر کی طرف بڑھے۔ میں خطرہ بھانپ کر تیزی کے ساتھ چھت پر چڑھ گئی اور وہاں سے ایک درخت کے ذریعے پڑوسیوں کی چھت پر اتر گئی۔ میں اس وقت پڑوسیوں کے گھر سے آپ کو فون کر رہی ہوں۔''

''جو لوگ گھر میں گھسے تھے، وہ اس وقت کہاں ہیں؟'' میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''وہ اس وقت بھی گھر میں موجود ہیں۔'' نیلم نے کہا۔

''اچھا، میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے غنی سے کہا۔ ''غنی! فوراً گھر پہنچو۔ گھر میں کچھ لوگ گھس آئے ہیں۔''

غنی نے گاڑی کو بیسٹ فائٹر کی طرح دوڑانا شروع کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اسے تیز رفتاری سے نہیں روکا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔ مجھے اپنے اس گارڈ کی فکر تھی جو حملہ آوروں کی فائرنگ سے زخمی ہو گیا تھا، پتا نہیں وہ بے چارہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ اس سے زیادہ فکر مجھے ان ویڈیو فلموں اور کاغذات کی تھی جو میں نے بہت مشکل سے حاصل کیے تھے۔ وہ سب چیزیں الماری کے سیف میں بند تھیں لیکن الماری اور سیف کا تالا توڑنا ان لوگوں کے لیے مشکل نہیں تھا۔

میں نے جھنجلا کر غنی سے کہا۔ ''تم گاڑی تیز نہیں چلا سکتے؟''

''سر! میں انتہائی تیز رفتاری سے چل رہا ہوں۔'' غنی نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا، واقعی گاڑی بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح دوڑ رہی تھی۔

اچانک غنی نے آگے جانے والے ایک موٹر سائیکل سوار کو بچانے کے لیے بہت خطرناک انداز میں گاڑی کو دائیں جانب بالکل رانگ سائڈ پر کر دیا پھر سامنے سے آنے والی بس سے بچنے کے لیے وہ دوبارہ انتہائی خطرناک انداز میں اپنی لین میں واپس آیا اور گاڑی کو انتہائی مہارت سے بائیں جانب موڑ دیا۔

اس سڑک پر آگے جا کر ہماری کوٹھی تھی۔ گویا غنی نے

منٹوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کرلیا تھا۔

میں نے احمد شاہ کو دیکھا، وہ اپنے ہتھیار ایک مرتبہ پھر چیک کررہا تھا۔

غنی نے گاڑی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر روک دیا اور ہم لوگ گاڑی سے اتر کر تیزی سے اپنی کوٹھی کی طرف بڑھے۔

اچانک نیلم میرے سامنے آگئی۔ وہ بنگلے کے باہر ہی کہیں کھڑی ہوئی تھی۔

''وہ لوگ ابھی اندر ہی ہیں صاحب جی!'' نیلم نے اطلاع دی۔

میں نے سکون کا سانس لیا اور نیلم سے کہا۔ ''تم شامی کو بھی سیل فون پر اطلاع دے دو۔ وہ بے خبری میں سیدھا گھر میں گھس جائے گا۔''

''میرے پاس ان کا سیل نمبر نہیں ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''نمبر تو آپ کا بھی نہیں تھا لیکن آپ کا نمبر تو مجھے زبانی یاد ہے اس لیے...''

''اچھا، تم یہیں ٹھہرو، شامی بھی بس آنے ہی والا ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے غنی اور احمد شاہ کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

غنی اور احمد شاہ اس وقت چیتے کی طرح چوکنا نظر آرہے تھے۔ وہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی زمین پر گر گئے اور سینے کے بل آگے کی طرف کھسکنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر مجھے کسی شخص کا چہرہ نظر آیا۔ اس کا چہرہ ایک ستون کی آڑ میں تھا لیکن وہ غیر فطری انداز میں پڑا ہوا تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو اس شخص کو دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ میرا گارڈ تھا جو مالی کے روپ میں رہتا تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹول کر دیکھی، وہ بالکل ساکت تھی۔ اس کے گرد اچھا خاصا خون پھیلا ہوا تھا جو اب جم کر سیاہی مائل ہوتا جارہا تھا۔

میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ حق نمک ادا کر گیا تھا۔

اس وقت اندر سے دو آدمی باہر نکلے۔ ان کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ غنی نے اچانک ایک آدمی کے ریوالور والے ہاتھ پر فائر کیا۔ احمد شاہ نے دوسرے آدمی کی پیشانی کو نشانہ بنایا اور اس کی پیشانی کے عین وسط میں سوراخ ہوگیا۔ ہم لوگ تیزی سے ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئے۔ فائرنگ کے دھماکوں سے دوسرے لوگ بھی باہر کی طرف دوڑ پڑے تھے لیکن آنے والے دروازے کے پاس آکر رک گئے۔ وہ بھی خاصے گھاگ اور منجھے ہوئے لوگ تھے، اندھا دھند باہر نہیں آنا چاہتے تھے۔ اچانک احمد شاہ نے پھر فائر کیا اور ایک انسانی چیخ گونج کر رہ گئی۔ میں اس کے نشانے پر اش اش کر اٹھا۔ دروازہ بہت معمولی سا کھلا ہوا تھا۔ اس معمولی کھلے ہوئے دروازے سے کسی کو نشانہ بنانا احمد شاہ جیسے ماہر ہی کا کام تھا۔

''تم لوگ ہر طرف سے گھر چکے ہو۔'' غنی نے کہا۔ ''اس لیے ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ ورنہ تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' یہ کہتے ہی اس نے اپنی جگہ تبدیل کردی۔

اس کے ساتھ ہی اندر سے ایک فائر ہوا اور گولی اس ستون پر پڑی جس کے پیچھے غنی چھپا ہوا تھا۔

جواب میں احمد شاہ نے بھی فائر کیا اور پھر ایک انسانی چیخ گونج کر رہ گئی۔

پھر فوراً ہی اندر سے ایک ریوالور باہر آکر گرا اور ایک شخص دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے باہر آگیا۔

غنی نے جھپٹ کر اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں نقدی اور سیل فون کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

غنی اسے دھکیل کر کمرے سے دور لے گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''اندر اور کتنے آدمی ہیں؟''

''اندر... دو آدمی اور ہیں۔ وہ دونوں آپ کی فائرنگ سے زخمی ہوگئے ہیں۔''

غنی نے ریوالور کا دستہ اٹھا کر اس کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ فوراً ہی ناک آؤٹ ہوگیا۔

احمد شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بہت محتاط انداز میں اندر کی طرف بڑھا۔ میں نے بھی اندر جانا چاہا لیکن غنی نے مجھے روک دیا اور بولا۔ ''سر! آپ باہر ہی ٹھہریں اور یہاں رہ کر ہمیں کور دیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد غنی اور احمد شاہ باہر نکلے تو ان کے ساتھ دو زخمی آدمی بھی تھے۔ ایک آدمی کا شانہ بری طرح ادھڑ گیا تھا اور دوسرے کے سینے میں دائیں جانب گولی لگی تھی۔ ان دونوں کا خون فرش پر ٹپک رہا تھا۔

سب سے پہلے باہر نکلنے والوں کے ہاتھ میں دو بریف کیس تھے۔ وہ میرے ہی بریف کیس تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ دونوں بریف کیس اٹھا لیے جن میں ویڈیو فلمیں اور کاغذات تھے۔ گویا میں عین وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا ورنہ وہ دونوں مردود میری ساری محنت پر پانی پھیر دیتے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''مجھے اسپتال پہنچا دو۔'' ان میں سے ایک کراہ کر بولا۔ ''شاید میں مر رہا ہوں۔''

''اگر تم سب کچھ سچ سچ بتا دو تو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی اور اسی وقت تمہیں اسپتال لے جاؤں گا۔''

''پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟'' دوسرے آدمی نے نحیف آواز میں کہا۔

''تمہیں کس نے بھیجا ہے یہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں امیر علی لایا تھا۔'' ان میں سے ایک آدمی بولا۔

''امیر علی کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ہوں امیر علی!'' دوسرا آدمی کراہ کر بولا۔

''تمہیں یہاں کس نے بھیجا تھا؟'' میں نے امیر علی سے پوچھا۔

''مجھے یہاں شاہ جی نے بھیجا تھا۔'' امیر علی نے کراہتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھیجا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے کہا تھا... کہ... تو... ا... ب... کے...'' وہ خاموش ہوکر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''غنی! اسے پانی پلاؤ۔'' میں نے کہا۔

غنی نے جلدی سے پانی کا جگ اٹھایا اور گلاس میں پانی نکال کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

امیر علی نے ایک آدھ گھونٹ پیا، باقی اس کے منہ سے باہر آگیا۔ وہ زندگی کی قید سے رہائی پاچکا تھا۔

میں دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابھی ہوش میں تھا اور اس کی حالت اتنی ابتر نہیں تھی۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے تھے؟''

''میں آپ کو بتا تو چکا ہوں کہ مجھے امیر علی یہاں لایا تھا۔''

''کیوں لایا تھا؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''یہاں کوئی دعوت تو تھی نہیں۔''

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ماڈل ٹاؤن میں ایک واردات کرنا ہے۔''

''تم وارداتیں کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو چھوٹی موٹی چوری کی وارداتیں کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''میں... میں کس کے لیے کام کروں گا۔ اپنے ہی لیے کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم بھی مرنا چاہتے ہو تو یہی سہی۔ تین آدمی پہلے ہی مرچکے ہیں، چوتھے تم سہی۔''

''آپ میری بات کا یقین کریں، میں...''

''غنی!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''اسے ایک گولی اور مار دو اور اس کی لاش بھی ان لاشوں کے ساتھ ڈال دو۔'' میں نے دوسری لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بوکھلا کر بولا۔ ''آپ... میری بات کا یقین کریں، مجھے امیر علی یہاں لایا تھا۔''

''امیر علی کس کے لیے کام کرتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔

''غنی! پولیس کو فون کرو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

پولیس کا نام سن کر اس کے چہرے پر سکون سا پھیل گیا۔

''لیکن اس سے پہلے اسے بھی گولی مار کر وہاں ڈال دو۔'' میں نے دوسری لاشوں کی جانب اشارہ کیا۔

غنی بھی جانتا تھا کہ میں اس شخص کو ڈرانے کے لیے یہ کہہ رہا ہوں۔

اس شخص کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر زردی چھا گئی۔ اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں مرجاؤں گا تو وہ بے آسرا ہوجائیں گے۔ مجھے معاف کردیں۔''

''یہ بات تو تم اس وقت سوچتے جب تم یہاں واردات کرنے آئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''تم تو وارداتیں کرتے رہتے ہو، اتنا بھی نہیں جانتے کہ بعض اوقات کسی واردات میں انسان کے ساتھ بھی واردات ہوجاتی ہے۔''

اسی وقت شامی اور گولی گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے اور اندر کا منظر دیکھ کر شامی بوکھلا کر بولا۔ ''نواب بھائی! خیریت تو ہے، آپ تو ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''ابھی میری زندگی کے کچھ دن باقی ہیں اس لیے نیلم نے مجھے بروقت مطلع کر دیا ورنہ میں ان حرام زادوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔'' پھر میں احمد شاہ سے مخاطب ہوا۔ ''احمد شاہ! یہ دونوں بریف کیس اٹھا کر الماری میں رکھ دو اور پولیس کو فون کرو۔''

احمد شاہ نے اپنا سیل فون نکالا ہی تھا کہ اس آدمی کو ہوش آگیا جسے غنی نے ریوالور کا دستہ مار کے بے ہوش کیا تھا۔ وہ چند

لمحے تک پڑا پلکیں جھپکاتا رہا، پھر جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم زندہ ہو لیکن تھوڑی دیر بعد مرنے والے ہو۔"

وہ گھبرا کر اپنی تک کھڑا ہو گیا۔ احمد شاہ نے آگے بڑھ کر ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور بولا۔ "اپنی جگہ سے حرکت کی کوشش مت کرنا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام غوث بخش ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"لوگ مجھے غوسو کہتے ہیں۔"

"یہاں کیوں آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں مجھے امیر علی لایا تھا۔"

"تمہیں بھی امیر علی لایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "کیوں لایا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ یہاں واردات کریں گے تو اچھا خاصا مال ملے گا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ پولیس وین کے سائرن کی آواز سے میں خود بھی چونک اٹھا تھا۔

شاید کسی پڑوسی نے پولیس کو اطلاع دے دی ہو گی کہ یہاں فائرنگ ہو رہی ہے۔ پولیس نے روایتی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پولیس والے شور مچاتے، چیختے چنگھاڑتے اندر داخل ہوئے۔ "خبردار... کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ اگر کچھ دیر پہلے آجاتے تو شاید ایک آدھ آدمی کی زندگی بچ جاتی۔"

"واٹ ڈو یو مین؟" پولیس پارٹی کی قیادت کرنے والے سب انسپکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پولیس کو آدھا گھنٹا پہلے فون کیا گیا تھا۔ آپ لوگ اب تشریف لا رہے ہیں۔ کیا ڈاکوؤں اور چوروں کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنا کام کر لیں تو آپ لوگ جائے واردات پر پہنچیں؟" میں نے بھی رواں انگریزی میں جواب دیا۔

میری انگریزی اور لب و لہجے سے انسپکٹر مرعوب ہو گیا اور بولا۔ "ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں جناب، تھانے میں ایک ہی موبائل ہے اور وہ اس وقت موجود نہیں تھی۔ نفری بھی کم ہے۔"

"اور موبائل کے بغیر تو تھانے سے باہر نکلنا تم لوگ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہو؟" میں نے طنزیہ کہا۔

انسپکٹر نے اچانک پوچھا۔ "آپ کی تعریف جناب!"

اسے شاید بجھوں کے سامنے اپنی تذلیل کا احساس ہوا تھا اسی لیے وہ سنبھل کر ایک مرتبہ پھر روایتی پولیس افسر بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی کے سامنے کھڑے ہو۔" غنی نے کہا۔ "ذرا ادب سے بات کرو۔"

"ست بدھائی! یہ کیا ہے؟"

"اس ریاست کا محل وقوع تمہیں تمہارے آئی جی صاحب ہی بتائیں گے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا، پھر غنی سے بولا۔ "آئی جی صاحب سے بات کراؤ۔"

"ایک منٹ سرکار!" انسپکٹر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "آپ لوگ پہلے واردات کی رپورٹ تو لکھوا دو۔"

"میں اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ چوری کی نیت سے میرے گھر میں گھس آئے اور میرے چوکیدار کو قتل کر دیا۔" پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ لوگ کیسے میرے چیف سیکیورٹی افسر کے ہاتھوں مارے گئے۔

"آپ کے پاس ریوالور کا لائسنس تو ہو گا؟" انسپکٹر نے غنی سے پوچھا۔

"میرا چیف سیکیورٹی افسر ہے تو لائسنس بھی ضرور ہو گا۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

انسپکٹر نے سب سے پہلے فون کال کر کے دو تین فون کیے، پھر برآمدے میں آ کر لاشوں کا جائزہ لینے لگا۔

"آپ کے چوکیدار کے پاس بھی ریوالور تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں چوکیدار کے پاس بھی ریوالور تھا........ اور لائسنس بھی!" میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے باری باری میرا، احمد شاہ، غنی اور نیلم کا بیان لیا اور بولا۔ "نواب صاحب! یہ لوگ آئے کیوں تھے؟ آپ نے آج یا کل بینک سے کوئی بڑی رقم تو نہیں نکالی؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ سوال تو آپ ان ہی لوگوں سے کریں تو بہتر ہے۔"

"مردوں سے؟" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپ کے سامنے تو مردے بھی بولنے لگتے ہیں۔" میں نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ دعویٰ تو یہی کرتے ہیں، غور سے دیکھیں، ان میں کچھ مردے نہیں ہیں۔"

اس وقت پولیس ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے لوگ بھی

آ گئے۔ وہ لاشوں کی تصویریں لینے لگے۔ [illegible] فنگر پرنٹ اٹھانے لگے۔

میں نے اشارے سے احمد شاہ کو بلایا اور آہستہ سے کہا۔ ''احمد شاہ! وہ دونوں بریف کیس کسی طرح اس کمرے سے نکال کر کہیں اور منتقل کر دو، پولیس ابھی میرا بیڈ روم اور ڈرائنگ روم سیل کر دے گی۔''

''میں نے نیلم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ ابھی یہاں پولیس آجائے گی، پھر آپ کا کمرا اور ڈرائنگ روم وغیرہ سیل کر دے گی۔ پولیس کے آنے سے پہلے ہی نیلم تمام ضروری کاغذات، بریف کیس وغیرہ وہاں سے لے گئی تھی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔

فرش پر چاک سے نشان لگانے کے بعد پولیس نے لاشیں وہاں سے اٹھالیں اور زخمی کو حراست میں لے کر اسپتال بھجوا دیا۔ جو آدمی صحیح سلامت تھا، پولیس نے اسے بھی حراست میں لے لیا۔

پھر انسپکٹر نے میرا کمرا سیل کر دیا کیونکہ ان لوگوں نے میرے ہی کمرے کا سامان الٹ پلٹ کیا تھا اور وہیں وہ دونوں آدمی زخمی بھی ہوئے تھے۔ وہاں فرش پر ابھی تک ان کا خون پڑا ہوا تھا جو اب جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔

''نواب صاحب!'' انسپکٹر نے روانگی سے پہلے کہا۔ ''آپ بھی اطلاع دیے بغیر لاہور مت چھوڑیے گا۔''

''انسپکٹر صاحب!'' میں نے ترش انداز میں کہا۔ ''میں آپ کو ابھی اطلاع دے رہا ہوں کہ میں کل، پرسوں کسی بھی وقت ست بدھائی جا سکتا ہوں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اس میں میرے ست بدھائی کے ٹیلی فون نمبرز بھی ہیں اور ایڈریس بھی!''

''چلیں ٹھیک ہے، پھر آپ کے یہ دونوں آدمی......''

''یہ دونوں میرے باڈی گارڈز ہیں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ بھی میرے ساتھ ہی جائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں لاہور سے کہیں بھی گیا، آپ کو انفارم ضرور کروں گا۔''

انسپکٹر باہر نکل ہی رہا تھا کہ راجا اور ناصر لوٹ آئے۔ گھر کے باہر پولیس وین دیکھ کر وہ دونوں پہلے ہی پریشان ہو گئے ہوں گے، گھر میں پولیس دیکھ کر تو راجا ایک دم چیخ کر بولا۔ ''فیکے...... فیکے پتر! تو ٹھیک تو ہے نا!'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔

''میں ٹھیک ہوں راجا!'' میں نے اس کی پشت تھپکتے ہوئے کہا۔ ''بالکل ٹھیک ہوں۔'' پھر میں نے اسے مختصراً اس واردات کے بارے میں بتایا۔

انسپکٹر شاید راجا اور ناصر دونوں کو جانتا تھا۔ اس کا لہجہ پھر بدل گیا۔ ''نواب صاحب! میں بس اتنی درخواست کروں گا کہ آپ کہیں بھی جانے سے پہلے مجھے انفارم ضرور کیجیے گا۔''

نیلم نے میرے [illegible] میرا کمرا [illegible] کر دیا تھا۔ میرے بیڈ روم سے جوتے، کپڑے اور تمام [illegible] سامان تک نکال کر لے گئی تھی۔ پولیس کی [illegible] کارروائی نے مجھے [illegible] پر تھکا دیا تھا۔ میں نے نیلم سے کافی لانے کو کہا اور خود ان چیزوں کا جائزہ لینے لگا جو وہ لوگ لے کر جا رہے تھے۔ بریف کیس میں سب سے اوپر وہ ڈی وی ڈی تھی جس میں میری ویڈیو بنائی گئی تھی۔

''فیکے پتر! تو ان کاغذات کی فوٹو کاپیاں بنا کر یہ تمام چیزیں بینک کے لاکر میں رکھ دے یا پھر انہیں ست بدھائی لے جا!'' راجا نے کہا۔

''ہاں، آپ کل صبح ہی ان چیزوں کو ست بدھائی پہنچا دیں۔'' ناصر نے تائید کی۔

''صبح نہیں بلکہ ابھی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ چیزیں اب مسکین شاہ کی نظروں میں آ گئی ہیں، میں نہیں چاہتا کہ یہ غیر محفوظ رہیں، کیا عجب کہ وہ پولیس ہی کو یہاں کی تلاشی کا وارنٹ دے کر بھیج دے۔'' پھر میں شامی سے مخاطب ہوا۔ ''شامی بادشاہ! تم ابھی ست بدھائی چلے جاؤ، گولی اور راجا بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ ان چیزوں کو حفاظت سے ست بدھائی پہنچا دو۔''

''ابھی ست بدھائی جانے کی کیا ضرورت ہے نواب بھائی؟'' شامی نے کہا۔ ''میں یہ تمام چیزیں اسی شیخ کے محل میں لے جاتا ہوں اور وہیں رہ کر ان کی حفاظت کروں گا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ ابھی نکل جاؤ۔'' میں نے غنی سے کہا کہ شامی کو کسی گاڑی کی چابی دے دو۔

شامی اور گولی کے جانے کے بعد نیلم کافی لے آئی۔

''یہ کافی کا کون سا وقت ہے فیکے پتر؟'' راجا نے کہا۔ ''میری تو بھوک کے مارے حالت خراب ہے اور تجھے کافی کی سوجھ رہی ہے۔''

''آپ کو بھوک لگ رہی ہے تو کھانا بھی تیار ہے۔'' نیلم نے کہا۔

''تم لوگ کھانا کھالو۔'' میں نے کہا۔ ''میرا تو بالکل موڈ نہیں ہے۔''

☆☆☆

دوسرے دن ناشتے کی میز پر ناصر نے کہا۔ ''سر! آپ آج مسکین شاہ سے مل لیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کچھ کاغذات کی فوٹو کاپیاں اور آڈیو کیسٹس کی دو تین کاپیاں اپنے ساتھ لے چلیں۔''

''مسکین شاہ تو میرا نام سنتے ہی بدک جائے گا اور ملاقات سے انکار کر دے گا۔''

''انکار تو نہیں کرے گا، ہاں ٹال مٹول سے کام ضرور لے گا کہ میں اس وقت میٹنگ میں ہوں یا اس وقت بہت بزی ہوں یا کوئی بھی بہانہ بنا سکتا ہے۔ میں اس سے ملاقات کا وقت لیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ مجھے اپنے اخبار کے لیے آپ کا انٹرویو کرنا ہے، میں اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ آنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''اخبار اور ٹی وی چینل کے انٹرویو میں ایسی کشش ہے کہ بڑے سے بڑا سیاست دان بھی ان کے لیے وقت نکال لیتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب الیکشن نزدیک ہوں۔'' اس نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر بولا۔ ''یار، ذرا مجھے مسکین شاہ کا سیل نمبر بھیج دو۔ ہاں، شاہ جی کا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ نمبر بھیجنا جس پر اس سے بات ہو جائے۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور مجھ سے بولا۔ ''میرے پاس مسکین شاہ کا سیل نمبر ہے لیکن وہ نمبر یا تو مصروف ہوتا ہے یا آف ہوتا ہے۔ ابھی میں نے جس سے نمبر مانگا ہے، وہ مسکین شاہ کا خاص آدمی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ناصر کو مسکین شاہ کا سیل نمبر موصول ہو گیا۔

اس نے وہی نمبر ملالیا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ''السلام علیکم!...... میں ناصر بول رہا ہوں شاہ جی...... ناصر خان!...... جی ہاں، آپ نے ٹھیک پہچانا، میں جرنلسٹ ہوں...... نہیں شاہ جی...... میں اپنے اخبار کے لیے آپ کا ایک زبردست انٹرویو کرنا چاہتا ہوں...... شاہ جی...... ایک ہفتے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی...... جی ہاں...... میں آج آ سکتا ہوں...... ابھی...... شاہ جی ابھی مجھے فوٹو گرافر کو بھی...... اچھا ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔'' اس نے اچانک سلسلہ منقطع کر کے مسکین شاہ کو زیر لب گالی دی اور بولا۔ ''وہ انٹرویو کے لیے ابھی بلا رہا ہے۔''

''تو پھر چلو۔'' میں نے کہا۔

''قبلہ نواب صاحب!'' راجا نے کہا۔ ''کیا آپ کی عقل گھاس چرنے کہیں دور نکل گئی ہے؟''

''کیوں مہاراجا! آپ ایسا کیوں فرما رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ تو ایک ریاست کا مالک ہے فیکے پتر! اور الیکشن میں ایک امیدوار بھی ہے۔ تو مسکین شاہ سے یہ بات کرتا ہوا اچھا لگے گا؟ یہ کام تو ہم صحافیوں کا ہے، ہمارے ہی لیے رہنے دے۔''

''اس کے لیے اتنی لمبی چوڑی بکواس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''سیدھی طرح کہہ دیتا کہ وہاں مت جاؤ۔''

''میرے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا۔'' ناصر نے کہا۔ ''لیکن میں نے اس خیال سے آپ کو منع نہیں کیا کہ آپ بہرحال مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں۔''

''خاک عقل مند ہیں۔'' راجا نے کہا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ناصر کے ساتھ میں جا رہا ہوں۔''

''وہاں مسکین شاہ کو مت بتانا۔'' میں نے کہا۔ ''اور غنی کو [illegible] اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مسکین شاہ بہت ہی خبیث آدمی ہے۔ لیکن وہ اپنے گھر پر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔''

راجا اور ناصر وہ اسٹف لے کر روانہ ہو گئے۔

میں نے آفتاب خان کا نمبر ملالیا۔ اس نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو، کیسے ہیں نواب صاحب؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دلاور کی کوئی خیر خبر؟''

''دلاور ابھی مسکین شاہ سے ملاقات کے لیے نکلا ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''دلاور...... مسکین شاہ!'' میں نے زیر لب دہرایا۔ ''مسکین شاہ کا دلاور سے براہ راست کیا تعلق ہے؟''

''ممکن ہے رانا زوہیب کے ذریعے ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہو۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''دلاور، مسکین شاہ کے مطلب کا آدمی ہے، شاید وہ اپنے طور پر بھی دلاور سے کوئی کام لینا چاہ رہا ہوگا۔''

''اطلاع کنفرم ہے کہ دلاور، مسکین شاہ ہی سے ملاقات کے لیے نکلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اطلاع دو سو فیصد کنفرم ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کچھ دیر بعد تمہیں فون کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فوری طور پر راجا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے راجا کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''دیکھ پتر! ابھی تو ہم پہنچے بھی نہیں ہیں۔ تجھے ابھی سے فکر پڑ گئی۔''

''تم لوگوں کے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی ابھی دلاور بھی مسکین شاہ سے ملاقات کے لیے نکلا ہے۔''

''دلاور؟'' راجا نے کہا۔ ''کیا یہ اطلاع کنفرم ہے؟''

''ہاں، ابھی تک تو کنفرم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم لوگوں کے پاس تو کوئی ہتھیار ہوگا نہیں۔ میں غنی سے بات کرتا ہوں۔''

''دیکھ پتر! تجھ پر ہر وقت ہتھیاروں کا بھوت کیوں سوار رہتا ہے، لگتا ہے تجھ میں سلطان راہی کی روح حلول کر گئی ہے۔''

''مہاراجا!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جن لوگوں سے ہمارا سامنا ہے، وہ ہتھیاروں ہی کی زبان سمجھتے ہیں، کیا سمجھا؟''

''سمجھ گیا۔'' راجا نے کہا۔ ''ابھی تو غنی ڈرائیونگ کر رہا ہے، وہ بعد میں خود تجھے کال کرے گا۔''

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور شامی بادشاہ کا نمبر ملا لیا۔

''کیسے ہو نواب بھائی؟'' شامی نے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم یہ بتاؤ شامی کہ تم دلاور کو پہچانتے ہو؟''

''میں تو نہیں پہچانتا لیکن ایسے لوگ ہیں جو دلاور کو پہچانتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔

''تم ان میں سے کسی ایک آدمی کو لے کر ابھی یہاں آ سکتے ہو؟''

''میں آ جاؤں گا لیکن خیریت تو ہے نواب بھائی؟''

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ دلاور، مسکین شاہ سے ملنے جا رہا ہے۔''

''میں ابھی پہنچتا ہوں۔'' شامی نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں غنی کا نمبر ملا ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی، اسکرین پر غنی کا نام تھا۔

''ہیلو!'' میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

''جی سر!'' غنی نے جواب دیا۔

''غنی، تم دلاور کو پہچانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پہچانتا نہیں ہوں لیکن جب وہ یہاں آئے گا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔''

''وہ کوئی بینڈ باجے یا پروٹوکول کے ساتھ تو آئے گا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ خاموشی سے آئے گا، ممکن ہے وہ اندر جانے کے لیے پچھلی دروازہ استعمال کرے، پھر تمہیں کیسے معلوم ہوگا؟''

''سر! راجا صاحب سے میری بات ہوئی ہے، وہ کہہ رہے تھے کہ اگر ان کی موجودگی میں دلاور وہاں آیا تو وہ فون کے ذریعے مجھے بتا دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''او کے غنی! یہ اچھا چانس تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ ہمیں ایسا موقع دوبارہ بھی ملے گا۔'' سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے پوچھا۔

''احمد شاہ! تم دلاور کو پہچانتے ہو؟''

''یس سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''میں نے کئی برس پہلے اسے صرف ایک دفعہ دیکھا تھا لیکن میں اسے پہچان لوں گا۔''

''تم ابھی مسکین شاہ کے گھر چلے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں غنی موجود ہے۔ تم سیل فون پر اس سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

''او کے سر، میں جاتا ہوں۔'' احمد شاہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں نے وقت گزاری کے لیے اخبار اٹھا لیا لیکن اخبار میں بھی دھماکوں، خودکش حملوں، اغوا برائے تاوان، لوڈ شیڈنگ اور احتجاج کی خبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک کے بعد دوسرا اخبار اٹھایا۔ ہر اخبار میں ایک ہی طرح کی خبریں اور ایک ہی طرح کی سرخیاں تھیں۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے چونک کر سیل فون اٹھا لیا۔ اسکرین پر جمال خان شیروانی کا نام تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ ''السلام علیکم شیروانی صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''میں بہ خیریت ہوں۔'' جمال خان شیروانی نے کہا۔

''آپ آج میری طرف آ رہے ہیں؟''

''دیکھیے اگر شام کو آپ کی کوئی مصروفیت نہ ہو تو میں آ جاتا ہوں۔''

''خالی ہاتھ مت آئیے گا۔'' شیروانی نے کہا۔

''میں خود بھی خالی ہاتھ کہیں جانے کا قائل نہیں ہوں۔'' میں نے ان کا مطلب سمجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب تھا کہ وہ ویڈیو لیتے آئیے گا۔''

''آپ وہ ویڈیو دیکھے بغیر نہیں رہیں گے۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں وہ ویڈیو لیتا آؤں گا۔''

''شکریہ نواب صاحب!'' جمال خان شیروانی نے کہا۔ پھر بولے۔ ''ہاں، میں نے سنا ہے کہ کل رات آپ کے گھر ڈاکو آئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ڈاکو کیا، مسکین شاہ کے بھیجے ہوئے لوگ تھے، اگر مجھے چند منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس ویڈیو سمیت مسکین شاہ کے خلاف تمام ثبوت میرے ہاتھ سے نکل جاتے۔ میں عین اس وقت گھر پہنچ گیا جب وہ تمام اسناد لے کر فرار ہونے والے تھے۔''

''اچھا، پھر......؟'' جمال خان شیروانی نے پوچھا۔

''انہوں نے میرے ایک گارڈ کو پہلے ہی ہلاک کر دیا تھا۔ میرے گارڈز نے ان لوگوں کو بھون کر رکھ دیا۔ دو آدمی موقعے ہی پر مارے گئے، ایک بعد میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا، چوتھا زخمی حالت میں تھا اور پانچواں صرف بے ہوش ہوا تھا۔ اب وہ دونوں پولیس کی حراست میں ہیں۔''

''اور آپ کا گارڈ؟'' جمال خان شیروانی نے پوچھا۔

''پولیس نے ابھی تک اس کی ڈیڈ باڈی مجھے نہیں دی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، پولیس نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟'' شیروانی نے پوچھا۔

''ابھی تک تو پریشان نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا شیروانی صاحب، آپ سے شام کو ملاقات ہوگی۔''

میں نے سلسلہ منقطع کیا تو دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹی جب دوبارہ بجی تو مجھے احساس ہوا کہ اس وقت میں گھر میں بالکل اکیلا ہوں، نیلم کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر نیلم گیٹ کی طرف بڑھی تو میں نے اسے روک دیا اور بولا۔ ''تم اندر جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔''

''صاحب جی!...آپ......''

نیلم نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے پر شامی تھا، اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔

''آؤ شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔

شامی نے حیرت سے کہا۔ ''کیا بات ہے نواب بھائی! کیا اس وقت گھر میں کوئی ملازم، کوئی گارڈ، کوئی چوکیدار نہیں ہے؟''

''نہیں شامی بادشاہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں مجھے اپنی پرانی زندگی یاد آتی ہے جب دودھ اور دہی لینے کے لیے بھی مجھے خود ہی بازار کی طرف دوڑنا پڑتا تھا۔''

''لیکن اب ایسا نہیں ہے نواب بھائی!'' شامی مسکرا کر بولا۔ ''اس گھر میں اب بھی آپ کا ایک جاں نثار موجود ہے گو کہ کسی خوب صورت لڑکی کے ہاتھ میں ریوالور اچھا نہیں لگتا لیکن......''

اس کی بات پر میں نے اچانک گھوم کر دیکھا تو مجھے نیلم دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ بہت اعتماد سے برآمدے کے ستون کے پاس کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے ریوالور اپنی پشت کی طرف چھپا لیا۔

''اندر تو آؤ شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''کیا یہیں کھڑے کھڑے ساری بات کرلو گے؟''

''یہ غفورا ہے نواب بھائی!'' اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دلاور کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔''

''اندر تو آؤ۔'' میں نے کہا۔ مجھے غفورا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ مجھے شامی پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ اسے گھر کیوں لایا ہے؟ وہ نیلم کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے پہلی بار کوئی لڑکی دیکھی ہو۔

''نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''آپ کہہ رہے تھے کہ دلاور کہیں آنے والا ہے؟''

''وہ کام ہو گیا ہے شامی بادشاہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ احمد شاہ بھی دلاور کو پہچانتا ہے۔''

''اچھا!'' شامی ہنس کر بولا۔ پھر وہ غفورے سے بولا۔ ''کام ہو گیا ہے غفورے! اب تم جاؤ۔''

''استاد!'' غفورا کوے جیسی آواز میں بولا۔ ''میں کئی مہینے سے بے روزگار ہوں، مجھے کوئی کام دلا دو۔ اب تو فاقوں کی نوبت آ گئی ہے۔''

''ہاں ہاں، میں تمہارے لیے کہیں بات کروں گا۔'' شامی نے اپنی جیب سے ہزار روپے کا ایک نوٹ نکالا اور غفورے کو دے دیا۔ ''فی الحال یہ رکھو۔''

''بھولنا مت استاد!'' غفورے نے کہا۔ ''میں آج کل واقعی بہت پریشان ہوں۔'' اس نے شامی سے ہاتھ ملایا، مجھے سلام کیا اور روانہ ہو گیا۔

"نواب بھائی!" اس کے جانے کے بعد شامی نے کہا۔ "لگتا ہے آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے۔ شاید میں فوراً نہیں آسکا یا شاید......"

"ایسی کوئی بات نہیں شامی بادشاہ!" میں نے جبراً مسکرا کر کہا۔ "تم سے کوئی غیروں والا رشتہ ہے۔ مجھے کوئی بات بری لگے گی تو میں صاف صاف کہہ دوں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں نواب بھائی!" شامی نے کہا۔ "کوئی بات تو ہے۔"

"بس، مجھے یہ غفورا اچھا نہیں لگا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "تم نے اسے یہ گھر بھی دکھا دیا۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔" شامی نے کہا۔ "لیکن ایک بات کا اطمینان رکھیں نواب بھائی! میں کسی ایسے ویسے آدمی کو یہاں تک نہیں لاسکتا ہوں۔ غفورا مرتے مر جائے گا لیکن آپ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتائے گا۔ اس بات کی ضمانت......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ غفورا بہت سراسیمگی کے عالم میں واپس آیا تھا۔

"کیا بات ہے غفورے؟" شامی نے چونک کر پوچھا۔

"استاد! باہر میں نے کچھ ایسے چہرے دیکھے ہیں جو دلاور کے ساتھ ہوتے ہیں۔" غفورے نے کہا۔ "اس کے آدمیوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں میں۔ وہ دلاور کے آدمی ہیں اور ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے۔"

شامی جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ "کتنے آدمی ہیں؟"

"دو آدمی تو میں نے سامنے دیکھے ہیں۔" غفورے نے کہا۔ "ادھر ادھر اور بھی ہو سکتے ہیں۔"

"تمہارے پاس ریوالور ہے؟" شامی نے اس سے پوچھا۔

"ہاں استاد ریوالور تو ہے۔" غفورے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم مین گیٹ کے پاس کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ ان میں سے کوئی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے بلا جھجک گولی مار دینا۔"

"میرے ریوالور میں صرف چھ گولیاں ہیں استاد!" غفورے نے کہا۔

"ریوالور کون سا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کولٹ پوائنٹ تھری ایٹ کا ریوالور ہے۔" غفورے نے جواب دیا۔

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ بوسیدہ سے کپڑوں میں نظر آنے والا وہ لڑکا جو چہرے سے انتہائی گیرا لگ رہا تھا، اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے مالیت کا کولٹ پوائنٹ تھری ایٹ ریوالور تھا۔

"ٹھہرو، میں تمہیں ریوالور کی مزید گولیاں دے دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس بھی پوائنٹ تھری ایٹ کا ایک ریوالور ہے۔"

میں اندر اپنے کمرے کی طرف گیا اور الماری سے ریوالور کی بہت سی گولیاں نکال کر لے آیا۔

"یہ رکھ لو۔" میں نے غفورے سے کہا۔ "گولیوں کی طرف سے فکر مت کرنا۔ گولیاں مزید مل جائیں گی۔"

غفورا گولیاں اپنی جیب میں بھر کر چلا گیا۔ وہ گیٹ کے نزدیک جا کر ایسی جگہ بیٹھا کہ کوئی بھی اس کی نظروں سے بچ کر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

"اب آپ بھی اپنے کمرے میں جائیں نواب بھائی!" شامی نے کہا۔ "اگر کوئی آدمی غفورے سے بچ کر یہاں آگیا تو وہ مجھ سے نہیں بچ سکے گا۔"

"میں بھی یہیں تمہارے ساتھ رہوں گا شامی!" میں نے کہا۔

"شامی جا چا ٹھیک کہہ رہے ہیں صاحب جی!" نیلم کی آواز سنائی دی۔ "میں یہاں کو ریڈور میں موجود رہوں گی۔ آپ کمرے میں جائیں۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نیلم!" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں جو دھماکوں کی آواز سے ڈر جاؤں گا یا پھر کوئی نازک اندام لڑکی ہوں کہ ریوالور اٹھانے سے میری کلائی میں موچ آجائے گی۔"

"نواب بھائی! میں......"

"مجھے نچ نچ کا نازک اندام نواب مت بناؤ شامی!" میں نے بگڑ کر کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، میں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں گا؟"

"ارے غصہ کیوں کرتے ہو نواب بھائی!" شامی مسکرا کر بولا۔ "میں تو ....."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ باہر سے فائر کا دھماکا ہوا تھا اور اس کی آواز اس دھماکے میں دب کر رہ گئی تھی۔

شامی نے ریوالور نکالا اور بہت مہارت سے برآمدے میں جا کر ایک ستون کی اوٹ میں چھپ گیا۔

میں نے بھی ریوالور نکال لیا تھا لیکن وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں گھات لگا کر بیٹھ سکتا۔ میرا وہ کمرا بہترین تھا جو پولیس نے سیل کر دیا تھا۔ وہاں سے گیٹ سے لے کر لان تک سب کچھ نظر آتا تھا۔

اچانک مجھے "ٹھک" کی ہلکی سی آواز سنائی دی، اس کے ساتھ ہی گیٹ کے پاس کوئی دلخراش انداز میں چیخا۔ اس کا مطلب تھا کہ غفورے کے پاس سائلنسر بھی تھا۔ دوسرا فائر کرنے سے پہلے اس نے ریوالور پر سائلنسر فٹ کر لیا تھا۔

میں نے سوچا، یہاں بیٹھنے کے بجائے میں کوٹھی کی چھت پر چلا جاؤں۔ میں وہاں سے نہ صرف دور دور کا جائزہ لے سکتا تھا بلکہ اندر آنے والوں کو نشانہ بھی بنا سکتا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں جا کر پستول کے کئی فاضل میگزین لیے اور ایک ٹیلی اسکوپ رائفل لے کر چھت پر چلا گیا۔

میں نے چھت پر جا کر دیکھا، دروازے کے پاس تین آدمی تھے۔ وہ غالباً کسی اور طرف سے دیوار پھاند کر گھر میں گھسنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

اچانک وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگنے لگے۔

فوراً ہی ان کے بھاگنے کا سبب بھی میری سمجھ میں آگیا۔ مجھے دور سے پولیس موبائل دکھائی دی تھی جو ہماری کوٹھی ہی کی طرف آرہی تھی۔

میں بہت عجلت میں نیچے آیا اور شامی سے کہا۔ "شامی بادشاہ! پولیس آرہی ہے، غفورے سے کہو کہ وہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔"

"غفورے کا پولیس میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔" شامی نے کہا۔ "وہ آج تک کبھی جیل نہیں گیا ہے۔ اسے اندر بلا لیں نواب بھائی! باہر تو وہ فضول میں یا تو پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے گا یا پھر دلاور کے آدمی اسے ہلاک کر دیں گے۔"

شامی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ممکن ہے اس فائرنگ کی اطلاع بھی کسی پڑوسی نے پولیس کو دے دی ہو۔ پولیس غفورے کو مشکوک انداز میں دیکھ کر اس سے پوچھ گچھ کرتی، اس کی تلاشی لیتی تو اس کی جیب سے نہ صرف ریوالور بلکہ بہت سے فاضل راؤنڈز بھی برآمد ہوتے۔ ریوالور کا لائسنس تو یقیناً اس کے پاس نہیں ہوگا۔

میں نے آواز دے کر غفورے کو بھی اندر بلا لیا اور اس سے کہا۔ "اپنا ریوالور شامی کو دے دو اور برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ تم ست بدحالی سے آئے ہو اور وہاں میری حویلی میں کام کرتے ہو۔"

غفورے نے اثبات میں سر ہلایا اور ریوالور شامی کے حوالے کر کے برآمدے میں بیٹھنے کے بجائے لان کی کیاریوں کی صفائی کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد پولیس کی موبائل وین وہاں آکر رکی۔ اس میں سے وہی انسپکٹر اترا جو ایک دن پہلے بھی آیا تھا اور کوٹھی سے لاشیں اور ملزمان کو گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو کانسٹیبل بھی تھے۔

میں اور شامی جان بوجھ کر کمرے میں چلے گئے۔ شامی نے غفورے کا ریوالور اور گولیاں میری الماری میں رکھ دیں۔

میں اطمینان سے راکنگ چیئر پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد غفورا بھی اندر آیا اور مجھ سے بولا۔

"صاحب جی! وہ پولیس والے آئے ہیں۔"

"اچھا، انہیں باہر برآمدے ہی میں بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے غفورے سے کہا اور شامی سے بولا۔ "شامی تم یہیں بیٹھو، باہر جا کر ان سے بات کروں۔ تم بھی مت بدحالی سے آئے ہو۔"

"نواب بھائی!" اس نے کہا۔ "میں جانے کو تو جاؤں گا لیکن پولیس سے برسوں میری آنکھ مچولی چلی ہے، ہو سکتا ہے وہ انسپکٹر بھی مجھے پہچانتا ہو، وہ میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے، نہ آپ کا..... لیکن فضول میں ٹینشن لینے سے کیا فائدہ؟"

"ٹھیک ہے، تم یہیں ٹھہرو، میں خود جا کر پولیس والوں سے بات کروں گا۔"

اس وقت مجھے پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے اور پھر راجا کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ "اب کیا ہے؟" وہ چیخ کر بولا۔ "تم لوگوں نے تو گھر ہی دیکھ لیا۔"

"ہمیں ان دونوں آدمیوں سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے جن کے ہاتھوں کل تین قتل ہوئے ہیں۔" انسپکٹر نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔

"میں بلواتا ہوں ان دونوں کو۔" راجا نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ غنی اور احمد شاہ گیراج میں سے نکل کر اندر کی طرف چلے گئے ہوں گے۔

راجا بکتا جھکتا میرے کمرے کی طرف آیا اور آکر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ناصر بھی تھا۔

"کیا رہا؟" میں نے پوچھا۔

"زبردست!" ناصر نے کہا۔

"مجھے تفصیل سے بتاؤ۔" میں نے کہا۔

''ہم ابھی کچھ بھی نہیں بتا رہے۔ پہلے ایک کپ چائے پئیں گے، پھر کوئی بات ہوگی لیکن اس سے پہلے اس پولیس انسپکٹر کا یہاں سے دفع ہونا ضروری ہے۔''

''وہ احمد شاہ اور غنی سے اب کیا پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو روز کا ڈراما ہے نا۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس کا خیال ہے کہ معاملہ ایک نواب کا ہے۔ اس لیے یہاں سے رقم بھی تگڑی ملے گی۔ میں ابھی اس کا دماغ درست کرتا ہوں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یہ باہر لان میں کوئی آدمی کام کر رہا ہے۔ کیا آپ نے ست بدحالی سے کسی کو بلایا ہے سر!''

''میں نے تو نہیں، شاہی بادشاہ نے بلایا ہے۔''

''نیلم!'' ناصر نے نیلم کو آواز دی۔

نیلم فوراً ہی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''جی ناصر صاحب!''

''غنی اور احمد شاہ کو یہاں بھیج دو۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔

اچانک غفورے کی بلند آواز سنائی دی۔ ''وہ لوگ کوئی ویلے نہیں بیٹھے ہیں، آرام سے بیٹھو، میں نے انہیں بلایا ہے۔''

''نام کیا ہے تیرا اوئے؟'' اس کے طرز تخاطب پر انسپکٹر کو جلال آگیا۔

احمد شاہ اور غنی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

''وہ انسپکٹر پھر تم دونوں سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' ناصر نے طیش میں آکر اٹھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام جان کر کیا کرو گے انسپکٹر صاحب!'' غفورے نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی منجھا ہوا اداکار بغیر اسکرپٹ کے ڈائیلاگ بول رہا ہو۔ ''میں تو اس حویلی کا بہت چھوٹا ملازم ہوں، ہاں، میرا صاحب بہت بڑا آدمی ہے، وہ اس وقت آرام کر رہا ہے اس لیے زیادہ شور وغل مت کرو۔''

اس وقت ناصر کی آواز سنائی دی۔ ''پرابلم کیا ہے انسپکٹر! کیوں شور مچا رکھا ہے تم نے؟ یہ تمہارا تھانا نہیں بلکہ نواب رفیق احمد شیرازی کی کوٹھی ہے۔''

''ناصر صاحب!'' انسپکٹر تلخ لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے میرے فرائض سے روک رہے ہیں؟''

''اگر چیخنا چلانا اور معزز لوگوں کے گھروں پر جا کر شور مچانا تمہارے فرائض میں شامل ہے انسپکٹر تو میں واقعی تمہیں روک رہا ہوں، اگر گالم گلوچ اور بدکلامی تمہارے فرائض میں شامل ہے تو میں تمہیں روک رہا ہوں۔''

''میں یہاں دو ملزموں سے پوچھ گچھ کرنے آیا ہوں۔''

''ملزم؟'' ناصر نے حیرت سے کہا۔ ''یہاں کون سے ملزم ہیں؟''

''نواب صاحب کے یہ دونوں گارڈز!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''ان کے ہاتھوں کل ہی تین آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔''

''تو پھر ان کے خلاف وارنٹ لاؤ اور انہیں گرفتار کر لو۔'' ناصر ہنسا کر بولا، پھر دونوں طرف سے خاموشی چھا گئی، اچانک ناصر کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''ہیلو! ذرا ہوم سیکریٹری سے بات کرائیے...... میں ناصر خان ہوں۔'' اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ ''سر، کیسے ہیں آپ...... جی ہاں، میں ناصر بول رہا ہوں، کل میں نے آپ سے ڈکیتی کی ایک واردات کا تذکرہ کیا تھا...... جی ہاں...... نواب صاحب کے بنگلے پر...... وہاں نواب صاحب کے گارڈز کے ہاتھوں تین ڈاکو مارے گئے تھے...... ایک فرض شناس پولیس انسپکٹر کو اچانک خیال آیا ہے کہ وہ دونوں تو قتل کے ملزم ہیں...... شاید وہ انہیں حراست میں لینے آیا ہے انسپکٹر کا نام...... ہاں، منیر احمد...... اچھا ٹھیک ہے...... نہیں جی، یہ اتنا بڑا افسر نہیں ہے...... جی سر...... آپ کا کام انشاء اللہ پرسوں تک ہو جائے گا...... جی ہاں، پرسوں میں پہلے صدر سے ملوں گا، پھر وزیراعظم سے ملاقات کروں گا...... جی ہاں، وہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

انسپکٹر نے اس مرتبہ بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ناصر صاحب! میں کب ان لوگوں کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟''

''یہ قتل کے ملزم ہیں نا!'' ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ان پر تو دفعہ تین سو دو لگتی ہے۔ اس کے لیے تو کسی وارنٹ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن سر! میں......''

''تم ملزمان کا کیا کرتے ہو انسپکٹر؟'' ناصر نے بلند آواز میں کہا، میں نے اسے پہلی دفعہ اتنے غصے میں دیکھا تھا۔

''میں ملزمان کو گرفتار کرتا ہوں۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

''تو پھر گرفتار کرو۔'' ناصر کا غصہ لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

راجا گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''ناصر کہیں اس انسپکٹر کی پٹائی شروع نہ کر دے۔ اس کا غصہ اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ میں جا کر اسے روکتا ہوں۔'' پھر وہ جاتے جاتے بولا۔ ''تم بیٹھو! تو باہر مت آنا۔''

''کیا بات ہے ناصر؟'' فوراً ہی راجا کی آواز سنائی دی۔ ''بھئی انسپکٹر صاحب ان لوگوں سے کچھ تفتیش کرنے آئے ہیں تو اتنا غصہ کیوں کر رہا ہے؟'' پھر وہ انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھیں اور جائیں یہاں سے۔''

''اب تو میں ان دونوں کو تھانے ہی بلا کر پوچھ گچھ کروں گا۔'' انسپکٹر کو بھی تاؤ آگیا، پھر برآمدے میں بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور دور ہوتی چلی گئی۔

انسپکٹر شاید چلا گیا تھا۔ ناصر اور راجا ایک مرتبہ پھر میرے کمرے میں آگئے۔ ناصر نے کہا۔ ''لگتا ہے، یہ انسپکٹر بھی مسکین شاہ کا آدمی ہے، آج اسے خصوصی ہدایات ملی ہوں گی کہ نواب رفیق کے گارڈز پر قتل کا مقدمہ بنا دو۔ میں ابھی اس انسپکٹر کا علاج کرتا ہوں ورنہ اس دفعہ وہ واقعی وارنٹ لے کر آجائے گا۔''

''تو صدر اور وزیراعظم سے کب مل رہا ہے؟'' راجا نے ہنس کر پوچھا۔

''یار! اس وقت تک ہوم سیکریٹری صاحب فون بند کر چکے تھے۔ آخری جملہ تو میں نے انسپکٹر کو مرعوب کرنے کے لیے بولا تھا اور وہ مرعوب بھی ہو گیا ورنہ وہ ابھی احمد شاہ اور غنی کو گرفتار کر کے لے جاتا۔''

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو ناصر خاموش ہو گیا۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا، دوسری طرف آئی جی عبداللہ جان صاحب تھے۔ میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا:

''السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے خوش دلی سے کہا، پھر بولے۔ ''نواب صاحب! آپ لاہور میں ہیں اور آپ نے مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔'' ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''میں اپنے ہی کچھ کاموں میں ایسا الجھ گیا کہ آپ سے ملاقات نہ کر سکا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے گھر میں ڈکیتی کی ناکام واردات ہوئی، چار آدمی مارے گئے لیکن آپ نے مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔''

''میں ابھی آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی علاقے کا انسپکٹر میری کوٹھی پر آیا تھا، وہ میرے دونوں گارڈز کو ان ڈاکوؤں کے قتل میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔''

''انسپکٹر منیر احمد؟'' عبداللہ جان صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں، اس کا نام یہی ہے۔''

''نواب صاحب! منیر انتہائی گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔ اس کی بہت سی شکایتیں میرے پاس پہلے بھی پہنچی ہیں، میں ابھی اسے لائن حاضر کرتا ہوں۔''

''آپ کی نوازش ہے جناب!'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے بکھیڑوں سے فارغ ہوتے ہی آپ سے ملاقات کروں گا۔''

''میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' آئی جی صاحب نے کہا اور رسمی جملوں کی ادائیگی کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے ناصر اور راجا کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

''شکر ہے، ایک بلا ٹلی۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں، اب تم بتاؤ، مسکین شاہ سے ملاقات کیسی رہی؟'' میں نے ناصر سے پوچھا۔

''میں وہاں پہنچا تو وہ بن سنور کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بہت پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ فوٹو گرافر نہیں ہے تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے۔

اس نے کہا۔ ''ناصر صاحب! میرے پاس وقت بہت محدود ہے۔ آپ کو اگر تفصیلی انٹرویو کرنا ہے تو آپ پھر کسی وقت آجائیے گا۔''

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا شاہ جی!'' میں نے کہا۔ ''پہلے ذرا آپ یہ فائلیں دیکھ لیں۔''

''کیا ہے ان فائلوں میں؟'' مسکین شاہ بیزاری سے بولا۔ ''کسی کمیٹی کی رپورٹ ہے یا......''

''یہ آپ کے خلاف میری رپورٹ ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

مسکین شاہ نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر وہ فائلیں اٹھائیں، پہلی فائل دیکھتے ہی اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟''

''آپ یہ فائلیں اطمینان سے پڑھیے گا۔ یہ میں خاص طور پر آپ کے لیے لایا ہوں۔ آپ ذرا یہ آڈیو کیسٹس سن لیں۔'' میں نے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

اپنی باتیں سن کر تو شاہ جی کا رنگ اڑ گیا۔

”شاہ جی!“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس بہت سے لوگوں کی ویڈیو فلمیں بھی ہیں جو آپ نے بنوائی ہیں، میرے پاس اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ وہ ویڈیوز آپ کے حکم پر اور آپ کے لیے بنائی گئی ہیں، اب بولیے کیا کہتے ہیں آپ؟“

کچھ دیر تک شاہ جی کے حلق سے آواز تک نہیں نکلی، اس نے کانپتے ہاتھوں سے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کئی میل تک دوڑتا رہا ہے۔

پھر وہ سنبھل کر آہستہ سے بولا۔ ”میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ یہ تمام اسٹف تمہارے پاس کہاں سے آیا کیونکہ تم ایک بڑے اخبار کے انویسٹی گیشن رپورٹر بھی ہو اور کالم نگار بھی۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم نے ان کاغذات، آڈیوز اور ویڈیو فلموں کی کیا قیمت لگائی ہے؟“

”قیمت تو آپ لگائیں گے شاہ جی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ اطمینان سے سوچ کر جواب دیجیے گا۔ اس وقت یوں بھی آپ کے پاس وقت کم ہے۔“

”وقت کو چھوڑو۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”مجھ سے ابھی فائنل بات کر لو۔“

”تو پھر بتائیے، کیا کہتے ہیں آپ؟“

”میں ان فائلوں اور دوسری چیزوں کے بدلے تمہیں ایک کروڑ دے سکتا ہوں۔“ شاہ جی نے کہا۔

میں ہنسنے لگا اور بولا۔ ”شاہ جی! یہ کوئی عوام کے ووٹ نہیں ہیں جنہیں آپ اتنے سستے داموں خریدیں گے، یہ تو آپ کی سیاسی موت کے ساتھ ساتھ آپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہے، آپ اپنے سیاسی امیج اور زندگی کی قیمت صرف ایک کروڑ لگا رہے ہیں؟“

”دو کروڑ...... تین کروڑ...... پانچ کروڑ...... دس کروڑ!“ شاہ جی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”بس میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔“

”آپ اس سے کہیں زیادہ دے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بیس کروڑ آخری ہے۔“ شاہ جی نے یوں کہا، جیسے نیلامی میں بولی لگا رہے ہوں۔ ”میرے پاس فوری طور پر بیس کروڑ سے زیادہ نہیں ہیں۔“

راجا نے کہا۔ ”یار ناصر! شاہ جی اتنے بڑے آدمی ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں تو واقعی ان کے پاس اس سے زیادہ پیسے نہیں ہوں گے، چل فائنل کر۔“

”یار راجا!“ میں نے کہا۔ ”یہ تو دیکھو کہ اس سے شاہ جی کو نقصان کتنا ہوگا۔“

”میں مانتا ہوں۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”میرا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ [illegible] کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا [illegible] مجھ پر بے شمار مقدمات ہو جائیں گے۔“

”اس کے باوجود آپ اپنی نیک نامی اور زندگی کی قیمت صرف بیس کروڑ لگا رہے ہیں؟“

”تم صحافی بھی بہت موقع پرست ہوتے ہو، کوئی ایک دفعہ تمہارے جال میں پھنس جائے تو تم لوگ زندگی بھر اسے بلیک میل کرتے ہو۔ میں اس وقت تمہیں پچیس کروڑ سے زیادہ تو دے ہی نہیں سکتا۔ اب تم چاہے کچھ بھی سمجھو۔ نقصان تمہارا بھی ہے، پچیس کروڑ کی رقم کوئی معمولی نہیں ہوتی، تم دونوں زندگی بھر بیٹھ کر کھاؤ گے تب بھی وہ رقم ختم نہیں ہوگی۔“

”اوکے شاہ جی!“ راجا نے کہا۔ ”پچیس کروڑ ڈن!“

”لیکن مجھے فوٹو کاپی نہیں بلکہ اصل کاغذات چاہئیں۔“

”ہم بھی کسی بندے کی بساط سے زیادہ نہیں مانگتے اور [illegible] بھی نہیں کرتے، ہم آپ کو ہر چیز اصل دیں گے لیکن پہلے آپ رقم ہمارے سوئس اکاؤنٹ میں منتقل کرائیں گے پھر۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم پچیس کروڑ روپے لے کر...“

”شاہ جی!“ راجا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ تو ابھی اپنی زبان سے پھر گئے۔“

”کیا مطلب؟“ شاہ جی سودا مکمل کرنے کے بعد پھر شیر ہو گیا تھا۔

”مطلب یہ کہ آپ نے ایک ہی جھٹکے میں پچیس کروڑ پاؤنڈز کو پچیس کروڑ روپے بنا دیا۔“

”وہاٹ!“ شاہ جی دہاڑ کر بولا۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، تم نے تو کبھی یک مشت پچیس لاکھ روپے نہیں دیکھے ہوں گے اور تم پچیس کروڑ پاؤنڈز کی بات کر رہے ہو؟“

”اوکے!“ راجا اٹھ کھڑا ہوا، اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھ گیا۔ ”ہمارے پاس ایسی پارٹیاں بھی ہیں جو اس اسٹف کے پچاس کروڑ پاؤنڈز بھی ادا کرنے کو تیار ہیں۔“ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آج کے بعد آپ کی سیاسی موت واقع ہو گئی ہے، چلو راجا!“

”ایک منٹ ٹھہرو، تم لوگ پچاس کروڑ روپے لے لو۔ [illegible]“

”سوری شاہ جی!“ میں نے کہا۔ ”آپ سے سودا طے نہیں ہو سکتا [illegible] ذرا یہ بھی سن لیں۔“ میں نے اپنی جیب [illegible] جس میں ڈھائی تین گھنٹے کی ریکارڈنگ ہو [illegible] ”ذرا یہ بھی سن لیں۔“

[illegible] میں وہ تمام [illegible] ریکارڈ تھی جو شاہ جی اور [illegible] درمیان [illegible] تھی۔ وہ [illegible] سن کر تو شاہ جی بالکل ڈھیر ہو گیا۔ اس نے [illegible] آواز میں کہا۔ ”ناصر! [illegible] دن [illegible] ہو۔ میرے اکاؤنٹ میں [illegible]“

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ باہر کے بینکوں میں آپ کا کتنا سرمایہ جمع ہے اور کہاں کہاں ہے؟“

”مجھے کوئی فکسڈ ڈپازٹ ختم کرنا ہوگا۔ مجھے صرف دو دن کی مہلت دے دو۔“

”ایک بات اچھی طرح سن لیں شاہ جی!“ راجا نے کہا۔ ”آپ کا تمام اسٹف ہمارے دوستوں کے پاس محفوظ ہے۔ اگر ہم دونوں میں سے کسی کو بھی کچھ ہوا، کوئی حادثہ پیش آیا تو ان میں سے کوئی وہ تمام ثبوت میڈیا کے حوالے کر دے گا۔ پھر سوچ لیں کہ آپ کہاں ہوں گے؟“

ہم دونوں وہاں سے باہر نکل آئے۔

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”ناصر! اگر اس نے اتنی رقم دے دی تو کیا تم اسے چھوڑ دو گے؟“

”وہ مر جائے گا لیکن اتنی بڑی رقم نہیں دے گا۔ مال اس نے اس لیے تو کمایا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کا بانٹ دے۔“ راجا نے کہا۔ ”اس نے دو دن کی مہلت شاید اس لیے مانگی تھی کہ ہم دونوں کا کچھ بندوبست کر سکے لیکن میں نے اس کے ارادے پر پانی پھیر دیا۔ اسے جتا دیا کہ ہماری موت کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوٹے گا۔“

اچانک مجھے دلاور کا خیال آیا۔ میں نے راجا سے پوچھا۔ ”کیا وہاں دلاور بھی آیا تھا؟“

”ہماری موجودگی میں تو آیا نہیں تھا۔“ راجا نے کہا۔

”ممکن ہے بعد میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔“

میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ”تم نے وہاں دلاور کو دیکھا؟“

”نہیں سر!“ احمد شاہ نے جواب دیا۔ ”میں نے دلاور کو تو نہیں دیکھا لیکن کچھ لوگوں کو ضرور دیکھا جو مشکوک انداز میں وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لے رہے تھے، وہاں آنے والی ہر گاڑی میں جھانک رہے تھے۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ میں نے کہا، پھر راجا سے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آفتاب خان کی اطلاع درست نہیں تھی کہ دلاور مسکین شاہ سے ملاقات کے لیے جا رہا ہے۔“

”راجا!“ ناصر نے کہا۔ ”تو ذرا اخبار کے لیے ایک زبردست سی تین کالمی خبر بنا۔ میں مختلف ٹی وی چینلز پر بات کرتا ہوں۔“

”ایک کام ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم لوگ [illegible] مسکین شاہ سے اس سودے بازی میں نور کا مطالبہ بھی کر سکتے ہو۔“

راجا نے [illegible] بولا۔ ”واہ یار! زبردست آئیڈیا ہے۔ [illegible] آیا؟“

”لیکن تم [illegible] کا مطالبہ کرو گے تو شاہ جی بدک جائے گا۔ اسے [illegible] ہو جائے گا کہ تم نور کا عشق بھی سر پہ ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”دیکھ پتر! تو شاہ جی کو کچا کھلاڑی مت سمجھ۔ وہ ان دو دن کی مہلت میں سب کچھ معلوم کر لے گا؟ اور میرے بارے میں تو ایک زمانہ جانتا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔“

اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے جمال خان شیروانی سے شام کو آنے کا وعدہ کیا ہے، میں نے شامی سے کہا۔ ”شامی بادشاہ! تم ذرا وہ ڈی وی ڈی لے آؤ جس میں......“

”میں ابھی لے آتا ہوں نواب بھائی!“ شامی نے کہا۔ ”لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ اب اس ویڈیو کو ضائع ہی کر دو تو بہتر ہے، خدانخواستہ وہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یوں بھی یہ کوٹھی دشمنوں کی نظروں میں آ گئی ہے۔“

”تو ست بدھائی کیوں نہیں چلتا پتر؟“ راجا نے کہا۔ ”اب یہاں کیا کام ہے؟“

”ہاں یار، میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ہم آج ہی ست بدھائی روانہ ہو جائیں گے۔“

میں نے غنی اور احمد شاہ سے کہہ دیا تھا کہ بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ دشمنوں نے ہمارا یہ ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت دوبارہ ہلا بول سکتے ہیں۔

احمد شاہ رائفل لے کر چھت پر چلا گیا اور غنی نے برآمدے میں مورچہ بنالیا۔

شامی صرف وہی ڈی وی ڈی لایا تھا جس میں میری ویڈیو تھی۔

''نیکے پتر! تو جمال خان شیروانی کو وہ ویڈیو دکھانا چاہتا ہے؟''

''میں نے تو بہت منع کیا لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ویڈیو دیکھ کر کہیں وہ پاگل نہ ہوجائے اور اسی پاگل پن میں شاہ جی پر چڑھ دوڑے۔''

''وہ بہت تجربہ کار بیوروکریٹ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے اس پاگل پن کی توقع تو نہیں ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، ہمیں کیا فرق پڑے گا۔''

''نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''آپ ویڈیو اپنے ساتھ لے کر مت جائیں۔ وہ میں اور گولی لے آئیں گے۔''

''شامی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''احتیاط بہت ضروری ہے۔''

''میں اس ڈی وی ڈی کو جمال خان شیروانی کی آنکھوں کے سامنے ہی ضائع کروں گا تاکہ وہ مطمئن ہوجائے۔'' پھر میں نے شامی سے پوچھا۔ ''تم نے جمال خان شیروانی کا بنگلا دیکھا ہے؟''

''اس کا بنگلا بھی میں نے دیکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر تم وہ ویڈیو لے کر وہاں پہنچو، میں بھی آرہا ہوں بلکہ ایسا کرو، تم ناصر کی گاڑی میں چلو، میں تمہارے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔''

☆☆☆

جمال خان شیروانی مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر میز پر رکھا ہوا لائٹر اٹھایا اور وہ ڈی وی ڈی لے کر برآمدے میں نکل آیا۔

میں نے باہر آکر لائٹر جلایا اور اس ڈی وی ڈی کو آگ لگانے لگا۔

جمال خان شیروانی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد پلاسٹک نے آگ پکڑلی۔ میں کچھ دیر اسے ہاتھوں میں لیے کھڑا رہا، پھر جلتی ہوئی ڈی وی ڈی کو فرش پر پھینک دیا۔

ہم دونوں خاموشی سے اس وقت تک اس جلتی ہوئی ڈی وی ڈی کو دیکھتے رہے، جب تک وہ جل کر خاک نہ ہوگئی۔

جمال خان شیروانی نے اپنے ایک ملازم کو آواز دے کر کہا کہ یہاں کی صفائی کردو۔

ہم ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں آگئے۔

جمال خان شیروانی کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا، پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھا، مجھ سے لپٹ گیا اور بری طرح رونے لگا۔

میں اس کے رونے پر گھبرا گیا اور بولا۔ ''شیروانی صاحب! اب تو پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں نے اسی لیے وہ ویڈیو آپ کے سامنے ضائع کی ہے تاکہ آپ مطمئن ہوجائیں۔''

''آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے نواب صاحب! آپ نے میری عزت بچائی۔''

''عزت دینے والا تو اللہ ہے شیروانی صاحب! میں نے آپ کی نہیں بلکہ اپنی عزت بچائی ہے۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ اب آپ کچھ دن کے لیے ست بدھائی ضرور [illegible] ہے۔'' میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اب اجازت دیں۔''

''میں آپ کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔''

''کھانے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے شیروانی صاحب! مجھے ابھی ست بدھائی کے لیے نکلنا ہے۔ زندگی رہی تو آئندہ کبھی آپ کے ہاں کھانا ہی کھالوں گا۔''

''ست بدھائی تو آپ کل بھی جاسکتے ہیں نواب صاحب!''

''میں جس کوٹھی میں مقیم ہوں، وہ دشمنوں کی نظروں میں آچکی ہے۔ مجھے دشمنوں کا خوف نہیں ہے، فضول میں ٹینشن رہے گی اس لیے میں آج ہی ست بدھائی کے لیے نکلنا چاہتا ہوں۔''

میں نے مصافحے کے لیے شیروانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بے اختیار میرے گلے لگ گیا۔

شامی نے پوچھا۔ ''نواب بھائی! کیا آپ واقعی ست بدھائی جارہے ہو؟''

''ہاں شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے ست بدھائی سے نکلے ہوئے کئی دن ہوگئے ہیں لیکن تم ابھی اپنے اس ٹھکانے پر رہنا، میں وہ سامان ابھی ست بدھائی تو نہیں

لے جا سکتا، تم کل یا پرسوں وہ سامان لے کر ست بدھائی آجانا۔"

"میں آپ سے رقم [illegible] کروں گا تو اب بھائی!" شامی نے کہا۔ "میں بھی کل [illegible] سے پہلے پہلے ست بدھائی پہنچ جاؤں گا۔"

"بہت [illegible] ضرورت ہے شامی بادشاہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس سامان میں پچیس کروڑ پاؤنڈز کی رقم چھپی ہوئی ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ راجا صاحب کو یہ رقم لے لینا چاہیے۔" شامی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، باقی باتیں گھر پر ہوں گی۔" میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے نیلم سے کہا۔ "نیلم! سامان باندھ لو، ہم ابھی ست بدھائی جا رہے ہیں۔"

"سامان تو میں نے پہلے ہی باندھ لیا ہے صاحب جی۔" نیلم نے کہا۔ "راجا صاحب نے کہا تھا کہ آپ واپس آتے ہی ست بدھائی کی طرف نکل جائیں گے۔" پھر وہ ہچکچا کر بولی۔ "صاحب جی! میں [illegible] کافی لے کر آؤں؟"

"نہیں نیلم!" میں نے کہا۔ "اب کھانا پینا سب کچھ ست بدھائی پہنچنے کے بعد ہوگا۔"

"میں تیار ہوں صاحب جی!" نیلم نے کہا۔ "غنی نے آپ کا سامان بھی تیار کر دیا ہے۔"

شامی اور کوثی کو رخصت کرنے کے بعد میں بھی ست بدھائی کے لیے روانہ ہوگیا۔ گاڑی حسب معمول غنی [illegible] رہا تھا۔ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر نیلم بیٹھی تھی۔ میں اور راجا عقبی نشست پر تھے۔ ناصر اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے آ رہا تھا، اس کے پیچھے احمد شاہ کی ڈبل کیبن پک اپ تھی۔

اچانک مجھے اس گارڈ کا خیال آیا جس نے ہماری خاطر اپنی جان دے دی تھی، میں نے ناصر کا سیل نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ "ناصر! تم پولیس کو فون کر دو کہ جاں بحق ہونے والے گارڈ کی میت ست بدھائی بھجوا دیں کیونکہ نواب صاحب ست بدھائی جا چکے ہیں۔"

"اوکے سر!" ناصر نے کہا۔ "میں ابھی فون کر دیتا ہوں۔"

غنی اپنی روایتی تیز رفتاری کے ساتھ ست بدھائی کی طرف جا رہا تھا۔ میری حالت اس وقت ایسی تھی کہ میں اپنے ہی سائے سے بدک رہا تھا۔ میرے ساتھ متعدد مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ میں تاریک راہوں میں مارا گیا تھا۔

"کس سوچ میں ہے فیکے پتر؟" راجا نے پوچھا۔

"یار، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب تو پاؤنڈز میں کروڑ پتی ہو جائے گا تو کیا حال ہوگا؟ تو، تو کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرے گا۔"

"سیدھے منہ" راجا نے کہا۔ "فیکے پتر! میں تو کسی سے [illegible] منہ بھی بات نہیں کرتا۔ میں کوئی رفیق احمد شیرازی نہیں ہوں کہ دولت [illegible] ہونے کے باوجود میں مرتا رہوں گا، کڑھتا رہوں گا۔"

"تیرے خیالات تو بہت زبردست ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"زریں خیالات کہہ!" راجا نے کہا۔ "جیسے اقوال زریں! میں بچپن سے یہ الفاظ پڑھتا آیا ہوں لیکن میں نے آج تک زرین نامی اس خاتون کو نہیں دیکھا جس کے اقوال اس کثرت سے اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں۔"

"تیرا خیال ہے کہ دولت مند ہونے کے بعد تو اس خاتون کو دیکھ سکے گا؟"

"آف کورس دیکھ سکوں گا۔" راجا نے کہا۔ "میں روز صبح اٹھ کر [illegible] کروں گا [illegible]۔ میں اپنا تخلص زریں رکھنے والا ہوں۔"

[illegible] اس قسم کی [illegible] یعنی [illegible] وقت [illegible] تھے [illegible] اعصاب بہت کشیدہ [illegible] تھے۔ [illegible] آزمایا ہوا نسخہ تھا [illegible] بکواس سے [illegible] ہی خود کو بہت پرسکون محسوس کرتے تھے۔

غنی نے اچانک گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گاڑی اتنی رفتار سے جا رہی تھی کہ بریک لگتے ہی میں اور راجا اچھل کر سامنے والی سیٹوں کی پشت سے ٹکرا گئے۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی نیلم اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرائی، پھر سیٹ اور ڈیش بورڈ کے درمیان گر گئی۔

"غنی!" راجا دہاڑ کر بولا۔ "تم ہوش میں تو ہو، یہ تم کس انداز میں ڈرائیونگ کر رہے ہو؟"

میں نے سامنے دیکھا، سڑک پر ایک ٹرالر اس انداز میں کھڑا تھا کہ راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔ سڑک پر ایک آدمی لالٹین لیے کھڑا تھا۔ وہ جھپٹ کر ہمارے نزدیک آیا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "معاف کرنا صاحب! ہمارے ٹرک کی کرینک شافٹ ٹوٹ گئی ہے اس لیے انجن جام ہو گیا ہے، ٹرالر اتنا بھاری ہے کہ اسے دو چار آدمی تو دور

کی بات، دس بیس آدمی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتے۔"

"تو کم سے کم سڑک پر ایسا بندوبست تو کرو کہ دوسری گاڑیوں کو حادثہ پیش نہ آئے۔" راجا نے کہا۔

"اسی لیے تو میں لالٹین لیے کھڑا ہوں۔" وہ شخص نرم لہجے میں بولا۔

میں نے دیکھا کہ ٹرالر اور سڑک پر اگی ہوئی خودرو جھاڑیوں کے درمیان کچے راستے پر اتنی گنجائش تھی کہ وہاں سے ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔

غنی نے اچانک گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ شخص اگر اچھل کر [illegible] نہ ہٹ [illegible] تو ہماری [illegible] گاڑی سے کچلا جاتا۔ غنی نے [illegible] مہارت [illegible] گاڑی اس تنگ جگہ میں سے نکال لی [illegible] پر میری نظر بھی پڑی تھی۔

پھر [illegible] روڈ پر آیا لیکن دوسری طرف [illegible] سمت سے آنے والی گاڑیوں کی بڑی قطار تھی۔ وہ گاڑیاں دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا اور غنی سے کہا کہ گاڑی کو روک کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرو اور سب کو پانی پلاؤ۔

غنی گاڑی روک کر کھڑا ہو گیا۔ پانی کی بوتلیں نیلم کے پاس تھیں۔ نیلم نے جھک کر پانی کی بوتل اٹھائی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بوتل سے چند گھونٹ لینے کے بعد اسے راجا کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ "مہاراجا! میں تو سمجھ رہا تھا کہ......"

"تو کیا، ہر آدمی یہی سمجھ رہا تھا فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "کہ ہمیں پھر دشمنوں نے گھیر لیا ہے لیکن......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ ہماری پشت پر زوردار دھماکا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارے پیچھے آنے والی گاڑی ٹرالر سے ٹکرا گئی ہو۔

راجا نے چیخ کر غنی سے کہا۔ "غنی، یہاں سے گاڑی نکالو، جلدی کرو۔"

غنی نے گاڑی کو جھٹکے سے آگے بڑھا دیا اور بولا۔ "سر! ست بدھائی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تو ہم پیدل بھی وہاں تک جا سکتے ہیں۔" اس نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

اچانک ایک اور زوردار دھماکا ہوا اور ٹرالر میں آگ لگ گئی۔

سامنے سے آنے والی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

غنی نے اچانک گاڑی کو کچے میں اتارا اور بائیں جانب پگڈنڈی پر دوڑانے لگا۔

میں نے گھوم کر دیکھا، اب ٹرالر کی جگہ سڑک پر جلتا ہوا بہت بڑا گولا تھا۔ اس کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ناصر کا نمبر ملانے ہی والا تھا کہ راجا کی آواز گونجی۔ "ہیلو ناصر!..... کون ہو تم؟" راجا ڈپٹ کر بولا۔ "اور ناصر کا سیل فون تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ کون حامد؟" راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

میں بھی ناصر کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"ناصر سے بات کراؤ!" راجا کا لہجہ سرد تھا۔ "میں راجا... تم بھی کمال کرتے ہو ناصر۔" راجا نے کہا۔ "یہ کسے تم نے اپنا سیل فون دے دیا..... کون؟ .... یار اسے ساتھ بٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟... ان حالات میں .. [illegible] ہاں، ہم لوگ خیریت سے ہیں لیکن تمہاری خیریت نیک مطلوب ہے؟ .. راستہ [illegible] ہے؟ .. واپس پہنچ [illegible]... بال [illegible] ظاہر [illegible] میں احمد شاہ سے بات کرتا ہوں۔"

اس نے سلسلہ [illegible] ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر احمد شاہ کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں احمد شاہ!"

"سر، آپ لوگ کہاں ہیں؟" احمد شاہ نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"ہم خیریت سے ہیں اور ست بدھائی کی طرف جا رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میری گاڑی آپ کے پیچھے ہی تھی لیکن بیچ میں دو تین گاڑیاں بہت تیزی سے گھس گئیں، پھر میں نے ایک بڑا ٹرالر سڑک پر دیکھا۔"

"غنی نے دھماکے سے پہلے ہی وہاں سے گاڑی نکال لی تھی، تم ایسا کرو، تمہارے پیچھے ناصر صاحب ہیں۔ ان کا خیال رکھو۔ ہم لوگ تو اب دس منٹ میں ست بدھائی پہنچ جائیں گے، ہماری فکر مت کرو۔"

"اوکے سر!" احمد شاہ نے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

غنی اس وقت تک گاڑی کو ست بدھائی جانے والی سڑک پر موڑ چکا تھا۔ وہ سڑک ابھی تک پختہ نہیں ہوئی تھی لیکن اس پر جو روڑی اور پتھر پڑے ہوئے تھے، ان پر روڈ رولر چل چکا تھا۔

مجھے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چیک پوسٹ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ صوبیدار میجر صاحب واقعی بہت محنت اور لگن سے کام کر رہے تھے۔

چیک پوسٹ مضبوط کنکریٹ کے کمرے کی تھی، اس کے دونوں جانب سیمنٹ کی بوریاں رکھ کر مورچے سے بنائے گئے تھے اور دور دور تک مجھے خاصی بلند خاردار تاروں کی باڑھ نظر آ رہی تھی۔

چیک پوسٹ کے سامنے سڑک کے عین درمیان میں مضبوط آہنی بیریئر لگا ہوا تھا۔

غنی نے بیریئر کے پاس گاڑی روکی اور حیرت سے بولا۔ ”یہ چیک پوسٹ کب بنی؟“

اسی وقت چیک پوسٹ سے نکل کر ایک باوردی گارڈ باہر آیا اور گاڑی کے نزدیک آتے ہی اس کی نظر غنی پر پڑی۔

اس نے ایک دم اسے فوجی انداز میں سلام کیا، پھر اس نے گاڑی کے عقبی حصے میں مجھے اور راجا کو دیکھا تو ایک مرتبہ پھر سیلوٹ کیا اور بلند آواز میں بولا۔ ”بیریئر ہٹاؤ، نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔“

فوراً سڑک کے درمیان لگا ہوا بیریئر ہٹا دیا گیا۔ غنی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”ایک منٹ!“ میں نے غنی سے کہا۔ ”گاڑی روکو!“

غنی نے گاڑی روک دی۔

”انہیں بتاؤ کہ ابھی ناصر صاحب بھی آئیں گے۔ یہ لوگ شاید ناصر کو نہ پہچانتے ہوں۔“

گاڑی رکتے دیکھ کر وہی گارڈ دوڑا دوڑا آیا جو چیک پوسٹ سے باہر آیا تھا۔

میں نے لیور دبا کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور اس سے کہا۔ ”ابھی ہمارے ایک مہمان بھی آئیں گے ناصر صاحب! انہیں زیادہ پریشانی نہ ہو۔“

”سر، ناصر صاحب کو تو میں پہچانتا ہوں۔ ہاں، ان کے ساتھ اگر کوئی اجنبی بھی ہوا تو میں کنٹرول روم سے رابطہ کر لوں گا۔ ویسے بھی صوبیدار میجر صاحب کلوز سرکٹ ٹی وی پر دیکھ لیں گے۔“

”کلوز سرکٹ ٹی وی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہاں کیمرے اور انٹر کام کب لگے؟“

”انٹر کام تو پہلے ہی تھے سر!“ گارڈ نے جواب دیا۔ ”کلوز سرکٹ کیمرے ابھی دو دن پہلے ہی یہاں لگے ہیں۔“ اس نے ادب سے جواب دیا۔

”او کے!“ میں نے کہا۔ ”چلو غنی!“

غنی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں صوبیدار میجر صاحب کے انتظامات پر بہت خوش تھا۔ کلوز سرکٹ کیمرے پہلے صرف حویلی کی دیواروں پر تھے۔ اب صوبیدار میجر صاحب نے شاید پوری ریاست کے گرد خاردار تار لگا کر اسے بالکل محفوظ بنا دیا تھا۔ چیک پوسٹ پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ ”ریاست ست بدھائی“ اس کے نیچے واضح الفاظ میں لکھا تھا۔ ”یہ شارع عام نہیں ہے۔“

صوبیدار میجر صاحب نے اتنی جلدی بہت بڑا کام کر لیا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک چیک پوسٹ اور دکھائی دی۔ اس چیک پوسٹ پر بیریئر کے بجائے بہت بھاری بھر کم اور بلند و بالا آہنی گیٹ تھا۔ ہماری گاڑی دیکھتے ہی وہ آہنی گیٹ کھل گیا۔ اسے کھولنے کے لیے غالباً کسی لیور کا استعمال کیا گیا تھا۔ وہ اتنا بڑا اور بھاری بھر کم گیٹ تھا کہ اس کے نیچے لوہے کے پہیے لگے ہوئے تھے، پہیوں کے نیچے ریل کی پٹڑی نما دو خم دار آہنی پٹیاں تھیں جن پر وہ پہیے حرکت کر رہے تھے۔ اس وقت گیٹ کا صرف ایک پٹ کھولا گیا تھا۔

غنی گھلے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ایک ساتھ کئی گارڈز نے ہمیں فوجی انداز میں سلام کیا۔ گویا پہلی چیک پوسٹ سے یہاں ہماری آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ میں اس وقت [illegible] میں خود کو اس ریاست کا نواب سمجھ رہا تھا۔ مجھے ان سب چونچلوں اور پروٹوکول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ محض نمود و نمائش نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بھی تھی۔

میں نے گارڈز کو سر کے ہلکے سے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور راجا سے بولا۔ ”یار مہاراجا! یہ صوبیدار میجر صاحب تو واقعی مجھے روایتی نواب بنا کر دم لیں گے۔“

”وہ اگر ایسا نہ کرتے تیکھے پتر تو دشمن تیرا دم لے لیتے۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو وہ کچھ انتظامات میں تو مصروف تھے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریاست ست بدھائی کو ممنوعہ علاقہ بنانے میں مصروف ہیں۔“

”سر! اب تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔“ غنی نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں تو کب سے یہی سب کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن......“

یہ پر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

انوکھی دعا

تنویر ریاض

کبھی چہرے دھوکا دیتے ہیں، کبھی لہجے چغلی کھاتے ہیں اور انسان فریب کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ جال بوسیدہ ہو تو ساری چالیں ناکام ہو جاتی ہیں... وہ جو مسیحائوں کے روپ میں زخموں پر مرہم رکھا کرتے تھے، ان کی دعائوں میں بڑی عجیب تاثیر تھی... تکلیف سے نجات دینے کا انھوں نے بڑا حیرت انگیز انداز اپنایا تھا... کہ جسے جان کر ہر چہرے پر خوف کا سایا پھیل جاتا تھا۔

[illegible]

فادر مارک فشر نے اپنی گاڑی اسپتال کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور تیز تیز قدموں سے چھ منزلہ عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ دوسرے ملاقاتیوں کی کاروں کے جمگھٹے کی وجہ سے اسے راستہ بنانے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ بہار کی ایک خوشگوار صبح تھی اور سیاحوں کی آمد شروع ہونے میں چند ہفتے باقی تھے۔ یہ وہ سیاح تھے جو صرف ایک دن کے لیے ساحل پر تفریح کرنے آتے اور دوپہر کا کھانا بھی اپنے ساتھ ہی لے کر آتے۔ اس لیے ان کے آنے سے مقامی لوگوں کو کوئی فائدہ نہ ہوتا بلکہ ان کی ذمے داریاں بڑھ جاتی تھیں۔ البتہ نیویارک اور فلاڈیلفیا سے آنے والے ان سیاحوں کی آمد

سے نوجوان پادری کو اپنی ذمے داریوں میں اضافے کا احساس ہونے لگتا اور اس کی تنہائی میں کچھ کمی واقع ہو جاتی۔

جیسے ہی وہ داخلی دروازے کے قریب پہنچا تو اس کی نظر وہیل چیئر پر بیٹھے ایک شخص پر گئی جو انگلیوں میں سگریٹ دبائے زور زور سے کش لے رہا تھا۔ اس کا زرد چہرہ اور غیر واضح نقوش سورج کی روشنی میں دھندلا سے گئے تھے۔ پادری نے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسے دیکھا اور اس کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ مریض کوئی اعتراف کرنا چاہتا ہے لیکن اسے بیان کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ اس کے لیے یہ صورت حال نئی نہیں تھی، گرجا میں بھی اکثر ایسا ہو جاتا تھا جب لوگ اعتراف کرنے کے لیے آتے لیکن ان کی زبان ساتھ نہ دے پاتی۔ اس نے مریض کے پاس رک کر ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا تو مریض بولا۔

"فادر!" اس نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرے قریب آؤ۔"

"مسٹر بوائیڈ!" فادر مارک نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کیسے..... کیا دوبارہ داخل ہو گئے؟ مجھے تمہارے یہاں آنے کے بارے میں علم نہیں تھا۔"

"ہاں۔ مجھے کھانسی میں خون آ رہا تھا۔" بوڑھے مریض نے لابی میں کھلنے والے شیشے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فادر مارک نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ مریض کے پسینے اور تمباکو کی بدبو اس کے دماغ کو چڑھ رہی تھی۔ ویسے تو وہ اس ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے فادر گریگوری نے اسپتال کی ڈیوٹی سنبھال رکھی تھی لیکن اب اسے تقریباً پورا دن ہی مونسگر کی تیمارداری کرنا پڑتی تھی۔ اس بوڑھے پادری کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی اور وہ دن بھر بستر میں پڑا کھانستا رہتا چنانچہ اب فادر مارک کو گریگوری کی جگہ اسپتال کی ڈیوٹی دینا پڑ رہی تھی جب بھی وہ عیادت کے لیے مونسگر کے کمرے میں جاتا تو وہاں بھی اسے ایسی ہی بدبو محسوس ہوتی۔

بوڑھے نے اپنے بائیں ہاتھ سے پادری کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے اسپتال کی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس بڑھیا کو یہاں سے دور رکھو۔"

فادر مارک نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ "کون سی بڑھیا؟ تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"بیٹی، باربرا بیٹی جسے تم لوگوں نے چرچ کی طرف سے مریضوں کی خدمت پر مامور کر رکھا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فادر کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہیل چیئر کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "وہ تمہاری بھیجی ہوئی ہے نا۔"

فادر مارک سیدھا کھڑا ہو گیا اور رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "بیرل۔ تمہارا اشارہ بیرل ایوانس کی طرف ہے۔"

بوڑھے مریض نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں وہی، میں جانتا ہوں کہ اس کا تعلق تمہارے چرچ سے ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" فادر مارک نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "مسئلہ کیا ہے؟ کیا وہ ٹھیک طرح تمہاری خدمت نہیں کرتی؟"

بوڑھے آدمی نے ایک بار پھر اپنا سر پیچھے کی جانب کیا اور پادری کو گھورتے ہوئے بولا۔ "وہ موت کا فرشتہ ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے اب اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کر رہا ہو۔

یہ انکشاف سن کر فادر مارک کا منہ کھلا رہ گیا۔ بوڑھے مریض نے اپنی جیبیں ٹٹول کر سگریٹ اور لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

"کیا کہا تم نے ..... موت کا فرشتہ ..... یعنی .....؟" پادری نے حونقوں کی طرح کہا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا مسٹر بوائیڈ؟"

بوڑھے مریض نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس [illegible] نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"مسٹر بوائیڈ!" اس بار فادر مارک نے ذرا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت سنجیدہ بات ہے، کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ مسز ایوانس اس اسپتال میں مرنے والے مریضوں کی موت کی ذمے دار ہے؟ آخر اس نے ایسا کیا کیا ہے جس کی بنا پر تم اتنی بڑی بات کہہ رہے ہو؟"

بوڑھے مریض کی مسلسل خاموشی نے اسے اشتعال دلا دیا اور اس کے لہجے میں غصے کی جھلک نمایاں تھی۔

"مسٹر بوائیڈ! میں سنجیدہ ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے کسی مریض کو دوا دینے میں بے احتیاطی کی یا غفلت برتی یا کوئی ایسی دوا دے دی جو اسے نہیں دینی چاہیے تھی؟"

بوڑھا مریض اب بھی کچھ نہ بولا۔ اس کی توجہ مارک سے زیادہ اپنے سگریٹ پر تھی۔

"میں اس بارے میں بہت سنجیدہ ہوں۔" فادر مضبوط لہجے میں بولا۔ "اگر تم کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"وہ ہماری موت کی دعا کرتی ہے۔" بوڑھے نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "جانتا ہوں کہ تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے لیکن تم میرے وارڈ میں کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو، جنہیں یہاں رہتے ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی شیشے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک سخت مزاج نرس برآمد ہوئی۔ اس نے بوڑھے مریض کی طرف دیکھا اور تیزی سے اس کی جانب لپکتے ہوئے بولی۔ "تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟" پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر وہیل چیئر کے ہینڈل پکڑے اور اسے داخلی دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ "تم سگریٹ پی رہے تھے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسپتال میں سگریٹ پینا منع ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پادری کو اس طرح گھورا جیسے اس نے ہی بوڑھے مریض کو یہ سگریٹ دی ہو۔ مسٹر بوائیڈ نے بھی جاتے جاتے مڑ کر فادر مارک کو دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا جیسے اسے کسی راز میں شریک کرنا چاہ رہا ہو۔ فادر مارک چند لمحے شیشے کے دروازے کی جانب دیکھتا رہا، پھر اسے یاد آیا کہ وہ یہاں مریضوں کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بھی مسٹر بوائیڈ اور نرس کے پیچھے چلتے ہوئے عمارت میں داخل ہو گیا۔

تیسری منزل پر اس کا سامنا بیرل ایوانس سے ہو گیا۔ وہ ایک کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر فادر پر پڑی۔ اس کے حلق سے ایک مسرت بھری چیخ برآمد ہوئی اور وہ اس کی جانب لپکتے ہوئے بولی۔

"اوہ فادر! مجھے امید تھی کہ آج تم ضرور یہاں آنے کے لیے وقت نکال سکو گے۔"

اس نے جامنی رنگ کا جاگنگ سوٹ اور سفید جوتے پہن رکھے تھے اور چشمے کے شیشوں کے پیچھے سے اس کی چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ فادر نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"ہیلو بیرل!" وہ ہال وے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا جہاں کھانے کی ٹرالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ فادر کو یہ اندازہ لگانے میں بالکل بھی دیر نہ لگی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔ اسے بھی بھوک کا احساس ہونے لگا اور بے خیالی میں اس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر چلا گیا۔

"میں تقریباً روزانہ ہی یہاں آتا ہوں۔" وہ گویا صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ مونسگر کی بیماری کی وجہ سے فادر گریگوری کو اس کے پاس ہی رہنا ہوتا ہے، اس لیے یہاں آنے کی ذمے داری میری ہے۔"

بیرل سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہاں یہ تو ہے۔ ہم سب ہی مریضوں کی دیکھ بھال پر مامور ہیں۔ اس کے باوجود لوگوں کو ہم سے شکایت رہتی ہے۔"

فادر مارک کو کچھ دیر پہلے بوائیڈ سے ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "تم سے مل کر خوشی ہوئی لیکن میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ابھی مجھے کئی مریضوں سے ملنا ہے۔"

وہ اس کے راستے میں آتے ہوئے بولی۔ "میں نے اس فلور پر تمام مریضوں کے کمرے ٹھیک کر دیے ہیں۔"

"بہت خوب!" وہ بلا جھجک بولا۔ "اس کے باوجود میرا ان سے ملنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کو اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا ہو یا کوئی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہو۔ ایسے میں انہیں ایک پادری کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک بند کمرے کی جانب بڑھا تو بیرل اسے آواز دیتے ہوئے بولی۔ "وہاں کوئی نہیں ہے۔"

فادر مارک نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دوسرے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، میں مسٹر بوائیڈ سے مل لیتا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی دوبارہ داخل ہوئے ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہیں آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ انہیں ایک گھنٹا پہلے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ میں ان کے لیے مسلسل دعا مانگ رہی ہوں۔"

☆☆☆

دوسری صبح فادر مارک کو مسٹر بوائیڈ کی موت کی اطلاع ملی۔ وہ صبح کی دعا سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آیا ہی تھا کہ سیکریٹری نے اسے فون کال کے بارے میں بتایا۔ دوسری جانب ایلین بوائیڈ کی بڑی لڑکی بول رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ بوائیڈ کی تجہیز و تکفین کے لیے ہفتہ کا دن مختص کر دیا جائے۔ فادر مارک نے رجسٹر پر نظر ڈالی اور اندراج کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے یہ خبر سن کر حیرت ہوئی، میں کل ہی اس سے ملا تھا اور ہمارے درمیان مختصر سی گفتگو بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں" وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔ "سانس کی ڈور کا کچھ پتا نہیں ہوتا، کب ٹوٹ جائے۔"

ٹیلی فون رکھتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس کے

ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہم سب اسی نازک ڈور سے نہیں بندھے ہوئے ہیں؟''

اس کا بقیہ دن اسی کیفیت میں گزرا۔ شام کو اسے سینٹ ونسینٹ پال سوسائٹی کی میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ جب وہ ہال میں داخل ہوا تو لوگوں کی سرگوشیوں اور کافی کی خوشبو نے اس کا استقبال کیا پھر اس کے کانوں میں کسی کی آواز آئی۔

''ہیلو فادر، ہیلو فادر مارک! یہاں آجاؤ۔''

بیرل اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ وہ اس سوسائٹی کے اہم اراکین میں سے ایک تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ چرچ کی ہر سوسائٹی یا تقریب میں شامل ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا ملنا محض اتفاق نہیں تھا پھر بھی فادر نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی، جب تک کہ وہ خود ہی اس کے سامنے نہ آگئی۔ اس نے گلابی رنگ کا جاگر سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اس کی جانب ایک کپ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''کافی!''

''نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں جانب کی نشستیں پہلے ہی پر ہو چکی تھیں۔ اس لیے یہ امکان نہیں تھا کہ بیرل اس کے برابر میں آکر بیٹھ جاتی۔ پوری میٹنگ کے دوران وہ اسے نظر انداز کرتا رہا۔ حالانکہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی نظریں مسلسل اس پر جمی ہوئی ہیں۔

ایک گھنٹے تک میٹنگ جاری رہی۔ اس دوران مختلف موضوعات زیر بحث آئے لیکن وہ لاتعلق بنا آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ اس دوران برابر بیٹھے ہوئے مسٹر بروک نے کئی بار اس کا شانہ ہلایا تو اس نے یہی جواب دیا۔ ''میں جاگ رہا ہوں۔''

مسٹر بروک زیرلب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''نو بج چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔'' پھر وہ راستہ دیتے ہوئے بولے۔ ''تم کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ ممکن ہے کہ تمہیں کسی وقت مونگر کو اسپتال لے جانا پڑ جائے لیکن اس حالت میں تم کچھ نہیں کر سکتے اور فادر گریگوری اس قابل نہیں کہ وہ اس کی تیمارداری کر سکیں۔''

''جانتا ہوں۔'' وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مونگر اسپتال جانے پر تیار نہیں ہوگا۔ اسے اپنے بستر پر ہی نیند آتی ہے۔''

وہ باہر آ رہا تھا کہ اس کی نظر عورتوں کے ایک گروپ پر گئی جو کافی کی میز کے گرد جمع تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی گفتگو کا موضوع شوہروں کی صحت یا حال ہی میں بیوہ ہو جانے والی عورتوں کی حالت سے متعلق ہوگا۔ وہ عورتیں زور و شور سے بحث کر رہی تھیں جبکہ بیرل کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ فادر نے ریک پر سے اپنی جیکٹ اٹھائی اور جیسے ہی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اس کے راستے میں حائل ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا تم بیمار ہو؟ تم مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے، یہ سب مونگر کی غلطی ہے۔ اسی کی وجہ سے تمہیں اتنا کام کرنا پڑ رہا ہے۔''

اسے اپنے بازو پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔ دیکھا تو بیرل اس کی آستین پکڑے ہوئے تھی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنا بازو چھڑا کر عمارت سے باہر نکل جاتا لیکن بیرل کی مسکراہٹ اور روشن آنکھوں کی چمک نے اسے بے بس کر دیا۔ تاہم وہ بڑے تحمل سے بولا۔

''مسز ایوانس۔ تم نے میری آستین پکڑ رکھی ہے۔''

بیرل نے پھر بھی اس کا بازو نہ چھوڑا اور اسے لے کر دوسری عورتوں کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ''فادر! ہمارے درمیان ایک چھوٹا سا مسئلہ زیر بحث ہے۔ کیا تم اسے حل کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔ یقین کرو، اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

''اس وقت مجھے بڑی شدت سے گھر جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔'' پادری نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں وہ تمام خواتین اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہوگئیں۔ اب اس کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا چنانچہ مجبوراً اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''معزز خواتین! فرمائیے، آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟''

''بیرل کا کہنا ہے کہ کسی شخص کی موت کے لیے خدا سے دعا مانگنے میں کوئی ہرج نہیں۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟'' سوال پوچھنے والی روز بارنس تھی۔

فادر مارک کو یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ وہ اس سوال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ گویا مسز بوائیڈ نے بیرل کے بارے میں جو کہا تھا وہ سچ تھا۔ بیرل پر اس کا شک اور گہرا ہو گیا۔

دوسری عورتوں پر نظر ڈالنے اور ان کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ سب اس بحث میں مسز روز کا ساتھ دے رہی تھیں۔ فادر مارک اس عورت کے شوہر انتھونی کو جانتا تھا۔ وہ کچھ مہینوں سے بہت بیمار تھا اور اب بھی اس کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر کے سبب اس کی صحت یابی میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ عورتیں اس موضوع پر کیوں گفتگو کر رہی تھیں، تاہم اسے شک تھا کہ اس کی ذمے دار بھی بیرل ہی ہے۔

''نہیں بتاؤ فادر!'' بیرل بولی۔ اس نے ابھی تک مارک کی آستین نہیں چھوڑی تھی۔

''کسی کی موت کی دعا نہیں مانگنی چاہیے۔'' اسے بیرل کو غلط ثابت کر کے خوشی ہو رہی تھی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سوال کیوں اٹھایا گیا۔ جیسا کہ تم سب جانتی ہو...''

روز مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ سوال تم اس سے پوچھو۔ بیرل کہتی ہے کہ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی۔ کیا میں صرف اس لیے ٹونی کے مرنے کی دعا مانگوں کہ اس کی بیماری کی وجہ سے مجھے تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنا پڑ رہی ہے؟''

فادر مارک نے اس بوڑھی عورت کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے۔ وہ جانتا تھا کہ ٹونی کی بیماری کوئی معمولی اذیت نہیں ہے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔ ہمیں ہمیشہ اپنے پیاروں کی سلامتی کے لیے دعا مانگنی چاہیے۔''

بیرل اس کی بات کاٹتے ہوئے روز سے مخاطب ہوئی۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ مریض کی صحت یابی کی کوئی امید نہیں تو پھر اس کی آسان موت کے لیے دعا کرنے میں کوئی ہرج نہیں تاکہ اسے بھی اس تکلیف سے نجات مل سکے۔''

پھر وہ فادر مارک کی طرف مڑی اور بولی۔ ''کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو۔ کیا تمہیں اس میں کچھ غلط نظر آتا ہے۔ بہرحال زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔''

''خدا جب چاہے کسی کو اپنے پاس بلا لے لیکن ہم کسی کی موت کی دعا نہیں مانگ سکتے۔'' وہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ تم خود کہہ رہی ہو کہ زندگی اور موت کا اختیار اس کے پاس ہے۔ ہم اس سے کسی کی زندگی کی بھیک تو مانگ سکتے ہیں لیکن کسی کی موت کی دعا نہیں کر سکتے۔ ایسا کرتے وقت ہمیں اپنے مقاصد اور نیتوں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔''

اس کی بات سن کر روز کی حامی خواتین تائیدی انداز میں سر ہلانے لگیں لیکن بیرل اپنے موقف پر قائم تھی۔ وہ بولی۔ ''جب آپ کسی عزیز ہستی کو آہستہ آہستہ گھلتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کی دن بہ دن گرتی ہوئی حالت دیکھ کر ہمارے سینوں میں چھریاں گھنپنے لگتی ہیں تو اس کے سوا کوئی چارا نہیں کہ ہم اسے اس اذیت سے نجات دلانے کے لیے موت کی دعا کریں۔''

☆☆☆

وہ جب گھر واپس آیا تو اس نے فادر گریگوری کو چھوٹے سے لونگ روم میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کی ٹانگوں پر ایک میگزین رکھا ہوا تھا اور تھوڑی سینے پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے خراٹوں کی گونج پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ ٹیلی وژن پر ہندوستان کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں کوئی پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ فادر گریگوری کئی بار چرچ کے لوگوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اس کی جنم بھومی کے بارے میں یہ دستاویزی فلم ضرور دیکھیں لیکن مونگر کی تیمارداری کرتے کرتے اتنا تھک چکا تھا کہ اسے ٹیلی وژن پر چلنے والی یہ فلم دیکھتے ہوئے نیند آ گئی۔

کچن

ایک عورت نے نئی سم لی اور سوچا کہ اپنے شوہر کو سرپرائز دوں گی، شوہر ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

وہ کچن میں گئی اور شوہر کو نئے نمبر سے کال کی۔

''ہیلو ڈارلنگ'' شوہر نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔

''تم مجھے پلیز بعد میں کال کرنا ابھی چڑیل کچن میں ہے۔''

خود اعتمادی

بیوی کچن سے۔ ''اجی سنتے ہو... ؟ میں روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی ہوں۔''

شوہر: ''اچھا جی وہ کیسے؟''

بیوی: ''اب تو مجھ سے روٹیاں بھی جلنے لگی ہیں۔''

کنگھی

لڑکی لڑکے سے: ''تمہارے بال ایسے ہیں جیسے کوئی گھاس اگی ہوئی ہو۔''

لڑکا: ''میں بھی کہوں کھوتی اتنی دیر سے کیوں دیکھے جا رہی ہے۔''

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور

فادر مارک ٹیلی وژن بند کرنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ بوڑھے پادری کی آواز آئی۔ ”تم بالکل صحیح وقت پر آئے ہو، بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ یہ فلم دیکھو۔“

فادر مارک ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس قسط میں واقعات کو سمیٹا جارہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی فلم ختم ہوگئی تو گریگوری قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”یقیناً ان لوگوں نے اس کی ایڈیٹنگ کی ہے ورنہ پچھلی بار تو میں نے پورا پروگرام دیکھا تھا۔“

فادر مارک اس کا دل رکھنے کے لیے بولا۔ ”اچھی فلم ہے، میں نے گزشتہ بار اس کی دو یا تین قسطیں دیکھی تھیں۔“

فادر گریگوری نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”تم کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ میں تمہارے لیے اچھی سی چائے بناتا ہوں۔ مجھے آج ہی انڈیا سے بہترین چائے کا پارسل موصول ہوا ہے اور میں تمہارے لیے پلک جھپکتے میں ایک پیالی بنادوں گا۔“

”نہیں، نہیں۔ شکریہ، میں آرام کروں گا۔ مجھے بہت زور کی نیند آرہی ہے۔“

”پھر تو تمہیں ضرور آرام کرنا چاہیے۔“ فادر گریگوری کچھ مایوس ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں تو سوچ رہا تھا کہ تم سے بیرونی دنیا کے بارے میں کوئی نئی بات سنتا۔ تم تو جانتے ہو کہ موسنگر کی وجہ سے میں کہیں نہیں جاسکتا تو کہ وہ بہت باتونی ہے لیکن اس کے پاس پرانے قصوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

فادر مارک کو گریگوری پر ترس آنے لگا۔ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ”آج میں نے بہت ہی عجیب دن گزارا۔ تم چائے بناؤ، پھر میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔“

فادر گریگوری خوشی خوشی کچن کی جانب چل دیا اور اپنے کہنے کے مطابق پلک جھپکتے میں دو پیالی چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے ایک پیالی فادر مارک کو تھمائی اور بولا۔ ”شروع ہوجاؤ۔ میں تمہاری زبان سے کچھ سننے کے لیے بے چین ہورہا ہوں۔“

”مجھے ڈر ہے کہ یہ سب سننے کے بعد تم مجھے پاگل نہ سمجھنے لگو۔“

”تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پہلے ہی اس بارے میں پورا یقین ہے۔ بس تم شروع ہوجاؤ۔“ فادر گریگوری چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

”کیا تم مسز بوائیڈ کو جانتے ہو؟“ فادر مارک نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، وہ ایک بے دین شخص ہے لیکن دل کا اچھا ہے۔“ فادر گریگوری سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اس کہانی کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے شروع سے آخر تک پوری داستان فادر گریگوری کو سنادی۔ فادر گریگوری چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خاموشی سے یہ قصہ سنتا رہا، جب فادر مارک اپنی بات ختم کرچکا تو اس کے بعد بھی وہ دونوں کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ جب کچن کی گھڑی نے گیارہ کا گھنٹا بجایا تو فادر گریگوری اپنے خیالوں سے باہر آتے ہوئے بولا۔ ”شیطان بہت چالاک ہے اور وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے پوری دنیا میں گھومتا رہتا ہے۔“

نوجوان پادری نے اپنی گول گول آنکھوں سے اسے دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مسز ایوانس میں شیطان کی روح سما گئی ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ فادر گریگوری اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ”کوئی بھی انسان شیطان نہیں ہوسکتا لیکن ہم سب بڑی آسانی سے اس کے بہکاوے میں آجاتے ہیں اور اس کی سرگوشیاں ہمیں پریشان کردیتی ہیں۔ جب زندگی بوجھ لگنے لگے تو انسان موت کی تمنا کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں بھی دوسروں کی تکلیف کو سمجھتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور غور سے مارک کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اسے ذہنی طور پر بڑے روحانی کرب سے گزرنا پڑا ہوگا۔“

”ہاں۔“ فادر مارک اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ضرور ہوا ہے اور اب تو یہ کہتے ہوئے شرم آرہی ہے کہ اس نے مجھے بھی ڈرادیا۔“

”مجھے بھی اس کی باتیں سن کر ڈر لگنے لگا ہے۔“ فادر گریگوری نے ایک کمزور سا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ دعاؤں کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وہ زخم خوردہ ضرور ہے لیکن بداندیش نہیں۔“

گریگوری اپنی جگہ سے اٹھا اور مارک کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”ڈرنے کی ضرورت نہیں مارک۔ اگر کوئی نقصان ہوا ہے تو اس میں خدا کی مرضی شامل تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر بوائیڈ کی موت محض ایک اتفاق ہے۔ اب تم سونے کے لیے جاسکتے ہو۔“

دوسری صبح موسنگر کی حالت مزید بگڑ گئی اور اسے اسپتال بھیجنے کے لیے ایمبولینس منگوانا پڑی جب ایمبولینس مریض کو لے کر وہاں سے روانہ ہوئی تو دونوں پادری بیرل

ایوانس اور اس کی دعاؤں کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

فادر مارک نے معمول کے مطابق گرجا میں صبح کی عبادات سرانجام دیں اور ان سے فارغ ہوکر واپس اپنے گھر آگیا۔ آج اسے مریضوں کی عیادت کرنے کے لیے اسپتال جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ فادر گریگوری پہلے سے موسنگر کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ فادر گریگوری نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی جگہ مریضوں کی تیمارداری کرے گا۔

گھر جانے سے پہلے وہ گرجا کی سیڑھیوں پر کھڑا حاضرین کی تعداد کا جائزہ لے رہا تھا کہ بیرل ایوانس ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کے پاس آئی اور سامنے کھڑے ہوکر سر کو جھکاتے ہوئے بولی۔

”ہم سب موسنگر کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔“

”اگر وہ عیادت داروں سے ملنے کے قابل ہوا تو تمہیں دیکھ کر ضرور خوش ہوگا۔“ فادر مارک نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں نے سوچا کہ مجھے تم سے پوچھ لینا چاہیے۔“ وہ بولی۔ ”گزشتہ شب جو واقعہ پیش آیا۔ اس کے پیش نظر میں سمجھ رہی تھی کہ شاید تم اس کی اجازت نہ دو۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے بارے میں یہ تاثر قائم کیا۔“ فادر مارک کو اپنے الفاظ کھوکھلے محسوس ہوئے۔

بیرل کی آنکھوں میں ایک چمک لہرائی اور وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”جانتی ہوں کہ تم اور سوسائٹی کی دوسری عورتیں مجھے غلط سمجھتی ہیں لیکن یقین جانو میں صرف مریضوں کی بہتری کے لیے دعا کرتی ہوں، جن کے لیے زندگی بوجھ بن جائے، ان کی آسانی چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ وہ خوش رہیں، چاہے یہاں یا خدا کے پاس۔“

اس نے فادر مارک کا ہاتھ تھاما اور بولی۔ ”اب تم گھر جاکر کچھ آرام کرلو ورنہ تمہیں بھی موسنگر کی طرح اسپتال میں داخل ہونا پڑ جائے گا۔“

وہ چرچ کے داخلی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تم جانتی ہو کہ فادر گریگوری اسپتال میں ہی ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں اس کے ساتھ مل کر دعا کروں گی کہ خدا ہم سب پر رحم کرے۔“

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں فادر مارک کی آنکھ اچانک ہی کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنا چشمہ ٹٹولنے لگا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ پھر اسے دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی اور اسے یاد آگیا کہ اسی دستک کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

”کون ہے؟“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور فادر گریگوری اندر آتے ہوئے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں نیند سے جگا دیا۔“

فادر مارک نے اپنی ناک پر چشمہ جمایا اور بولا۔ ”فادر! کیا بات ہے، سب خیریت تو ہے نا؟“

”میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔“ فادر گریگوری چند قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا پیارا موسنگر بھی اس دنیا سے چلا گیا۔ میں ابھی اس کے پاس سے ہی آرہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی موت بڑی آسانی سے واقع ہوئی ہے۔“

”تم وہیں تھے؟“ فادر مارک نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو تم اس کے پاس ہی تھے؟“

”نہیں۔“ فادر نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے نیچے ہال میں مسز نزک کی عیادت کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ نمونیا سے صحت یاب ہورہی ہے۔ جب واپس آیا تو ڈاکٹر نے اس کی موت کے بارے میں بتایا۔ کاش میں چند لمحے پہلے آجاتا۔“

”بیرل ایوانس بھی وہاں موجود تھی۔ کیا وہ اسے دیکھنے آئی تھی؟“

فادر گریگوری نے غور سے اپنے نوجوان ساتھی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”وہ عورت...... میرا خیال ہے کہ نہیں۔ کیا وہ اسے دیکھنے کے لیے آنے والی تھی۔ میں نے تو اسے پورے دن وہاں نہیں دیکھا لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

فادر مارک نے بستر کی چادر اپنے گھٹنوں پر لے لی اور فادر گریگوری کو ایک خوفزدہ بچے کی طرح دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ اسپتال جاکر موسنگر کے لیے دعا کرے گی۔ میں نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اب دیکھ لو کہ کیا ہوگیا۔“

فادر گریگوری آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور اس کے جھکے ہوئے سر کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں کل ہی اس معاملے کی تحقیقات کراؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ مسز ایوانس وہاں نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی تم جانتے ہی ہو کہ موسنگر

بہت بیمار تھا اور اس کی موت اسی وقت لکھی ہوئی تھی۔ مجھے امید ہے کہ تحقیقات کے بعد ہمارے دماغ سے تمام شکوک و شبہات نکل جائیں گے اور ہم پہلے کی طرح پرسکون ہو سکیں گے۔''

☆☆☆

جمعہ کے دن کافی مصروفیت رہی۔ انہیں دو جنازوں کا انتظام کرنا تھا۔ پہلی میت مسٹر بوائیڈ کی تھی جن کی تدفین ہفتے کے روز ہونا قرار پائی تھی جبکہ موسنگر کو دفنانے کے لیے اس سے اگلا دن طے ہوا تھا۔ اسی وجہ سے فادر گریگوری جمعہ کی سہ پہر تک اسپتال نہیں پہنچ سکا۔ موسم خوشگوار تھا اور دھوپ نکلنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اسپتال کے پورٹیکو تک پہنچا۔ اسے ایک آواز سنائی دی۔

''دوسرا کہاں ہے؟''

اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''کون ہے بھئی۔ سامنے آجاؤ۔''

ایک عورت پورٹیکو سے نکل کر آئی اور بولی۔ ''وہ لمبا گورا پادری۔ میں اس سے کہنا چاہ رہی تھی کہ وہ مریضوں کو سگریٹ دینا بند کردے۔''

فادر گریگوری نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ ایک نرس تھی اور اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے ہاتھ میں کافی کی پیالی پکڑی ہوئی تھی اور اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

''فادر مارک سگریٹ نہیں پیتا۔'' گریگوری نے کہا۔

''پھر وہ ایسا کس طرح کرسکتا ہے؟''

وہ اسے دیکھتی رہی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ممکن ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ ویسے وہ بہت پیارا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تم لوگوں کو ڈیٹ پر جانے کی اجازت نہیں۔''

فادر گریگوری نے دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر قہقہہ دبانے کی کوشش کی اور بولا۔ ''کبھی کبھی میں بھی یہی سوچتا ہوں لیکن کیا کریں۔ ہمیں ہر حال میں چرچ کا فرماں بردار رہنا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور نرس کے قریب جا کر بولا۔ ''کیا تم کل ڈیوٹی پر تھیں؟''

''ہاں، لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں جاننا چاہ رہا تھا کہ ہمارے چرچ کی ایک عورت یہاں آئی تھی۔ شاید تم نے اسے دیکھا ہو۔''

نرس نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں اور بولی۔ ''دن بھر میں کئی لوگ یہاں آتے ہیں پھر میں اسے کیسے یاد رکھ سکتی ہوں۔''

''میں تمہیں اس کی نشانی بتاتا ہوں۔ اسے جاگنگ سوٹ پہننے کا شوق ہے اور اس کے پاس مختلف رنگوں کے سوٹ ہیں۔''

نرس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''اچھا، تم اس کی بات کر رہے ہو۔ اسے صرف میں ہی نہیں بلکہ سب نرسیں جانتی ہیں۔''

''وہ یہاں مریضوں کے لیے دعا کرنے اور انہیں آرام پہنچانے کے لیے آتی ہے۔'' فادر گریگوری نے جواب دیا۔

''وہ تو دیواروں کا رنگ دیکھ کر بھی دعا کرتی ہے۔'' نرس سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بعض اوقات ہمیں اسے مریضوں کے پاس سے ہٹانا پڑتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے علاج میں رکاوٹ پیش آتی ہے۔''

''کیا وہ کل یہاں آئی تھی؟'' فادر گریگوری نے پوچھا۔

''ہاں، وہ یہاں آئی تھی اور نرسوں سے پوچھتی رہی کہ فادر گریگوری کہاں ہے، کیا وہ تمہیں ہی پوچھ رہی تھی؟''

فادر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ڈھونڈتے ہی رہے۔''

''اس اسپتال میں چھ نرسیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کسی کو ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں۔''

''مجھے خود بھی حیرت ہے۔'' فادر گریگوری بولا۔ ''کیا تمہیں یاد ہے کہ وہ موسنگر کو دیکھنے آئی تھی؟''

''تم اس بوڑھے پادری کی بات تو نہیں کر رہے جس کا گزشتہ روز انتقال ہوا ہے؟'' فادر گریگوری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نرس ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ سارا دن بے شمار لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی آئی ہو۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ اگر وہ مجھے نظر آگئی تو کیا اسے بتادوں کہ تم اس سے ملنا چاہ رہے ہو؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اس سے مل لوں گا۔''

☆☆☆

فادر گریگوری کو بے چینی سے پولیس چیف جولین ہال کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ آن پہنچا۔ جمعہ کی شام چرچ بالکل خالی تھا اور وہ دونوں اس تنہائی میں سکون سے باتیں کرسکتے تھے۔ جولین نے فادر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے کہنے کے مطابق یہاں آگیا ہوں۔ اب بتاؤ معاملہ کیا ہے؟ مجھے امید ہے کہ تم میرے لیے کوئی نئی مشکل نہیں کھڑی کرو گے۔''

''مجھے امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' فادر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پولیس آفیسر نے اپنا چشمہ اتارا اور اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کیا بات ہے جو تم دفتر یا اپنے گھر میں نہیں کرسکتے تھے اور جسے سننے کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا؟''

''وعدہ کرو کہ ناراض نہیں ہوگے۔'' فادر گریگوری نے لجاجت سے کہا۔

''میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا جب تک کہ پوری بات نہ سن لوں۔''

''میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جو کچھ تمہیں بتاؤں۔ اسے صبر اور سکون سے سن لینا۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے۔ جو مناسب سمجھو وہ کرو۔''

جولین نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، اب تم شروع ہوجاؤ۔''

فادر گریگوری نے اسے تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ جولین نے پوری بات سننے کے بعد جیب سے چشمہ نکالا اور آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''دو بوڑھے آدمی اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی موجودگی میں مر گئے۔ یہ کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہیں۔ موت تو کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ ان حالات میں صرف اس عورت پر شبہ کیا جاسکتا ہے جو ان کے لیے دعا کرتی تھی حالانکہ بہت سے لوگ اس طرز عمل کی تعریف بھی کریں گے۔ وہ مریضوں کے مرنے کی دعا مانگتی تھی تاکہ انہیں تکلیف سے نجات مل جائے۔ کسی نے اسے کچھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ تم اور فادر مارک اس سے خوفزدہ ہوگئے ہو۔ کیا میں اسے اس شک کی بنا پر گرفتار کرلوں کہ وہ ملحدانہ باتیں کرتی تھی؟''

''تم سمجھتے ہو کہ ہم بے وقوف ہیں؟'' فادر گریگوری نے کہا۔ ''شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ اس وقت واقعی میں اپنے آپ کو احمق سمجھ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے پولیس آفیسر کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا وقت ضائع کیا۔ مجھے معاف کردینا کہ میں تمہارے ساتھ احمقانہ انداز میں پیش آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں فادر مارک کے لیے پریشان ہوں۔''

☆☆☆

جس دن موسنگر کی آخری رسومات ادا کی جارہی تھیں۔

اس روز غضب کی گرمی تھی۔ اس شدید گرمی میں ائرکنڈیشنر بھی پوری طرح کام نہیں کر رہے تھے۔ ہال میں موجود تمام افراد پسینے میں شرابور ہوگئے تھے۔ خوش قسمتی سے میت کو لے جانے والی گاڑی کا ائرکنڈیشنر کام کر رہا تھا۔ اس وجہ سے بشپ اور اس کے ساتھی پادریوں کو قبرستان جاتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ جب وہ لوگ گاڑی سے باہر آئے تو گرم ہوا کے تھپیڑوں نے ان کا استقبال کیا۔ فادر مارک تھوڑا سا لڑکھڑایا تو گریگوری نے اس کا بازو تھام لیا اور بولا۔ ”بہتر ہے کہ تم کار میں ہی رہو۔“

فادر مارک نے کوئی جواب نہیں دیا اور بشپ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اچانک ہی اس کی نظر بیرل ایوانس پر گئی جو کسی نہ کسی طرح میت کے قریب پہنچ گئی تھی۔ سیاہ لباس میں وہ کافی پرسکون نظر آ رہی تھی۔ تدفین کے فوراً بعد فادر مارک بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ فادر گریگوری فوراً اس کے پاس پہنچا اور اس کے سفید خشک چہرے پر نظر ڈالتے ہی چلایا۔ ”ارے کوئی ہے۔ اسے فوراً اسپتال لے چلو۔“

فادر مارک کو ہوش آیا تو اس وقت بھی گریگوری اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے پیار سے فادر مارک کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا ورنہ تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔“

مارک نے فادر گریگوری کو دیکھا اور بولا۔ ”کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا؟“

”ہاں۔“ فادر گریگوری نے کہا۔ ”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں وائرل انفیکشن ہے جس پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تمہاری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی اور آج کی گرمی کی وجہ سے یہ نوبت آئی۔“

اس نے فادر مارک کو پانی پلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بہت زیادہ پانی پینے کی ضرورت ہے۔“

”کیا تم نے اسے دیکھا؟“ فادر مارک نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

فادر گریگوری سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس کی جانب ہے اور بولا۔ ”ہاں لیکن وہاں اور بھی تو کئی لوگ تھے۔“

”میں اسے دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسے میرے پاس نہ آنے دینا فادر۔“

”تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس چیف جولین کو یقین ہے کہ ہم اس بے چاری عورت کے بارے میں احمقانہ باتیں کر رہے تھے اور میں اس سے تقریباً متفق ہوں۔“

نوجوان پادری نے اس کا بازو تھام لیا اور بولا۔ ”پلیز، فادر، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ساری رات تمہارے پاس بیٹھا رہوں گا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”ہاں، جب تک میں ٹھیک نہ ہو جاؤں۔“ فادر مارک کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ تھوڑی دیر میں ہی سو گیا۔

کچھ دیر بعد وہی نرس دروازے پر آئی جس سے ایک روز پہلے وہ مل چکا تھا۔ اس نے گھڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

”میں رات کو یہیں رکوں گا۔ فادر مارک کی یہی خواہش ہے۔“

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ یہ کہہ کر وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح خاموشی سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد فادر گریگوری نے اپنی کرسی کا رخ دروازے کی جانب کر لیا تاکہ آئندہ اسے کسی پر حیرانی نہ ہو۔ گو کہ چند لمحوں بعد اس کی بھی آنکھ لگ گئی لیکن بار بار اس کے خواب میں وہی نرس آتی رہی جو بے چینی سے اپنی گھڑی پر انگلیاں مار رہی تھی۔

نرس نے [illegible] کمرے کا چکر [illegible] فادر گریگوری کو [illegible] دیکھ کر واپس لوٹ گئی۔ [illegible] اس کی موجودگی میں وہ اپنا [illegible] نہیں رکھ سکتی لہٰذا اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابھی فادر مارک کا وقت نہیں آیا تھا۔ ایسے ہر موقعے پر وہ بوڑھی عورت کی ہدایات پر عمل کرتی اور مریض کی مدد کر کے اسے ہر تکلیف سے آزاد کر دیتی یہ اس کا سیدھا سادا اصول تھا لیکن اس کے لیے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی اور اگر بیرل ایوانس نوجوان پادری میں دلچسپی ظاہر کرتی۔ دن کے یہ دعائیہ کلمات ادا کرتی اور مخصوص رنگ کا لباس پہنتی تو وہ اک بار بھی وہی عمل دہرا سکتی تھی جو اس سے پہلے بوڑھے پادری، مسٹر بوائیڈ اور کئی دوسرے مریضوں کے ساتھ کر چکی تھی۔ ایسے مواقع پر وہ خود ایسے فرشتے کا روپ دھار لیتی جو کسی کو نظر نہ آتا ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ وہ پولیس چیف کی عقابی نگاہوں کے حصار میں آ چکی ہے اور آئندہ وہ فادر مارک تو کیا بلکہ کسی بھی مریض کو بیماری کی اذیت سے نجات دلانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔

حضرت عزیر علیہ السلام

رضوانہ ساجد

انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی بھی بڑا واقعہ ایک ہی دن میں رونما نہیں ہوتا۔ وقت برسوں اس کی پرورش کرتا ہے... خدا اپنے قانون خود بناتا ہے... وہ فرعون کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کراتا ہے اور کہیں قدرت اپنے مخصوص بندوں کے لیے سامانِ نجات تیار کر رہی ہوتی ہے... بھڑکتی آگ کے شعلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈے ہو کر نمرود کو حیران کرتے ہیں تو کبھی بخت نصر جیسے جلاد بادشاہ کو ششدر کر دیتے ہیں... جس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے یہ منظر دیکھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو آگ میں دھکیلا گیا تو نہ صرف بھٹی کے اندر بھڑکتے شعلے خاموش ہو گئے... بلکہ بھٹی کے فرش پر انگاروں کے ڈھیر پھولوں میں تبدیل ہو گئے... سبحان اللہ... بے شک اللہ اپنے صادق اور امین بندوں کو اپنی امان میں رکھتا ہے... اور انبیا کا درجہ تو بہت بلند ہوتا ہے۔

ابنِ آدم کے لیے [illegible] انبیا

بائبل میں آپ کا نام عزرا (EZRA) اور قرآن پاک میں عزیر ہے۔ آپ کے والد اور سلسلۂ نسب کے بعض دوسرے ناموں میں مورخین کے درمیان بڑا اختلاف ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام کی نسل سے تھے۔

قرآن پاک کی سورۂ توبہ میں آپ کے نبی ہونے کا اشارہ ان الفاظ میں ملتا ہے۔

”اور یہودیوں نے کہا۔ ”عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا۔ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی باتیں ہیں محض ان کی زبانوں سے نکالی ہوئی۔ ان لوگوں نے بھی ان ہی کی سی بات کہی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت، یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔“

آپ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمائے گئے لیکن یہ مرتبہ اچانک زیب مقدر نہیں ہو گیا بلکہ اس سے پہلے

آپؑ ان تمام امتحانات سے گزار ے گئے جو اسباق نبوت میں درج ہیں۔

ابھی نوعمر تھے اور لڑکوں میں شمار تھا کہ آپؑ نے سمتِ بابل سے اس آندھی کو چلتے دیکھا جس نے مبارک گھر ''یروشلم'' کو خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ اس کی عظمت و رفعت مٹی میں مل گئی۔ عمارت کھنڈر بن گئی۔ متبرک ظروف، فوج کا سامانِ غنیمت بن گئے، شہر میں قتلِ عام شروع ہوا تو کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ بوڑھے، کمزور اور بیمار، زندگی سے نجات پا گئے۔ صرف جوان اور بچے تھے جنہیں غلام بنا کر زندگی کی بھیک دے دی گئی تھی۔

یہ آندھی بابل کے فرماں روا بخت نصر کی شکل میں نازل ہوئی تھی۔ فرماں روائے بابل پر خبط سوار ہوا تھا کہ اپنی حدود کو وسعت دے۔ یہی دیوانگی اسے فلسطین کی طرف لے آئی تھی۔ پے در پے تین حملے کیے اور بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل کی طرف لے گیا۔ انہی قیدیوں میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی تھے۔ یہ ہجرت بھی تھی، غلامی بھی اور قید بھی۔ جلاوطنی کا ایک عذاب تھا جو آپؑ کو کھینچے لیے چلا جا رہا تھا۔

بخت نصر فصیلِ شہر کے قریب خیمہ لگائے بیٹھا مشرقی دروازے سے قیدیوں کو نکلتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو اب اس کی ملکیت تھے۔ وہ اپنی فتح پر نازاں ضرور تھا لیکن اس سوچ میں غلطاں بھی تھا کہ جس شہر میں تواتر سے برگزیدہ ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں وہاں گمراہیاں اتنے عروج پر کیوں ہیں؟ کیا ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو انہیں ڈراتا کہ اگر باز نہ آئے تو میں عذاب کی صورت نازل ہو جاؤں گا۔ بالآخر اس نے ایک قیدی کو اپنے پاس بلایا۔

''کیا تم میں خدا کا کوئی بندہ ایسا نہیں تھا جو تمہیں ہدایت کرتا؟''

''ایک تھا مگر افسوس ہم نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔ اس نے تیرے اس حملے سے پہلے ان سب حالات کی پیش گوئی کر کے بنی اسرائیل کو ڈرایا بھی تھا۔''

''پھر دیکھو میں تم پر کیسا فتح یاب ہوا۔''

''تمہاری کیا مجال تھی اگر ہم نے اپنے خدا کو ناراض نہ کیا ہوتا اور اپنے نبی کو نہ جھٹلایا ہوتا۔''

''تمہارا وہ نبی اس وقت کہاں ہے، کہیں وہ میری فوج کی تلواروں کی غذا تو نہیں بن گیا؟''

''اس نے تمہارے حملوں کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا لیکن حکمرانوں کو اس کی یہ بات پسند نہیں آئی اور اسے شاہی قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ اب بھی وہیں ہوگا۔''

''وہ تو بڑا باکمال آدمی ہے، کیا نام ہے اس کا؟''

''حضرت یرمیاہؑ۔''

بخت نصر نے قیدی کو جانے دیا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس نام کا جو بھی آدمی شاہی قید خانے میں ہو اسے عزت و احترام کے ساتھ میرے حضور پیش کرو۔

یہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام تھے جو اس وقت بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے۔ آپؑ بخت نصر کے حضور پیش ہوئے تو گویا خواب کی تعبیر آپؑ کے سامنے تھی۔

''آخر وہ دن آ گیا جس سے میں ڈرایا کرتا تھا۔'' حضرت یرمیاہؑ نے فرمایا۔ ''میں نے اپنی قوم کو بہت سمجھایا لیکن کسی نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔''

''کیا آپؑ کو معلوم تھا کہ اس قوم پر عذاب لانے کے لیے تمہارے خدا نے میرا انتخاب کیا ہے؟''

''میں سیکڑوں بار عالمِ رویا میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہ عظیم الشان قوم اب میری غلام رہے گی۔''

''تم اللہ کے حکم سے ستر سال سے زیادہ اسے غلام نہیں رکھ سکو گے۔ اللہ اس قوم کو پھر عروج دے گا اور تم پر فارس غالب ہو جائے گا۔''

''کیا تم بہت زیادہ دانش کی باتیں نہیں کر رہے ہو؟''

''میں تو وہی کہتا ہوں جو مجھ سے میرا خدا کہلواتا ہے۔''

''میں تمام یروشلم کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں لیکن اگر آپؑ میرے ساتھ چلنے کی ہامی بھر یں تو میں آپؑ کو مہمان اور مشیر کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں اور میری قوم آپؑ کی ہمیشہ عزت کرے گی۔''

''میری قوم جس ذلت کے ساتھ بابل لے جائی جا رہی ہے اس کے مقابلے میں کوئی بھی عزت مجھے کیسے راس آ سکتی ہے اور مجھے کیونکر قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ تو تکلیف مت کر، میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''اچھا میرے لیے کوئی نصیحت؟ کوئی ایسی نصیحت جو میری بادشاہت کو قائم رکھے۔''

''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جو متبرک ظروف تم اپنے ساتھ لے جا رہے ہو ان میں کبھی شراب مت پینا۔ اگر شراب پی گئی تو بابل پر زوال آ جائے گا۔''

''محترم بزرگ، میں اس نصیحت کو یاد رکھوں گا۔ اس سامان کو سرکاری مال خانے میں فتح کی یادگار کے طور پر حفاظت سے رکھوں گا۔''

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے بابل جانے سے انکار کر دیا تھا اور بخت نصر یہ سوچ رہا تھا کہ حضرت یرمیاہؑ نہ سہی، اس قوم کے کچھ عقل مند اگر مجھے مل جائیں اور میرے مشیر بن کر رہیں تو میرے حق میں کتنا اچھا ہو۔ یہ نبی زادوں کی سرزمین ہے۔ یہاں ایسی نسلوں کے جوان موجود ہوں گے جو میری سلطنت کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں ان کو ایسا بنا دوں گا کہ ان کی رگوں میں خون تو فلسطینی ہوگا لیکن وہ سر سے پاؤں تک کلدانی بن چکے ہوں گے۔ ان کے اذہان میرے لیے سوچا کریں گے۔

خدا اپنے قانون خود بناتا ہے۔ وہ فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کرتا ہے۔ بخت نصر بیت المقدس کے نوجوانوں کی تلاش میں تھا اور قدرت اپنے مخصوص بندوں کے لیے سامانِ نجات تیار کر رہی تھی۔

بخت نصر نے بہت سوچ سمجھ کر خواجہ سراؤں کے سردار اسپنز کو اپنے پاس بلایا اور اسے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے ایسے نوجوانوں کو تلاش کر کے لاؤ جو عقل و دانش میں بے مثال ہوں۔ جنہیں میں اپنا مشیر بنا سکوں۔

اسپنز کے لیے یہ تلاش اتنی آسان نہیں تھی۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں میں سیکڑوں ایسے تھے جن پر نگاہ جاتی تھی۔ ان کا موازنہ کرنا تھا اور بہتر سے بہتر کی تلاش کرنی تھی۔ ادھر قدرت نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کی تکمیل ہونے لگی۔ اسپنز نے جن چار نوجوانوں کا انتخاب کیا، ان میں ایک حضرت عزیر علیہ السلام بھی شامل تھے۔ باقی تین کے نام حضرت دانیال علیہ السلام، حنیناہ اور میسا ایل تھے۔ یہ چاروں اعلیٰ نسب بھی تھے اور ظاہری شکل و صورت میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اسپنز نے ہر طرح سے ان کا امتحان لیا اور بادشاہ کے حضور پیش کر دیا۔ بادشاہ کو اس کے سوا ان میں کوئی کمی نظر نہیں آئی کہ وہ کمزور بہت تھے۔ حضرت عزیر علیہ السلام خاص طور پر، کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے چھوٹے بھی تھے۔

''ان کے چہروں پر وہ رونق نہیں ہے جو میرے دربار کو آراستہ کر سکے۔ یہ اتنے کمزور کیوں ہیں؟'' بخت نصر نے سوال کیا۔

''جلاوطنی کی صعوبتوں نے انہیں کمزور کر دیا ہے۔ شاہی غذا میسر آئے گی تو ان کے چہرے چمکنے لگیں گے۔''

''میں ان نوجوانوں کے لیے تین سال کے لیے وظیفہ مقرر کرتا ہوں۔ انہیں شاہی خوراک کھلائی جائے اور وہ شراب کثرت سے پلائی جائے جو صرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہے اور ان پر معلم مقرر کیے جائیں جو انہیں کلدانی زبان سکھائیں اور دوسرے علوم کی تعلیم دیں۔''

ان چاروں کو ایک بڑے مکان میں ٹھہرا دیا گیا۔ یہ چاروں اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور نیک سیرت بھی تھے۔ مذہب سے خاص لگاؤ تھا۔ شریعت موسوی کے پاسدار تھے۔ خصوصاً حضرت عزیرؑ کو تو کتاب مقدس توریت کے بہت سے حصے زبانی یاد تھے۔ انہیں کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ شراب کو منہ لگائیں اور اس گوشت کو کھائیں جو بتوں کے نام پر قربان کیا گیا ہو۔ انہوں نے حضرت دانیالؑ کو اپنا لیڈر بنا لیا کیونکہ وہ عمر میں بڑے تھے اور انہیں یہ اختیار دیا کہ وہ جو چاہیں فیصلہ کریں۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد شراب پینے سے انکار کر دیا۔ بابل میں رہ کر اور شراب پینے سے انکار۔ کچھ عجیب سی بات تھی اور وہ بھی شاہی شراب۔ اس کے لیے تو لوگ ترستے رہتے تھے۔

''تم کیسے نوجوان ہو کہ شراب سے پرہیز کرتے ہو؟''

''ہمارے مذہب میں شراب جائز نہیں۔ ہم نے حلال، حرام میں فرق کرنا چھوڑ دیا تھا ورنہ ہم ہرگز غلام نہ بنتے۔ ہم وہ گوشت بھی نہیں کھائیں گے جو بتوں کے نام پر قربان کیا جاتا ہے۔''

''یہ تو تم نے ایسی بات کر دی کہ میں بادشاہ کے عتاب کا نشانہ بن جاؤں گا۔ جب تم گوشت نہیں کھاؤ گے، شراب نہیں پیو گے تو تمہاری کمزوری کیسے دور ہوگی۔ تمہارے چہروں پر رونق کیسے بحال ہوگی۔ کیا مجھ پر یہ الزام نہیں آئے گا کہ جو غذا تمہارے لیے مخصوص کی گئی ہے، وہ میں اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ کیا تمہیں اچھا لگے گا کہ جو مہربانیاں میں نے تم پر کی ہیں اس کا صلہ یہ ملے

کہ میں سزا کا مستحق ٹھہرایا جاؤں۔"

"مہربان بزرگ، ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" حضرت دانیالؑ نے اسپنز کو تسلی دی۔ "حلال غذا میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ تو ہمیں معمولی ساگ پات کھلا اور سادہ پانی پینے کے لیے دیتا رہ۔ تو دیکھے گا کہ ہمارے چہروں کی رونق بحال ہونے لگی ہے۔ صرف دس دن میں تو دیکھے گا کہ شاہی کھانا کھانے والوں سے زیادہ رونق ہمارے چہروں پر ہے۔"

"صرف سادہ پانی جس میں شراب شامل نہ ہو تمہیں کیسے تروتازہ رکھ سکتا ہے؟"

"ہم تمہاری منت کرتے ہیں۔ ہماری آزمائش کے لیے دس روز مقرر کر دے۔ اگر دس روز بعد ہمارا دعویٰ غلط ثابت ہوا تو ہمارے لیے کوئی سزا تجویز کر لینا۔"

ان صالح نوجوانوں نے اسپنز کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی بات مان لے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شاہی غذا کے بجائے ساگ پات اور سادہ پانی مہیا کر دیا اور دس روز تک انہیں آزماتا رہا۔ دس روز کے بعد اس نے ان کے چہروں کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ان کے چہروں پر ان سب جوانوں کے چہروں کی نسبت جو شاہی کھانا کھاتے تھے، زیادہ رونق اور تازگی نظر آئی۔ خواجہ سراؤں کے سردار کو یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی شخص سادہ پانی اور معمولی غذا سے بھی صحت قائم رکھ سکتا ہے۔ اس نے مزید تصدیق کے لیے ان چاروں کو بخت نصر کے سامنے مزید ہدایات لینے کے لیے پیش کیا تاکہ بادشاہ ان کے چہروں پر نمایاں ہونے والے فرق کو پہچان سکے۔ بادشاہ نے ان کو دیکھتے ہی اسپنز کی اور اپنی مہربانیوں کی تعریف کی۔

"تو نے ٹھیک کہا تھا۔ جلاوطنی کی صعوبتوں نے ان نوجوانوں کو کمزور کر دیا تھا۔ اب انہیں عیش اور شاہی شراب میسر ہوتی ہے تو چہرے کس طرح چمکنے لگے ہیں۔ اب تو انہیں لے جا۔ ان کی غذا کا خیال رکھ۔ ان پر معلم مقرر کر اور انہیں اس قابل بنا دے کہ یہ میرے دربار میں رہنے کے اہل ہو جائیں۔"

اسپنز خوش تھا کہ راز فاش نہیں ہو سکا۔ بادشاہ یہی سمجھتا رہا کہ بہترین خوراک اور شاہی شراب نے ان نوجوانوں کو صحت مند بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لڑکوں میں وہ کوئی غیر معمولی بات دیکھ رہا تھا۔ بھلا کوئی سادہ پانی پی کر ایسا توانا ہو سکتا ہے۔ یقیناً ان لڑکوں کے ساتھ کوئی غیبی طاقت ہے۔ اسپنز نے گردن جھٹک دی۔ مجھے کیا، ان کے ساتھ کوئی بھی ہو۔ میرا تو فائدہ ہو رہا ہے، خزانے سے بہترین شراب ان لڑکوں کے نام پر لیتا ہوں جو میرے استعمال میں رہتی ہے اور انہیں سادہ پانی پلاتا ہوں۔

بادشاہ نے تین سال کی مدت مقرر کی تھی۔ اس عرصے میں یا اس سے کچھ زیادہ میں ان چاروں نوجوانوں کو کلدانی زبان سیکھنی تھی اور مروجہ علوم میں مہارت حاصل کرنی تھی۔ اسپنز نے ان کی تعلیم کے لیے بہترین اساتذہ مہیا کر دیے تھے۔

ان کے اساتذہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ یہ چاروں بڑی تیزی سے علم کی منزلیں طے کر رہے ہیں خصوصاً حضرت دانیال علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام (عزرا) کی رفتار تو قابلِ رشک ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اپنے اساتذہ سے آگے نکل جائیں۔

تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ یہ تین سال حضرت عزیر علیہ السلام کے لیے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے لڑکپن سے نکل کر جوانی میں قدم رکھا تھا۔ شباب کی سرخی چہرے پر ایسا نور بن کر ابھری تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں راستہ بھول جاتی تھیں۔

بخت نصر کے دربار میں پہنچے تو وہ کچھ اور دیکھنا بھول گیا۔ بنی اسرائیل کے یہ چاروں افراد اپنی وضع قطع میں بالکل اہل بابل میں سے معلوم ہو رہے تھے۔ وہی لباس، وہی انداز۔ دربار میں کھڑے رہنے کے سلیقے سے آراستہ، شاہی آداب سے مزین۔

بادشاہ نے ان کا امتحان لینے کے لیے ان سے پوچھا۔ "کیا تم نے کلدانی زبان سیکھ لی؟"

"محترم، ہمیں پوری طرح یہ زبان آ گئی ہے۔ اتنی کہ ہم بادشاہ سے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

بادشاہ سے گفتگو کرنے کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہوں کے حضور جو مرصع زبان بولی جاتی ہے ہمیں اس پر دسترس حاصل ہے۔ بادشاہ ان کے اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ دربار میں جو مختلف علوم کے ماہر بیٹھے تھے انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ان نوجوانوں سے سوالات کریں اور ان کی علمی صلاحیت کو آزمائیں۔ اساتذہ نے جو سوال پوچھا ان نوجوانوں نے خاطر خواہ جواب دیا۔ دلچسپ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوئی جب حضرت عزیر علیہ السلام نے ان علما سے سوال کرنے اور انہیں آزمانے کی خواہش ظاہر کی اور بادشاہ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے دربار کے ماہر علما ایک نوعمر لڑکے کے سامنے بے بس نظر آ رہے ہیں۔ اس نوجوان کے سوالات مذہب سے متعلق تھے اور کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔

بادشاہ کو یہ چاروں نوجوان اور ان کا علمی وقار ایسا پسند آیا کہ دربار کو ان کی موجودگی سے آراستہ کر لیا۔ جب دربار میں

بیٹھتا تو دائیں بائیں ان کو کھڑا رکھتا۔ سلطنت کا کوئی مسئلہ ہوتا، ان سے مشورہ طلب کرتا اور عمل کرتا۔ حضرت دانیالؑ کی دانش اور حضرت عزیرؑ کی سنجیدگی اور قوت حافظہ سے بادشاہ بے حد متاثر تھا۔ اہل بابل کے لیے یہ امر باعثِ حیرت تھا کہ غلام قوم کے یہ افراد غلامی کے بجائے آقائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بخت نصر ان کی ازحد قدر دانی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس جو بنی اسرائیل جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، ان بے شل نوجوانوں سے خوش نہیں تھے جنہوں نے کلدانیوں کی زبان سیکھ لی ہے اور انہی کی طرح کا لباس پہن لیا ہے۔ بعض تو یہ بھی کہنے لگے تھے کہ شاید انہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر بابلیوں کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔

یہ نوجوان اپنی اس حالت پر خوش تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو اتنا خوش کر دیا تھا کہ اپنی قوم کے حق میں بہت سی مراعات حاصل کر سکتے تھے۔ یہی ان کا مطمح نظر تھا۔

بخت نصر کے دربار میں ان کی قدر و منزلت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ عزت و وقار میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن ابھی عروج کی منزلیں مزید باقی تھیں۔ خدا چاہتا تھا کہ یروشلم کے ان فرزندوں کے ذریعے اس کا نام بلند ہو۔ ہوا یہ کہ ایک رات جب بخت نصر نیند کے بستر پر تھا، اس نے ایک پریشان کن خواب دیکھا۔ خواب کیا تھا خوف اور دہشت کا پیغام تھا۔ مزید پریشانی یہ ہوئی کہ اسے خواب یاد نہیں رہا۔ بس اتنا یاد رہا کہ اس خواب میں اس نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ مسہری کی چھت پر آسیب زدہ کی طرح گھور رہا تھا۔ خوف تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا اور خواب تھا کہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ محل کے نجومیوں اور جادوگروں کو طلب کر کے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس نے کیا خواب دیکھا ہے، اور اس کی تعبیر کیا ہے؟ صبح ہوتے ہی اس نے فال گیروں، نجومیوں اور جادوگروں کو اپنے حضور طلب کر لیا۔

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور اس خواب کو دریافت کرنے کے لیے میری جان بے تاب ہے۔"

"اے بادشاہ، تو ابد تک جیتا رہے۔ جب ہم ہیں تو تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا خواب بیان کر اور ہم اس کی تعبیر کریں گے۔"

"اگر مجھے خواب یاد رہ جاتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ میں تو یہ جاننے کے لیے فکرمند ہوں کہ میں نے خواب میں کیا دیکھا تھا۔ تعبیر کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔ تم لوگوں کو اپنے علم سے یہ بتانا ہے کہ میں نے خواب کیا دیکھا۔ اس کے بعد تعبیر کرنی ہے۔"

ایسا عجیب و غریب مطالبہ سن کر سب کے چہرے اتر گئے۔ بھلا کوئی علم یہ کیسے بتا سکتا ہے کہ کس نے خواب کیا دیکھا ہے۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ آخر ایک نے ہمت کر کے اپنی پسپائی بیان کی۔

"اس زمین کے سینے پر کوئی عالم ایسا نہیں جو بادشاہ کے اس خواب کو بیان کر سکے جو اس نے دیکھا ہے اور اب بھول گیا ہے۔ شاید کوئی بادشاہ یا امیر ایسا نہیں جس نے کبھی ایسا سوال کیا ہو۔ اس راز کو تو کوئی دیوتا ہی کھول سکتا ہے۔ ہمیں اس سے معذور رکھ۔"

بادشاہ یہ سن کر غضب ناک ہوا۔ "میں یہ حکم دے چکا ہوں کہ اگر تم نے خواب نہ بتایا تو تم سب قتل کیے جاؤ گے اور اگر بتا دیا تو مجھ سے انعام پاؤ گے۔ میں تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد کسی کی نہیں سنوں گا۔" حضرت دانیال علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام بھی اس وقت دربار میں موجود تھے۔ جب تمام علما اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تو یہ بھی لوٹ آئے۔ اس وقت بادشاہ اتنے غضب میں تھا کہ اس وقت وہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں تھا۔

وہ ابھی بہ مشکل گھر پہنچے تھے کہ ان کے کانوں نے بادشاہ کا حکم سنا۔ "بابل کے تمام حکیموں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے گھروں کو آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا جائے۔"

اس حکم کا جاری ہونا تھا کہ سردار اریوک سپاہیوں کو لے کر اس حکم نامے پر عمل کرانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ بابل کے تمام حکیم جان کے خوف سے نکل بھاگے تھے، صرف یہ چار نوجوان اللہ پر توکل کیے گھر میں بیٹھے تھے کہ اریوک اپنے سپاہیوں کے ساتھ آ پہنچا۔

"فلسطین کے غلامو! کیا تم نے بادشاہ کا پیغام نہیں سنا؟"

"ہم سن چکے ہیں۔"

"تمہیں اپنی جان کی پروا نہیں جو یوں گھر میں بیٹھے ہو؟"

"آسمان پر ایک خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی کسی کی جان نہیں لے سکتا۔"

"پھر تم چاروں مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"تو کیوں ہماری جان لیتا ہے۔ ہم نے کیا جرم کیا ہے؟"

"اتنے بے خبر نہ بنو۔ کیا بادشاہ نے کہہ نہیں دیا تھا کہ اگر اس کا خواب نہ بتایا گیا تو وہ تمام حکیموں کو قتل کرا دے گا جن میں

تمہارے استاد بھی شامل ہیں اور تم بھی شامل ہو۔“

”اگر میں اس کا خواب بتادوں؟“

”پھر شاید یہ حکم واپس ہوجائے۔“

”مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔“ حضرت دانیالؑ نے کہا اور حضرت عزیرؑ بھی ساتھ ہولیے۔ بادشاہ قہر و غضب کا پیکر بنا بیٹھا تھا کہ یہ دونوں اس کے سامنے پہنچ گئے۔

”میرے پاس کسی کے لیے معافی نہیں ہے۔ کیوں آئے ہو یہاں؟“

”ہم یہ عرض کرنے آئے ہیں کہ ہمیں صرف ایک رات کی مہلت مل جائے تو ہم خواب اور اس کی تعبیر بتادیں گے۔“

”میں خوب جانتا ہوں کہ تم وقت ٹالنے کی کوشش کررہے ہو تاکہ بچ کر نکل جاؤ ورنہ جو بات بڑے بڑے حکیم نہ بتا سکے تم کیا بتاؤ گے۔“

”بے شک! ہم بھی نہیں بتا سکتے لیکن آسمان پر ایک خدا رہتا ہے جو دلوں کے راز جانتا ہے۔ اس نے اگر ہم پر یہ راز ظاہر کردیا تو ہم ضرور سرخرو ہوں گے۔“

”میں تمہیں ایک رات کی مہلت ضرور دوں گا لیکن میں نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔ صبح کے سورج کی پہلی کرن تمہاری موت کا پیغام لے کر آئے گی۔“

بادشاہ نے حضرت عزیرؑ اور حضرت دانیالؑ کے مکان کے باہر پہرا لگادیا تاکہ وہ دوسروں کی طرح گھر چھوڑ کر کہیں روپوش نہ ہوجائیں۔ یہ دونوں گھر لوٹ آئے۔

آپؑ کے باقی دو ساتھی بے چینی سے آپؑ کی واپسی کا انتظار کررہے تھے۔ حضرت عزیرؑ اور حضرت دانیالؑ نے اپنے ساتھیوں کو اس واقعے کی اطلاع دی اور فرمایا کہ وہ آسمان کے خدا سے رحمت طلب کریں ورنہ ظالم بادشاہ ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے میں دیر نہیں لگائے گا۔

یہ چاروں صالح مرد خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔ اس کی مناجات میں مشغول ہوگئے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ زبان پر خدا کی ستائش تھی۔

”تو ہی ہے جو حکمت اور قدرت کا گنج ہے۔ تو ہی وقتوں اور زمانوں کو تبدیل کرتا ہے۔ بادشاہوں کو معزول اور قائم کرتا ہے۔ تو ہی ہے جو پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم پر بادشاہ کے راز کو ظاہر کردے تاکہ ہم ہلاکت سے بچ جائیں۔“

رات کے آخری حصے میں جب سحر نزدیک تھی۔ ان چاروں کو نیند نے آدبوچا۔ خدا اس راز کو ظاہر کرنے والا تھا۔ حضرت دانیالؑ نے مبارک خواب دیکھا۔ اس خواب کے ذریعے وہ راز آپؑ پر کھل گیا۔

سحر نمودار ہوئی اور بادشاہ کے سپاہی قتل کے ارادے سے چڑھ دوڑے۔ خدا نے اس ارادے کو پہلے ہی ردِ نہ کیا تھا۔ وہ راز ظاہر ہوگیا تھا جو قتل کا سبب بنا تھا۔ حضرت دانیالؑ نے ہاتھ کے اشارے سے ان سپاہیوں کو روک دیا۔

”اپنی تلواریں نیام کرلو۔ مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔“

”ہم تمہیں قتل کرنے نہیں بلکہ گرفتار کرنے آئے ہیں تاکہ بادشاہ کے پاس جاکر جوابدہ ہوسکو۔ مہلت کا وقت ختم ہوگیا ہے۔“ یہ سپاہی حضرت دانیالؑ کو بادشاہ کے پاس لے گئے۔ حضرت عزیرؑ اور باقی ساتھی بھی بادشاہ کے پاس لے جائے گئے۔ بادشاہ نے انہیں دیکھتے ہی اپنا مطالبہ دہرا دیا۔

”میرا خواب بتاؤ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔“

”خدا نے وہ راز مجھ پر ظاہر کردیا ہے مگر میں یہ راز تجھ پر اس وقت ظاہر کروں گا جب تو بابل کے حکیموں کے قتل کے احکامات واپس لے گا کیونکہ ان میں وہ بھی ہیں جو میرے استاد رہے ہیں اور سب کے سب بے قصور بھی ہیں کیونکہ کوئی بھی علم اس بھید کو نہیں کھول سکتا۔“

بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا لیکن اس شرط پر کہ دانیالؑ جو کچھ بتائیں گے اگر سچ نہ ہوا تو ان کی گردن ماردی جائے گی۔ اس کے بعد حضرت دانیالؑ نے بادشاہ کا خواب اسے یاد دلایا۔

”اے بادشاہ تو نے ایک بڑی مورت دیکھی۔ اس مورت کا سر خالص سونے کا تھا۔ اس کا سینہ اور اس کے بازو چاندی کے، اس کا شکم اور اس کی رانیں تانبے کی تھیں۔ اس کی ٹانگیں لوہے کی اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے۔ تو

اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک پتھر ہاتھ لگائے بغیر ہی کاٹا گیا اور اس مورت کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے، لگا اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور ہوا ان کو اڑا لے گئی یہاں تک کہ ان کا پتا نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو توڑا ایک پہاڑ بن گیا اور تمام زمین میں پھیل گیا۔“

بادشاہ اس خواب کی جزئیات کو بڑے انہماک سے سن رہا تھا پھر اچانک اسے یاد آگیا۔ جو کچھ حضرت دانیالؑ بیان کررہے تھے، بادشاہ نے وہی سب کچھ خواب میں دیکھا تھا۔

بادشاہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ ”جو کچھ تو نے بیان کیا، وہی سچ ہے۔ مجھے اپنا خواب یاد آگیا۔ تو نے ایک لفظ بھی اپنے دل سے لگا کر نہیں کہا۔ اب تو جلدی سے اس کی تعبیر بتا تاکہ میری بے چین روح کو قرار آئے۔“

حضرت دانیالؑ نے تعبیر بیان کرنی شروع کی۔

”خواب میں دیکھی گئی مورت دراصل تیری سلطنت ہے۔ مورت کا سونے کا سر تو ہے۔ اس مورت کے بازو چاندی کے ہیں یعنی تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے چھوٹی ہوگی۔ اس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام زمین پر حکومت کرے گی اور چوتھی سلطنت لوہے کے مانند مضبوط ہوگی اور اس سلطنت میں تفرقہ ہوگا۔“

یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں جو آئندہ پیش ہونے والی تھیں، حضرت دانیالؑ نے اس خواب کے ذریعے بتائیں۔ بخت نصر تو اتنا متاثر ہوا کہ بادشاہ ہوتے ہوئے منہ کے بل گرا اور حضرت دانیالؑ کو سجدہ کیا۔

خدا ان چاروں صالح نوجوانوں کو اعلیٰ مراتب سے نوازنا چاہتا تھا لہٰذا اس خواب اور اس خواب کی تعبیر کو بہانہ بنادیا۔ ایک حکم کے ذریعے حضرت دانیالؑ کو بابل کے تمام حکیموں کا سردار بنادیا اور حضرت عزیرؑ اور باقی دو ساتھیوں کو صوبے کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز کردیا۔

☆☆☆

حضرت عزیرؑ صوبے دار بنے ہوئے تھے۔ حضرت دانیالؑ تمام دانش مندوں کے سردار تھے۔ بخت نصر ان کا ایسا معتقد تھا کہ ایک حکم کے ذریعے اہلِ بابل کو باور کرادیا تھا کہ کوئی حضرت دانیالؑ اور حضرت عزیرؑ دبرانہ ہے، نہ ہی ان کے مذہب کی مخالفت کرے۔ بخت نصر کا یہ حال ہوگیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے دانیالؑ کے خدا کی تعریف کیا کرتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے غلاموں کا غلبہ اس پر اتنا ہوگیا ہے کہ وہ خود ان کا غلام ہوگیا ہے۔ بعض کو تو یہ شک ہونے لگا تھا کہ اس نے دانیالؑ کا دین اختیار کرلیا ہے۔

حضرت عزیرؑ گورنری کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن وہ شریعت موسوی کے بہت بڑے عالم اور فقیہ بھی تھے۔ اس لیے تبلیغ کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ سرکاری عہدے کی وجہ سے یہ سہولت حاصل تھی کہ لوگ آپؑ کی باتوں کو سنا کرتے تھے۔ آپؑ بے خوف ہوکر ”توحید“ کا درس دے رہے تھے اور بت پرستی کی مخالفت کررہے تھے جبکہ اہلِ بابل بت پرست تھے۔

آپ (حضرت عزیرؑ) کی یہ توحید پرستی لوگوں کو بہت شاق گزر رہی تھی۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ ایک جلاوطن فرد ہمارے دیوتاؤں کے خلاف بول رہا ہے اور آسمان پر رہنے والے خدا کی پرستش کی طرف لوگوں کو راغب کررہا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عزیرؑ کا یہ کہنا تھا کہ وہ اپنی تبلیغ بنی اسرائیل کے لوگوں تک محدود رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں تلقین کررہے ہیں کہ ان کی گمراہی کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ وہ اب بھی اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں اور حضرت موسیٰؑ کی شریعت پر عمل پیرا ہوجائیں تو ان کے مصائب کے دن ٹل سکتے ہیں۔ ہماری شریعت میں بت پرستی کی گنجائش نہیں اس لیے میں اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ ہمیں غلام ضرور بنایا گیا ہے لیکن ہم نے اپنے دین کو خیرباد نہیں کہہ دیا ہے۔ بابل کا مہاپجاری آپؑ سے کئی ملاقاتیں کرچکا تھا لیکن آپؑ توحید پرستی کا راستہ چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بخت نصر آپؑ سے اتنا خوش تھا کہ مہاپجاری بھی مجبور تھا۔ وہ بادشاہ سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس کا اثر و رسوخ عوام میں بہت تھا۔ اس نے چپکے چپکے انہیں بھڑکانا شروع کردیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بادشاہ نے ان غلاموں کو اتنی اہمیت دینی شروع کردی ہے کہ یہ لوگ اب بابل پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے لگے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو پورے بابل میں ان کا دین پھیل جائے گا اور ہمارے دیوتا ہم سے ناراض ہوجائیں گے۔ ان کا غضب ہم پر ٹوٹے گا۔

مہاپجاری یہ بانگ دہل کہہ رہا تھا۔ ”اگر بنی اسرائیل کا خدا اتنا ہی طاقتور ہوتا تو یہ لوگ ہرگز غلام نہ بنائے جاتے۔ یہ ہمارے دیوتاؤں کی طاقت تھی کہ ہمیں فتح حاصل ہوئی اور یروشلم کے لوگ غلام بنالیے گئے لیکن اب خود ہمارا بادشاہ ان غلاموں کو اہمیت دے رہا ہے۔ ہمارے دیوتا ہم سے ناراض ہوگئے تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔“

پجاری کی باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ ملک میں بغاوت جیسے آثار ظاہر ہونے لگے۔ بادشاہ کی مخالفت میں خود اس کے اپنے

خاندان کے افراد بھی شامل تھے اور سب بادشاہ کو قصوروار ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان سب کا یہی کہنا تھا کہ بادشاہ نے ان غلاموں کو اتنا سر چڑھا لیا ہے کہ وہ ہمارے دین میں رخنہ اندازی کرنے لگے ہیں۔ غلاموں کو صوبوں کے انتظامات سپرد کیے جائیں گے تو پھر یہی ہوگا۔ یہ تک کہا جانے لگا تھا کہ بادشاہ نے ان کا دین اختیار کرلیا ہے۔

بادشاہ نے جب یہ حالات دیکھے تو وہ فکرمند ہوا۔ وہ نہ تو پجاری سے مخالفت مول لے سکتا تھا اور نہ عوام سے لڑ سکتا تھا اور نہ بادشاہت سے ہاتھ دھونا چاہتا تھا۔ حضرت عزیرؑ کی خطا بھی نظر نہ آتی تھی۔ وہ اپنے لوگوں میں تبلیغ ضرور کررہے تھے لیکن انہوں نے بابلیوں کے دین میں مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ اس فلسفے پر کاربند تھے کہ جس کا جو دین ہے وہ اس پر چلتا رہے۔ بادشاہ نے یہی کہا تھا کہ کوئی دانیالؑ اور ان کے ساتھیوں کو برا نہ کہے۔ حضرت عزیرؑ اپنے منصب کو بھی کامیابی سے چلا رہے تھے۔ بدانتظامی کو بہانہ بنا کر انہیں منصب سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایسی گتھیاں تھیں جنہیں سلجھاتے سلجھاتے وہ ہلکان ہوگیا۔ اس نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ دیوتاؤں سے غافل نہیں ہوا ہے لیکن کوئی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ حضرت عزیرؑ کو سزا ملنی چاہیے کیونکہ وہ کہتے ہیں خدا ایک ہے اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ اس طرح وہ ہمارے بتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اس مسلسل دباؤ نے بادشاہ کی نیت کو بھی ڈانواڈول کردیا۔ اس نے سوچا کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے کہ حضرت عزیرؑ سزا سے بھی بچ جائیں اور یہ قضیہ بھی نمٹ جائے۔ اس کے مشیر اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ مجبور ہوکر اس نے پجاری کو مشورے کے لیے طلب کیا۔

پجاری سمجھ رہا تھا کہ اسے کس لیے طلب کیا گیا ہے اور اس مسئلے میں اس کی کتنی اہمیت ہوگئی ہے۔ وہ تمام شاہی آداب کو بالائے طاق رکھ کر دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس کی گستاخی پر چونکا ضرور تھا لیکن مجبور تھا۔ اس نے پجاری کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور مشورہ چاہا کہ وہ اس دلدل سے کیسے نکل سکتا ہے۔

پجاری نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ''جناب، اب عوام آپ کے قابو میں آنے والے نہیں۔ آپ نے جس طرح ان کے دین میں دخل اندازی کی ہے اس کے بعد وہ آپ پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔''

''یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ میں نے کس بت خانے کو گرایا۔ کس بت کی توہین کی۔ میں تو اب بھی دیوتاؤں کی پرستش کرتا ہوں۔ کیا میں بے دین ہوگیا ہوں؟''

''آپ کا قصور یہ ہے کہ آپ نے بنی اسرائیل کو حد سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔''

''وہ غلام ہیں اور غلام رہیں گے، میں ان سے بابل کے ترقیاتی کاموں میں مدد لے رہا ہوں۔''

''لوگ دانیالؑ اور اس کے عزیرؑ کی بات کرتے ہیں۔ آپ نے ایک غلام دانیالؑ کو تمام فال گیروں اور نجومیوں کا سردار بنا دیا ہے۔ دربار میں اسے اونچے درجے پر بٹھایا جاتا ہے۔ عزیرؑ کو صوبے دار بنایا ہوا ہے۔ وہ اپنی طاقت کا غلط استعمال کررہا ہے۔ اسے یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ ہمارے دیوتاؤں کے خلاف تقریریں کرے۔ یہ پوری قوم کی بے عزتی ہے۔ کیا ہم میں ان سے زیادہ کوئی قابل نہیں؟''

بادشاہ نے سر جھکا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حضرت عزیرؑ اور ان کے ساتھیوں کو سزا ملے لیکن حالات ایسے ہوگئے تھے کہ اسے پجاری کے مشورے پر عمل کرنا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مہا پجاری کو متوجہ کیا۔

''میں یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تم باہر جاکر لوگوں سے کیوں نہیں کہتے کہ بادشاہ اپنے دین پر قائم ہے۔''

''آپ سے زیادہ لوگوں کو ان یہودیوں پر غصہ ہے جو ہر حال میں آپ کی حکم عدولی کرتے ہیں۔''

''کسی کی مجال ہے جو کوئی میرے حکم کی خلاف ورزی کرے۔''

''اس کے لیے آپ کو عملی ثبوت دینا ہوگا تاکہ لوگ آپ کی طرف سے مطمئن ہوجائیں اور ان کا غصہ ٹھنڈا ہو۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''آپ یہی چاہتے ہیں ناکہ لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے؟''

''ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔''

''پھر آپ ایسا کریں کہ ایک بڑی مورتی تیار کروائیں اور اسے بابل کے وسط میں نصب کرادیں۔ تمام سرداروں، صوبے داروں، قاضیوں اور مشیروں کو حکم دیں کہ اسے سجدہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ عزیرؑ اور اس کے ساتھی آپ کے اس حکم کی تعمیل نہیں

کریں گے اور آپ کو انہیں سزا دینے کا موقع مل جائے گا۔''

''میں چاہتا ہوں وہ سزایاب نہ ہوں۔ اگر وہ بھی سجدہ کرلیں؟''

''اس سے اچھی کیا بات ہے کہ وہ ہمارے دین میں شامل ہوجائیں۔ آپ کے عوام اس سے بھی خوش ہوں گے۔''

''تو پھر تم عزیرؑ سے ملو اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرو۔''

مہا پجاری کو اب موقع مل گیا تھا کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام سے ملے اور انہیں ڈرا دھمکا سکے۔ ملاقاتیں وہ پہلے بھی کرتا رہا تھا لیکن یہ ملاقات وہ بادشاہ کے کہنے سے کررہا تھا۔ اسے یہ بھی یقین ہوگیا تھا کہ بادشاہ کے دل میں ان کی طرف سے برائی آگئی ہے۔

مہا پجاری جس وقت حضرت عزیرؑ سے ملاقات کے لیے پہنچا تو آپؑ اپنے دوستوں کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ مقامی لوگ بھی تھے جو آپؑ کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

آپؑ فرما رہے تھے۔ ''اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ ہم جو بت اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں وہ کس طرح اللہ سے ہمسری کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ اپنے ملک کی مثال سامنے رکھو۔ اگر یہاں ایک کے بجائے چار بادشاہ ہوں اور سب کے اپنے اپنے احکامات ہوں تو کیسی افراتفری پھیل جائے گی۔ اس لیے مان لو کہ اللہ ایک ہی ہے۔ دیوی دیوتا ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔''

حاضرین میں سے کسی نے سوال کرڈالا۔ ''اگر تمہارا خدا اتنا ہی طاقتور تھا تو اس نے ہمارے دیوتاؤں کے مقابلے میں تمہاری مدد کیوں نہیں کی؟''

حضرت عزیرؑ نے جواب دیا۔ ''جب بادشاہ کسی سے ناراض ہوتا ہے تو اسے سزا دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہمارے لوگ خدا کی طرف سے غافل ہوگئے تھے۔ اس کے احکامات سے روگردانی کرنے لگے تھے جس کی سزا ہمیں دی گئی۔''

حضرت عزیرؑ نہایت آسان لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کررہے تھے۔ لوگوں پر آپؑ کی باتوں کا اثر بھی ہورہا تھا۔

مہا پجاری یہ باتیں بہ غور سن رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ظاہر کردیا۔

''کیوں جی، تم تو کہتے تھے کہ تم لوگوں کو ورغلانے کا کام نہیں کرتے۔ ہمارے دیوتاؤں کو برا نہیں کہتے، اپنے کام سے کام رکھتے ہو۔ پھر یہ کیا کررہے ہو؟''

''میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ خدا ایک ہے۔''

''یہ جو کہا کہ صرف خدا کی پرستش کرو۔''

''تم بھی تو کہتے ہو کہ بتوں کی پرستش کرو۔''

''ہمارا ملک ہے ہم جو جی چاہے کہیں۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا؟''

''میرے خدا نے۔'' حضرت عزیرؑ کو جلال آگیا۔ ''میرے خدا نے مجھے اپنا نبی بنایا ہے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کا کام مجھے سونپا ہے۔ اب اگر خدا کے دیگر بندے بھی آکر بیٹھ جاتے ہیں تو یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنے لوگوں سے کچھ کہوں اور ان سے کچھ اور۔''

''اب وقت آگیا ہے کہ تم ایسا نہیں کرسکو گے۔ جس ملک میں رہتے ہو اسی کا دین اختیار کرنا پڑے گا۔ یہاں بت بھی ہوں گے اور تم انہیں سجدہ بھی کرو گے۔''

''تمہارا یہ خواب، خواب ہی رہے گا کیونکہ بادشاہ نے مجھے ضمانت دی ہے کہ یہودیوں کے دین میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ہم حضرت موسیٰؑ کی شریعت کو مانتے ہیں اور اسی کو مانتے رہیں گے۔''

''جس بادشاہ کی تم بات کررہے ہو اسی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ وہ ایک بڑا بت تعمیر کرا رہا ہے جس کو تمام عمال حکومت سجدہ کریں گے۔ تم بھی۔''

''تمہیں معلوم ہے ہم بتوں کو سجدہ نہیں کرتے۔''

''بادشاہ کا تو یہی حکم ہے۔''

''ہم اس بادشاہ کو مانتے ہیں جس نے تمہارے بادشاہ کو بادشاہ بنایا ہے۔ ہم اسی کا حکم مانتے ہیں اور اس کا حکم ہے، اس کے علاوہ کسی کو سجدہ نہ کرو۔ انسان کو بھی نہیں ناکہ پتھر اور لکڑی کو۔''

''تم نے اگر بادشاہ کا حکم نہ مانا تو موت کی سزا پاؤ گے۔''

''موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے تمہارے بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں۔''

''میرا کام سمجھانا تھا، آگے تمہاری مرضی۔''

"میں جانتا ہوں کہ یہ آگ تمہاری ہی لگائی ہوئی ہے۔"

"جب جانتے ہو تو جتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب بھی وقت ہے سوچ لو۔ بت تعمیر ہونے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔"

مہاپجاری کے چلے جانے کے بعد آپؑ نے اپنے باقی دو ساتھیوں کو طلب کیا۔ خفیہ طور پر حضرت دانیالؑ سے بھی ملے اور سب نے یہی طے کیا کہ وہ پجاری کے بچھائے ہوئے جال میں نہیں آئیں گے۔ مورتی کو سجدہ ہرگز نہیں کریں گے۔ اس کی پاداش میں جو سزا بھی ملے گی اس سے نجات کے لیے اللہ سے مدد طلب کریں گے۔

وقت گزرتا رہا اور کئی مہینے بعد خالص سونے کی مورتی بن کر تیار ہوگئی۔ اس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ تھی اور اسے ایک بڑے میدان میں نصب کردیا گیا۔

بادشاہ کی طرف سے احکام جاری ہوئے کہ تمام ناظم، حاکم، مشیر، خزانچی، سردار اور صوبوں کے تمام منصب دار اس مورت کی تقدیس کے لیے حاضر ہوں۔

بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ حضرت دانیالؑ پر کوئی الزام آئے اور وہ سزا کے مستحق ٹھہریں۔ اس لیے اس نے بڑی ہوشیاری سے انہیں بابل سے باہر بھیج دیا۔ اب امتحان حضرت عزیرؑ اور ان کے بقیہ دو ساتھیوں حیناہ اور میسائیل کا تھا۔

وقت مقررہ پر تمام ارکان حکومت، مشیر، سردار، خزانچی، مشیر حاضر ہوگئے اور مورتی کے سامنے باادب کھڑے ہوگئے۔ مہاپجاری کی عقابی آنکھیں حضرت عزیرؑ کو تلاش کر رہی تھیں جن کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ پجاری دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس کی چال کامیاب ہوگئی۔ اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں بادشاہ کے عتاب سے نہیں بچا سکتی۔

ایک منادی کرنے والے نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔ "اے لوگو! اے امتیو! اور اے مختلف زبانیں بولنے والو! تمہارے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اس سونے کی مورت کے سامنے گر کر سجدہ کرو اور جو کوئی سجدہ نہ کرے اسی وقت آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالا جائے گا۔"

اس آواز کی گونج ختم ہوتے ہی سناٹے نے آنکھیں کھول دیں۔ میدان مختلف سازوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ وہاں موجود تمام انسان اس بے جان مورتی کے سامنے سجدے میں گر گئے۔

مہاپجاری اور اس کے چیلے چپاٹے گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے کہ اس مجمع میں حضرت عزیرؑ موجود ہیں یا نہیں۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ سجدہ تو درکنار وہ تو اس مورتی کو دیکھنے تک نہیں آئے تو وہ دوڑتے ہوئے بادشاہ کے پاس گئے۔

"اے بادشاہ، تو ابد تک جیتا رہے۔ تجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کی قسم۔ سزا دینے کے لیے تیار ہو جا۔ تیرے حکم کی تعمیل کے لیے سب حاضر ہوئے لیکن بابل کے صوبے کی کارپردازی پر متعین عزیرؑ اور اس کے ساتھی حاضر نہیں ہوئے۔ انہوں نے تیری تعظیم نہیں کی۔ وہ تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے۔ وہ مورت جسے تو نے نصب کیا اسے انہوں نے سجدہ نہیں کیا۔"

بادشاہ اسی وقت سزا کا حکم سنا سکتا تھا لیکن وہ چاہتا تھا حضرت عزیرؑ کو ایک موقع اور دے یا پھر ان سے مل کر انہیں قائل کرے، معاملے کی نزاکت ان پر ظاہر کرے۔ اس نے ان آدمیوں سے کہا کہ وہ عزیرؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس کے سامنے پیش کریں۔

اب یہ لوگ حضرت عزیرؑ کے قصر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک بڑا مجمع بھی ان کے ساتھ ہوگیا تھا جو حضرت عزیرؑ کے خلاف نعرے بلند کر رہا تھا۔ حضرت عزیرؑ نہایت بے خوفی سے محل سے باہر نکل آئے۔

"کیا تم نے یہ اعلان نہیں سنا تھا کہ تمہیں دورا کے میدان میں حاضر ہونا ہے اور مورتی کو سجدہ کرنا ہے؟" ان لوگوں نے حضرت عزیرؑ سے کہا۔

"تم لوگ کئی دن سے شور مچا رہے ہو۔ پھر ہم کیسے نہ سنتے لیکن اب کیوں آئے ہو۔ مورتی کو سجدہ تو ہو چکا۔"

"ہم یہ پوچھنے آئے ہیں کہ تم اور تمہارے ساتھی کیوں حاضر نہیں ہوئے؟"

"اس لیے کہ بتوں کو سجدہ کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کی ذات میں کسی کو شریک نہیں کرتے۔"

"یہ شاہی فرمان تھا جس کی تعمیل تم پر فرض تھی۔"

"ہم بادشاہ کے دنیاوی احکام ماننے کے پابند ہیں۔ اسے ہمارے دین میں دخل نہیں دینا چاہیے۔"

"اس کا مطلب ہے تم غلام ہوتے ہوئے شاہی حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو؟"

"ہاں ایسا ہی ہے۔"

"اگر تم انکار کرتے ہو تو ہمیں حکم ہے کہ ہم تمہیں گرفتار کرلیں۔"

"ہمیں گرفتاری قبول ہے لیکن بادشاہ کی خاطر بت پرستی اختیار نہیں کرسکتے۔"

یہ لوگ حضرت عزیرؑ اور ان کے دو ساتھیوں کو گرفتار کرکے بادشاہ کے پاس لے آئے۔ حضرت دانیالؑ کو بادشاہ نے بابل سے دور بھیج دیا تھا۔

یہ تینوں بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو مہاپجاری بھی موجود تھا۔ وہ جان بوجھ کر یہاں آیا تھا تاکہ بادشاہ حضرت عزیرؑ کو کوئی رعایت نہ دے سکے۔

بادشاہ نے بھی حضرت عزیرؑ سے وہی سوال کیا جو اس سے پہلے اس کے سپاہی کرچکے تھے۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم میرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہو اور اس سونے کی مورت کو جسے میں نے نصب کیا، سجدہ نہیں کرتے؟"

"اے بادشاہ، تو نے بالکل سچ سنا ہے بلکہ تو پہلے سے بھی جانتا ہے کہ ہم بتوں کی پرستش نہیں کرتے۔"

"اب تک تم آزاد تھے لیکن اس مورت کو سجدہ کرنے کے لیے تو ہماری طرف سے حکم دیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ تم نے سجدہ نہ کرکے دیوتاؤں کو ناراض کیا بلکہ ہماری حکم عدولی کرکے ہمیں بھی ناراض کیا ہے۔"

مہاپجاری کو فکر ہو رہی تھی کہ بادشاہ اپنی طے کردہ سزا کا ذکر کیوں نہیں کر رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ حضرت عزیرؑ کو معاف کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ اسے اس کا وعدہ یاد دلانا چاہیے۔ مہاپجاری نے دخل اندازی کرنا ضروری سمجھا۔

"عوام کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں بلکہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ دیوتاؤں کو سجدہ نہ کرنے والوں کو آگ میں پھینک دیا جائے۔"

بادشاہ کو بھی جیسے اپنا وعدہ یاد آگیا لیکن وہ اب بھی انہیں ایک موقع دینا چاہتا تھا۔ "میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اب اگر ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اس مورت کے سامنے جو میں نے بنوائی ہے سجدہ کرنا۔"

"اے بادشاہ، ہم نہیں چاہتے کہ اپنی جان بچانے کے لیے تجھے دھوکے میں رکھیں اور تجھ سے جھوٹا وعدہ کرلیں۔ بار بار موقع دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم اس مورتی کو کبھی سجدہ نہیں کریں گے۔"

"اس کی سزا تم جانتے ہو۔" بادشاہ نے کہا۔ "آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالے جاؤ گے اور کون سا معبود تم کو میرے ہاتھ سے چھڑائے گا؟"

"اے بادشاہ، ہمارا خدا جس کی ہم عبادت کرتے ہیں ہم کو آگ کی جلتی بھٹی سے چھڑانے کی قدرت رکھتا ہے۔ تو سزا دے کر دیکھ لے۔ وہی ہم کو تیرے ہاتھ سے چھڑائے گا۔"

بخت نصر کا غصہ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل کرنے لگا۔ اس نے حکم دیا کہ بھٹی کی آنچ معمول سے سات گنا زیادہ کردی جائے۔ اس آگ کو دہکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور حضرت عزیرؑ کو ساتھیوں سمیت داخل زنداں کردیا گیا۔

ایک ہفتے تک مسلسل آگ جلتی رہی۔ جب اس کی آنچ دور دور تک محسوس کی جانے لگی تو بخت نصر نے اپنے لشکر کے چند زورآور پہلوانوں کو حکم دیا کہ حضرت عزیرؑ اور ان کے دو ساتھیوں کو ان کے کپڑوں سمیت بھٹی میں پھینک دیا جائے۔

پہلوانوں نے بھٹی کے قریب جانے کی کوشش کی لیکن شعلوں کی شدت نے انہیں دور ہی روک دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آگ خوب روشن ہوگئی ہے۔ بھٹی کی دیواریں خوب اچھی طرح تپنے لگی ہیں۔ اس میں جس جاندار کو بھی پھینکا جائے گا وہ زندہ نہیں بچے گا۔

بخت نصر اونچی جگہ بیٹھا تھا۔ اس جگہ سے بھٹی کے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے پہلوانوں نے پہلے حضرت عزیرؑ کو بھٹی کی طرف اچھالا پھر حیناہ کو پھینک دیا پھر میسائیل آگ کی نذر ہوگئے۔ بھٹی سے بہت دور کھڑے تماشائیوں نے مارے خوف کے آنکھیں بند کرلیں۔

بخت نصر نے اپنی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے یہ منظر دیکھا کہ بھٹی کے اندر بھڑکنے والے شعلے خاموش ہوگئے ہیں۔ بھٹی کے فرش پر انگاروں کے ڈھیر پھولوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ بادشاہ نے اپنی آنکھوں کو مزید رگڑا۔ اسے یاد آیا کہ آگ میں تین آدمی پھینکے گئے تھے لیکن وہ اس وقت چار آدمیوں کو دیکھ رہا تھا جو آگ کے انگاروں پر چل پھر رہے تھے۔ تین ہوں یا چار اگر آگ بجھ بھی گئی ہے تو بھی اس کی تپش اتنی ہوگی کہ کوئی کیسے چل پھر سکتا ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں جنہیں آگ نے کوئی گزند نہیں پہنچائی۔ اس نے اپنے ارکانِ دولت کو جمع کیا۔

"کیا ہم نے تین آدمیوں کو آگ میں نہیں پھینکا تھا؟"

''ہاں وہ تین ہی تھے۔''

''میں ایک عجیب بات دیکھ رہا ہوں۔ بھٹی میں تین نہیں چار آدمی ہیں۔ یہ چوتھا یقیناً وہ فرشتہ ہے جو ان کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

بخت نصر خود بھٹی کے دروازے پر گیا۔ اس بھٹی میں جتنی آگ روشن ہوئی تھی اس کے بعد ہفتوں تک اس کی دیواریں تپتی رہتیں لیکن عجیب بات تھی کہ دیواریں اور فرش ٹھنڈے تھے۔ قدرت نے آگ کے اثر کو ختم کر دیا تھا۔

یہ تینوں باہر آئے تو کسی طرح بھی آگ نے انہیں نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ان کے کپڑے تک آگ سے نہیں جلے تھے۔ یہ ایک معجزہ تھا جسے دیکھ کر لوگوں کو یقین آ جانا چاہیے تھا کہ ان کا دین سچا ہے لیکن جب دلوں پر مہر لگ جائے تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ بادشاہ نے ضرور کوئی چالاکی کی ہے۔ وہ ان یہودیوں کا طرف دار ہے۔ اس نے دکھانے کے لیے انہیں آگ میں ڈالا لیکن پھر بچا بھی لیا۔ اس کہانی پر کسی کو مشکل ہی سے یقین آ سکتا تھا لیکن ایک دوسرے سے یہی کہتے پھر رہے تھے۔ البتہ بادشاہ اس معجزے سے متاثر ہوا تھا اور اس نے یہ فرمان جاری کیا تھا۔

''عزیرؑ کا خدا مبارک ہو جس نے اپنا فرشتہ بھیج کر اپنے بندوں کو رہائی بخشی جنہوں نے اس پر توکل کر کے بادشاہ کے حکم کو ٹال دیا اور اپنے بدنوں کو نثار کیا کہ اپنے خدا کے سوا کسی دوسرے معبود کی عبادت اور بندگی نہ کریں۔

اس لیے میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں کہ جو قوم یا امت یا اہل لغت عزیرؑ کے خدا کے حق میں کوئی نامناسب بات کہیں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے کیونکہ کوئی دوسرا معبود نہیں جو اس طرح رہائی دے سکے۔''

یہ ماجرا دیکھ کر بہت سوں کی زبانیں بند ہو گئی تھیں لیکن بہت سے لوگ اب بھی ایسے تھے جو اسے کوئی چالاکی سمجھ رہے تھے۔ مہا پجاری نے ان لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا رکھا تھا۔ مہا پجاری کی اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ حضرت عزیرؑ کے سامنے آتا لیکن درپردہ سازشوں میں مشغول تھا۔ ایسی رکاوٹیں ڈال رہا تھا کہ حضرت عزیرؑ کو اپنے فرائض انجام دینے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں لیکن وہ ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے تھے البتہ بادشاہ کا عجیب حال تھا۔ مخالفتوں کا بازار اب بھی گرم تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں اس نے ایک خواب دیکھا۔ اس خواب کی تعبیر جاننے کے لیے ایک مرتبہ پھر اس نے فال گیروں اور نجومیوں کو اپنے حضور حاضر ہونے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے اپنا خواب بیان کیا۔ وہ سب کے سب اس خواب کی تعبیر بیان کرنے سے قاصر رہے بالآخر اس نے حضرت دانیالؑ کو طلب کیا۔

''اے دانیالؑ، ساحروں کے سردار، چونکہ میں جانتا ہوں کہ مقدس الوہی روح تجھ میں ہے اور کوئی راز تیرے لیے مشکل نہیں۔ اس لیے جو خواب میں نے دیکھا ہے اس کی کیفیت اور تعبیر بیان کر۔''

''آپ خواب بیان کریں، مجھے قوی امید ہے کہ میں تعبیر بیان کروں گا۔''

''میں خواب بیان کرتا ہوں۔ اسے غور سے سن۔'' بادشاہ نے کہا۔ ''میں نے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ زمین کے وسط میں ایک نہایت اونچا درخت ہے۔ وہ درخت بڑھا اور مضبوط ہوا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور وہ زمین کی انتہا تک دکھائی دینے لگا۔ اس کے پتے خوش نما تھے اور میوہ فراواں تھا اور اس میں سب کے لیے خوراک تھی میدان کے چرندے اس کے سائے میں اور ہوا کے پرندے اس کی شاخوں پر بسیرا کرتے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک قدسی آسمان سے اترا۔ اس نے بلند آواز سے پکار کر یوں کہا کہ درخت کو کاٹو۔ اس کی شاخیں تراشو اور اس کے پتے جھاڑو اور اس کا پھل بکھیر دو۔ چرندے اس کے نیچے سے چلے جائیں اور پرندے اس کی شاخوں پر سے اڑ جائیں لیکن اس کی جڑوں کا کندہ زمین میں باقی رہنے دو اور وہ آسمان کی شبنم سے تر ہو اور اس کا حصہ زمین کی گھاس میں حیوانوں کے ساتھ ہو۔ اس کا دل انسان کا دل نہ رہے بلکہ اسی کو حیوان کا دل دیا جائے اور اس پر سات دور گزر جائیں۔''

حضرت دانیالؑ یہ خواب سن کر پریشان ہو گئے۔ تعبیر کچھ ایسی تھی کہ بتاتے ہوئے کترا رہے تھے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ خواب سمجھ میں نہیں آیا۔ بالآخر بہت سوچ سمجھ کر آپ نے کہنا شروع کیا۔

(جاری ہے)

ماخذات: قصص القرآن، قصص الانبیا، توریت، تاریخ طبری

تحفہ

بابر نعیم

یہ محبت بھی عجیب داستان کا نام ہے... کہاں شروع، کہاں ختم... کچھ خبر ہی نہیں ہوتی... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ محبت اور قربانی... ایک ہی چہرے کے دو روپ... ساتھ ساتھ چلتے چلتے کب کس روپ میں ڈھل جائیں... کب کس آزمائش میں مبتلا کر دیں، کب کوئی خوشی دامن میں ڈال دیں اور کہاں دیدار کی حسرت لیے دار پر چڑھ جائیں... اس نے بھی کسی کے دامن میں جب اپنی محبت کا تحفہ ڈالا تو یہ لمحات اسے ایک صدمے میں مبتلا کر گئے۔

محبت اور مجبوری کی سنسنی خیز تصویر۔۔۔ ایک عجیب تحریر

''اوہ! یہ تو نہایت ہی عمدہ ہے۔'' ہنری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ اپنی کے بریسلیٹ کی زنجیر کے لیے ایک نیا آویزہ خریدنا چاہتا تھا اور چھوٹا سا پیانو نما سلور کا یہ آویزہ اس کے دل کو بھا گیا تھا لیکن پرائس ٹیگ پر نگاہ پڑتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''کیا یہ جلد ہی کسی وقت سیل میں آ جائے گا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''نہیں سر۔'' جیولر نے جواب دیا۔ اس کی مصنوعی مسکراہٹ بھی مدھم پڑ گئی تھی ''لیکن میں آپ کو یقین سے کہہ

رہا ہوں کہ یہ ایک نہایت مناسب قیمت ہے۔''

ہنری نے پیانو کی شکل کے اس چھوٹے سے ملبور آویزے پر نظریں جما دیں۔ بے حد اعلیٰ! یہ پیانو کے ان تمام اسباق کی نمائندگی کرے گا جو ایلی ایک دن ایک دن سیکھ لے گی جیسے کہ اس کی دلی خواہش ہے۔

''حقیقت میں یہ ان کم ترین قیمت کے آئٹمز میں سے ایک ہے جو ہمارے پاس فروخت کے لیے موجود ہیں۔'' جوئیلر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہنری سے جلد از جلد جان چھڑانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کیونکہ اس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ شخص خریداری کا متحمل نہیں ہے۔ وہ اس خریدار کا انتظار کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا جو اپنی پسند کی شے پر رقم بھی خرچ کر سکتا ہو۔

ہنری نے جوئیلر کی بے زاری پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کی نظریں بدستور سلور کے پیانو نما آویزے پر اٹکی ہوئی تھیں جو فلورسینٹ روشنیوں میں جگ مگ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی دو سو ڈالرز کی رقم اسے دو سو ملین ڈالرز کے مانند محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ اب اور کرسمس کے درمیان کسی قسم کی سیل میں شامل نہیں ہوگا؟'' ہنری نے جاننا چاہا۔

''نہیں۔'' جوئیلر نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''کم از کم آئندہ دو گھنٹے میں تو نہیں ہوگا۔''

ہنری اسٹور سے خالی ہاتھ باہر نکل آیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کاندھوں پر ایک بوجھ لیے فٹ پاتھ پر چل رہا ہو۔ افسردگی اور بے چارگی کی کیفیت میں اس کے شانے جھکے ہوئے تھے۔ وہ لوگوں سے نظریں ملانے سے کترا رہا تھا۔

لوگ اس کے دائیں بائیں جانب سے گزر رہے تھے۔ پیسے والے لوگ! ملازمت والے لوگ۔ وہ لوگ جو اپنی بیویوں کے لیے کرسمس کے تحائف کی خریداری کر سکتے تھے۔

برفباری بھی شروع ہو گئی تھی۔

ہنری برف کے گالوں میں نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی بیوی ایلی کا خیال گردش کر رہا تھا۔ اس کی ایلی!

اس کے برے وقتوں میں بھی ایلی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے ملازمت سے برخاست کیے جانے کے وقت بھی نہیں۔ اس کی طویل بے روزگاری کے باوجود بھی نہیں۔ بلوں کے بڑھتے ہوئے ڈھیر پر بھی نہیں۔ قرض خواہوں کی فون کالز کی تعداد بڑھنے کے باوجود بھی نہیں۔

ہنری نے اپنی جیب میں موجود اپنے دادا کی دی ہوئی گھڑی کو ٹٹولا۔ اس دنیا میں یہ اس کا آخری اثاثہ تھا۔

ہنری نے وقت دیکھا۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔

ایلی اپنے کام سے فارغ ہو کر جلد گھر پہنچنے والی تھی۔ اس نے تعطیلات کے دنوں میں پارٹ ٹائم کام تلاش کر لیا تھا لیکن وہ بھی جلد ختم ہونے والا تھا۔ اس کی اگلی تنخواہ کا چیک بہ مشکل تمام ان کی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کر سکتا تھا۔

لیکن اس کے باوجود ایلی نے [illegible] سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اسے برا بھلا کہا تھا۔ وہ یہ بات بھی کبھی زبان پر نہیں لائی تھی کہ وہ اس کی توقعات پر پورا نہیں اترا تھا یا وہ اپنی ذمے داریاں پوری کرنے میں ناکام رہا تھا۔

نہ جانے وہ کون سی بری گھڑی تھی جب اس نے طیش میں آ کر مسٹر سمتھ سے بدتمیزی کرتے ہوئے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اسے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بوڑھے سمتھ نے اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرانے سے گریز کیا تھا۔

''تمہیں اپنے غصے پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے ڈارلنگ۔'' ایلی نے اس کے ملازمت سے برخاست ہونے کی خبر سننے کے بعد کہا۔ ''تشدد سے کبھی حاصل نہیں ہوتا جو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

لیکن اس کے باوجود ایلی نے اس سے تندی اختیار نہیں کی۔ وہ اسے پالتی رہی۔

ہنری اسٹور کی رنگ برنگی ونڈوز میں کرسمس کی مناسبت سے سجی ہوئی مختلف اشیا کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی اسے اپنی بے بسی پر تلملاہٹ بھی ہو رہی تھی کہ وہ ایلی کو کرسمس کا وہ تحفہ بھی نہیں دے سکتا جس کی وہ مستحق تھی۔

اس نے دوبارہ اپنی گھڑی کو دیکھا۔ ساتھ ہی ان الفاظ کو پڑھنے لگا جو گھڑی کے پیچھے کندہ تھے۔ ''اچھی چیزیں ان کو ملتی ہیں جو صبر کرتے ہیں۔''

گھڑی کی پشت پر اس کا نام بھی کندہ تھا... ہنری مارٹن!

گھڑی کی فنشنگ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس پر جا بجا خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی چین بھی ٹوٹی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود یہ گھڑی ایک جذباتی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کی ذاتی اشیا میں یہ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔

پھر اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور تیز تیز قدموں سے ناک کی سیدھ میں اس دکان کی سمت چل دیا جو دو بلاک کے فاصلے پر واقع تھی۔ گزشتہ دو ہفتوں کے دوران میں وہ کئی مرتبہ اس دکان کے سامنے سے گزر چکا تھا۔ اس عرصے میں اس کا ذہن سوچ و بچار اور بحث میں مبتلا رہتا تھا لیکن وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

لیکن اب کرسمس کی شب آن پہنچی تھی۔ اب بحث اور سوچ و بچار کا وقت نہیں تھا۔ وہ اس بڑی سی ڈسپلے ونڈو کے سامنے پہنچ کر رک گیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ''پرانی شے بدلے نئی اشیا''

وہ شوکیس میں رکھی ہوئی اشیا کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں موسیقی کے متروکہ آلات، لگیج اور جیولری بھی ہوئی تھیں لیکن چاندی کے اس پیانو نما آویزے جیسی وضع کی کوئی شے شوکیس میں موجود نہیں تھی۔

ہنری نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے دادا کی نشانی دستی گھڑی پر اپنی گرفت مضبوط کر دی اور اپنی مطلوبہ دکان میں داخل ہو گیا۔

''تم بالکل آخری لمحات میں آئے ہو۔'' ایک دوستانہ آواز ابھری۔ اس میں کرسمس کی گرمجوشی بھی شامل تھی۔ ''ہم کرسمس کی شب کی وجہ سے دکان بند کرنے جا رہے تھے۔''

ساتھ ہی ایک بوڑھا شخص عقبی کمرے سے نکل کر کاؤنٹر پر آ گیا۔ اس کے شانے قدرے جھکے ہوئے تھے۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' اس پستہ قد بوڑھے نے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

ہنری نے جیب سے دادا کی نشانی دستی گھڑی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی اور چہرے پر فخریہ مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کرسمس کے لیے کچھ رقم درکار ہے۔''

''ہاں، کس کو درکار نہیں ہے۔'' پستہ قد بوڑھے نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر گھوم کر ہنری کے برابر میں آن کھڑا ہوا اور گھڑی کو اٹھا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اسے بغور الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، اس کی سنہری سطح پر رگڑ کے نشانات کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے ہنری کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں اس کے تیس ڈالرز دے سکتا ہوں۔''

ہنری نے تھوک نگلتے ہوئے حلق کو تر کیا اور بولا۔ ''مجھے زیادہ کی ضرورت ہے۔''

اس پستہ قد بوڑھے نے ہمدردی سے شانے اچکا دیے۔ ''اس وقت اس سے بہتر آفر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

ہنری کو اپنا خون کھولتا محسوس ہوا۔ لیکن ایلی کی خاطر اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور ایلی کی خاطر اپنی آواز کو

محبوب عمل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے۔ انہیں اس دنیا میں اللہ تعالیٰ سے شرفِ ہم کلامی حاصل تھا۔ ایک دفعہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔

''اے میرے رب! تجھے میرا کون سا عمل زیادہ پسند ہے تاکہ میں وہ کام زیادہ کروں۔'' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ''مجھے تیرا وہ عمل تمام کاموں سے زیادہ پسند آیا کہ جب بچپن میں تمہاری ماں تمہیں مارتی تو تم مار کھا کر پھر اسی کی طرف دوڑتے تھے۔'' (تذکرۂ نوبہ)

❖❖❖

دکھائے کیا شوقِ جنوں

ایک صاحب کو [illegible] پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ وہ کہیں سے گزر رہے تھے تو ایک کھمبے پر ایک بورڈ لگا تھا۔ حسبِ عادت اسے پڑھنے کے لیے اس پر چڑھے لکھا تھا ''کھمبا گیلا ہے، ہاتھ مت لگائیں۔''

❖❖❖
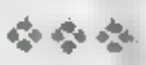
مکھن

''مکھن کہاں ہے''

''مکھن ختم، خلاص''

''سارا کھا لیا۔''

''نہیں سارا لگا دیا، یہ کھانے کی چیز تھوڑی ہے۔''

''لگانے کی ہے، جس کو لگاؤ پھسل پڑتا ہے۔''

''جو پھسلے گا اس کی ٹانگ ٹوٹے گی۔''

''یہ سوچنا اس کا کام ہے، ہمارا کام تو لگانا ہے۔''

(ابنِ انشا)

مرسلہ: بابا ایمان، حافظ آباد

کنٹرول کرتے ہوئے بے ساختہ کچھ کہنے سے گریز کیا۔ اس نے تیکھی نظروں سے پستہ قد بوڑھے کو دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس بوڑھے کا گلا گھونٹ دے لیکن اینی کی خاطر وہ اس حرکت سے باز رہا۔ ”مجھے اس کے عوض کم از کم دو سو ڈالرز چاہئیں۔“ اس نے بوڑھے سے نجی لہجے میں کہا۔

”آئی ایم سوری، لیکن، ان دنوں میں بھی اس کی مالیت دو سو ڈالرز نہیں ہوتی۔“ یہ کہتے ہوئے اس بوڑھے نے گھڑی کو کاؤنٹر پر ہینری کی جانب کھسکا دیا اور بولا۔ ”دیکھو، چونکہ یہ کرسمس کی شب ہے اس لیے میں تمہیں اس کے عوض پچاس ڈالرز کی آفر کرسکتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ ایک پینی نہیں دے سکتا۔“

”میری بے عزتی مت کرو۔“

”بیٹا، پلیز نہیں“

ہینری نے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے گرجا۔ ”مجھے بیٹا کہہ کر مت پکارو!“

”میرا گریبان چھوڑ دو۔“ بوڑھا اپنے ہاتھوں کو بے ربط طور پر ہلاتے ہوئے ممنایا۔ ”ورنہ میں پولیس کو بلالوں گا۔“

بوڑھے کی اس دھمکی پر ہینری آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے قریب ترین کندشے پر ہاتھ مارا جو کاؤنٹر پر رکھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے اس شے سے بوڑھے کے چہرے، سر اور گردن کے عقبی حصے پر ضربیں لگانا شروع کردیں۔

بوڑھا دکاندار لہراتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

تب اچانک ہینری کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ ایک پبلک مقام پر ہے اور یہ کاروباری اوقات ہیں۔ کوئی بھی کسی لمحے دکان میں آسکتا ہے۔ پھر جب اس نے بوڑھے کو فرش پر ڈھیر دیکھا اور اس کے چہرے سے خون بہتا ہوا نظر آیا تو وہ بدحواس ہوگیا۔ وہ تیزی سے دروازے کی سمت لپکا، لیکن پھر اچانک رک گیا۔ وہ گھوم کر واپس کاؤنٹر کی سمت گیا اور وہاں پر موجود کیش رجسٹر کو کھول کر جلدی جلدی اس میں موجود کرنسی نوٹوں کو اپنی جیب میں ٹھونسنے لگا۔ زیادہ تر نوٹ پانچ اور دس ڈالر مالیت کے تھے۔

پھر وہ پلٹ کر دوڑتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی کہ آیا اس بوڑھے دکاندار کی سانسیں چل رہی ہیں یا نہیں؟

☆☆☆

جوئیلری اسٹور کے سیلز مین نے جب ہینری کو دوبارہ اپنی دکان میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا تو اس کے چہرے پر بوریت کے آثار امڈ آئے لیکن جب ہینری نے اپنی جیب میں سے پانچ اور دس ڈالرز کے نوٹ نکال کر گننا شروع کیے تو سیلز مین کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ ہینری کی جانب متوجہ ہوگیا

ہینری نے پورے دو سو ڈالرز کی رقم جوئیلر کے حوالے کردی اس ادائیگی کے بعد بھی اس کی جیب میں رقم بچ رہی تھی۔

☆☆☆

ہینری گھر پہنچا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔

اینی اس سے کچھ ہی دیر پہلے گھر پہنچی تھی۔

ہینری خاموشی سے گھر میں داخل ہوگیا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کچن سے برتنوں کی کھنکھناہٹ سنائی دے رہی تھی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ اینی کچن میں مصروف ہے۔

وہ دبے پاؤں بیڈ روم میں چلا گیا اور اپنی جیبیں خالی کرنے لگا۔ پیانو نما سلور آویزے کا بکس اس نے ایک دراز میں رکھ دیا اور مڑے تڑے نوٹ موزے رکھنے والی دراز میں ڈال دیے۔

پھر اس نے اپنی گھڑی نکالنا چاہی۔

لیکن گھڑی جیب میں موجود نہیں تھی۔ وہ اسے راہن کی دکان پر بھول آیا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے اس کے پھیپھڑے سانس لینا بھول گئے ہوں۔ کمرا گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا اور سر تھام لیا۔

اس کی گھڑی جائے واردات پر رہ گئی تھی۔ اس سے نہ صرف ڈکیتی سرزد ہوئی تھی بلکہ شاید قتل بھی ہوگیا تھا۔

وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اس کی گھڑی پر نہ صرف بوڑھے راہن کے خون کے نشانات پائے جائیں گے بلکہ اس کا اپنا نام بھی گھڑی پر کندہ ہے جو دنیا دیکھ لے گی۔

اسے اپنی بچت کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

”ہنی، کیا تم یہاں ہو؟“ اینی نے بیڈروم کے دروازے کی آڑ سے اپنے دلکش چہرے کی جھلک دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ڈنر تقریباً تیار ہے!“

ہینری نے سانس کھینچتے ہوئے سونگھنے کی کوشش کی اور اٹھ کر دروازے کی جانب چل دیا۔

”آج تم نے کیا پکایا ہے، سویٹ ہارٹ؟“

اینی نے آگے بڑھ کر اس کی کمر کو اپنی باہوں کے حلقے میں لے لیا اور اس کی ناک کا بوسہ لیتے ہوئے بولی۔

”آئی لو یو!“

ہینری کی زبان الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے لڑکھڑا سی گئی۔ ”آئی لو یو سو مچ، ڈارلنگ!“

اینی کے لبوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے ہینری کا ہاتھ تھاما اور اسے ڈائننگ ٹیبل پر لے آئی جہاں انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ کئی مہینوں کے بعد میز پر اتنی چیزوں کا اہتمام تھا۔

ہینری اپنی پریشانی بھول گیا اور وہ پُراشتیاق نگاہوں سے میز پر سجے کھانوں کو دیکھتے ہوئے قدرے حیران لہجے میں بولا۔ ”یہ سب کہاں سے آگیا؟“

اینی ایک بڑے سے پیالے میں سلاد مکس کررہی تھی۔ وہ بولی۔ ”آج مجھے تنخواہ ملی ہے۔“

”لگتا ہے زیادہ بڑی رقم ہاتھ لگی ہے۔“ ہینری نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔

اینی کا ہاتھ رک گیا۔ پھر وہ مسکرا دی اور سلاد کو دوبارہ مکس کرنے لگی۔ ”مجھے بونس بھی ملا ہے۔“ اس نے تھوڑا سا مکس سلاد ہینری کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کرسمس کی خوشی میں۔“

ہینری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سلاد کی پلیٹ اپنے قریب کھسکا لی اور سلاد کا چمچا منہ میں ڈال کر اسے چبانے لگا۔ اس کے ضمیر پر جو بوجھ دیر سے دھرا تھا اس نے وقتی طور پر اسے ایک طرف اتار پھینکا اور پوری توجہ سے کھانے میں مگن ہوگیا۔ کھانا نہایت ہی لذیذ تھا۔

اینی اس دوران میں ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر کہیں چلی گئی تھی۔

اچانک ایک چھوٹا سا لپٹا ہوا پیکٹ اس کے سامنے میز پر آن گرا۔ ہینری چونک پڑا۔ پھر ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ یہ وہی پیکٹ ہے جو کچھ دیر پہلے اس نے بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں چھپایا تھا۔

”یہ...... یہ کیا ہے؟“ وہ سٹپٹا سا گیا۔

اینی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”یہ تمہارا کرسمس کا تحفہ ہے، ڈیئر۔“

اینی کا قہقہہ اس کے کانوں کو بے حد بھلا لگا تھا۔

ہینری کا ہاتھ کانپ گیا اور کانٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر گیا۔ ”لیکن ابھی کرسمس شروع نہیں ہوا۔“

”میں انتظار نہیں کرسکتی تھی۔“ اینی نے بے تاب لہجے میں کہا۔ ”مجھے تجسس ہو رہا تھا۔“

ہینری نے بہ مشکل تمام وہ پیکٹ ہاتھ میں اٹھالیا اور کچھ دیر تک تھامے رکھنے کے بعد نروس انداز میں اس پر لپٹا ہوا کاغذ اتارنا شروع کردیا۔ پھر اس نے بکس کو کھول دیا۔

اندر ایک سنہری چین رکھی ہوئی تھی۔

”یہ تمہاری گھڑی کے لیے ہے۔“ اینی نے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم اپنی دادا کی دی ہوئی اس نشانی سے کتنا پیار کرتے ہو۔ جوں ہی مجھے اپنے بونس کی رقم ملی، میں سمجھ گئی کہ مجھے تمہارے لیے کیا تحفہ لینا چاہیے۔“

ہینری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ الفاظ اس کے حلق میں اٹک رہے تھے۔ وہ گھڑی کے بارے میں وضاحت پیش کرنا چاہ رہا تھا، کسی جواز کی تلاش میں تھا لیکن اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

اتنے میں دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

ہینری کا دل بھی زوردار انداز میں دھڑکنے لگا۔

”کرسمس کی شب اس وقت کون آسکتا ہے؟“ اسے اینی کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ ہینری نے جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت کون آیا ہے۔

وہ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب چل دیا۔

اتنے میں دستک دوبارہ ہوئی۔

ہینری نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے خشمگیں اور درشت چہرے والے باوردی پولیس والے کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں پولیس کار کی رنگ برنگی لائٹس فلیش کررہی تھیں۔

”ہم کرسمس کی شب زحمت تو نہیں دینا چاہتے تھے لیکن“ ایک باوردی پولیس والے نے شانے اچکاتے ہوئے کہا جو افسر دکھائی دے رہا تھا۔ ”کیا یہاں کوئی مسز اینی مارٹن رہتی ہیں؟“

ہینری کو یوں لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بند ہوگیا ہو۔

اتنے میں اسے عقب سے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے کس چیز کا اعتراف کرنا ہوگا، ہینری!“

ہینری تیزی سے گھوم گیا۔

اینی ندامت سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ پھر وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ”مجھ سے ایک بھیانک حرکت سرزد ہوچکی ہے“

آخری رابطہ

ایچ اقبال

تن کے داغ تو دھل جاتے ہیں، پر من کے داغ کہاں جاتے ہیں... جو ہمیشہ کسی نہ کسی غلطی یا غلط فہمی کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے اردگرد لاتعلقی کی اتنی اونچی دیواریں اٹھالیتے ہیں کہ انہیں نہ تو اپنی ذات سے باہر جھانکنے کی فرصت ملتی ہے اور نہ ہی موسم کے بدلنے کی کچھ خبر... اس کی ذات بھی کچھ ایسی ہی گم صم تھی جو سطر سطر بڑی خاموشی سے اپنے جذبات کو رقم تو کر رہی تھی مگر اس کے نصیبوں کے نصاب میں کوئی اور ہی داستان لکھی جارہی تھی... وہ جو مجسم ایثار تھی... جس کی شخصیت پُربہار تھی... مگر گلشنِ زیست میں اس کی حیثیت فقط خار سے زیادہ نہ تھی۔ دوسروں کی مرضی پر چلتے چلتے جب نارسائی کے مرض میں مبتلا ہوئی تو اس کے پاس ازالے کے طور پر اپنے خوابوں کو گروی رکھنے کے علاوہ اور کوئی اثاثہ نہ تھا... سو وہ یہ کام بھی کر گزری کہ... تعلق ٹوٹ جانے سے محبت مر نہیں جاتی... بلکہ کسی بھی صورت میں ڈھل جائے، زندہ رہتی ہے۔

چند باتیں کرنے کے بعد وہ دونوں بینچ پر کچھ دیر سے خاموش اور کھوئے کھوئے سے بیٹھے تھے۔ دونوں کے چہروں سے حزن وملال کا اظہار ہو رہا تھا۔ لڑکی زیادہ اداس نظر آ رہی تھی۔ اس کا نام شاہانہ تھا۔ وہ اپنے نوجوان ساتھی سے تین ساڑھے تین سال چھوٹی معلوم ہوتی تھی اس کے ساتھی کا نام عزیر تھا۔

وہ دونوں شہر کے ایک پوش علاقے کے ایک پارک میں بیٹھے تھے اس لیے وہاں آنے جانے والوں کے واسطے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ ایک نوجوان جوڑا وہاں ایک بینچ پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔

"خاصا وقت گزر گیا۔" شاہانہ اس سکوت کو توڑتے ہوئے قدرے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔ "اب اور بیٹھے رہے تو واپسی میں مجھے رات ہو جائے گی یا کم از کم اندھیرا تو پھیلنے ہی لگے گا۔"

"ہوں!" عزیر نے گم صم انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تو اٹھیں؟"

"ہاں۔" شاہانہ نے کہا۔ "لیکن چلتے چلتے اپنی بات ایک بار پھر دہرا دو۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"میں سمجھوں گی کہ تم نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہوگا!"

"سوچنے سمجھنے کے لیے مجھے بہت وقت ملا تھا شاہانہ!" عزیر نے کہا۔ "تم نے مجھے فون پر کل رات ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس وقت کی ملاقات تو رسمی سی تھی، رسمی ملاقات... اور شاید آخری۔"

شاہانہ جیسے تڑپ گئی۔ "کیوں؟ آخری کیوں؟"

"شادی کے بعد یہ مناسب نہیں ہوگا شاہانہ کہ تم مجھ سے ملو!"

"مگر کیوں؟" شاہانہ بحث پر آمادہ ہو گئی۔ "کیا شادی کے بعد لڑکیاں اپنی سہیلیوں سے، اپنے دوستوں سے ملنا چھوڑ دیتی ہیں؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ بے حد آزاد خیال گھرانا ہے۔ وہاں میرے دوستوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جائے گا۔"

"عام دوستوں میں اور مجھ میں فرق ہے۔"

"کیا فرق ہے عزیر؟" شاہانہ کے لہجے میں کرب تھا۔

"بہت فرق ہے۔" عزیر نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جب ہم ملیں گے تو ہماری آنکھیں بھی چار ہوں گی اور اس وقت ہماری آنکھوں میں جو تاثر ہوگا، وہ کسی بھی زیرک شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس کا اثر تمہاری ازدواجی زندگی پر بھی پڑ سکتا ہے۔"

"کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" شاہانہ ضد پر اتر آئی۔

عزیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ "شاید میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں تمہیں سمجھا سکوں۔"

"تم چاہتے ہو کہ میری شادی کے بعد تم مجھ سے کبھی نہ ملو؟"

"ہاں، میں یہی مناسب سمجھتا ہوں۔"

"تم مجھے بھول جاؤ گے؟" شاہانہ کی آواز بھرا گئی۔

عزیر نے کچھ رک کر جواب دیا۔ "شاید یہ آسان نہ ہو لیکن میں کوشش کروں گا۔"

"تمہارا لہجہ کہہ رہا ہے کہ تم مجھ سے ہی نہیں، اپنے آپ سے بھی جھوٹ بول رہے ہو لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی عزیر!" شاہانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"چلو اٹھو!..... دیر نہیں ہونا چاہیے تمہیں!" عزیر نے کہا۔ "تم جہاں سے ٹیکسی کرتی ہو، وہاں تک پہنچنے میں بھی پندرہ منٹ لگیں گے۔ ہم کچھ باتیں راستے میں بھی کر سکتے ہیں۔"

شاہانہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں پارک کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

"تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا عزیر!" شاہانہ بولی۔

عزیر نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ "تم شادی کے بعد بھی مجھ سے ملتے رہو گے۔ میں تمہیں دیکھ کر ہی شاید زندہ رہ لوں، اگر دیکھوں گی بھی نہیں تو مر جاؤں گی۔"

"مگر......"

"تمہیں یہ وعدہ کرنا ہی ہوگا۔" شاہانہ نے اس کی بات کاٹی۔ "اگر تم یہ وعدہ نہیں کرو گے تو میں یہ شادی نہیں کروں گی۔"

"خود غرض بن جاؤ گی؟ اپنے گھر والوں کا بھی خیال نہیں کرو گی؟"

"انہوں نے کب میرا خیال کیا ہے!" شاہانہ نے تلخی سے کہا۔

"تم نے مجھے ان کی مجبوریاں بتائی تھیں۔"

"میں نہ ہوتی، تب بھی وہ مجبوریاں ہوتیں۔ اس وقت وہ کیسے سہارا بناتے؟ سہارے کے بغیر بھی مجبوریوں کا وقت کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شاہانہ لیکن......"

شاہانہ نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "میں اب کچھ اور نہیں سننا چاہتی عزیر! تمہیں یہ وعدہ کرنا ہی ہوگا، ورنہ میرا فیصلہ بھی اٹل سمجھو۔ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔"

عزیر نے ایک طویل سانس لی۔ "اچھا! میں وعدہ کرتا ہوں۔"

شاہانہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی لیکن وہ مسکراہٹ بھی اداسی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گی۔"

عزیر کچھ نہیں بولا۔ وہ دونوں پارک سے نکل آئے تھے۔ عزیر کی کار کچھ ہی فاصلے پر موجود تھی۔ وہ دونوں اس کی طرف بڑھے۔ شاہانہ جب عزیر سے ملنے پارک آتی تھی تو ٹیکسی میں آتی تھی۔ واپسی پر عزیر اسے اپنی کار میں ایک ایسی جگہ تک پہنچا دیتا تھا جہاں سے وہ گھر تک ڈھائی تین میل کا فاصلہ ٹیکسی سے طے کرتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اس کے گھر والے یا آس پاس کے لوگ اسے عزیر کے ساتھ اس کی کار میں نہ دیکھیں۔

جب کار چل پڑی تو عزیر نے کہا۔ "میں نے وعدہ تو کر لیا ہے لیکن اگر اس طرح تمہاری ازدواجی زندگی پر کوئی آنچ آئی تو اس کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوگی۔"

"مجھے اس ازدواجی زندگی سے اتنا پیار نہیں ہو جائے گا کہ اس پر کوئی آنچ آنے سے مجھے پریشانی لاحق ہو!"

عزیر نے ایک طویل سانس لی۔ "گویا تم ایک اچھی بیوی نہیں بننا چاہتیں؟"

"میں نے یہ نہیں کہا۔" شاہانہ بولی۔ "لیکن کسی اچھی بیوی کو شکوک وشبہات کی نظر سے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ تم مجھ سے میرے ایک دوست کی حیثیت سے ملو گے اور دوست کو کچھ اور سمجھ لینا زیادتی کی بات ہے۔ میرا اور تمہارا معاملہ صرف محبت کا ہے۔ ہم نے کسی اخلاقی حد تک سے تو کبھی تجاوز نہیں کیا!"

"کسی کی زبان روکی جا سکتی ہے، سوچ پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی!"

"مجھے بحث میں نہ الجھاؤ عزیر! میرا دل بہت دکھا ہوا ہے۔"

"کیا میرا دل خوش ہوگا؟"

"تم مرد ہو۔ مردوں کے اعصاب عورت کے اعصاب سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔"

"یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔"

"تم بحث بڑھاتے جا رہے ہو!"

عزیر نے خاموشی اختیار کر لی۔

جلد ہی وہ مقام آ گیا جہاں عموماً ایک دو ٹیکسیاں کھڑی مل جاتی تھیں۔ شاہانہ وہاں عزیر کی کار سے اترتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں اپنی شادی کا کارڈ دینے آؤں گی۔"

عزیر اب بھی خاموش رہا۔

شاہانہ ایک ٹیکسی میں جا بیٹھی۔ اس نے ڈرائیور کو اپنے گھر کا پتا بتایا تو ٹیکسی حرکت میں آ گئی۔ شاہانہ نے مڑ کر عقبی شیشے سے دیکھا۔ عزیر کی کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ وہ وہیں کھڑی رہی، تاوقتیکہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اب شاہانہ سیدھی بیٹھ گئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکاری کو باہر آنے سے روکا۔ وہ بہت اداس تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

گھر دو سو گز کے پلاٹ پر تھا۔ اس میں چھ افراد رہتے تھے۔ شاہانہ کے والدین، اس کے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن!

دروازہ اس کی ماں صباحت بیگم نے کھولا۔

"اتنی دیر کہاں لگا دی؟" وہ آہستہ سے بولیں۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے شاہانہ سے پوچھنا ضروری ہو۔

"عزیر سے باتوں میں کچھ دیر ہو گئی۔" شاہانہ نے صاف گوئی سے جواب دیا اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کی چھوٹی بہن فرزانہ اس وقت کچن میں تھی۔ وہ شاہانہ سے دو سال چھوٹی تھی لیکن شادی کے قابل بہرحال ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ ہی دن پہلے سیکنڈ ایئر کا امتحان پاس کیا تھا۔

دونوں چھوٹے بھائی آٹھ اور دس سال کے تھے جن کے بارے میں شاہانہ کا خیال تھا کہ اب وہ کرکٹ کھیل کر واپس آ رہے ہوں گے۔ اپنی عمر کے باعث انہیں اندازہ نہیں تھا کہ گھر میں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور کیوں پک رہی تھی۔

شاہانہ کے والد آذر صاحب اچھی خاصی جگہ ملازم تھے اور وہ گھرانا آسودگی کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن ڈھائی تین سال کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ان کی آسودگی کا جنازہ نکال دیا تھا۔ زندگی نہایت پریشانی کے عالم میں گزر رہی تھی۔ قرض خاصا ہو گیا تھا لیکن آذر صاحب نے اس رقم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا جو انہوں نے شاہانہ اور فرزانہ کی شادی کے لیے جمع کی تھی۔

مہنگائی کی وجہ سے دور اندیش آذر صاحب نے سوچا تھا کہ ابھی تو قرض ہی بڑھ رہا تھا لیکن آئندہ دو سال میں سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف اتنا ہی ہوا تھا کہ دونوں لڑکوں اور فرزانہ کی تعلیم وہ کسی نہ کسی طرح

جاری رکھ سکتے تھے۔ بس گھر کے اخراجات میں ساٹھ فیصد کمی کرنا پڑی تھی۔

ان حالات میں جب شاہانہ کے لیے فیروز کا رشتہ آیا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پردۂ غیب سے ان کی مدد کی ہو۔ فیروز ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے شاہانہ کی شادی آذر صاحب کی بہت سی پریشانیوں کا ازالہ کرسکتی تھی۔ وہ فیروز کے والد کی انڈسٹری ہی میں ملازم تھے۔

فیروز کے معاملے میں ایک خرابی یہ تھی کہ وہ عمر میں شاہانہ سے دس سال بڑا تھا اور چار سال قبل اس کی ایک شادی بھی ہوچکی تھی۔ اس کی بیوی کا نام زہرہ تھا۔ وہ کیونکہ ماں نہیں بن سکی تھی اور فیروز کی ماں کو دادی بننے کا بے حد ارمان تھا لہٰذا انہوں نے فیروز کی دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ زہرہ اگرچہ خاصے ٹھیک ٹھاک گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس نے فیروز کی دوسری شادی پر بہ ظاہر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا اور نہ ہی طلاق مانگی تھی۔ وہ بدستور فیروز کے ساتھ رہ رہی تھی۔

آذر صاحب کے لیے سب سے بڑا مسئلہ شاہانہ کو آمادہ کرنا تھا۔ ماں کی طرح وہ بھی اپنی بیٹی کی ضدی فطرت سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی واقف تھے کہ وہ کالج کے زمانے ہی سے کسی عزیر نامی لڑکے کو پسند کرتی تھی اور کچھ ہی دن میں شاہانہ کے لیے عزیر کا رشتہ آنے والا تھا۔

عزیر کے بارے میں انہیں اپنی بیوی سے معلوم ہوا تھا کہ تعلق اس کا بھی ایک آسودہ حال گھرانے سے ہے لیکن مالی اعتبار سے وہ فیروز کے مقابلے پر کچھ بھی نہیں...... اس سے قطع نظر آذر صاحب کو فیروز اور شاہانہ کی شادی کے باعث یہ امید بھی تھی کہ فیروز کے باپ کی انڈسٹری میں ان کی ترقی کا امکان روشن ہوجائے گا۔

شاہانہ کو سمجھانے بجھانے کی ذمے داری سلطانہ بیگم کو سونپی گئی تھی چنانچہ اس وقت بھی وہی شاہانہ کے کمرے میں گئیں جو بستر پر اداس لیٹی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ ماں کو دیکھ کر احتراماً اٹھ بیٹھی۔

سلطانہ بیگم نے بستر پر ہی اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہوئی عزیر سے؟"

شاہانہ نے نظریں جھکائے رکھیں اور آہستہ سے بولی۔ "میں نے کسی ایسے شخص سے محبت نہیں کی تھی امی جو ذہنی طور پر پست ہو۔ آپ نے مجھے گھر کی جو پریشانیاں بتائی تھیں، ان سے میں نے اسے بھی آگاہ کردیا۔"

"پھر؟" سلطانہ بیگم نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ ہم دونوں اپنی محبت کو گلا گھونٹ کر مار ڈالیں اور میں اپنے گھر والوں کی پریشانیوں کا خیال کروں۔"

"اس پر تم نے کیا کہا؟" سلطانہ بیگم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میں کیا کہتی۔" شاہانہ تلخی سے بولی۔ "چڑھا دیں آپ لوگ مجھے سولی پر!"

سلطانہ بیگم نے بیٹی کو گلے سے لگالیا لیکن شاہانہ ان کی اس شفقت سے ذرا بھی جذباتی نہیں ہوئی۔

"بیٹی!" سلطانہ بیگم نے قدرے اداس لہجے میں کہا۔ "چاہتے تو ہم بھی نہیں تھے کہ تم سوت پر کسی گھر میں جاؤ لیکن حالات......"

"حالات!" شاہانہ قدرے تلخی سے بولی۔ "اگر میں ملازمت کرکے اس گھر کا کچھ بوجھ ہلکا کرتی تو عزیر کو قطعی اعتراض نہیں ہوتا!"

"آج کل ملازمت ملنا آسان تو نہیں ہے بیٹی! اور اگر ملازمت ملتی بھی تو آٹھ دس ہزار سے زیادہ کی تو کیا ملتی...... اس سے وقتی طور پر کچھ سہارا ہوتا لیکن آنے والا وقت آج سے زیادہ خوف ناک نظر آرہا ہے۔ ان دس بارہ ہزار کی اہمیت بھی ختم ہوجائے گی۔ بہت کچھ سوچ چکے ہیں تمہارے والد۔"

"مجھے اندازہ ہے کہ وہ کیا سوچ چکے ہیں!" شاہانہ کے لہجے کی تلخی برقرار رہی۔ "آخر مجھ پر ہی کیوں تان ٹوٹی ہے۔ فرزانہ کی شادی کرادی جاتی فیروز سے! فرزانہ تو کسی سے محبت نہیں کرتی۔"

"مگر وہ لوگ تمہی کو پسند کررہے ہیں۔ تم فرزانہ سے زیادہ خوب صورت ہو اور پھر فرزانہ ابھی بالغ ہونے کے باوجود بچی سی لگتی ہے۔"

"اور میں بوڑھی لگنے لگی ہوں۔"

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" سلطانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

"پھر چھوڑیں، اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ آپ پیغام بھجوادیں فیروز کے گھر والوں کو کہ آپ کو یہ رشتہ منظور ہے۔"

سلطانہ بیگم نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن شاہانہ جلدی سے بول پڑی۔ "میں اب اس معاملے میں کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتی امی!"

سلطانہ بیگم خاموش رہ گئیں۔ چند لمحے بیٹھی رہیں، پھر

اٹھ کر کمرے سے جانے لگیں۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ کوئی جرم کرکے جارہی ہوں۔

شاہانہ پھر لیٹ گئی، وہ اب بھی اداس تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی خاص منصوبہ پرورش پارہا تھا۔

☆☆☆

عزیر نے ایک آرکیٹکٹ کی حیثیت سے خود کو منوانے کے لیے خاصی جدوجہد کی تھی اور صرف سال بھر کے عرصے میں اس نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا، اگر یہ منزل اس کے سامنے نہ ہوتی تو وہ سال بھر پہلے ہی شاہانہ سے شادی کرچکا ہوتا لیکن اب اسے افسوس ہورہا تھا کہ اگر اس نے اس معاملے کو ترجیح نہ دی ہوتی تو اچھا ہوتا۔

اس کے والد کا انتقال ہوچکا تھا۔ گھر میں وہ صرف اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ چند مہینے پہلے ہی اس نے اپنا بنگلا بنوایا تھا اور نئی کار بھی خرید لی تھی لیکن اب وہ سب کچھ اسے بہت فضول محسوس ہورہا تھا۔ اس نے یہ محنت شاہانہ کو ایک آسودہ زندگی میں لانے کے لیے کی تھی اور اب شاہانہ کے بغیر وہ سب کچھ اس کے لیے کسی نہ کسی حد تک بے معنی ہوکر رہ گیا تھا۔

وہ ان دنوں آرکیٹکٹ کی حیثیت سے بھی اپنا کام دل جمعی سے نہیں کرپارہا تھا۔ شاہانہ سے آخری ملاقات کے بعد سے اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دفتر بھی دیر سے جانے لگا تھا۔

مگر اس دن اسے کوئی خاص دیر نہیں ہوئی تھی جس صبح اس نے ایک شاندار کار اپنے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھی جس کی پچھلی نشست پر شاہانہ نظر آئی تھی۔ دس بجنے والے تھے لیکن ابھی اس نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ اس کے دیر تک سونے کی وجہ سے اس کی والدہ بھی دیر سے ہی ناشتا تیار کرتی تھیں۔ اس وقت وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گئی ہوئی تھیں۔ عزیر برآمدے میں کرسی ڈالے اخبار پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اس لیے برآمدے کی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔

شاہانہ کو کار سے اترتے دیکھ کر عزیر کو اتنی حیرت ہوئی تھی کہ اخبار اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا اور وہ خود بھی کھڑا ہوگیا تھا۔ شاہانہ سے اس کی ملاقات کو دس دن سے زیادہ نہیں گزرے تھے اور شاہانہ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے اپنی شادی کا کارڈ دینے ضرور آئے گی لیکن وہ شاندار کار دیکھ کر عزیر کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ شاہانہ کی شادی ہوچکی ہے شاید اور اب وہ اپنے شوہر کی کار میں آئی ہے۔ کار برآمدے کے سامنے آن رکی۔ اسے ایک باوردی شوفر چلا کے لایا تھا۔ وہ جلدی سے اترا، اس کا مقصد یہی ہوگا کہ شاہانہ کے لیے دروازہ کھولے لیکن شاہانہ نے اتنا انتظار نہیں کیا۔ وہ خود ہی دروازہ کھول کر اتری اور تیزی سے برآمدے کی طرف چلی آئی۔

"ہیلو عزیر!" اس کا لہجہ خوش گوار تھا اور چہرے سے بھی پژمردگی ظاہر نہیں ہورہی تھی۔

"ہیلو!" عزیر کے منہ سے مشینی انداز میں نکلا تھا۔

"اندر چلو۔" شاہانہ نے کہا۔

"ہاں ہاں، آؤ!" عزیر دروازے کی طرف مڑا۔ "ممی نہارہی ہیں۔ وہ ایک مرتبہ پوچھ چکی ہیں تمہیں...... ایک ڈیڑھ ماہ بعد آئی ہو آج یہاں!"

"پارک میں مل لیتے تھے نا!" شاہانہ نے جواب دیا۔ "یہاں پر ممی کی وجہ سے باتیں کرنے میں احتیاط برتنا پڑتی تھی۔"

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوچکے تھے۔

"بیٹھو!" عزیر نے کہا اور پھر بجھی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "شادی مبارک ہو!"

"شادی؟" شاہانہ حیرت سے بولی، پھر ہنس پڑی۔ "اچھا!...... کار کی وجہ سے سمجھے ہو یہ بات، حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب میری شادی ہوگی تو میں تمہیں دعوت نامہ دینے ضرور آؤں گی۔ اس وقت آئی بھی اسی لیے ہوں۔ پہلے تمہارے دفتر فون کیا، وہاں سے معلوم ہوا کہ آج کل تم بارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچ رہے ہو لہٰذا میں تمہارے موبائل پر رابطہ کیے بغیر سیدھی یہیں آگئی۔" ان باتوں کے دوران میں اس نے اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکال لیا تھا جو اس نے عزیر کی طرف بڑھا دیا۔

"لیکن...... لیکن...... یہ...... کار...... میرا مطلب ہے......" عزیر کا ذہن شاید بہت زیادہ الجھ گیا تھا۔

"تمہارے ہونے والے سسر صاحب نے مہربانی فرمائی ہے۔" شاہانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ کار اس لیے بھجوائی ہے کہ شادی کی تیاریوں اور کارڈز وغیرہ کی تقسیم میں پریشانی نہ ہو۔"

"خوب! سسر تو بہت اچھے ملے ہیں، بہت خوش نظر آرہی ہو۔"

"کیا نہیں نظر آنا چاہیے؟" شاہانہ سنجیدہ ہوگئی۔ "مجھے

یاد ہے، تم نے کچھ اس قسم کی بات کی تھی کہ میں ایک اچھی بیوی بننے کی کوشش کروں گی۔"

"اچھا!" عزیر کی مسکراہٹ مضمحل سی تھی۔ اس نے کہا۔ "تو فوری طور پر پریکٹس شروع کر رہی ہے۔"

"مجھے جلدی واپس جانا ہوگا۔ یہ ڈر بھی ہے کہ ممی نہا کر آگئیں تو بات کرنا مشکل ہوگا، میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں، تم شادی کب کرو گے؟"

عزیر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

"پلیز عزیر!" شاہانہ بولی۔ "ہمیں جلدی جلدی بات کرنا ہے۔"

"تم نے سوال ہی ایسا داغ دیا کہ فوری طور پر میں کوئی جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔"

"اچھا اب تو دو جلدی سے!"

"تم مجھ سے ایک وعدہ لے چکی ہو کہ میں تمہاری شادی کے بعد بھی تم سے ملتا رہوں گا۔ اب کوئی دوسرا وعدہ لینے کی کوشش نہ کرو۔"

"عزیر!" اس مرتبہ شاہانہ کچھ جذباتی نظر آئی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم نے مجھے دیوانہ وار چاہا ہے۔ شاید تم نے فیصلہ کیا ہو کہ اب زندگی بھر شادی نہیں کرو گے لیکن ہوسکتا ہے کہ دو چار سال بعد تم اتنے جذباتی نہ رہو۔ ممی بھی چاہیں گی کہ تمہاری شادی ہو جائے، تمہیں ان کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!"

"مجھے نہیں معلوم۔" عزیر کی آواز بھرا گئی۔ "تم نے اچانک ایسی بات چھیڑی ہے کہ میرا دماغ شل ہونے لگا ہے۔"

"اچھا میں فرض کیے لیتی ہوں کہ تین چار سال بعد تم شادی کے لیے تیار ہو جاؤ گے لیکن اگر کوئی ایسی لڑکی تمہاری بیوی بننا چاہے جس کی ایک شادی ہو چکی ہو تو کیا تم اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے؟...... یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس لڑکی کا نام شاہانہ ہوگا۔"

"کیا!" عزیر چونک گیا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ......"

"تم ٹھیک سمجھ رہے ہو، وہ میں ہی ہوں گی عزیر!" شاہانہ کی آواز بھرا گئی۔ "جو کچھ ہو رہا ہے، یہ وقتی بات ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں کھونا چاہتی۔ تین چار سال بعد میں تمہاری ہوسکتی ہوں، بشرطیکہ تم بھی ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ جو تین چار سال تک کسی کی بیوی رہ چکی ہو۔"

"تم میرے لیے ہمیشہ ویسی ہی رہو گی شاہانہ جیسی آج ہو۔" عزیر کے جذبات جیسے امڈ پڑے۔ "تم بوڑھی بھی ہو جاؤ تو......"

"نہیں۔" شاہانہ کی مسکراہٹ بھیگی ہوئی سی تھی۔ "میں بوڑھی نہیں ہو جاؤں گی تین چار سال میں ......اور یہ بھی ممکن ہے کہ تین سال سے زیادہ نہ گزریں۔"

"تم نے مجھے بہت الجھا دیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"تین چار سال بعد مجھے طلاق مل جائے گی عزیر!"

"کیا کہہ رہی ہو تم...... آخر یہ کیسے ممکن ہے؟"

شاہانہ اس کا جواب دیتی یا نہ دیتی لیکن اسی وقت عزیر کی والدہ آگئیں اور انہوں نے شاہانہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"بہت دن بعد آئیں بیٹی!" انہوں نے گلہ کیا۔

"حالات کچھ ایسے ہی رہے!" شاہانہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "اس وقت بھی جلدی میں آئی ہوں۔ بس اب جا ہی رہی تھی، اچھا ہوا کہ آپ آگئیں۔ آپ کو سلام کرنے کا موقع تو مل گیا۔"

"چائے وغیرہ کچھ......"

"نہیں ممی!" شاہانہ نے مسکرا کر کہا۔ "پھر کبھی آؤں گی تو پیوں گی۔ ابھی تو میں بس یہ کارڈ دینے آئی تھی عزیر کو۔"

"کیسا کارڈ ہے؟"

"شادی کارڈ ہے ممی!"

"اچھا!" عزیر کی ماں نے خوشی کا اظہار کیا۔ "فرزانہ کی شادی ہو رہی ہے!"

"جی نہیں۔" شاہانہ نے ہنس کر کہا۔ "یہ میری شادی کا کارڈ ہے۔"

"کیا!" وہ بھونچکا رہ گئیں۔

"اچھا بس اب چلتی ہوں۔" شاہانہ ان سے گلے ملی اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

عزیر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ وہ شاہانہ کو چھوڑنے کے لیے باہر تک نہیں جاسکا تھا۔ اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال اس کی والدہ کا بھی تھا۔

باہر سے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

عزیر کی والدہ ایک صوفے پر جیسے گر سی گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے عزیر؟" انہوں نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔ وہ شاہانہ کو بہت پسند کرنے لگی تھیں۔

عزیر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ اب بھی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھا تھا۔ ایک سوال نے تو اس کے دماغ میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے لیے قیاس کرنا بھی مشکل تھا کہ شاہانہ کو تین چار سال بعد طلاق کیوں ہو جائے گی؟ شاہانہ کو اس بات کا یقین کیوں تھا؟

☆☆☆

شاہانہ نے جو منصوبہ بندی کی تھی، اس کے باعث اسے یقین تھا کہ تین سال نہیں تو چار سال میں طلاق کی نوبت آہی جائے گی۔

فیروز سے اس کی شادی ہو گئی۔ شاہانہ نے اس میں اپنے کالج کی کئی دوست لڑکیوں اور لڑکوں کو بلایا تھا اور وہ سب ہی آئے تھے لیکن عزیر نہیں آیا تھا۔ شاہانہ کو اس کا اندازہ تھا کہ وہ نہیں آسکے گا۔ وہ کیسے دیکھ سکتا تھا کہ جس لڑکی کو دلہن بنا کر اسے اپنے ساتھ لے جانا تھا، وہ کسی اور کی دلہن بنی بیٹھی ہو۔

لیکن شاہانہ کا یہ اندازہ غلط تھا۔ عزیر نے وہ کرب ناک منظر دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر خود کو اندھیرے میں چھپائے کھڑا رہا تھا اور برات اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ اس نے شاہانہ کو دلہن بنے ہوئے فیروز کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

شاہانہ اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔

رات کا ایک بجا تھا جب وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی اور فیروز بستر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے فیروز کو دیکھا نہیں مگر احساس کیا کہ وہ بستر پر بیٹھ چکا تھا۔ شاہانہ کا دل بھر آیا۔ کبھی اس نے اس قسم کے خواب دیکھے تھے کہ جب وہ دلہن بن کر بیٹھی ہوئی ہوگی تو عزیر اس کے قریب آئے گا لیکن تقدیر نے کچھ اور ہی گل کھلا دیا تھا۔

"شاہانہ!" فیروز کی مدھم آواز اس کے کانوں میں آئی۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

"ہاں۔" فیروز نے ایک طویل سانس لی۔ "نئی دلہنوں کی زبان ذرا دیر سے کھلتی ہے۔ خیر! تم تھکی ہوئی بھی ہو۔ اب آرام کرو، باتیں کل بھی کی جاسکتی ہیں۔"

فیروز بستر سے اٹھ گیا۔ شاہانہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ یہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ فیروز شیروانی اتار کر الماری میں رکھ رہا تھا۔ پھر وہ مڑا اور شاہانہ کی طرف دیکھے بغیر کمرے کے ایک بڑے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر صوفے پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ آرسی مصحف کی رسم میں شاہانہ اس کے چہرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال چکی تھی۔ اب اس نے فیروز کو غور سے دیکھا۔ وہ صحت مند اور اچھے نقش و نگار کا مالک تھا۔ اس کی عمر واقعی شاہانہ سے آٹھ دس سال زیادہ ہوسکتی تھی۔

یہ کیا ہوا؟ شاہانہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ ایک ایسا معما تھا جسے حل کرنے کی اس کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ بیٹھی بس سوچتی ہی رہی۔ خاصا وقت گزر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ فیروز سو چکا تھا۔ خود شاہانہ بھی لیٹنا چاہتی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے زیورات اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھے اور آہستگی سے لیٹ گئی۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس واقعے نے اس کی نیند اڑا دی ہو لیکن جب انسان بہت زیادہ تھکا ہوا ہو تو عموماً زیادہ دیر تک جاگا نہیں رہ سکتا۔ نیند نے شاہانہ کو بھی جلد ہی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

صبح شاید وہ دیر تک سوتی رہ جاتی، اگر اسے جگایا نہ جاتا۔ جگانے والا فیروز ہی تھا لیکن اس نے شاہانہ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، صرف آوازیں دی تھیں۔ شاہانہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

"غسل کر کے ساڑی باندھ لو۔" فیروز نے کہا۔ "ہمارے گھر میں یہ رواج نہیں کہ لڑکی شادی کے دوسرے دن بھی دلہن بنی رہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک تمہیں گھر والوں کے ساتھ ناشتے کی میز پر ہونا چاہیے۔"

خود فیروز اس وقت تک تیار ہو چکا تھا۔ سوٹ میں ملبوس اس کی شخصیت زیادہ دلکش نظر آرہی تھی۔

شاہانہ اس سے نظریں ملائے بغیر بستر سے اٹھی اور کپڑے نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ فیروز کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"چلیں؟" اس نے شاہانہ کی طرف دیکھا۔

شاہانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فیروز نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گھر میں مشرقی انداز کے سلام کرنے کا بھی رواج نہیں ہے۔ سب سے گڈ مارننگ کہنا۔"

"بہتر۔" شاہانہ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"شکر ہے۔ میں نے تمہاری آواز تو سنی!"

شاہانہ نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ فیروز نے یہ بات مسکرا کر کہی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس وقت بھی فیروز کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

وہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔

”اس وقت ہمیں بیس سیکنڈ کی تاخیر ہو چکی ہے۔“ فیروز نے کہا۔ ”اس گھر کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ساڑھے آٹھ بجے سب لوگ ناشتے کی میز پر پہنچ جائیں۔ سب پہنچ چکے ہوں گے اور ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا..... اچھا ہاں! ایک بات کا خیال رہے! کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے یہ رات صوفے پر اور تم نے بستر پر گزاری تھی۔ مجھے امید ہے، تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں کیا ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس گھر کے اصول کس نے وضع کیے ہیں؟“ شاہانہ پہلی مرتبہ کھل کر بولی۔

”ممی نے۔“ فیروز نے جواب دیا۔ ”یوں سمجھ لو کہ وہی اس گھر کی حاکم ہیں۔ ڈیڈی کو بھی ان کے اشارے پر چلنا پڑتا ہے۔“

اس موضوع پر انہیں زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا..... وہ دونوں ڈائننگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔ شاہانہ کو توقع تھی کہ ڈائننگ روم ان قریبی عزیز داروں سے بھرا ہوا ہوگا جو اس شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے لیکن اس کے برخلاف اسے ایک مہمان بھی نظر نہیں آیا۔ صرف گھر کے لوگ تھے جنہیں وہ گزشتہ رات دیکھ چکی تھی۔

فیروز کے والد جو عموماً لالہ عیسیٰ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی بیگم فریال عیسیٰ میزبان کی نشست پر بیٹھی تھیں۔ ان کی عمر شاید پچپن سال ہو لیکن دیکھنے میں وہ پچاس سال سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھیں۔ خاصی لمبی تڑنگی اور بھرے ہوئے جسم کی مالک تھیں۔ صحت مند لالہ عیسیٰ بھی تھے۔ ان کے سامنے کی کرسی پر فیروز کا چھوٹا بھائی اعجاز بیٹھا تھا۔ جس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اسی سال اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ شاہانہ کو ان سب باتوں کا علم شادی سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

فیروز کی پہلی بیوی زہرہ، اعجاز کے برابر میں بیٹھی تھی۔ اسے بہت خوب صورت تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ ایک پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔

سب خوش گوار موڈ میں نظر آ رہے تھے، حتیٰ کہ زہرہ بھی!

”گڈ مارننگ!“ کی آوازیں ڈائننگ روم میں گونجیں۔

شاہانہ فیروز سے ایک قدم پیچھے ہو گئی تھی۔ فیروز نے باپ کے برابر کی سیٹ کا رخ کیا۔ شاہانہ اس کے برابر میں بیٹھنا چاہتی تھی لیکن بیگم فریال عیسیٰ بول پڑیں۔ ”نہیں شاہانہ!..... تم اس طرف بیٹھو، زہرہ کے ساتھ..... تم اس کی ہم منصب ہو۔“

”جی۔“ شاہانہ نے آہستہ سے کہا اور گھوم کر زہرہ کے برابر میں جا بیٹھی۔ زہرہ نے بڑی محبت سے شاہانہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ شاہانہ اس کی طرف دیکھ کر خفیف سا مسکرائی۔

ناشتا شروع کیا گیا۔ دو ملازم میز کے قریب موجود تھے تاکہ اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ فوراً حاضر کر دی جائے۔

”چھوٹی بھابی!“ اعجاز بول پڑا۔ ”آپ کو شوگر تو نہیں ہے؟“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

”کیا بکواس کرنے لگے تم!“ بیگم فریال عیسیٰ نے ڈانٹا۔

”احتیاطاً کہہ رہا ہوں ممی!“ اعجاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بڑی بھابی نے ان کی پلیٹ میں شاہی ٹکڑا رکھا ہے۔“

”شاہانہ بچی نہیں ہے جو یہ نہ جانے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں!“

اعجاز نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت شاہانہ نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ماں کے دباؤ میں زیادہ نہیں تھا۔

ناشتا جاری رہا۔

”شاہانہ!“ فریال عیسیٰ بولیں۔ ”ہمارے گھر کے رواج بہت سے گھروں سے مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں یہ بھی نہیں ہوتا کہ شادی کی رات کے بعد دلہن چند دنوں کے لیے اپنے گھر جائے لیکن تمہاری ماں کے بہت کہنے پر میں نے ان کی بات مان لی ہے۔ دس بجے تک تمہارے گھر سے کچھ لوگ آئیں گے۔ چلی جانا لیکن چار بجے شوفر تمہیں لینے آ جائے گا۔ شام کی چائے ہمارے گھر میں ساڑھے چار بجے پی جاتی ہے۔“

ہر بات کا ٹائم ٹیبل بنا ہوا ہے اس گھر میں، شاہانہ نے سوچا۔

نو بجے سب ناشتے کی میز سے اٹھ گئے۔

”چھوٹی بھابی!“ اعجاز بولا۔ ”ٹینس کھیلنا آتا ہے آپ کو؟“

”نہیں۔“ شاہانہ نے جواب دیا۔

”کیا مصیبت ہے!“ اعجاز نے منہ بنایا۔ ”گھر میں بھی کوئی ٹینس نہیں کھیلتا اور مجھے جنون ہے اس کا۔ آپ آئیں تو میں نے سوچا شاید ...“ پھر اس نے ”ہونہہ“ کر کے سر جھٹکا اور ڈائننگ روم سے جانے لگا۔

”میں لاؤنج میں جا رہا ہوں ممی!“ اعجاز نے جاتے جاتے کہا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

لالہ عیسیٰ اور فریال عیسیٰ دوسرے دروازے سے باہر چلے گئے۔

”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں ممی!“ فیروز بھی جاتے ہوئے بولا۔ ”ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔“

”اچھا!“ فریال عیسیٰ نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا اور اپنے شوہر کے ساتھ ڈائننگ روم سے نکل گئی۔

”تم میرے ساتھ آؤ۔“ زہرہ نے مسکرا کر شاہانہ کا ہاتھ پکڑا۔ ”کمرے میں بیٹھ کر کچھ گپ شپ کریں گے۔“

شاہانہ نے فیروز کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں۔“ فیروز بولا۔ ”تم زہرہ کو بہت اچھی دوست پاؤ گی۔“

شاہانہ خفیف سا مسکرا دی۔ زہرہ اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ شاہانہ سوچنے لگی، یہ کس قسم کی عورت ہے کہ اس نے اتنی خوش دلی سے اپنے شوہر کی دوسری شادی گوارا کر لی اور اب بھی مسرور نظر آ رہی ہے۔

”یہ ہے میرا کمرا۔“ زہرہ نے شاہانہ کے ساتھ ایک کمرے میں قدم رکھا۔ ”کل رات سے پہلے یہ میرا کمرا نہیں تھا۔ تمہاری خواب گاہ جس کمرے کو بنایا گیا، وہ پہلے میری اور فیروز کی خواب گاہ تھا۔“

شاہانہ کو اس وقت بھی یہ خیال تھا کہ یہ باتیں بتاتے ہوئے زہرہ کے لہجے میں تلخی ہونا چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بدستور خوش گوار موڈ میں تھی۔

”آپ.....“ شاہانہ نے کچھ کہنا چاہا۔

”نہیں۔“ زہرہ جلدی سے بول اٹھی۔ ”آپ نہیں، تم۔“

”میں عمر میں تھوڑی سی چھوٹی ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ زہرہ نے کہا، پھر ہنس کر بولی۔ ”تم نے سنا نہیں تھا، ممی کیا کہہ رہی تھیں؟ ہم دونوں ہم منصب ہیں۔“

”ہم منصب تو شاید میں نہیں بن سکی۔“ شاہانہ نے بے اختیار کہا، پھر خود ہی اطمینان بھی محسوس کیا کہ وہ زہرہ کی ہم منصب نہیں بن سکی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا شاہانہ؟“ زہرہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”یہ بات واضح کرو کہ تم میری ہم منصب نہیں بن سکیں۔“

”میں عمر میں چھوٹی ہوں نا!“ شاہانہ مسکرائی۔ ”ہم منصب کیسے ہو سکتی ہوں۔“

”تم بات ٹال رہی ہو!“ زہرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم شاید بے اختیار ایک ایسی بات کہہ گئی ہو جس کا مطلب کچھ اور ہی نکلتا ہے۔“

شاہانہ کو احساس ہو گیا کہ اس سے غلطی ہو گئی تھی۔ فیروز نے اسے سمجھا بھی دیا تھا کہ گھر میں کسی کو گزشتہ رات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ بات بنانے کی مزید کوشش کرتی لیکن اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون؟“ زہرہ نے چونک کر پوچھا۔

”میں ہوں بھئی!“ باہر سے آواز آئی۔

”اوہ، ڈیڈی!“ زہرہ دروازے کی طرف لپکی۔

اب شاہانہ نے سمجھا کہ وہ لالہ عیسیٰ کی آواز تھی۔ ناشتے کی میز پر تو اس نے لالہ عیسیٰ کو بولتے ہوئے سنا ہی نہیں تھا۔

زہرہ نے دروازہ کھولا۔

لالہ عیسیٰ نے اپنے منہ سے سگار نکالا اور زہرہ کے پیچھے کھڑی ہوئی شاہانہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ ”تمہارے گھر سے لوگ آ گئے ہیں شاہانہ.....! ڈرائنگ روم میں ہیں سب! تمہاری ممی بھی ہیں۔ انہیں یہ بات گراں گزری ہے کہ وہ لوگ وقت سے پہلے آ گئے۔ ہماری بیگم صاحبہ نے دس بجے کا وقت دیا تھا نا.....!“

”میرے گھر والوں کو ابھی یہاں کے اصولوں کا علم نہیں ہے نا ڈیڈی!“ شاہانہ نے کہا۔ ”میں آج سمجھا دوں گی سب کو، اب ممی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

”اچھا اب تم وہاں جاؤ تو!“ لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ”ہماری بیگم صاحبہ نے کسی ملازم سے کہنے کے بجائے مجھے ہی حکم دے دیا تھا کہ تمہیں مطلع کر دوں۔“

”آؤ شاہانہ!“ زہرہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

وہ دونوں باہر نکلیں، لالہ عیسیٰ دوسری طرف مڑ گئے۔

”آپ بھی آئیے نا ڈیڈی!“ شاہانہ بولی۔

”صرف خواتین آئی ہیں تمہیں لینے! میں کیا کروں گا وہاں جا کر۔“ لالہ عیسیٰ نے جواب دیا، پھر ہنس کر بولے۔ ”ویسے اعجاز تو پہنچ گیا ہوگا۔ اسے بہت شوق ہے عورتوں میں بیٹھنے کا!“

زہرہ مسکرا کر بولی۔ ”جب اعجاز وہاں ہوگا تو آپ بھی آ جائیے!“

”ہاں آئیے نا ڈیڈی!“ شاہانہ بولی۔

”نہیں نہیں، تم لوگ جاؤ، میں آرام کروں گا۔“ لالہ عیسیٰ آگے بڑھ گئے۔

شاہانہ اور زہرہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔

”ممی کی بہ نسبت ڈیڈی خاصے خوش مزاج ہیں۔“

شاہانہ بولی۔

"بہت اچھے انسان بھی ہیں۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "مخلص، ہمدرد، غریب پرور۔"

"فیروز بتا رہے تھے۔ گھر کے باقی لوگوں کے علاوہ ڈیڈی بھی ممی سے دبتے ہیں۔"

"دبتے نہیں ہیں، بس سمجھوتا کرلیا ہے انہوں نے، وہ گھر کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتے لیکن اب شاید وہ ایک دھماکا کرہی ڈالیں۔"

"دھماکا؟" شاہانہ حیرت سے بولی۔

اس موقعے پر ان کی گفتگو ایک بار پھر ادھوری رہ گئی کیونکہ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوچکی تھیں۔

شاہانہ کو لینے کے لیے آنے والوں میں اس کی بہن فرزانہ اور اس کی دو سہیلیاں شامل تھیں۔ ان کے ساتھ چالیس بیالیس سال کی ذکیہ خاتون بھی تھیں جو کسی رشتے سے شاہانہ کی خالہ لگتی تھیں۔

شاہانہ کی دونوں سہیلیاں اٹھ کر بڑی گرم جوشی کے ساتھ شاہانہ سے ملیں۔ فرزانہ کا انداز کچھ عجیب نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس شادی سے خوش نہ ہو۔

لالہ عیسیٰ کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی کہ اعجاز وہاں موجود تھا اور خوب چہک رہا تھا۔ ملازم چائے اور دیگر لوازمات لے آیا تھا۔

فریال عیسیٰ نے اپنے سمدھیانے سے آئے ہوئے مہمانوں کی مدارات تو کی لیکن ان کا انداز متکبرانہ ہی تھا جس کی وجہ سے شاہانہ کی خالہ ذکیہ انہیں کبھی کبھی تیکھی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتی تھیں۔

اعجاز نے مچھلی کے ایک شکار کا قصہ سنانا شروع کردیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کی مخاطب صرف فرزانہ ہو۔ وہ اسے جس انداز سے دیکھ رہا تھا، وہ بھی شاہانہ کو اچھا نہیں لگا اور یہ بات بھی بری لگی کہ فرزانہ اعجاز کی باتوں میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔

ان لوگوں کو جلد ہی جانا تھا لیکن فیروز کا انتظار کرنے کی وجہ سے ان سب کو کچھ زیادہ رکنا پڑا۔

جب روانگی کے لیے سب کھڑے ہوئے تو فیروز بولا۔ "ایک کار میں پانچ خواتین کیسے جائیں گی۔"

"یہ مسئلہ تو ہے بھائی جان!" اعجاز بولا۔ "میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنی کار میں فرزانہ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

اسی وقت خالہ ذکیہ بول پڑیں۔ "میں بھی فرزانہ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"یہ مناسب رہے گا۔" فیروز نے تائید کی۔

اعجاز کے چہرے سے صاف ظاہر ہوگیا کہ وہ صرف فرزانہ کو لے جانا چاہتا تھا۔ خالہ ذکیہ کی موجودگی کی بات اسے گراں گزری تھی لیکن فیروز کے سامنے وہ لب کشائی کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

اس دوران میں فریال عیسیٰ اتنی بے تعلقی سے بیٹھی رہیں جیسے انہیں اس سے کوئی سروکار ہی نہ ہو کہ کون کس کے ساتھ جائے گا۔

لالہ عیسیٰ کی شاندار کوٹھی سے دو کاریں روانہ ہوگئیں۔ شاہانہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ جس کار میں بیٹھی، وہ وہی کار تھی جو کچھ دن سے آذر صاحب ہی کے گھر میں رہی تھی۔

"تم لوگ اسی کار میں آئی تھیں؟" شاہانہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" ایک سہیلی نے جواب دیا۔ "فرزانہ بتا رہی تھی کہ آج رات کو ولیمے میں آنے کے لیے بھی یہی کار استعمال کی جائے گی۔ اس کے بعد لالہ صاحب شاید یہ واپس منگوالیں گے۔"

شاہانہ سر ہلا کے رہ گئی۔ اس کا دماغ اور کئی الجھنوں کی بھی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ گزری ہوئی رات اس کے لیے سب سے بڑا معما تھی۔ فیروز نے نہ صرف اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرنا، دور کنار اسے ہاتھ لگانے سے بھی گریز کیا تھا۔ اس نے اسے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ گھر والوں کو اس بات کا علم نہ ہونے پائے۔ اتفاقاً اس کے منہ سے ایک جملہ زہرہ کے سامنے نکل گیا تھا۔ گو کہ اس مبہم جملے سے رات کے بارے میں کوئی بات آشکار نہیں ہوئی تھی لیکن زہرہ نے اس جملے میں وہی معنی دیکھ لیے تھے جس کا اظہار شاہانہ کو نہیں کرنا تھا۔ زہرہ یقیناً غیر معمولی طور پر ذہین تھی۔ شاہانہ کے جملے سے ہر ایک وہ مطلب اخذ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ چونک بھی گئی تھی۔ شاہانہ بات بنانے کے لیے کچھ کہتی مگر لالہ عیسیٰ کے آجانے کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

زہرہ نے اس پر ایک انکشاف یہ بھی کیا تھا کہ لالہ عیسیٰ اپنی بیوی سے دبے ہوئے نہیں تھے بلکہ انہوں نے گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لیے سمجھوتا کرلیا تھا لیکن اب وہ کوئی دھماکا کرسکتے تھے۔

وہ دھماکا کیا ہوتا؟

اس کی وضاحت بھی نہیں ہوسکی تھی۔

ان خیالات میں شاہانہ کی سب سے بڑی الجھن گزشتہ رات تھی۔ فیروز کے اس رویے سے ہٹ کر یہ بات بھی تھی کہ فیروز اس سے کوئی خاص گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن وہ دلہن

ہونے کے باعث بالکل خاموش رہی تھی اس لیے فیروز نے اس گفتگو کو اگلے دن تک کے لیے ٹال دیا تھا۔ اب شاید آج رات وہ اس بارے میں کوئی بات کرتا۔

کار کے سفر کے دوران میں یہی سب خیالات شاہانہ کے دماغ میں چکراتے رہے۔ اس کی سہیلیوں نے بھی اس سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کی کیونکہ انہیں شوفر کی موجودگی کا خیال ہوگا۔

گھر پہنچ کر آگے پیچھے دونوں کاریں رکیں۔ پچھلی کار سے فرزانہ اور خالہ ذکیہ اتریں۔

شاہانہ نے اعجاز کے کھلنڈرے مزاج کے باعث سمجھا تھا کہ اعجاز یہاں سے رکے گا اور ایک کپ چائے پینے کے لیے کہا جائے گا تو وہ انکار ہرگز نہیں کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بعد میں شاہانہ کو معلوم ہوا کہ راہ میں ہی اعجاز کے موبائل پر اس کی ماں کی کال آگئی تھی اور اس سے کہا گیا تھا کہ وہ فرزانہ اور خالہ کو چھوڑ کر وہاں ہرگز نہ رکے اور فوراً واپس آجائے۔

شاہانہ کو یہ اچھا بھی لگا کہ وہ وہاں نہیں رکا تھا۔ اس کے مزاج کے کھلنڈرے پن میں شاہانہ نے کچھ اور بھی محسوس کرلیا تھا۔ اس کی نگاہیں کچھ ٹھیک نہیں تھیں۔ وہ فرزانہ کو جس انداز میں دیکھ رہا تھا، وہ کوئی اچھا انداز نہیں تھا۔

گھر میں شاہانہ کی کچھ اور دوست بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان سب نے اسے گھیر لیا اور گزشتہ رات کے حوالے سے شاہانہ کو چھیڑنے لگیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ سب چلی گئیں تو شاہانہ نے تنہائی ملتے ہی موبائل پر عزیر سے رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو!" عزیر کی مردہ سی آواز آئی۔

"تم شادی میں نہیں آئے!" شاہانہ نے کہا مگر اس کے انداز میں شکایت نہیں تھی۔

"آیا تھا۔" عزیر کے جواب نے شاہانہ کو چونکا دیا۔

"کیوں خوامخواہ جھوٹ بول رہے ہو عزیر!" شاہانہ پژمردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم آئے ہوتے تو مجھ سے یہ بات چھپی نہیں رہتی۔"

"یقین کرو، میں آیا تھا۔ میرے سامنے تمہاری برات رخصت ہوئی تھی۔ میں تمہارے گھر سے کچھ فاصلے پر اس جگہ کھڑا رہا تھا جہاں ایک بڑا جنرل اسٹور ہے۔"

"وہاں کیوں کھڑے رہے؟ میں نے تو تم سے یہ کہا تھا کہ......"

عزیر نے اس کی بات کاٹی۔ "تم نے صرف شادی میں آنے کا وعدہ لیا تھا جو میں نے پورا کیا۔ تم نے شرکت کا وعدہ نہیں لیا تھا۔"

"اوہ!" شاہانہ کے منہ سے نکلا۔

"اور وہاں کھڑے کھڑے بھی مجھ پر کیا گزرتی رہی، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ جب تمہاری برات جارہی تھی تو میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔"

شاہانہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری کیا حالت ہوئی ہوگی لیکن کیا میرے بارے میں تم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے؟"

"خوب اندازہ ہے مجھے!"

"میں نے تم سے تین چار سال انتظار کرنے کی بات کی تھی لیکن اب کسی وجہ سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ شاید اتنا طویل انتظار نہ کرنا پڑے۔"

"یہ خیال کیوں؟" عزیر نے تیزی سے پوچھا۔

"زیادہ دیر گفتگو کرنا پڑے گی۔ میں کوشش کروں گی کہ ایک دو دن میں تم سے ملنے کی کوشش کروں۔ فون پر زیادہ دیر بات نہیں کی جاسکتی۔ ابھی تو میں کمرے میں اکیلی ہوں لیکن کسی وقت بھی کوئی آسکتا ہے۔..."

دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔

"لو، کوئی آہی گیا۔" شاہانہ جلدی سے بولی اور فون بند کرکے تکیے کے نیچے گھسیڑ دیا۔

آنے والی صرف سلطانہ بیگم ہی نہیں تھیں، ان کے ساتھ فرزانہ بھی تھی۔ سلطانہ بیگم نے بڑی محبت سے شاہانہ کو گلے لگایا۔

"خوش رہو۔ سدا خوش رہو میری بچی!" ان کی آواز رندھی ہوئی سی تھی۔

شاہانہ قطعی جذباتی نہیں ہوئی۔

"ذکیہ خالہ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"باورچی خانہ انہی پر چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"بڑا منا اور چھوٹا منا؟"

شاہانہ کے چھوٹے بھائیوں کے اصل نام گھر میں کوئی نہیں لیتا تھا۔ سب ہی ان کو بڑا منا اور چھوٹا منا کہتے تھے۔

سلطانہ بیگم نے منہ بنا کر کہا۔ "کھیل رہے ہوں گے کہیں...... کھیلنے ہی میں دل لگتا ہے ان کا۔ پڑھائی سے تو بھاگتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں تمہارے ابا جان سے کہ وہ انہیں کوئی ہنر ہی سکھوا دیں لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ بس یہ کہہ دیتے ہیں کہ مر کھپ کر کچھ تو پڑھ لیں گے۔"

اس دوران میں فرزانہ خاموش اور سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی رہی تھی۔ اس کا یہ انداز شاہانہ کے لیے کسی قدر نیا تھا۔ کسی قدر نیا اس لیے کہ اس میں یہ تبدیلی اس وقت سے آئی

تھی جب شاہانہ کی شادی کا معاملہ چلا تھا۔ اس سے پہلے وہ اتنی سنجیدہ نہیں رہتی تھی۔

سلطانہ بیگم کچھ باتیں کر کے چلی گئیں۔ فرزانہ وہیں بیٹھی رہی۔ شاہانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اتنی چپ چپ کیوں ہو تم میرے سامنے!''

''ایک بات سوچ رہی تھی۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ اتنا سوچ رہی ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کو شادی کی مبارک باد دوں یا عزیر بھائی کو فون کر کے ان سے ہمدردی کا اظہار کروں۔''

فرزانہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی شاہانہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

فرزانہ کہتی رہی۔ ''مجھے تو اس بات کا بہت افسوس ہے آپا کہ آپ نے ایک دولت مند گھرانے کی بہو بننے کے لیے عزیر بھائی کا دل توڑ دیا۔''

''فرزانہ!'' شاہانہ کو غصہ آ گیا۔ ''تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ میں اس شادی کے لیے کیوں تیار ہوئی ہوں؟ صرف تم لوگوں کی خاطر میں نے ابا جان کے کہنے پر یہ سولی اپنی گردن میں خود ڈالی ہے۔''

فرزانہ عجیب سے انداز میں ہنس دی۔

شاہانہ بولی۔ ''میں پہلی مرتبہ تمہارا یہ گستاخانہ انداز دیکھ رہی ہوں۔ میں نے ایسی کیا بات کہی تھی کہ تم ہنس دیں؟''

''آپی!'' فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو عزیر بھائی سے سچی محبت ہوتی تو آپ انکار کر سکتی تھیں۔ مجھے تو کسی سے محبت نہیں۔ ابا جان کا مسئلہ تو اس طرح بھی حل ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کے بجائے میری شادی کرا دیتے فیروز بھائی سے!''

جواب میں شاہانہ کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔ وہ غصے اور حیرت سے فرزانہ کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

فرزانہ ذرا سے توقف کے بعد پھر بولنے لگی۔ ''جن مردوں کو دوسری شادی کا شوق ہوتا ہے، وہ تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی دوسری بیوی بہت کم عمر ہو اور میں آپ سے کم عمر ہوں۔''

''فرزانہ!'' شاہانہ کا جسم غصے سے لرز گیا۔ ''اس سے پہلے کہ میں تمہارے منہ پر تھپڑ مار دوں، چلی جاؤ تم یہاں سے...... ان باتوں کے لیے مناسب وقت وہ تھا جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت تم امی سے بات کرتیں اس بارے میں۔''

''امی سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔'' فرزانہ نے بڑی بے باکی سے جواب دیا۔ ''پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ آپ انکار کر دیں گی لیکن پھر بات ہی پکی کر لی گئی، اس کے بعد میں کیا بات کرتی امی سے!''

''اچھا اب چلی ہی جاؤ تم میرے پاس سے!'' شاہانہ کو ڈر تھا کہ وہ فرزانہ پر ہاتھ چھوڑ بیٹھے گی۔

''جاتی ہوں۔'' فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو امیر گھرانے کی بہو بننا مبارک ہو۔ اگر آپ مجھے عزیر بھائی کا موبائل نمبر دے دیں تو میں ان سے ہمدردی کے دو بول تو......''

''فرزانہ!'' شاہانہ غصے سے ہانپنے لگی۔ ''میں کہتی ہوں کہ بس چلی جاؤ اب۔''

فرزانہ سر جھٹک کر اٹھی اور تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی شاہانہ بستر پر گری اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ فرزانہ کی باتوں نے اسے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس بہن کے مستقبل کی خاطر اس نے اپنی محبت قربان کی تھی، وہ بہن اس سے اس انداز میں بات کرے گی اور یہ سمجھے گی کہ اس نے صرف دولت کی خاطر فیروز سے شادی کی تھی۔

☆☆☆

چار بجے شاہانہ ''فیروز ولا'' چلی گئی۔ لالہ عیسیٰ نے اپنی کوٹھی کا نام بیٹے کے نام پر رکھا تھا۔

ولیمہ ظاہر ہے کہ رات کو ہوتا لیکن قریبی عزیزوں کے خاندان کی عورتیں دوپہر کے بعد سے ہی آنے لگی تھیں۔ کوٹھی میں خاصی چہل پہل ہو گئی تھی۔ شاہانہ کو موقع نہیں مل سکا کہ وہ تنہائی میں زہرہ سے بات کر سکتی۔ اس نے محسوس کیا کہ زہرہ بھی اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی تھی۔ اسے غالباً شاہانہ کے ایک جملے ہی کی وجہ سے کرید لگی ہوئی ہوگی۔

ولیمہ رات کو ایک شاندار میرج ہال میں تھا۔ لالہ عیسیٰ کے وسیع تعلقات کے باعث مہمانوں کی بہتات تھی۔ مہمانوں میں شاہانہ کے والد، والدہ، بہن اور چھوٹے بھائیوں کے علاوہ بھی کچھ عزیز شامل تھے۔

اس وقت شاہانہ کا ماتھا ٹھنکا جب اس نے اعجاز اور فرزانہ کو کسی جگہ کھڑے بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتے دیکھا۔ فرزانہ جس قسم کی باتیں کر چکی تھی، ان کی وجہ سے شاہانہ کا ماتھا ٹھنکنا ہی چاہیے تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ فرزانہ کے دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ وہ کسی دولت مند

گھرانے کی بہو بنے۔

شاہانہ کے لیے خوشی کی بات ہوتی کہ اس کی چھوٹی بہن کسی بڑے گھرانے میں بیاہی جائے لیکن اسے شک تھا کہ اعجاز اسے اپنی زندگی کی رفیق نہیں بنا سکے گا۔ اس کی ماں فریال عیسیٰ اس کے راستے کی رکاوٹ بنتیں۔ شاہانہ کو تو انہوں نے اس لیے قبول کیا تھا کہ وہ پوتا پوتی کی خواہش مند تھیں اور اپنی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے صرف شاہانہ کو قبول کیا تھا۔ اس کے دوسرے عزیزوں سے وہ اچھے تعلقات نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ ان میں تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی روز صبح شاہانہ دیکھ چکی تھی کہ جو خواتین اسے لینے آئی تھیں، ان کے سامنے فریال عیسیٰ کا انداز ایسا رہا تھا جیسے وہ ان لوگوں کو طوعاً وکرہاً قبول کررہی ہوں اور یہ بھی شروع شروع کی بات تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تکبر نمایاں ہوتا چلا جاتا۔ وہ شاہانہ کے عزیزوں سے حقارت سے پیش آتیں۔ ایسی صورت میں اعجاز سے فرزانہ کی بے تکلفی شادی پر تو منتج نہ ہوتی لیکن کوئی اور گل کھل سکتا تھا جو خصوصاً اس کے والدین کے لیے بدنامی کا سبب بنتا۔

شاہانہ ٹہلتے ہوئے اپنی ماں کے قریب گئی۔ آذر صاحب اس وقت لالہ عیسیٰ سے باتیں کررہے تھے۔

''امی!'' شاہانہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''فرزانہ کو اپنے ساتھ رکھیے!''

''میں دیکھ چکی ہوں۔'' سلطانہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ابھی اسے پکارنے ہی والی تھی۔''

''اب فوری طور پر ایسا نہ کیجیے گا۔ ابھی اس نے دیکھا ہے کہ میں آپ کے قریب آئی ہوں، وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے آپ سے کچھ کہا ہے۔''

''تو سمجھ جائے...... بڑی ہو تم اس کی...... اس کا خیال رکھنا تمہارا بھی فرض ہے۔''

''کوئی وجہ ہے جو میں آپ کو فوری طور پر کچھ کرنے سے روک رہی ہوں۔''

''کیا وجہ ہے؟''

''کسی وقت اطمینان سے بتاؤں گی۔ فیروز مجھے کچھ اشارہ کررہے ہیں، کچھ دوست اور ان کی بیویاں بھی ہیں ان کے ساتھ! وہ مجھے ان سے ملانا چاہتے ہوں گے۔''

شاہانہ نے ماں کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور فیروز کی طرف بڑھ گئی۔ ولیمے کے اختتام پر سب لوگ گھر لوٹے تو اس رات بھی سب تھکے ہوئے تھے۔

کمرے میں فیروز نے شاہانہ سے کہا۔ ''کل میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا مگر تم کچھ بول ہی نہیں رہی تھیں۔ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں شاہانہ......! ہمارے آئندہ تعلقات کا انحصار ہے ان باتوں پر!''

''ایسی کوئی اہم بات ہے تو کیجیے۔'' شاہانہ اب چاہتی تھی کہ معاملات اس پر آشکارا ہوں۔

''بس دو ایک سوال کرنا ہیں تم سے!'' فیروز نے کہا۔ ''کیا تم مجھ سے شادی کے لیے یوں تیار ہوگئیں کہ میں ایک بہت مال دار باپ کا بیٹا ہوں؟''

شاہانہ فوراً جواب نہیں دے سکی۔

''جواب دو شاہانہ!'' فیروز کچھ توقف سے بولا۔

''نہیں۔'' شاہانہ نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر کیوں کی؟ لڑکیاں عموماً کسی ایسے شخص سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں جس کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہو۔''

''میں نے صرف اپنے باپ کی خواہش کا احترام کیا ہے۔'' شاہانہ کی نظریں جھکی رہیں۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔''

''میں بالکل جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔''

''تمہارے والد کی یہ خواہش کیوں تھی، اس کا اندازہ میں لگا سکتا ہوں۔ آج کے دور نے انسان کو شدید مالی پریشانیوں سے دوچار کر رکھا ہے۔ انسان جو کچھ نہیں کرنا چاہتا، وہ بھی کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یقین کرو کہ اس بات سے میرے دل میں تمہارے والد کا احترام کم نہیں ہوا ہے۔ بہرحال ان کا مقصد پورا ہوجائے گا۔ ڈیڈی مجھے بتا چکے ہیں کہ وہ تمہارے والد کو اپنی انڈسٹری کے کسی بڑے منصب پر بٹھا دیں گے۔ ان کی تنخواہ دوگنی ہوجائے گی بلکہ تین گنا سمجھو۔ میرے ڈیڈی بہت اچھے انسان ہیں شاہانہ! ایک دردمند دل ہے ان کے پہلو میں! وہ چند دن پہلے ہی یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ اپنی انڈسٹری میں کام کرنے والے ہر فرد کی تنخواہ پچاس فیصد بڑھا دیں گے۔ انہیں شدت سے احساس ہے اس دور کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی کے مطالبے سے پہلے ہی وہ خود یہ قدم اٹھائیں...... خیر! میں دوسری باتوں میں چلا گیا۔ اب میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا تم کسی کو پسند کرتی تھیں؟ کیا مجھ سے شادی کرکے تم نے اپنی محبت قربان کی ہے؟''

شاہانہ سکتے کی حالت میں رہ گئی۔ وہ سوال ایسا نہیں تھا کہ اس کا جواب آسانی سے دیا جاسکتا۔

''شاید میں......'' فیروز بولتا رہا۔ ''مجھے غلط نہ سمجھ رہی ہو...... میں اپنی بات کس طرح کہوں...... شاید یوں کہا جاسکتا ہے کہ میں نے ایک بہت آسان سا سوال کرڈالا۔ ممکن ہے کہ میرے یہ الفاظ بھی غلط ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ میرا مقصد تم پر واضح ہوگیا ہوگا۔ مجھے تم سے جو کچھ معلوم کرنا تھا، ان میں یہ سوال تھا ہی نہیں۔ یہ غیر ارادی طور سے میری زبان پر آگیا۔ پہلے سوال کا اثبات میں جواب نہیں دیا جاسکتا۔ صحت مند شخص اگر بولنا نہ چاہو اور ایسے موقعوں پر منفی جواب...... میرے ایک خیال یہ بھی رہتا ہے کہ شاید اس کے سچ پر یقین نہ کیا جائے اس لیے بہتر ہوگا کہ میں تمہیں اس امتحان میں نہ ڈالوں۔''

شاہانہ نے سکون محسوس کیا۔ اس سوال نے اسے شدید ذہنی دباؤ میں ڈال دیا تھا جس سے فیروز نے ہی اسے نجات دلائی۔

فیروز پھر بولا۔ ''ابھی تم نے کہا تھا کہ یہ شادی تم نے صرف اپنے والد کی خواہش کے احترام میں کی تھی۔ میں نے اس پر یقین کرلیا ہے۔ اب تھوڑی سی وضاحت اور کردو۔ میری بیوی نہ ہوتی تو بھی تم مجھ سے صرف اسی لیے شادی کرتیں کہ تمہیں اپنے والد کی خواہش کا احترام کرنا تھا؟''

''جی!''

''اور اگر میری عمر اتنی زیادہ نہ ہوتی تو بھی؟''

''جی۔''

''تمہارے ان جوابات نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ تم کسی سے محبت کرتی ہو لیکن میں اس موضوع پر تم سے زیادہ بات نہیں کروں گا۔ مجھے یہ اصرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس سوال کا جواب دو۔ تم مجھے اپنے کسی راز میں شریک کرو یا نہ کرو، میں تمہیں ایک معاملے میں اپنا رازدار بنانا چاہتا ہوں۔''

شاہانہ کے دل کی دھڑکنیں خفیف سی تیز ہوگئیں۔ وہ قیاس بھی نہیں کرسکتی تھی کہ فیروز اسے اپنے کس راز میں شریک کرنا چاہتا ہے۔

فیروز ٹہلنے لگا۔ وہ بہت سنجیدہ اور سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی بات کہاں سے شروع کرے! اچانک وہ شاہانہ کے سامنے رکا اور بولا۔ ''میری بیوی زہرہ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''وہ بہت اچھی ہیں، خوش مزاج ہیں۔''

''وہ میری محبت ہے شاہانہ! اس سے میری شادی محبت کا نتیجہ تھی اور میں آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا۔'' فیروز جذباتی نظر آنے لگا۔ ''میں اسے یہ کرب دے ہی نہیں سکتا کہ اس کی آنکھیں میری دوسری شادی ہوتے ہوئے دیکھیں۔ تم سے میری شادی صرف ممی کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ میں تو اس دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا لیکن زہرہ نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں گھر کی فضا خراب کرنے میں فریق نہ بنوں اور دوسری شادی کرلوں۔ میں نے اس کی بات صرف ایک شرط پر مانی تھی کہ میری دوسری بیوی بھی ممی کی یہ خواہش پوری نہیں کرے گی کہ ممی کا پوتے پوتیوں کا شوق پورا ہوجائے۔ اس پر وہ چونک گئی۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے، تب میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی دوسری بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم ہی نہیں کروں گا اور تم کل دیکھ چکی ہو کہ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ میں تم سے دور ہی رہوں گا۔ جب دو تین سال گزر جائیں گے تو ممی تم سے بھی اکتانے لگیں گی۔ اس وقت شاید وہ میری تیسری شادی کے بارے میں سوچیں۔ زہرہ کا کہنا ہے کہ جب میں نے یہ پالیسی اپنانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں تیسری شادی کے لیے بھی تیار نہ ہوجاؤں۔ ایسی صورت حال پیش آنے پر تم مجھ سے طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہو۔ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ممی کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ وہ تو اس پر بھی تیار رہتی ہیں کہ زہرہ نے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا۔ بہرحال اس طرح تمہیں اس بندھن سے نجات مل جائے گی اور ابھی تمہاری عمر اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تم سے کوئی شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اگر تم کسی سے محبت کرتی ہو اور وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ دو تین سال انتظار کرے۔ اس کے بعد وہی تمہارا ہوگا اور تم اس کی!''

فیروز کی ان باتوں نے شاہانہ کو اتنا جذباتی کردیا کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ بہت عظیم انسان ہیں۔''

فیروز ہنسا۔ ''عظیم نہیں، میں صرف انسان ہوں اور انسان بھی ایسا جو کسی سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔ میں زہرہ کی زبان پر یہ فقرہ برداشت نہیں کرسکتا کہ میں بے وفا ہوں۔ خیر! ان سب باتوں کا مقصد یہ تھا کہ اب تم میرے رویے کی وجہ سے ذہنی انتشار میں مبتلا نہ رہو۔ اب تمہیں علم ہوچکا ہے کہ میں تمہارے قریب کیوں نہیں آیا اور نہ آئندہ آؤں گا۔ تم سکون سے وقت گزارو۔ بس کسی پر ظاہر نہ ہو کہ ہمارے مابین ایسی کوئی بات طے ہے۔''

شاہانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آج دن میں میری زبان سے ایک ایسا جملہ نکل گیا تھا کہ زہرہ چونک گئی تھیں۔''

شاہانہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فیروز مسکراتے ہوئے بول پڑا۔ ”ہاں زہرہ مجھے بتا چکی ہے۔ تمہیں محتاط رہنا ہوگا شاہانہ! میں نے تمہیں کل ہی سمجھا دیا تھا۔ اب پھر سمجھا رہا ہوں کہ کسی کے سامنے بھی ایسی کوئی بات تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے جس سے کسی کو ذرا بھی شبہ ہو۔ زہرہ بھی تمہیں یہی سمجھائی کہ تم آئندہ خیال رکھو۔“

”میں اب بہت محتاط رہوں گی۔“ شاہانہ خوش تھی۔ ”لیکن آج آپ صوفے پر نہیں سوئیں گے۔ میں اپنا بستر فرش پر لگا لیتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ فیروز نے کہا۔ ”اب تم کمرے میں اکیلی ہی رہا کرو گی۔ میں اب زہرہ کے پاس جا رہا ہوں۔“ وہ ایک الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آئندہ بھی ایسا ہی ہوا کرے گا۔ میں گھر والوں کو دکھانے کے لیے ابتدائی رات میں تو یہیں آیا کروں گا لیکن جب گھر میں سناٹا چھا جایا کرے گا تو میں یہاں سے زہرہ کے پاس چلا جایا کروں گا۔“

فیروز نے الماری کھولی۔ شاہانہ کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ فیروز وہاں سے کیا نکالے گا۔ شاہانہ نے اب تک وہ الماری کھول کر نہیں دیکھی تھی۔ اسے کچھ بھی علم نہیں تھا کہ اس کمرے میں کہاں کیا رکھا تھا۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے دیکھا کہ فیروز نے الماری سے شراب کی دو بوتلیں نکال کر الماری بند کی تھی۔

شاہانہ کے تاثرات دیکھ کر فیروز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اگر تم اسے برائی سمجھو تو میں اعتراف کرلوں گا کہ مجھ میں یہ ایک برائی تو بہر حال ہے۔ زہرہ بھی جانتی ہے کہ اگر میں رات کو شراب نہ پیوں تو مجھے نیند نہیں آتی۔ یقین کرو، کل رات میں صوفے پر لیٹ تو گیا تھا لیکن مجھے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ اگر آج کی طرح کل ہی تم سے یہ سب باتیں ہو جاتیں تو میں بوتلیں لے کر کل رات بھی زہرہ کے پاس چلا جاتا۔ ممی نے زہرہ کو دوسرا کمرا دے دیا تھا اور مجھے یہاں سے شراب منتقل کرنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ ابھی اس الماری میں چند بوتلیں اور رکھی ہیں۔ میں روزانہ دو دو ایک ایک کر کے سب بوتلیں یہاں سے لے جاؤں گا۔“

شاہانہ نے نظریں جھکا لیں۔ فیروز سے ایک اعتبار سے ”قطع تعلق“ ہو جانے کے باوجود اسے یہ اچھا نہیں لگا تھا کہ فیروز جیسا اچھا انسان شراب پیتا تھا لیکن پھر اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، وہاں اسی انداز میں سوچا جا سکتا ہے ورنہ زیادہ تر مال دار گھرانوں کے ماڈرن افراد اب شراب نوشی کو برا نہیں سمجھتے۔

”یہاں ابھی میری کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔“ فیروز نے کہا۔ ”میں وقتاً فوقتاً لے جاتا رہوں گا لیکن اس سے تمہاری نیند میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر مجھے رات کے وقت بھی ضرورت پڑے گی تو میں آکر لے جاؤں گا۔ کمرے کی چابی ہے میرے پاس! ابھی جاتے جاتے میں کمرے کا پش بٹن دبا کر دروازہ لاک کرتا جاؤں گا۔ ابھی تم کمرا اندر سے بولٹ مت کرنا۔ جب میں یہاں سے اپنی سب چیزیں لے جاؤں گا تو تمہیں بتا دوں گا۔ اس کے بعد تم کمرا بولٹ بھی کرسکتی ہو، لیکن اس میں تمہیں ایک دشواری ہو جائے گی۔ صبح میں بہت جلدی زہرہ کے کمرے سے یہاں آیا کروں گا تاکہ جب گھر کے لوگ اٹھیں تو مجھے یہیں سے نکلتے دیکھیں۔ تمہیں میری وجہ سے اپنی نیند خراب کر کے بولٹ کھولنا پڑے گا۔“

شاہانہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس وقت کوٹھی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ سب ہی لوگ گہری نیند سو چکے ہوں گے۔ فیروز بڑے اطمینان سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پش بٹن دبا کر دروازہ لاک کر گیا۔

شاہانہ ایک طویل سانس لے کر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی عزیر کو فون کر کے ساری بات بتائے لیکن اس طرح وہ عزیر کے تاثرات سے بے خبر رہ جاتی۔

تھکن کی وجہ سے جلد ہی اسے نیند آگئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ہڑبڑاہٹ کے عالم میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے فرش پر کھڑے ہوئے فیروز کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ شراب کی ہلکی سی بو بھی آرہی تھی۔ شاہانہ بوکھلا کر اٹھی تو فیروز جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”معاف کرنا شاہانہ!“ وہ بولا۔ ”دراصل میں اپنی ایک انگشتری تلاش کر رہا تھا۔ رات کو وہ میں عموماً تکیے کے نیچے رکھ دیا کرتا تھا۔ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ سرکایا تو تمہاری آنکھ کھل گئی۔“

شاہانہ کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور کچھ ایسے خیالات اس کے دماغ میں چکرانے لگے جو خوش گوار ہرگز نہیں تھے۔

”اب تم اٹھ ہی گئی ہو تو ذرا تکیہ اٹھا کر دیکھو!“ فیروز نے کہا۔

شاہانہ نے تکیہ اٹھایا۔ وہاں ایک انگشتری موجود تھی۔

شاہانہ کے دماغ میں خیال آیا، ہوسکتا ہے وہ انگشتری فیروز نے ابھی تکیے کے نیچے رکھی ہو...... مگر کیوں؟ مقصد؟

شاہانہ کا دماغ کوئی جواب نہیں سوچ سکا۔

”شکریہ۔“ شاہانہ سے انگشتری لیتے وقت فیروز اس طرح مسکرایا جیسے خوش ہو گیا ہو۔ ”دراصل انگشتری پہنے پہنے سونے میں مجھے الجھن ہوتی ہے اس لیے تکیے کے نیچے رکھ دیتا ہوں۔ اس شادی کی وجہ سے میرا دماغ اتنا منتشر رہا تھا کہ میں یہ پہننا بھول ہی گیا۔ دراصل یہ زہرہ سے میری منگنی کی انگشتری ہے اس لیے مجھے بہت عزیز ہے۔ خیر! اب تم سو جاؤ۔ ابھی صرف چھ ہی بجے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ صبح جلدی یہاں آجایا کروں گا۔ ابھی تم ڈیڑھ گھنٹے تو سو ہی سکتی ہو۔ ناشتے کی میز پر ساڑھے آٹھ بجے پہنچنا ہوتا ہے۔“

”جی۔“ شاہانہ دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ اتنا ہی کہہ سکی۔

فیروز باتھ روم میں چلا گیا۔

شاہانہ آہستگی سے دوبارہ لیٹ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ابھی تک قابو میں نہیں آئی تھیں۔ جو واقعہ ہو چکا تھا، اس کے اثرات اس کے دماغ پر گہرے تھے۔ فیروز نے انگشتری کی جو بات کہی تھی، وہ درست بھی ہوسکتی تھی لیکن اس واقعے کی وجہ سے وہ ایک اور انداز میں سوچنے پر بھی مجبور ہو گئی۔ اس کے دماغ میں یہ خدشہ کسمسانے لگا تھا کہ فیروز کسی وقت نشے میں بھول بھی سکتا تھا کہ اس نے شاہانہ سے کیا وعدہ کیا تھا یا اس بارے میں کیا سوچا تھا۔

شاہانہ خوب صورت تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ جسمانی طور پر بھی پرکشش تھی۔ نشے میں ڈوبا ہوا انسان اسے دیکھ کر کسی وقت بہک بھی سکتا تھا۔

ان خیالات کے باوجود شاہانہ تھوڑی سی اونگھ گئی کیونکہ وہ واقعہ بھی اسے نیند کے غلبے سے پوری طرح باہر نہیں لا سکا تھا۔

لیکن اونگھتے اونگھتے ہی میں کسی خیال نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ فیروز پوری طرح تیار تھا اور ایک صوفے پر بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا جو اس نے کسی ملازم سے منگوائی ہوگی۔

شاہانہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے سات بجنے والے تھے۔ شاہانہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ یہ اسے عجیب سا لگا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک اونگھتی رہی تھی۔

”اچھا ہوا تم جاگ گئیں۔“ فیروز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں آواز دے کر جگاؤں۔ اب غسل وغیرہ کر کے تیار ہو جاؤ۔ آج ناشتے کی میز پر پہنچنے میں سیکنڈز کی بھی دیر نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔

شاہانہ پر نیند کا غلبہ اب بھی تھا لیکن وہ بستر سے اٹھ گئی۔

مکمل طور سے تیار ہونے میں اسے پون گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔

”ابھی پندرہ منٹ ہیں۔“ فیروز نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”آؤ بیٹھو......! ہم دو منٹ پہلے بھی کمرے سے نکلیں گے تو وقت پر ڈائننگ روم میں ہوں گے۔“

شاہانہ اس کے سامنے جا بیٹھی۔

”تمہارے لیے چائے منگواؤں؟“ فیروز نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ میں ناشتے پر ہی پیوں گی۔“

”میں تو اس وقت ایک کپ ضرور پیتا ہوں۔“ فیروز نے کہا۔ ”منہ میں شراب کا جو ذائقہ ہوتا ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے۔“

”جی۔“ شاہانہ نے کہا، پھر بولی۔ ”آپ کے گھر میں شادی کے بعد کے رسم و رواج تو ہوئے نہیں۔ اگر آج میں کہیں جانا چاہوں تو جا سکتی ہوں؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ ڈیڈی نے تمہیں منہ دکھائی میں کار تو دے ہی دی ہے، گھر میں ایک اضافی شوفر بھی ہے۔ اسے لے لینا۔ بس ممی کو بتائے بغیر کہیں نہیں جانا۔“

”اگر میں شوفر کو ساتھ نہ لوں تو کوئی حرج ہے؟“

”ڈرائیونگ جانتی ہو؟“

”کالج کے زمانے میں سیکھ لی تھی۔“

”ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے؟“

”وہ تو نہیں ہے۔“

”تو بنوا لو! کوئی تصویر ہے اپنی تمہارے پاس؟“

”کئی ہیں۔“ شاہانہ نے جواب دیا۔ ”گھر سے جو سامان لائی تھی، اس میں ہوں گی۔“

”وہ نکال لینا ابھی کسی وقت! میں دفتر کے کسی آدمی کو فون کر دیتا ہوں۔ لائسنس کل تک بن کر گھر ہی آجائے گا۔ تمہیں اس کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”آپ دفتر کس وقت جاتے ہیں؟“

”آج تک کی تو چھٹی ہی کرلی ہے۔ کل سے جانا شروع کروں گا۔ دس بجے تک روانہ ہوتا ہوں، لیکن ڈیڈی نو بجے ہی نکل جاتے ہیں۔“

''اگر آج آپ گھر پر ہیں تو میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ ممی کو ضرور خیال آئے گا کہ آپ کے ہوتے ہوئے بھی میں گھر سے کہیں جانا چاہتی ہوں۔''

''اگر کہیں جانا ضروری ہے تو میں لے چلتا ہوں۔''

''نہیں کچھ ایسا ضروری بھی نہیں ہے، ایک بہت قریبی دوست ہے میری! اس سے ملنے جاتی۔ اب کل ہی چلی جاؤں گی۔''

''قریبی دوست؟'' فیروز نے اسے غور سے دیکھا۔

شاہانہ کے دل میں چور تھا اس لیے وہ نظریں چراتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ''جی! لیکن خیر! کل ڈرائیونگ لائسنس بھی بن کر آجائے گا۔''

''ہاں وہ تو آجائے گا۔ اچھا یہ بتاؤ! تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''شادی کے بعد جو صورت حال تمہارے سامنے آئی ہے، اس کے بارے میں شاید کوئی لڑکی تصور بھی نہیں کرسکتی۔''

''جی۔'' شاہانہ خفیف سا مسکرائی۔ ''میں خود کو کسی کہانی کا کردار محسوس کرنے لگی ہوں۔''

فیروز دھیرے سے ہنسا۔ ''رات کو زہرہ سے تمہارے متعلق خاصی باتیں ہوتی رہی تھیں۔''

''کوئی خاص بات؟''

''نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں بس ادھر ادھر کی۔ وہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس صورت حال نے تمہیں ششدر کردیا ہوگا۔ اچھا خیر! اب اٹھو۔ ناشتے کے لیے چلو۔''

فیروز کے ساتھ ہی شاہانہ بھی اٹھ گئی۔

☆☆☆

گیارہ بجے تھے جب شاہانہ زہرہ کے کمرے میں تھی۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔'' شاہانہ کہہ رہی تھی۔ ''ممی کا اتنا دباؤ کیوں ہے گھر کے لوگوں پر؟''

زہرہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''جب میں شادی ہوکر اس گھر میں آئی تھی تو یہ میرے لیے بھی ایک معما تھا۔ مجھے فیروز نے ہی اس بارے میں بتایا۔ دراصل ڈیڈی شروع سے اتنے بڑے انڈسٹریلسٹ نہیں تھے لیکن ممی کے والد کی انڈسٹری بہت بڑی تھی۔ ان کا انتقال شادی کے فوراً بعد ہی ہوگیا تھا۔ ان کا سب کچھ ممی کے حصے میں آیا۔ ان کا کوئی اور بھائی بہن نہیں۔ اس طرح ڈیڈی ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ بن گئے۔ ممی کو اسی کا زعم ہے۔ اسی کے بل بوتے پر انہوں نے شروع ہی سے ڈیڈی پر چھا جانے کی کوشش کی۔ ڈیڈی کیونکہ صلح پسند ہیں اس لیے وہ ہر بات نظر انداز کرتے رہے لیکن بعد میں یہ ہوا کہ ان کے بچوں پر بھی اس کا نفسیاتی اثر پڑا۔ فیروز کے بڑے بھائی تو ان سے بہت ہی ڈرنے لگے تھے۔''

شاہانہ چونکی۔ ''فیروز کے کوئی بڑے بھائی بھی ہیں؟''

''اب نہیں ہیں۔ انتقال ہوچکا ہے ان کا۔''

''کب؟''

''کئی سال ہوگئے۔ اس وقت تو میری بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اخباروں میں رپورٹس چھپی تھیں۔ دراصل کچھ جرائم پیشہ افراد نے انہیں اغوا کرلیا تھا۔ تاوان میں ایک بہت بڑی رقم مانگی تھی۔ خیر وہ بڑی رقم بھی دے دی جاتی لیکن کسی وجہ سے ان لوگوں کو شبہ ہوگیا کہ پولیس سے رابطہ کرلیا گیا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے فیروز کے بڑے بھائی شہباز کو قتل کردیا تھا۔ لاش ایک سڑک پر پھینک دی تھی۔''

''یہ تو بہت بڑا صدمہ گزر چکا ہے اس گھر پر!''

''ہاں، لیکن اب تو بات بہت پرانی ہوچکی ہے۔ دس سال گزر چکے ہیں اور وقت کی گرد سب صدموں کو دبا دیتی ہے۔''

''ان لوگوں کا پتا نہیں چلا تھا؟''

''نہیں۔''

''اعجاز تو اس وقت خاصا چھوٹا ہوگا۔''

''بہت زیادہ چھوٹا بھی نہیں۔ ہاں بس لڑکا سا تھا۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ممی سے کچھ زیادہ نہیں ڈرتا۔''

''ہاں، زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے کچھ سرکش ہوگیا ہے لیکن آج ممی نے اسے بہت جھاڑ پھٹکار دیا ہے۔''

''کیوں؟''

زہرہ فوراً کچھ نہیں بولی۔ وہ کسی سوچ میں پڑ گئی تھی۔

شاہانہ بولی۔ ''اگر تم وجہ نہ بتانا چاہو تو میں اصرار نہیں کروں گی۔''

''نہیں، دراصل میں سوچنے لگی تھی، کہیں تم برا نہ مان جاؤ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں بے خبر نہ رکھوں۔''

شاہانہ کو کچھ شبہ ہوا لیکن وہ خاموشی سے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''دراصل۔'' زہرہ نے قدرے تذبذب سے کہا۔ ''اعجاز لاڈ پیار سے کچھ سرکش ہی نہیں ہوا بلکہ اس کا اثر اس کے کردار پر بھی پڑا ہے۔ کل صبح جب تمہارے گھر والے تمہیں لینے آئے تھے، اس وقت بھی وہ تمہاری بہن کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ بعد میں اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اپنی کار میں صرف فرزانہ کو ہی تمہارے گھر پہنچائے۔ پھر کل رات ولیمے میں بھی اس کی کوشش رہی کہ وہ فرزانہ کے قریب رہنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کرے۔''

شاہانہ نے وہ سب کچھ بڑے سکون سے سنا۔ وہ اس کے لیے کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔

زہرہ نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم فرزانہ کو اس معاملے میں سمجھا دو۔''

''میں نے خود یہ بات محسوس کرلی تھی زہرہ! میں امی سے بھی کہہ چکی ہوں کہ وہ فرزانہ کا خیال رکھیں۔ تم تو مجھے یہ بتاؤ کہ ممی نے اعجاز کو کس بات پر ڈانٹا؟''

''اسی بات پر!'' زہرہ نے جواب دیا۔ ''انہوں نے بھی اعجاز اور فرزانہ کی بات محسوس کرلی تھی۔''

''تو انہوں نے اعجاز سے کہا کیا؟''

''وہ نہ پوچھو۔ اتنا تو میں نے بتا دیا نا کہ اعجاز کو ڈانٹ پڑی تھی۔''

''یہ کہہ کر تم نے میرا تجسس اور بڑھا دیا ہے کہ میں تم سے اس معاملے کی تفصیل نہ پوچھوں۔''

''دراصل جھوٹ بولنا مجھے پسند نہیں اور سچ سن کر تمہیں دکھ ہوگا۔''

''اب تم نے میرا تجسس اور بڑھا دیا۔ پلیز! مجھے بتاؤ زہرہ! دکھ ہوتا ہے تو ہو، مجھے تم سے گلہ نہیں ہوگا۔''

زہرہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''دراصل تم سے فیروز کی شادی انہوں نے مجبوراً کی ہے۔ ان کے اپنے طبقے کی کوئی لڑکی تو کسی ایسے شخص سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی جس کی ایک شادی پہلے ہی ہوچکی ہو۔ دراصل ممی بہت مغرور خاتون ہیں۔ آہستہ آہستہ تو وہ یہ کوشش بھی کریں گی کہ تمہارے والدین بھی یہاں کم سے کم آئیں۔ فرزانہ سے اعجاز کی بے تکلفی انہوں نے اسی لیے پسند نہیں کی۔ اس پر جب انہوں نے اعجاز کو ڈانٹا تو وہ کہنے لگا کہ فرزانہ اس کی بھابی کی بہن ہے جو اس گھر میں آتی جاتی تو رہے گی لہٰذا اس سے باتیں بھی ہوں گی۔ اس پر ممی نے کہا کہ وہ فرزانہ کی آمد کو روکنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں گی۔ اس بات پر اعجاز نے سرکشی دکھائی اور کہہ بیٹھا کہ پھر وہ فرزانہ سے کہیں باہر مل لیا کرے گا کیونکہ وہ اسے اپنی دوست بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس پر ممی نے اسے اور زیادہ ڈانٹا تو وہ چپ ہوگیا لیکن میرا خیال ہے، وہ مصمم ارادہ کرچکا ہے کہ فرزانہ سے کہیں نہ کہیں ملاقات کرتا رہے گا۔ اب یہ تمہارا کام ہے شاہانہ کہ تم فرزانہ کو روکنے کی کوشش کرو۔ وہ اس گھر کی بہو تو ہرگز نہیں بن سکے گی اور یہ میل ملاپ اس کے لیے مناسب نہیں رہے گا۔''

''مجھے خوب اندازہ ہوچکا ہے۔'' شاہانہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی والدہ کو اور زیادہ سمجھا دوں گی۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دکھ نہیں ہوا زہرہ! میں خود بھی ممی کا مزاج سمجھ چکی ہوں اور کل دیکھ بھی لیا ہے کہ میرے گھر والوں کے ساتھ ممی کا رویہ تحقیر آمیز تو نہیں تھا لیکن ان کی سرد مہری سے اندازہ تو میں لگا چکی ہوں کہ آئندہ ان کا انداز کیا ہوسکتا ہے۔''

''اب تمہیں کوشش یہ کرنا ہوگی کہ اعجاز اپنی چکنی چپڑی باتوں سے فرزانہ کو شیشے میں نہ اتار سکے اور وہ دونوں گھر کے باہر ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔''

''میں نے امی سے کہہ تو دیا ہے لیکن اگر موقع ملا تو ان سے فون پر ایک بار پھر بات کروں گی۔''

اسی دن دوپہر کے کھانے کے بعد جب سب لوگ ادھر ادھر ہوچکے تھے، شاہانہ نے موبائل فون پر سلطانہ بیگم سے رابطہ کرکے انہیں ساری بات بتادی۔

''ہاں۔'' سلطانہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ اندازہ تو مجھے بھی ہوچکا ہے کہ فریال عینی بہت مغرور ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ ٹھیک نہیں رہے گا۔''

شاہانہ نے ان سے بات کرنے کے بعد عزیر سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ آج اس سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آسکے گی۔

بات کرنے کے بعد وہ کمرے میں لیٹی تمام حالات پر غور کرتی رہی۔ فیروز گھر میں ہی کہیں تھا لیکن اس وقت کمرے میں نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے شاہانہ کو خیال آیا کہ وہ زہرہ سے اس دھماکے کے بارے میں پوچھنا بھول گئی تھی جو زہرہ ہی کے بہ قول لالہ عیسیٰ کرنے والے تھے۔ بھول جانے کا سبب یہ تھا کہ اس کا دماغ فرزانہ اور اعجاز کے معاملے میں الجھا رہ گیا تھا۔

پھر اس روز کسی وقت بھی اس سے زہرہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

دوسرے دن وہ فریال عینی سے اجازت لے کر گھر

سے روانہ ہوئی۔ بہانہ اس نے اپنے گھر جانے ہی کا کیا تھا اور وہ گھر جانا بھی چاہتی تھی لیکن پہلے اسے عزیر سے ملنا تھا۔

روانگی سے ذرا ہی دیر پہلے اس کا ڈرائیونگ لائسنس بن کر آگیا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ جس ملک میں سب کام صرف تعلقات یا پیسے کے بل بوتے پر گھر بیٹھے ہو جائیں، اس ملک کی بنیادیں کب تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔

وہ اپنی نئی کار میں گھر سے روانہ ہوئی تھی جو اسے لالہ عیسیٰ نے منہ دکھائی میں دی تھی۔ اس سے پہلے شاہانہ نے اپنی کالج کی کئی دوستوں کی کاریں چلائی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ "اپنی" کار چلا رہی تھی لیکن "حقِ ملکیت" کا احساس اس کے لیے ذرا بھی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ دولت کی متمنی کبھی نہیں رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی دولت عزیر تھا جو کچھ عرصے کے لیے اس سے بچھڑ گیا تھا۔

شاہانہ نے ایسی دواؤں کا انتظام کر لیا تھا کہ وہ کبھی فیروز کے بچے کی ماں نہ بن سکے لیکن حالات ایسے حیرت انگیز پیش آئے تھے کہ اسے وہ دوائیں استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

راہ میں اس نے کار ایک شاپنگ پلازا کی پارکنگ لاٹ میں روکی۔ اسے علم تھا کہ وہاں کی دو ایک دکانوں پر ایسے غیر ملکی پرفیوم بھی مل جاتے تھے جو اور کہیں دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ انہی میں سے ایک پرفیوم عزیر کو بہت پسند تھا۔ شاہانہ اس کے لیے وہی پرفیوم خرید کر لے جانا چاہتی تھی۔

وہ پرفیوم لے کر لوٹ رہی تھی تو اس کا سامنا خالہ ذکیہ سے ہوگیا۔ یہ اس کی رشتے کی وہی خالہ تھیں جو شادی کے دوسرے روز اسے لینے آئی تھیں۔

انہوں نے گرم جوشی کے ساتھ شاہانہ کو گلے لگایا اور اسے اپنے ساتھ شاپنگ پلازا ہی میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں لے گئیں۔

خالہ ذکیہ کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن وہ بہت اچھے نقش و نگار کی مالک تھیں۔ آسودہ حالی نے انہیں اور زیادہ نکھار دیا تھا۔ ان کا گھرانا بھی خوش حال تھا۔ وہ طبیعت کی بھی بہت اچھی تھیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ شاہانہ کے والد کی مالی مدد کرنا چاہی تھی لیکن خوددار آذر صاحب نے ان کی مدد لینا گوارا نہیں کی تھی۔

شاہانہ کے علم کے مطابق خالہ ذکیہ کی زندگی کا ایک المیہ یہ تھا کہ وہ شادی کے بعد جب دلہن بن کر اپنے شوہر کے گھر پہنچی ہی تھیں تو نہ جانے کس وجہ سے ان کے شوہر کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ وہ شب عروسی منانے سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی تھیں جس کے بعد انہوں نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔

ان کا... مرحوم شوہر ایک بے حد دولت مند شخص تھا۔ اس کے ورثا میں سے کوئی نہ ہونے کے سبب اس کی ساری دولت خالہ ذکیہ کے حصے میں آئی تھی۔ کیونکہ وہ خود پڑھی لکھی اور ذہین تھیں اس لیے انہوں نے خود ہی اپنے مرحوم شوہر کا ادارہ سنبھال لیا تھا اور اب تک اسے بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہی تھیں۔ ان کا رہنا سہنا اپنے والدین ہی کے ساتھ تھا اور آذر صاحب کے گھر سے ان لوگوں کا میل جول بھی تھا۔ وہ سبھی لوگ خوش حال لیکن منکسر المزاج تھے۔

خالہ ذکیہ نے شاہانہ کے لیے چائے اور کچھ اسنیکس وغیرہ منگوائے۔

"تم خوش تو ہو نا شاہانہ!" وہ بولیں۔

"جی، جی ہاں، بالکل۔"

"کیا خریدنے آئی تھیں؟"

"ایک پرفیوم لینا تھا۔"

"فیروز کو دینا ہوگا۔"

شاہانہ خفیف سا مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے جھوٹ بولنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت اسے واش روم جانے کی خواہش محسوس ہوئی جس کا اظہار اس نے خالہ ذکیہ سے بھی کیا۔

"اس طرف ہے واش روم۔" خالہ ذکیہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "جلدی سے ہو آؤ۔ چائے آنے میں اتنا وقت تو لگے گا۔"

شاہانہ اٹھ کر جانے لگی۔

خالہ ذکیہ جلدی سے بولیں۔ "شاپنگ بیگ تو یہیں چھوڑ کر جا رہی ہو مگر یقین کرو کہ میں موبائل چور بھی نہیں ہوں۔"

شاہانہ دھیرے سے ہنس دی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے وہ بھی میز پر رکھ دیا اور واش روم کی طرف چلی گئی۔

کبھی کبھی ایسے اتفاقات بھی پیش آجاتے ہیں، خالہ ذکیہ نے بڑی خوش دلی سے سوچا تھا۔

نظروں سے شاہانہ کے اوجھل ہوتے ہی خالہ ذکیہ نے اس کا موبائل اٹھایا اور اس میں فیڈ کیے ہوئے نمبر دیکھنے لگیں۔ ان کے انداز میں عجلت تھی۔ "ع" کے حرف میں انہیں عزیر کا نمبر جلدی ہی مل گیا۔ وہ انہوں نے فوراً اپنے پاس نوٹ کر کے موبائل ٹھیک اسی جگہ رکھ دیا جہاں شاہانہ رکھ کر گئی تھی۔

ویٹر چائے وغیرہ رکھ کر گیا ہی تھا کہ شاہانہ لوٹ آئی۔

"واپس گھر ہی جاؤ گی؟" خالہ ذکیہ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" شاہانہ نے جواب دیا۔ "پہلے تو امی سے ملنے جاؤں گی۔"

ادھر ادھر کی باتوں میں چائے پی لی گئی۔ اس کے بعد جب وہ دونوں وہاں سے اٹھیں تو خالہ ذکیہ نے کہا۔ "کسی دن ہماری طرف بھی چکر لگاؤ! فیروز کو بھی لیتی آنا بلکہ مجھے تم دونوں کی دعوت کرنا ہے۔"

"دعوت کی کیا ضرورت ہے خالہ! ہم ویسے ہی آجائیں گے۔"

"خیر خیر! دیکھا جائے گا۔"

وہ دونوں شاپنگ پلازا سے نکل آئیں۔

"آپ کی گاڑی کہاں ہے؟" شاہانہ نے پوچھا۔

خالہ ذکیہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔

شاہانہ بولی۔ "شادی کے دوسرے دن جب آپ مجھے لینے آئی تھیں تو آپ کی کار کہاں تھی؟"

"میں جان بوجھ کر نہیں لائی تھی۔"

"کیوں؟" شاہانہ کو حیرت ہوئی۔

"مجھے پہلے ہی علم تھا کہ تمہاری ساس بہت مغرور عورت ہے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے بھی معمولی عورت سمجھے۔"

"مگر کیوں خالہ؟ مجھے یاد ہے، آپ انہیں بڑی تیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔"

"کھڑے کھڑے باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔" خالہ ذکیہ نے شاہانہ کا شانہ تھپک کر کہا۔ "اب تم جاؤ، میں بھی چلتی ہوں، خدا حافظ۔"

خالہ ذکیہ اپنی کار کی طرف بڑھ گئیں۔

شاہانہ جب اپنی کار میں وہاں سے روانہ ہوئی تو الجھن کا شکار تھی۔ خالہ ذکیہ کی یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ انہوں نے فریال عیسیٰ کو یہ کیوں باور کرانا چاہا کہ وہ ایک معمولی عورت ہیں؟

سوچنے سے اس کی یہ الجھن ختم نہیں ہو سکی اور وہ عزیر کے دفتر پہنچ گئی کیونکہ بارہ بج چکے تھے اس لیے اس کا خیال تھا کہ عزیر دفتر ہی میں ہوگا۔

خیال درست ثابت ہوا۔ عزیر اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ "فون تو کر دیتیں کہ آرہی ہو!"

"خیال تھا کہ مجھے غیر متوقع طور پر دیکھ کر تم زیادہ خوش ہوگے۔"

"خوش تو میں یقیناً ہوا ہوں لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظر شاہانہ کے لائے ہوئے پیکٹ کی طرف تھی۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے لیے لائی ہوں۔" شاہانہ نے پرفیوم کا ڈبا نکالا۔

عزیر کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ "ایک تحفہ تو میں بھی تمہیں دینا چاہتا تھا مگر اس کا موقع نہیں ملا۔ وہ گھر پر ہے۔ کسی دن گھر آؤ گی تو دوں گا۔ یہ کیا لکھ رہی ہو؟"

شاہانہ اس کی میز ہی سے قلم اٹھا کر پرفیوم کے پیکٹ پر کچھ لکھنے لگی تھی۔ وہ لکھ کر اس نے پیکٹ عزیر کو دیا۔

عزیر نے پڑھا۔ شاہانہ نے لکھا تھا۔

"اس کی خوشبو میں تم میری خوشبو محسوس کیا کرو گے۔"

عزیر خفیف سا مسکرا کر بولا۔ "تمہاری خوشبو تو میرے ذہن میں رچی ہوئی ہے شاہانہ...! خیر، میں وہ باتیں جاننے کے لیے بے چین ہوں جو تم مجھے بتانا چاہتی ہو اور جو تم نے فون پر نہیں بتائی تھیں۔"

"میری شادی ایک حیرت انگیز شادی ہے عزیر!" شاہانہ نے کہا۔ "کیا تم یقین کرو گے کہ شب عروسی ابھی میری زندگی کا حصہ نہیں بنی۔"

عزیر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر شاہانہ کی باتیں سنتے ہوئے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔ جب شاہانہ کچھ بتانے کے بعد خاموش ہوئی تو عزیر نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔

"یہ سب کچھ ایک کہانی سی معلوم ہوتی ہے۔"

"فیروز بھی اسی قسم کی ایک بات کہہ چکے ہیں۔"

"عظیم شخص ہے وہ جو اپنی پہلی بیوی سے اتنی محبت کرتا ہے۔"

"میرے دل میں بھی اب ان کی بہت عزت بڑھ گئی ہے۔" عزیر نے کہا، پھر بولا۔ "تمہارے لیے کافی منگواؤں یا کچھ اور پسند......"

"کچھ نہیں۔" شاہانہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ابھی راستے ہی میں ایک جگہ چائے پی تھی بلکہ ہلکا پھلکا سا ناشتا بھی ہو گیا تھا۔ بس کچھ دیر باتیں کریں گے، پھر مجھے امی سے ملنے بھی جانا ہے۔"

"اچھا تو اب میں تمہیں اپنی ایک الجھن سے آگاہ کر دوں۔"

"اوہ، ہاں! یہ پرفیوم کا پیکٹ دیکھ کر تم کچھ کہتے کہتے

رہ گئے تھے۔''

''ہاں۔'' عزیر نے کہا۔ ''میں تمہیں وہی بات بتانے والا تھا جو کچھ دیر سے میری الجھن کا سبب بنی ہوئی ہے۔''

''کچھ دیر سے؟''

''ہاں۔'' عزیر نے کہا۔ ''تمہاری آمد سے شاید پانچ منٹ پہلے مجھے ایک پراسرار کال موصول ہوئی تھی۔''

''پراسرار کال؟'' شاہانہ الجھ گئی۔

عزیر نے جواب دیا۔ ''میں اسے پراسرار کال اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس عورت نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''عورت؟'' شاہانہ کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

''ہاں۔ میں اسے عورت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی آواز میں کسی حد تک پختگی تھی جو لڑکیوں کی آواز میں نہیں ہوتی۔''

''کیوں فون کیا تھا اس نے؟'' شاہانہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور جلد از جلد ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے شام سات بجے کا وقت دیا ہے۔ ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوگی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں جب ریسٹورنٹ میں داخل ہوں تو رومال سے اپنا [illegible] بار بار صاف کرتا رہوں۔ اس طرح وہ مجھے پہچان لے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے میرا فون نمبر تو کہیں سے لے لیا مگر اس نے مجھے کبھی دیکھا نہیں ہے۔''

''کسی اجنبی عورت سے کسی ریسٹورنٹ میں ملنے جانا تو مخدوش بات ہے عزیر!'' شاہانہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں یقیناً اس ملاقات سے گریز کرتا لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے تو اس نے تمہارا نام لیا تھا۔''

''کیا!'' شاہانہ چونک گئی۔

عزیر نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ''وہ مجھ سے تمہارے بارے میں کوئی خاص گفتگو کرنا چاہتی ہے۔''

''ان باتوں سے تو میرا دماغ چکرا گیا ہے۔ کوئی عورت تم سے آخر میرے بارے میں کیا بات کرنا چاہے گی؟''

''خود میرا دماغ بھی چکرایا ہوا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ وعدہ لینے کی بھی کوشش کی تھی کہ تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ جب میں یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اس نے اصرار کیا کہ میں کم از کم ملاقات سے پہلے تک رازداری برتوں۔ میرا دماغ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھا لیکن میں نے سوچا کہ اگر میں نے اس عورت کی کوئی بات بھی نہیں مانی تو شاید وہ مجھ سے ملاقات نہ کرے اور تمہارا نام آجانے کے باعث میں متجسس ہو چکا تھا اس لیے مجھے اس سے ایک جھوٹا وعدہ کرنا پڑا۔ میں نے اس کی دوسری شرط ماننے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اسی لیے ملاقات کا وقت اور جگہ کا تعین ہوا۔''

''کس ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوگی؟'' شاہانہ نے بے دلی سے پوچھا۔

عزیر نے ایک مشہور ریسٹورنٹ کا نام بتایا۔

''سات بجے۔'' شاہانہ بڑبڑائی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اگر میں سات بج کر پانچ دس منٹ پر وہاں پہنچوں تو اس عورت کو دیکھ سکتی ہوں۔''

''لیکن اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تم اس کی نظر میں نہ آؤ۔''

شاہانہ سوچ میں پڑ گئی، پھر چونک کر بولی۔ ''اس عورت کا نمبر تو تمہارے موبائل پر آگیا ہوگا!''

''نمبر تو آیا ہے لیکن وہ کسی پی سی او کا ہے۔ وہ عورت یقیناً ذہین ہے۔ وہ اگر اپنے موبائل سے فون کرتی تو اسے خدشہ ہوگا کہ اگر اس موبائل فون میں میرا کوئی جاننے والا ہو تو میں اس کا نام جاننے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

اس عورت کے معاملے میں گفتگو آگے چلتی لیکن اسی وقت شاہانہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شاہانہ نے موبائل نکالا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''یہ نمبر تو اجنبی ہے۔''

''ابھی کال ریسیو کرو۔ معلوم تو ہونا چاہیے، کون ہے؟''

شاہانہ نے موبائل کان سے لگایا۔ ''ہیلو!''

''کیا تم میری آواز پہچان سکتی ہو شاہانہ؟'' دوسری طرف سے بڑے خشک لہجے میں کہا گیا تھا۔

''اوہ!'' شاہانہ چونکی۔ ''آپ ممی بول رہی ہیں نا؟''

اس نے فریال عیسیٰ کی آواز پہچان لی تھی۔

''تم کہاں ہو؟'' فریال عیسیٰ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں نے ابھی تمہارے گھر فون کیا تھا۔''

شاہانہ گڑبڑا گئی لیکن اس نے بات بنانے میں دیر بھی نہیں لگائی۔ اس نے کہا۔ ''راستے میں ایک دوست مل گئی تھی ممی! وہ مجھے چائے پلانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ اب میں یہاں سے روانہ ہو رہی ہوں۔''

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''شکی مزاج بھی ہیں یہ محترمہ۔'' شاہانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ ''میں یہ بہانہ کر کے چلی تھی کہ امی سے ملنے جارہی ہوں۔ وہ وہاں فون کر بیٹھی ہیں۔ اب مجھے جانا چاہیے عزیر، لیکن میں شام سے پہلے کسی وقت تمہیں فون ضرور کروں گی اور شام کو ریسٹورنٹ میں آنے کی کوشش بھی کروں گی۔''

''بس خیال رکھنا کہ اس عورت کے سامنے نہ آؤ۔''

شاہانہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہاں سے وہ اپنے والدین کے گھر کی طرف روانہ ہوئی مگر اس دوران میں بھی اس کا دماغ اس سوال میں الجھا رہا۔

وہ عورت کون ہو سکتی ہے؟ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا تھا کہ اس عورت کو عزیر کا موبائل نمبر کہاں سے مل گیا۔ شاہانہ کے گھر والے یہ تو جانتے تھے کہ وہ عزیر نامی کسی نوجوان سے محبت کرتی ہے اور اپنی ماں پر اس کا اظہار خود شاہانہ ہی نے کیا تھا لیکن اس نے عزیر کا نمبر کسی کو نہیں بتایا تھا۔

یکایک شاہانہ کو خیال آیا کہ ریسٹورنٹ میں وہ اپنا موبائل میز پر ہی چھوڑ کر ٹوائلٹ چلی گئی تھی۔ خالہ ذکیہ اس کے موبائل میں عزیر کا نمبر تلاش کرسکتی تھیں۔

مگر کیوں؟

شاہانہ کے دماغ میں دوسرا سوال ابھرا۔ خالہ ذکیہ ایسا کیوں کریں گی؟... وہ اس کے بارے میں عزیر سے کیا بات کرسکتی ہیں؟

نہیں! اس نے سر جھٹکا۔ وہ خالہ ذکیہ نہیں ہوسکتیں۔

اسی الجھن میں وہ گھر پہنچ گئی۔

''کہاں رہ گئی تھیں بیٹی؟'' سلطانہ بیگم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''دو مرتبہ فون آچکا ہے تمہاری ساس کا؟''

''دوسرا فون کب آیا تھا؟'' شاہانہ نے پوچھا۔

''بس ابھی کوئی دو ایک منٹ پہلے......''

شاہانہ نے فوراً فریال عیسیٰ سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''میں گھر پہنچ گئی ہوں ممی!''

''ٹھیک ہے۔'' دوسری طرف سے مختصر جواب دینے کے بعد رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''اس کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟'' شاہانہ نے فرزانہ کی طرف اشارہ کیا۔

''شہر کے حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں شاہانہ!'' سلطانہ بیگم نے جواب دیا۔ ''اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے کالج چھوڑنے میں اس کے ساتھ جایا کروں گی اور لینے بھی آیا کروں گی۔ بس اسی بات پر منہ پھلا لیا ہے۔ کالج بھی نہیں گئی کہہ رہی ہے کہ اب جائے گی بھی نہیں۔''

اسی وقت فرزانہ اٹھی اور پیر پٹخنے کے انداز میں چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

''دیکھا تم نے!'' سلطانہ بیگم بولیں۔ ''اسے کچھ دن سے اچانک نہ جانے کیا ہوگیا ہے...... تمہارے ابا تو دفتر گئے ہیں۔ وہ آجائیں تو میں انہیں بتادوں گی۔ وہی گوشمالی کریں گے اس کی۔''

''آپ نے اس سے اعجاز کی کوئی بات تو نہیں کی؟''

''نہیں۔ اس طرح تو اسے اور زیادہ کھل کر سوال جواب کرنے کا موقع مل جاتا۔''

''اچھا کیا آپ نے......! فی الحال ابا سے بھی کچھ نہ کہیے گا، خود ہی ٹھنڈے مزاج کے ساتھ سمجھاتی بجھاتی رہیے۔''

سلطانہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ پھر جیسے چونک کر اور [illegible] والے انداز میں بولیں۔ ''تمہارے ابا کی ترقی بھی تو ہوگئی ہے۔ تین تنخواہ بڑھ گئی ہے۔ کچھ دن میں دفتر سے کار بھی مل جائے گی۔''

شاہانہ کو پہلے ہی اس کا علم فیروز سے ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے فیروز سے شادی نہ کی ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اس کے والد کی تنخواہ میں بس پچاس فیصد اضافہ ہوتا لیکن وہ یہ باتیں اپنی زبان پر نہیں لائی۔

''اب کھانا تو کھا کے جاؤ گی نا؟'' سلطانہ بیگم نے پوچھا۔

''نہیں اماں! میں جلدی واپس جاؤں گی۔ ویسے ہی راستے میں دیر ہوگئی۔ دراصل خالہ ذکیہ مل گئی تھیں۔ وہ چائے پلانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئیں۔ آپ ابھی کیا کررہی تھیں؟''

''باورچی خانے میں تھی۔''

''تو آپ اپنا کام دیکھیں۔ میں ذرا فرزانہ کو سمجھاتی ہوں۔''

''تم بھی کوشش کرکے دیکھ لو۔'' سلطانہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

شاہانہ نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں فرزانہ گئی تھی۔

گزشتہ روز ان دونوں میں تلخی ہو چکی تھی لیکن شاہانہ نے مناسب یہی سمجھا تھا کہ ان باتوں کو بھلا کر چھوٹی بہن سے تعلقات

...بہتر کرلے۔ اس نے بڑے ہوتے ہوئے بھی چھوٹی بہن کے سامنے جھک جانے میں کوئی مضائقہ اس لیے نہیں سمجھا کہ اس گھر کی بہتری اسی میں تھی۔

وہ فرزانہ کے قریب بیٹھ گئی اور ہنس کر بولی۔ ''کیا بی اے کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''پرائیویٹ امتحان دے دوں گی۔ کالج تو نہیں جاؤں گی اب!'' فرزانہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر سرد لہجے میں جواب دیا۔

''یہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔ اماں بتا رہی تھیں کہ دفتر سے ابا کو کار ملنے والی ہے۔ کار ملے گی تو شوفر بھی ملے گا۔ تم کار میں چلی جایا کرنا کالج! اماں کو ساتھ نہیں جانا پڑے گا۔''

''میں اس کار میں بیٹھنا پسند نہیں کروں گی جو آپ کی شادی کی وجہ سے اس گھر میں آرہی ہے۔'' فرزانہ نے تلخی سے کہا۔

شاہانہ کو اس جواب پر غصہ آ گیا مگر وہ پی گئی اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس موضوع پر بات آگے بڑھائے۔ فی الحال فرزانہ کو سمجھانا بجھانا بے کار تھا۔ حالات کو وقت پر چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہوتا۔

''اچھا جیسا تم مناسب سمجھو!'' شاہانہ نے فرزانہ کا گال تھپک کر کہا۔ ''انسان خود ہی اپنے بارے میں زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتا ہے۔ اچھا میں اب چلوں گی۔ تم آنا کسی دن مجھ سے ملنے۔''

''اماں کے ساتھ تو نہیں آؤں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں کار بھیج دوں گی اپنی۔'' شاہانہ نے ہنس کر کہا۔ اس نے سوچا تھا کہ فرزانہ کو اعجاز سے دور کرنے کے لیے نرمی سے کام لینا پڑے گا۔ اسے یہ باور کرانے کی ضرورت تھی کہ فریال عیسٰی کے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں بن سکے گی۔

تھوڑی دیر اور بیٹھ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گئی۔

ڈرائنگ روم میں فریال عیسٰی کے ساتھ فیروز بھی موجود تھا۔ وہ اس روز دفتر تو گیا تھا لیکن جلد ہی لوٹ آیا ہوگا۔

''راستے میں کسی بھی وجہ سے کہیں نہ رکا کرو شاہانہ!'' فیروز نے نرمی سے کہا۔ ''ممی پریشان ہو جاتی ہیں۔''

شاہانہ سمجھ گئی کہ اس کی شکایت فیروز سے کی گئی تھی۔

''میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ مجھے معاف کر دیجیے ممی!''

فریال عیسٰی نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

''وقتی ناراضی ہے۔'' فیروز نے ہنس کر کہا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ فریال عیسٰی کے رویے کی وجہ سے شاہانہ کے دل پر کوئی اثر ہو۔

''مجھے اندازہ ہے۔'' شاہانہ نے بھی ہنس کر بات ختم کر دی اور کہا۔ ''آپ جلدی آگئے دفتر سے یا یہ آپ کا معمول ہے؟''

''نہیں، معمول تو نہیں ہے۔ آج جلدی آ گیا۔ دراصل کئی دن کی چھٹی کے بعد گیا تھا اس لیے آج دل نہیں لگا۔''

''میں جا کے کپڑے بدل لوں؟''

''ٹھیک ہے، کھانے کا وقت بھی قریب ہے۔'' فیروز نے کہا۔ ''اور ہاں! شام کو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''شام کو؟'' شاہانہ چونکی۔ ''کہاں؟''

''ایک دوست کا فون آ گیا تھا۔ بہت بے تکلف دوست ہے۔ اس نے ہم دونوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے۔''

''کس وقت چلنا ہے؟'' شاہانہ نے پوچھا۔

''اب چھ بجے تو اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ سات بجے تک نکلیں گے۔ سردیاں ہیں نا' واپسی بھی جلدی ہو جائے گی۔ دس بجے تک لوٹ آئیں گے۔''

شاہانہ نے اس وقت شدید بے بسی محسوس کی۔ سات بجے اسے اس عورت کو دیکھنے جانا تھا جو عزیر کو فون کر چکی تھی لیکن شاہانہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ فیروز کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی۔

کمرے میں جا کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور موبائل فون پر عزیر سے رابطہ بھی کیا۔ ''میں ریسٹورنٹ نہیں آسکوں گی عزیر! تم مجھے بعد میں بتا دینا کہ اس عورت نے تم سے کیا باتیں کیں۔''

''تم نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟'' عزیر نے پوچھا۔

شاہانہ نے اسے مختصر طور پر وجہ بتا کر ایک آدھ بات کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ سب کے ساتھ کھانے کی میز پر تھی۔ اعجاز اس وقت تک اپنے کالج سے واپس آجایا کرتا تھا اس لیے وہ بھی موجود تھا۔ لنچ کے لیے لالہ عیسٰی بھی دفتر سے آجاتے تھے۔ شاہانہ نے انہیں کچھ پریشان سا دیکھا۔ باقی لوگوں کو بھی اس کا احساس ہوا تھا۔

فریال عیسٰی بولیں۔ ''کیا بات ہے لالہ صاحب؟ کچھ پریشان ہیں آج آپ؟''

لالہ عیسٰی اس طرح مسکرائے جیسے جبراً مسکرائے ہوں، پھر کہا۔ ''بھئی کاروبار میں پریشانیاں تو لگی رہتی ہیں۔''

''ڈیڈی!'' فیروز بولا۔ ''جب میں دفتر سے آیا تھا تو میں نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی تھی۔''

''بینک کے معاملات ہیں کچھ!'' لالہ عیسٰی نے کہا۔ ''اور وہ فائل میں صرف اپنے پاس رکھتا ہوں۔''

''تو بینک کا کچھ معاملہ ہے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''ہاں۔ لیکن تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو گڑبڑ ہونے والی ہے، اسے میں سنبھال لوں گا۔''

''کیا گڑبڑ ہو رہی ہے ڈیڈی؟''

''تم کھانا کھاؤ۔'' لالہ عیسٰی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

فیروز چپ ہو گیا لیکن فریال عیسٰی بولیں۔ ''دفتر جانے سے پہلے مجھے کچھ بتا کر جائیے گا۔'' ان کے انداز میں حاکمیت تھی۔

لالہ عیسٰی نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن کھانے کے بعد وہ فریال عیسٰی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

شاہانہ نے دیکھا کہ زہرہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

فیروز شاہانہ کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔

''آپ زہرہ کے پاس کیوں نہیں جاتے؟'' شاہانہ نے اس سے کہا۔ ''آخر وہ بیوی ہے آپ کی...... ٹھیک ہے کہ آپ نے دوسری شادی مجھ سے کرلی ہے لیکن پہلی بیوی کو اس طرح نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا۔''

''میں رات کو تو اسی کے پاس ہوتا ہوں۔''

''وہ بھی چوری چھپے۔''

''دراصل ممی کا حکم ہے کہ میں شادی کا یہ پہلا ہفتہ صرف تمہارے ساتھ گزاروں۔'' فیروز نے کہا اور سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

شاہانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ ڈیڈی کی پریشانی کی وجہ سے آپ بھی پریشان ہو گئے ہیں۔''

''بات ہی ایسی ہے شاہانہ!'' فیروز نے جواب دیا۔ ''کوئی چھوٹا موٹا تو کیا، اچھا خاصا بحران بھی ڈیڈی کو اتنا پریشان نہیں کرتا۔ یہ کوئی بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔''

''اور آپ کو شاید وہ بتانا نہیں چاہتے؟''

''وہ ممی کے ساتھ گئے ہیں۔ انہیں تو بتا ہی دیں گے۔ بات اگر میرے خیال کے مطابق بہت بڑی ہے تو مجھ سے بھی چھپی نہیں رہ سکے گی بلکہ میں ابھی دفتر کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔''

''ڈیڈی کے جانے کے بعد؟''

''ہاں۔''

شاہانہ چپ ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب معلوم ہوا کہ لالہ عیسٰی جا چکے ہیں تو فیروز بھی چلا گیا۔

کیا آفت آنے والی ہے اس گھر پر؟ شاہانہ بستر پر پڑی سوچتی رہی۔ اسے خیال آیا کہ زہرہ کے پاس جا کر اس سے بات کرے لیکن یہ سوچ کر رہ گئی کہ زہرہ سے اس کا زیادہ میل جول فریال عیسٰی کو شک میں ڈال سکتا تھا۔ شکی مزاج تو وہ تھی ہی! شاہانہ کو اس کا ثبوت مل چکا تھا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے زہرہ سے اس کا موبائل نمبر نہیں پوچھا تھا ورنہ بات ہو جاتی۔

زہرہ کو اس نے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھا تھا جب لالہ عیسٰی کی پریشانی کی بات سامنے آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاید اسے معاملے کا کچھ اندازہ ہو۔ شاہانہ اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی تھی کہ لالہ عیسٰی کیا دھماکا کرنے والے تھے۔ اب اسے خیال آیا کہ لالہ عیسٰی کی وہ پریشانی اسی پُراسرار دھماکے کا حصہ یا پیش خیمہ ہو۔ شاہانہ کے دماغ میں ''پُراسرار دھماکے'' کے الفاظ اس لیے آئے تھے کہ وہ اس دھماکے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

وہ لیٹے لیٹے اچھل پڑی کیونکہ دروازہ بڑی زور سے کھولا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں آنے والا اعجاز تھا۔

شاہانہ کو غصہ آ گیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہیں دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آنے کی اجازت لینا چاہیے۔''

''میں اس وقت آپ سے تمیز داری کا سبق سیکھنے نہیں آیا ہوں۔'' اعجاز نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

شاہانہ بھی اسے گھورتی رہ گئی۔

''مجھے بتائیے بھابی صاحبہ!'' اعجاز چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کیا آپ کی پیاری بہن میں ہیرے جواہرات ٹنکے ہوئے ہیں جو میں چرا لوں گا؟''

''جو کہنا ہے، صاف صاف کہو۔'' شاہانہ خشک لہجے میں بولی۔

اعجاز نے کہا۔ ''اگر آپ کی بہن سے میری دوستی ہو گئی

ہے، تو اس میں حرج ہے کوئی؟"
"تمہاری بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"
"فرزانہ نے مجھے فون کر کے بتایا ہے کہ اس پر گھر سے باہر نکلنے کی پابندی لگا دی گئی ہے۔"
شاہانہ کو شک تو تھا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کے موبائل نمبر لے لیے ہوں گے لیکن اس نے اعجاز پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا۔ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "بہت خوب......! اتنی جلدی دوستی اتنی بڑھ گئی ہے کہ موبائل نمبروں کا تبادلہ بھی ہو گیا؟"
"میری بات کا جواب دیجیے! آپ نے اس پر یہ پابندی کیوں لگوائی ہے؟"
"پابندی لگائی ہوگی تو امی نے لگائی ہوگی، میں نے کچھ نہیں کیا۔"
"آگ تو آپ ہی نے بھڑکائی ہے۔" اعجاز نے تلملائے ہوئے انداز میں کہا۔ "دیکھنے کے بعد آپ نے مجھے اور فرزانہ کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو آپ اپنی امی کے پاس گئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے ان سے ہم ہی دونوں کے بارے میں کچھ کہا ہوگا۔"
"تمہیں مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟" شاہانہ کا لہجہ تیز ہو گیا۔
"مجھے کسی سے اپنا حق مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"لیکن میں تمہیں یہ حق نہیں دے سکتی کہ تم مجھ سے اس قسم کی باتیں کرو۔ مت بھولو کہ میں تمہاری بڑی بھابی ہوں۔"
"آپ بھی نہ بھولیں کہ میں بھی بہت ضدی ہوں۔ اگر میں کچھ کر گزرنے پر تل جاؤں تو مجھے کوئی روک نہیں سکے گا۔" اعجاز نے کہا اور پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
شاہانہ کھلے ہوئے دروازے کو گھورتی رہ گئی۔ اعجاز کی باتوں نے اس کا دماغ خاصا گرم کر دیا تھا۔ وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ غصے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تولیے سے منہ خشک کر کے اس نے برش سے بال درست کیے اور پھر کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس طرح متحرک ہو کر اس نے خود پر خاصی حد تک قابو پا لیا تھا۔ وہ اعجاز کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اسے خیال آیا کہ اعجاز کچھ ذہین نہیں ہے۔ اگر اسے اس معاملے میں اس کا ہاتھ نظر آیا تھا تو بھی اسے یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھی۔
ایک اعتبار سے وہ اسے دھمکی بھی دے کر گیا تھا۔ شاہانہ سوچنے لگی کہ وہ اسے محض دھمکی ہی سمجھے یا واقعی اعجاز کے دماغ میں کوئی زہریلا منصوبہ پرورش پانے لگا ہے؟
وہ سوچتی رہی لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا سکی، کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی۔ اس نے ایک اور پہلو پر بھی غور کیا۔ کیا وہ فیروز کو یہ ساری بات بتا دے؟
بتانے کی صورت میں اس کا امکان تھا کہ فیروز بھی اعجاز کو سرزنش کرتا۔ ماں سے وہ پہلے ہی ڈانٹ کھا چکا تھا۔ ایسی صورت میں اس کی جھلاہٹ اور بڑھتی۔ ضدی وہ یقیناً تھا، پھر نوجوان خون...... وہ سرپھرا کوئی زیادہ سنگین حرکت بھی کر سکتا تھا۔
شاہانہ نے فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی اختیار کر کے اعجاز کو باور کرائے گی کہ وہ اس کے خلاف نہیں ہے۔ فی الحال تو وہ شاہانہ کے جوابات سے پھر کر ہی رہ گیا تھا لیکن اس کے ازالے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اعجاز جیسے سرپھرے نوجوان کو نرمی ہی سے سنبھالا جانا زیادہ بہتر ہوتا۔
یہ سب کچھ سوچتے ہوئے شاہانہ کے لبان میں بھی نہ تھا کہ فرزانہ پر پابندی لگنے سے جذبہ مستعل ہو چکا تھا اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ اب جو ہو، سو ہو!
ساڑھے پانچ بجے کے قریب فیروز واپس آ گیا۔ شاہانہ نے محسوس کیا کہ اب وہ کچھ زیادہ ہی کسی طرف پریشان تھا۔
شاہانہ نے اس سے کچھ معلوم کرنا چاہا لیکن وہ ٹال گیا۔ شاہانہ نے اصرار نہیں کیا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ بیوی بن جانے کے باوجود فیروز کی بیوی نہیں تھی کہ فیروز کے پیچھے ہی پڑ جاتی۔
"ڈیڈی بھی آ گئے ہوں گے۔" اس نے دوسری بات کی۔
"نہیں۔ وہ مشاورت کے لیے کسی سے ملنے گئے ہیں۔ شاید آٹھ بجے تک آئیں یا شاید اس سے پہلے!"
شاہانہ سوچنے لگی کہ ان حالات کی وجہ سے ممکن ہے کہ فیروز دعوت میں جانے کا ارادہ منسوخ کر دے۔ ایسی صورت میں شاہانہ کو اپنا کام کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ اس نے ایسی تدبیر سوچ لی تھی کہ شام کو تنہا گھر سے نکل سکے۔
وہ آہستہ سے بولی۔ "اب تو دعوت میں جانا شاید ممکن نہ ہو۔ میرا مطلب ہے، آپ بھی پریشان ہیں۔"
"وہ پریشانی اپنی جگہ! دعوت میں تو جانا ہی ہوگا۔ میں

وعدہ کر چکا ہوں۔ بس یہ ہے کہ ذرا جلدی واپسی ہوگی۔"
اس جواب نے شاہانہ کو مایوس کر دیا۔

☆☆☆

ٹھیک سات بجے عزیر رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتا ہوا اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوا جہاں اسے ایک نامعلوم عورت سے ملنا تھا۔
وہ اپنا چہرہ صاف کرتا ہوا ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ وہ ادھر ادھر نظر دوڑا رہا تھا کہ کسی میز سے اٹھ کر ایک عورت اس کی میز کی طرف آنے لگی۔ عزیر کی نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ پختہ عمر کی ایک خوش شکل عورت تھی جسے عزیر نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو پہچان لیتا کہ وہ شاہانہ کی خالہ ذکیہ تھیں۔
وہ بڑی بے تکلفی سے عزیر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور مسکراتے ہوئے بولیں۔ "تم وقت کے بہت پابند ہو، اور یہ بہت اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے ابھی شاہانہ سے میرا ذکر نہیں کیا ہوگا۔"
"آپ کا نام؟" عزیر نے پوچھا۔
"تمہاری والدہ کی کیا عمر ہے؟"
عزیر نے عمر بتا دی، پھر بولا۔ "لیکن اس بات سے میرے سوال کا کیا تعلق؟"
"تعلق ہے۔" خالہ ذکیہ نے کہا۔ "میں تمہاری والدہ سے دس سال چھوٹی ہوں اس لیے تم مجھے خالہ کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو۔ کچھ دن بعد نام بھی جان لو گے۔ مجھے امید ہے کہ تم نام جاننے پر اصرار نہیں کرو گے۔"
عزیر خاموش رہا۔ ویٹر قریب آ گیا تھا۔ خالہ ذکیہ نے اس سے چائے اور کچھ اسنیکس لانے کے لیے کہا۔
"یقیناً تم یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گے کہ میں تم سے شاہانہ کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتی ہوں۔" خالہ ذکیہ نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔
"ظاہر ہے۔" عزیر نے کہا۔
"شاہانہ کی شادی سے تمہیں بہت صدمہ پہنچا ہوگا؟"
"یہ بھی ظاہر ہے۔ اگر آپ کو میرے اور شاہانہ کے بارے میں معلومات ہیں تو آپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"
"شاہانہ نے تم سے بے وفائی نہیں کی ہے۔ وہ حالات سے مجبور ہو گئی تھی۔"
عزیر کو ان باتوں کا علم تھا۔ شاہانہ اسے سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس عورت کو غالباً ان باتوں کا علم نہیں تھا۔
"یقین کرو کہ میں تمہاری اور شاہانہ کی ہمدرد ہوں۔" خالہ ذکیہ نے کہا۔ "اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ شاہانہ کے لیے اگر تمہارے دل میں منفی جذبات پیدا ہوئے ہوں تو میں انہیں ختم کروں۔ میں تمہیں وہ حالات بتانا چاہتی ہوں جن کی وجہ سے شاہانہ نے یہ شادی کی۔"
عزیر خاموش رہا۔ خالہ ذکیہ نے شاہانہ کے والد آذر صاحب کی مجبوریاں بتانا شروع کیں۔ عزیر وہ بھی خاموشی سے سنتا رہا حالانکہ وہ سب کچھ اسے بہت پہلے ہی شاہانہ سے معلوم ہو چکا تھا۔
خالہ ذکیہ کے خاموش ہونے کی دیر تھی کہ ویٹر وہ سب کچھ لے آیا جو اس سے منگوایا گیا تھا۔
خالہ ذکیہ نے چائے بناتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ جاننے کے بعد تم شاہانہ کے بارے میں کیا رائے قائم کرو گے؟"
"ایک اچھی بیٹی کو اپنے باپ کی مجبوری کے باعث یہ کرنا ہی چاہیے تھا۔"
"مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ بات سمجھ کر۔" خالہ ذکیہ نے کہا۔ "اب یہ بھی بتاؤ کہ آئندہ کے لیے تمہارا کیا پروگرام ہے؟"
"میں سمجھا نہیں۔"
"شاہانہ کو بے وفا سمجھنے کے بعد تم نے کیا فیصلہ کیا تھا؟ کیا یہ سوچا تھا کہ تم بھی کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لو گے؟"
"ابھی میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔"
"سوچنا بھی مت......! میں تم سے یہی کہنے کے لیے ملی ہوں۔ شاہانہ کچھ عرصے بعد پھر تمہاری ہو جائے گی اور یقین کرو کہ وہ اس وقت بھی دوشیزہ ہی ہوگی۔ فیروز نے اپنی ماں کے مجبور کرنے پر یہ شادی کی ہے لیکن شاہانہ کو اپنی بیوی نہیں بنایا۔ میرا مطلب ہے کہ عملاً ایسا نہیں کیا۔ اس نے شاہانہ کے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"
عزیر حیرت سے خالہ ذکیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اگرچہ یہ سب باتیں بھی اسے شاہانہ سے معلوم ہو چکی تھیں لیکن وہ حیران اس بات پر تھا کہ یہ عورت وہ سب کچھ کیسے جانتی تھی؟
"ایسی صورت میں..." خالہ ذکیہ کچھ کہتے کہتے رکیں، پھر اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ "یہ چائے وغیرہ لو نا؟"
عزیر نے ایک بسکٹ اٹھا لیا۔
خالہ ذکیہ بولیں۔ "ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تم نے کسی دوسری لڑکی کے بارے میں سوچا تو یہ تمہاری غلطی ہوگی۔

تمہیں شاہانہ کا انتظار کرنا چاہیے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ شاہانہ پھر سے میری ہو جائے۔"

عزیر نے عورت کو مزید کریدنے کے لیے پوچھا۔ شاہانہ اسے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ یہ سب کچھ کیونکر ہوگا۔

"دراصل......" خالہ ذکیہ نے وہی سب کچھ بتایا تھا جو شاہانہ اسے وضاحت سے پہلے ہی بتا چکی تھی۔

"آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟" عزیر نے بے ساختہ پوچھ ہی ڈالا۔

"فی الحال میں تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گی۔" خالہ ذکیہ نے کہا۔ "مناسب وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا اور میں کون ہوں۔"

"اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟"

"غالباً اس وقت کے آنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"مگر میں ان سب باتوں پر اعتبار کیسے کرلوں؟"

"کیا شاہانہ سے تمہارا رابطہ نہیں ہے؟"

"دو ایک مرتبہ بات ہو چکی ہے۔"

"وہ کیا کہتی ہے اس شادی کے بارے میں؟"

"شرمندہ ہے۔" عزیر نے جھوٹ بولا۔

خالہ ذکیہ کچھ سوچنے لگیں، پھر بولیں۔ "مجھے خیال تھا کہ وہ شاید حجاب کے باعث تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتا سکے گی، اسی لیے میں نے تم سے ملنا اور تمہیں یہ سب کچھ بتانا ضروری سمجھا۔ تم نے اتنی توجہ سے میری باتیں سنی ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ شاہانہ نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال! اب تم خود کھل کر شاہانہ سے بات کر لینا۔ بھول جاؤ کہ میں نے تم سے رازداری کا کوئی وعدہ لیا تھا۔ بتا دو شاہانہ کو کہ ایک عورت نے تمہیں یہ سب کچھ بتایا ہے۔ وہ بھی الجھن میں پڑ جائے گی کہ میں کون ہوں لیکن وہ میری ان باتوں کی تصدیق ضرور کر دے گی۔ پھر تم آئندہ ملاقات میں مجھ سے یہ سوال نہیں کر سکو گے کہ تم میری ان باتوں پر یقین کیوں کرو۔"

"مجھے یقیناً اب شاہانہ سے کھل کر بات کرنا ہی گی۔"

"ضرور کرو۔ میں خود کہہ چکی ہوں۔"

"ابھی آپ نے آئندہ ملاقات کی بات کی تھی۔ ہماری آئندہ ملاقات کا کیا امکان ہے؟"

"شاہانہ سے تمہاری شادی کے موقعے پر تو ملاقات ہونا ہی ہے لیکن اس سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔"

"گویا مجھے تین چار سال انتظار کرنا ہے۔"

"اب شاید تمہیں اتنا انتظار نہ کرنا پڑے۔ شاہانہ اب جلد ہی تمہاری بیوی بن جائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"بس اب زیادہ سوالات نہ کرو۔"

عزیر چپ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکلے اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ عزیر نے اپنی کار میں وہاں سے روانہ ہوتے ہی موبائل پر شاہانہ سے رابطہ کیا۔

"ہیلو!" شاہانہ کی مدھم آواز سنائی دی۔

"عزیر بول رہا ہوں۔ کیا تم نے میرا نام نہیں دیکھا؟"

"رانگ نمبر۔" دوسری طرف سے شاہانہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

عزیر سمجھ گیا کہ وہ اس وقت فیروز کے ساتھ ہوگی اس لیے اس کا بات کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

عزیر اپنے گھر پہنچنے کے بعد بہت بے چین رہا۔

رات کے دس بجے تھے جب شاہانہ کی کال آئی۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" عزیر کی آواز سنتے ہی وہ بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ موقع ملنے پر میں ہی تمہیں فون کیا کروں گی۔"

"آئی ایم سوری! میں اس عورت سے ملنے کے بعد ذہنی طور پر شاید حاضر نہیں رہا تھا۔ بس بے چین ہو گیا تھا تم سے بات کرنے کے لیے۔"

"میں خود بے چین تھی لیکن مجھے موقع اب ملا ہے۔ یہاں حالات کچھ ڈرامائی سے ہو گئے ہیں۔ ابھی فیروز کو ڈیڈی نے اپنے کمرے میں بلایا ہے تو مجھے موقع مل گیا کہ تم سے بات کروں۔ اب بتاؤ۔ اس عورت سے کیا بات ہوئی؟"

عزیر نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا۔ بیچ بیچ میں شاہانہ صرف حیرت کا اظہار کرتی رہی۔ آخر عزیر نے خاموش ہو کر کہا۔ "یہ عورت کون ہو سکتی ہے شاہانہ؟"

"خود میرا دماغ بھی چکرا گیا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔"

☆☆☆

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ شاہانہ نے کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک سنی۔ اگر وہ فیروز ہوتا تو اسے دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ شاہانہ نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں پوچھا۔ "کون؟"

باہر سے ایک ملازم کی آواز آئی۔ اس نے بتایا کہ لالہ عیسٰی نے اسے ڈرائنگ روم میں بلایا ہے۔

شاہانہ نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر عزیر سے کہا۔ "میں اب تم سے پھر کسی وقت بات کروں گی۔ ڈیڈی نے بلایا ہے۔" اس نے جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

کمرے سے وہ بڑی تیزی کے ساتھ نکلی تھی۔ یہ بھی اس کے لیے ایک ڈرامائی معاملہ تھا کہ رات کے سوا دس بجے اسے لالہ عیسٰی نے ڈرائنگ روم میں بلایا تھا، لیکن اس بات کے ساتھ ہی شاہانہ کے دماغ میں عزیر کی بتائی ہوئی باتیں بھی گونجتی رہی تھیں اور وہ الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ نامعلوم عورت ان باتوں سے کیونکر آگاہ ہو گئی تھی۔ اس کا اور فیروز کا یہ راز گھر میں صرف زہرہ جانتی تھی لیکن کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اس راز سے کسی اور کو بھی آگاہ کر دیتی؟

اس عورت کی یہ بات بھی عجیب تھی کہ عزیر اسے "خالہ" کہہ کر مخاطب کر سکتا ہے۔ اس بات کی وجہ سے شاہانہ کا دماغ اپنی خالہ ذکیہ کی طرف بھی گیا تھا اور اسے دوبارہ یہ بات بھی یاد آئی تھی کہ ریسٹورنٹ میں وہ اپنا موبائل فون خالہ ذکیہ کے سامنے میز پر ہی چھوڑ گئی تھی جس سے خالہ ذکیہ عزیر کا موبائل نمبر حاصل کر سکتی تھیں۔

گزشتہ روز تو شاہانہ نے خالہ ذکیہ کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا لیکن اب وہ پھر ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ سمجھ میں بس یہ نہیں آرہا تھا کہ انہیں وہ سب باتیں اگر کسی سے معلوم ہو سکتی ہیں تو صرف زہرہ سے معلوم ہو سکتی ہیں لیکن زہرہ سے ان کا تعلق بعید از قیاس سا معلوم ہو رہا تھا۔

اس ساری الجھن کے ساتھ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو صورتِ حال اس کے لیے مزید ڈرامائی ہو گئی۔ وہاں گھر کے سبھی افراد جمع تھے۔ فیروز، اعجاز، زہرہ اور فریال عیسٰی بھی۔ زہرہ کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے لیکن اعجاز الجھن کا شکار معلوم ہو رہا تھا۔ تفکرات کے سائے صرف لالہ عیسٰی، فیروز اور فریال کے چہروں پر بھی تھے۔ اس سے شاہانہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فیروز کے بعد فریال عیسٰی کو بھی اپنے شوہر کی پریشانی کا علم ہو چکا تھا۔

"آؤ شاہانہ! بیٹھو!" لالہ عیسٰی بولے۔

شاہانہ فیروز کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم حیران ہوگی کہ میں نے سب لوگوں کو کیوں جمع کیا ہے۔" لالہ عیسٰی نے کہا۔ "دراصل کچھ دیر پہلے تک تو میں صرف اپنی اہلیہ اور فیروز سے اس معاملے پر بات کر رہا تھا لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ تم لوگوں کو بھی صورتِ حال کا علم ہو جانا چاہیے۔ تم سب اسی گھر کے فرد ہو۔ تم سب کے علم میں ہونا چاہیے کہ اس گھر پر کیا آفت آنے والی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہو گئی ہے ڈیڈی؟" شاہانہ بے چینی سے پوچھ بیٹھی۔

"میں نے کچھ عرصے پہلے ایک بینک سے ایک کثیر سرمایہ قرض لیا تھا۔ جو میں نے کسی اور کاروبار میں لگایا تھا۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ بس یہ جان لو تم لوگ کہ وہ سرمایہ ڈوب گیا ہے۔ وہ میں بینک کو واپس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنی ساری انڈسٹری ختم کرنا پڑتی اس لیے میں اپنے اثر و رسوخ سے کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو ٹالتا رہا مگر کچھ عرصے پہلے...... یہ تو تم سبھی کے علم میں ہوگا کہ حالیہ دنوں میں ایک عدالتی فیصلے کے باعث تمام قرضوں کی واپسی ضروری ہو گئی تھی۔ اگرچہ ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے مجھ سے کئی گنا زیادہ قرضے لیے ہیں لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نزلہ تو عضو ضعیف ہی پر گرتا ہے۔ مجھ جیسے بہت سے لوگ اس کی زد پر آئے ہیں اور اب تو معاملہ یوں ہے کہ پانی ناک تک آچکا ہے۔ میں نے سب کاغذات فیروز کو دکھا بھی دیے ہیں۔" لالہ عیسٰی نے خاموش ہو کر ایک طویل سانس لی۔

"بات کہاں تک پہنچ گئی ہے ڈیڈی؟" اس مرتبہ اعجاز بول پڑا۔

"خطرناک حد تک۔" لالہ عیسٰی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اگر میں نے پرسوں صبح تک رقم بینک کو واپس نہیں کی تو مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ بات عدالت میں بہر حال جائے گی لیکن میں اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ مجھے اگر جیل نہ بھی بھیجا گیا تو یہ ضرور ہوگا کہ ساری انڈسٹری نیلام کر دی جائے۔ میرا بینک اکاؤنٹ بھی منجمد کر دیا جائے گا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا، کیا ہو جائے گا۔ رسوائی بھی ہوگی اور ہم سڑک پر آجائیں گے۔"

اعجاز کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

"بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے ڈیڈی؟" شاہانہ پوچھ بیٹھی۔

"صرف ایک صورت ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ مشروط ہوگی۔ میں فیروز کو اور انہیں بتا چکا ہوں۔" لالہ عیسٰی کا اشارہ فریال عیسٰی کی طرف تھا۔ "ابھی یہاں کوئی آنے والا ہے۔ میں نے ملازمین کو ہدایت کر دی ہے کہ آنے والے کو ڈرائنگ روم میں آنے سے نہ روکا جائے۔"

"مناسب ہدایت کی تھی آپ نے لالہ صاحب!" وہ خالہ ذکیہ کی آواز تھی، جس نے سب کو چونکا دیا۔

"میں آگئی ہوں۔" خالہ ذکیہ نے قریب آتے ہوئے کہا، پھر ہنس کر بولیں۔ "کیسے ممکن ہے کہ آپ بلائیں اور ہم نہ

آ گئیں۔"

"تم!" فریال عیسیٰ کے منہ سے نکلا۔

"تم ذکیہ۔"

خالہ ذکیہ کی پیشانی پر شکن آلود ہو گئی۔ انہوں نے لالہ عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لالہ صاحب! آپ نے اپنی اہلیہ کو یہ نہیں سکھایا کہ کسی معزز مہمان کو کس طرح مخاطب کیا جاتا ہے؟"

فریال عیسیٰ نے [illegible] عیسیٰ کی طرف سر گھما کر کہا۔ "آپ نے مجھے کسی بانو کا نام بتایا تھا۔"

"ہاں۔" لالہ عیسیٰ بولے۔ "ان کا پورا نام ذکیہ بانو ہے۔"

شاہانہ اس وقت اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"بیٹھیے بانو!" لالہ عیسیٰ نے کہا۔

"کیسی ہو شاہانہ؟" خالہ ذکیہ نے ایک [illegible] پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"جی...... جی...... ٹھیک ہوں۔" شاہانہ کا دماغ [illegible] سے چکرایا ہوا تھا۔

"جی لالہ صاحب! فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔" خالہ ذکیہ بولیں۔ "فون پر آپ نے [illegible] پریشانی سے تو آگاہ کر دیا تھا لیکن میں اتنی بار سوچ [illegible] ہوں کہ آپ کے معاملے کی قائل دیوا سکوں۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"تو پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میرا قرض......" لالہ عیسیٰ ہچکچا کر خاموش ہو گئے۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے۔" لالہ عیسیٰ نے تذبذب سے کہا۔ "کسی طرح اس قرض کی ادائیگی ہو جائے۔"

"اوہ!" خالہ ذکیہ سنجیدہ نظر آئیں۔ "کیا آپ کا مطلب ہے کہ وہ قرض میں ادا کروں؟"

"یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہو گا۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ دھیرے دھیرے آپ کا قرض اتار سکوں۔"

خالہ ذکیہ ہنس پڑیں۔ "کمال کر رہے ہیں آپ! جو رقم آپ نے بتائی ہے، وہ آپ انتہائی کوشش کے باوجود بھی برسوں میں ادا نہیں کر سکتے۔ خیر! اس بات کو چھوڑیے! قرض کی واپسی کا ذکر تو بے کار ہے لیکن میں آپ کا یہ قرض ادا کر دوں گی۔ اس کے لیے میری دو شرطیں ہیں۔"

"کیا؟" لالہ عیسیٰ نے پوچھا۔ [illegible]

خالہ ذکیہ نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، پھر کہا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ اس معاملے میں مجھ سے تنہائی میں بات کریں گے لیکن آپ نے سارا گھر جمع کر رکھا ہے۔ مناسب ہو گا کہ ہم اس معاملے پر تنہائی میں بات کریں۔"

لالہ عیسیٰ نے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھا جن کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا۔

[illegible] سے نگاہیں ملیں تو انہوں نے سر جھکا لیا۔ یہ گویا اس بات کی اجازت تھی کہ لالہ عیسیٰ خالہ ذکیہ سے تنہائی میں ملاقات کر لیں۔

"آیئے!" لالہ عیسیٰ نے کھڑے ہوتے ہوئے [illegible] ذکیہ سے کہا۔

وہ خالہ ذکیہ کو قریب کے ایک کمرے میں لے گئے۔

ڈرائنگ روم میں سکوت چھا گیا۔ سب اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔ یہ سکوت دس بارہ منٹ تک طاری رہا۔ آخر لالہ عیسیٰ اور خالہ ذکیہ واپس آئے۔ لالہ عیسیٰ بدستور پریشان نظر آ رہے تھے لیکن خالہ ذکیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے کچھ طنزیہ سی نگاہوں سے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھا، پھر بیرونی دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولیں۔ "سوچنے کے لیے آپ کے پاس صرف آج رات کا وقت ہے لالہ صاحب! اگر میری شرطیں [illegible] تو میرے پاس صرف کل کا دن [illegible] قرض کی ادائیگی [illegible] حالات اور یہ سب معاملات کل ہی طے کرنا ہوں گے۔"

لالہ عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خالہ ذکیہ نے وہاں موجود کسی شخص سے کوئی الوداعی بات نہیں کی اور ڈرائنگ روم سے باہر جاتے جاتے بولیں۔ "مجھے آپ کے فون کا انتظار رہے گا لالہ صاحب!"

وہ چلی گئیں۔

لالہ عیسیٰ تھکے تھکے سے انداز میں اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اب سبھی کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد لالہ عیسیٰ نے کھنکار کر کہا۔ "ابھی اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے خاندان میں اسے سب ذکیہ کہتے ہیں لیکن بزنس کمیونٹی میں اسے بانو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ مناسب ہو گا کہ میں اس کی شرائط بتانے سے پہلے تم لوگوں کو اس کے بارے میں بتا دوں۔ جب یہ چوبیس پچیس سال کی تھی تو اس کی شادی ہو گئی تھی لیکن شادی کی رات اس کا مقدر نہیں بن سکی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا شوہر ہارٹ فیل ہو جانے کے باعث دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ بھی ایک

بہت بڑا انڈسٹریلسٹ [illegible] اس کی انڈسٹری اور جائداد بانو کے حصے میں آ گئی۔ یہ بہت ذہین بے اور تاجرانہ [illegible] انڈسٹری اس خوبی سے چلائی کہ اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اس سے میری ملاقاتیں [illegible] یا کاروبار کی قسم کے عشائیوں اور عصرانوں میں ہوتی رہی ہیں۔"

"اس کی شرطیں کیا ہیں؟" فریال عیسیٰ نے بے چینی سے پوچھا۔

"[illegible] اسی طرف آ رہا تھا۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "اس سے [illegible] جو چند ملاقاتیں ہوئی [illegible]"

فریال [illegible] پھر [illegible] بولیں۔ "اس کی شرطیں بتایئے۔"

لالہ عیسیٰ نے ایک [illegible] سانس لی اور پھر نظریں جھکا کر [illegible] "اس کی ایک شرط تو یہ ہے کہ یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

یہ شرط کیا تھی، ایک دھماکا تھا۔ ایک ایسا دھماکا جس میں آواز بالکل نہیں تھی۔ اس کے برخلاف ڈرائنگ روم میں [illegible] سکوت چھا گیا تھا جیسے وہ ازلی اور ابدی ہو۔

اس وقت فریال عیسیٰ کے چہرے کا رنگ اس طرح اڑا کہ میک اپ کے باوجود اس کا چہرہ سفید سا نظر آنے لگا۔

شاہانہ کے دماغ میں اس وقت ایک اور ہی خیال چکرانے لگا تھا۔ زہرہ نے اس سے کسی دھماکے کی بات کی تھی جو لالہ عیسیٰ کرنے والے تھے۔ شاہانہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ زہرہ نے کیا اسی دھماکے کی بات کی تھی؟ اور اب تک جو باتیں ہوتی رہی تھیں، وہ اسی ڈرامے کا ایک حصہ تھیں۔

اس سکوت میں لالہ عیسیٰ کی آواز ابھرنے لگی۔ "میں بتا رہا تھا کہ برسوں پہلے ابتدائی چند ملاقاتوں میں ہی یہ مجھے پسند کرنے لگی تھی اور اشاروں کنایوں میں اس نے مجھ پر ظاہر بھی کر دیا تھا کہ یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔" لالہ عیسیٰ نے فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ اس وقت کی بات ہے جب تمہارے بڑے بھائی کا انتقال ہوئے صرف ایک سال گزرا تھا۔"

"یہ کسی وقت کی بات بھی ہو۔" فریال عیسیٰ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئیں۔ "اس کی یہ شرط کسی صورت میں نہیں مانی جا سکتی۔"

"میں بھی اسے ٹال ہی گیا تھا لیکن......"

"لیکن کچھ نہیں۔" فریال عیسیٰ نے کہا اور تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے چلی گئیں۔

لالہ عیسیٰ نے ایک [illegible] [illegible] موجود سب لوگوں سے بولے۔ "کوئی وقت آ [illegible] سب لالہ عیسیٰ اور اس کا گھرانا فٹ پاتھ پر آ جائے گا۔"

فیروز کھڑا ہوا۔ "ایک خیال آیا ہے میرے ذہن میں...... میں ممی سے بات کرتا ہوں۔" وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اسی طرف چلا گیا جدھر فریال بیگم گئی تھیں۔

لالہ عیسیٰ شکست خوردہ سے انداز میں کھڑے ہوئے اور مردہ سے لہجے میں بولے۔ "بس! تم لوگوں کو یہی بتانا تھا۔" وہ اندرونی دروازے کی طرف مڑ گئے۔

اب زبیر بھی کھڑا ہو کر سوچ میں ڈوبا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد شاہانہ نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ زہرہ خفیف سا مسکرا دی۔ "میں نے کہا تھا نا [illegible]!" وہ دھیرے سے بولی۔ "دھماکے کے بارے میں بتایا تھا [illegible] ہو گیا نا دھماکا!"

شاہانہ اٹھ کر تیزی سے زہرہ کے قریب جا بیٹھی۔ "تمہیں اس کا علم کیسے ہوا تھا؟"

"پھوپی [illegible] نے بتایا [illegible]"

"پھوپی؟"

"ہاں۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "[illegible] کی طرف سے میرا اور ان کا [illegible] دور دراز کا رشتہ ہے۔ تمہیں [illegible] ان سے دور دراز کا رشتہ ننھیال کی طرف سے ہے، اس لیے ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے ناواقف رہے۔"

شاہانہ کے لیے یہ انکشاف تھا لیکن اس کا ذہن اس سے کہیں زیادہ اہم باتوں میں الجھا ہوا تھا، وہ بولی۔ "تو ابھی یہ سب کچھ ڈراما ہوتا رہا تھا؟"

"سو فیصد۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "پھوپی ذکیہ سے ڈیڈی کی شادی ہوئے تو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔"

"کیا!" شاہانہ چونک پڑی۔

"ہاں۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "لیکن ڈیڈی نے اسے خفیہ رکھا ہوا تھا۔ پھوپی ذکیہ نے بھی اپنے خاندان میں میرے علاوہ کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔"

"خفیہ رکھنے کا مقصد؟"

"ڈیڈی نہیں چاہتے تھے کہ ممی سے جھگڑا فساد ہو۔ وہ اس انکشاف کے لیے کسی مناسب موقعے کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ جب تمہاری اور فیروز کی شادی ہوئی تو ان کو موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ ممی سے کہہ سکتے تھے کہ اگر وہ فیروز کی دوسری شادی کرا سکتی ہیں تو وہ دوسری شادی کیوں نہیں کر سکتے۔"

"ممی کہتیں کہ وہ تو انہوں نے اولاد کی وجہ سے کروائی

ہے۔"

"اور ڈیڈی کہتے کہ انہیں بھی بیٹی کا باپ بننے کی شدید خواہش ہے اور ممی ان کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔ صرف لڑکوں ہی کو جنم دیتی رہیں اور پھر انہوں نے اپنا آپریشن بھی کرالیا تاکہ مزید اولاد پیدا نہ ہو۔"

شاہانہ کا جسم سنسنانے لگا۔ "تمہیں یہ سب کچھ خالہ ذکیہ سے معلوم ہوا ہے؟"

"ظاہر ہے۔"

"لیکن اس وقت تو کوئی اور ہی ڈراما کھیلا گیا ہے۔"

"مجھے اس بارے میں پھوپی ذکیہ سے کچھ نہیں معلوم ہوسکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ ڈیڈی کو یہ تدبیر اچانک سوجھی ہوگی اور انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ طریقہ زیادہ موثر ہوسکتا ہے۔"

"لیکن ممی تو اکڑ گئی ہیں۔"

"میں اسے وقتی بات سمجھتی ہوں۔" زہرہ نے کہا۔ "یکایک جھٹکا لگا ہے ان کے دماغ کو۔ وہ جذباتی تو ہوں گی لیکن فیروز گئے ہیں نا ان کے پیچھے! وہ انہیں سمجھائیں گے۔ ممی کو ماننا تو پڑے گا۔ انہیں گھر کی تباہی پر اس کو ترجیح دینا ہی ہے کہ ڈیڈی دوسری شادی کرلیں۔"

"اور وہ قرض کی بات؟"

"وہ بھی مجھے فرضی کہانی معلوم ہوتی ہے۔"

"انہوں نے فیروز کو کاغذات دکھائے ہیں۔"

"جعلی کاغذات تیار کرائے ہوں گے۔" زہرہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "اب یہ تو ممکن نہیں کہ فیروز ان کاغذات پر شبہ کریں اور ان کی جانچ پڑتال کروائیں۔"

"گویا فیروز کچھ نہیں جانتے؟"

"پھوپی ذکیہ نے مجھے قسم دی تھی کہ میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ یہ میرے لیے ایک امتحان تھا۔ میں فیروز سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ ان سے کوئی بات نہیں چھپا سکتی لیکن پھوپی ذکیہ نے کہا کہ میں اس محبت ہی کی خاطر کچھ دن صبر کرلوں۔ وہ اس گھر میں آنے کے بعد ایسے حالات پیدا کریں گی کہ تمہیں جلد طلاق ہوجائے اور فیروز صرف میرے لیے وقف ہوجائیں۔ وقف تو وہ اب بھی میرے لیے ہی ہیں لیکن سب کچھ رازداری سے ہو رہا ہے۔ تمہیں طلاق ہوجانے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"یہ تمہی نے خالہ ذکیہ کو بتایا ہے کہ فیروز نے عملی طور پر مجھے اپنی بیوی نہیں بنایا ہے؟"

"ہاں۔"

اب شاہانہ کو یقین ہوگیا تھا کہ عزیر سے ملنے والی وہ پُراسرار عورت خالہ ذکیہ ہی ہیں۔

زہرہ نے مسکرا کر کہا۔ "انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تم کسی سے محبت کرتی ہو۔ وہ چاہتی ہیں کہ تمہیں تمہاری محبت جلد از جلد مل جائے۔"

"انہیں میری محبت کا اتنا خیال تھا تو انہوں نے یہ شادی پہلے ہی کیوں نہ رکوادی؟ وہ ڈیڈی سے بات کرسکتی تھیں۔"

"شاید تمہیں اس کا علم نہیں کہ جن دنوں تمہاری اور فیروز کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی، وہ بیرون ملک گئی ہوئی تھیں۔ کوئی کاروباری معاملہ تھا۔ اتفاق ہے کہ وہ بیرون ملک سے اس دن واپس آئی تھیں جس روز فیروز سے تمہارا نکاح ہو رہا تھا۔ جب وہ تمہاری امی سے ملنے گئیں تو انہیں اس کا علم ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے فون پر بات کی تھی تو میں نے انہیں فیروز کے ارادے سے آگاہ کیا تھا...... پھر تمہارے نکاح کے بعد ہی انہیں تمہاری امی سے ہی معلوم ہوا تھا کہ تم نے اپنے باپ کی خاطر اپنی محبت قربان کی ہے۔ وہ اگر ملک میں ہی ہوتیں تو تمہاری اور فیروز کی شادی ہرگز نہ ہونے دیتیں۔ تم سے ان کا دور کا رشتہ سہی لیکن وہ تمہیں بہت چاہتی ہیں۔"

اس موضوع پر بات آگے چلتی لیکن اسی وقت فیروز تیزی سے وہاں آیا۔ "ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ تو اسی وقت اٹھ گئے تھے۔"

فیروز تیزی سے واپس جانے لگا۔

"ہوا کیا؟" زہرہ اس کی طرف لپکی۔

"میں نے ممی کو سمجھا بجھا کر آمادہ کرلیا ہے۔ اب ڈیڈی کو ان کے پاس لے جانا ہے اور انہیں بتانا ہے کہ میں نے کیا تدبیر سوچی ہے جس کی وجہ سے ممی تیار ہوئی ہیں۔"

"کیا تدبیر سوچی ہے؟"

"ابھی میں جلدی میں ہوں۔ بعد میں بتاؤں گا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل آئے تھے۔ فیروز کا جواب سننے کے بعد زہرہ رک گئی اور فیروز آگے نکل گیا۔ زہرہ ڈرائنگ روم کی طرف لوٹ آئی۔

☆☆☆

فیروز نے جو تدبیر سوچی تھی، اس کا اظہار اس نے اس وقت کیا جب وہ لالہ عیسیٰ کو تلاش کرکے اسٹڈی سے بیڈروم میں لے گیا جہاں فریال عیسیٰ گم صم بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تدبیر یہ ہے ڈیڈی!" فیروز نے کہا۔ "فی الحال آپ اس عورت کی بات مان لیں۔ جب قرضہ ادا ہوجائے تو آپ شادی سے انکار کردیجیے گا۔ اس کے بعد وہ آپ کا

کیا بگاڑ سکتی ہے۔"

"اتنی بے وقوف نہیں ہے وہ۔" لالہ عیسیٰ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "وہ چاہتی ہے کہ صبح دس بجے ہمارا نکاح ہوجائے۔ اس کے بعد ہی وہ قرضے کی رقم میرے بینک میں ٹرانسفر کروائے گی۔"

"اوہ!" فیروز کے منہ سے نکلا۔

فریال عیسیٰ اس کا منہ تکنے لگیں۔

فیروز نظریں جھکا کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا، پھر یکایک سر اٹھا کے بولا۔ "تو پھر ایک صورت اور ہوسکتی ہے ممی!" وہ فریال عیسیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔ "نکاح کا کڑوا گھونٹ تو آپ پی ہی لیں۔ بعد میں ڈیڈی اسے طلاق بھی دے سکتے ہیں۔"

"نہیں دے سکتا۔" لالہ عیسیٰ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "اسے خود بھی یہ اندیشہ ہے اور یہ ابھی سامنے بھی آگیا ہے کہ تم لوگوں کے دباؤ میں آکر میں اسے طلاق دے سکتا ہوں اس لیے وہ اپنی پوزیشن پوری طرح مضبوط کرلینا چاہتی ہے۔ ابھی اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی کہ یہ ہر صورت میں آخر کار تیار ہوہی جائیں گی۔" ان کا اشارہ فریال عیسیٰ کی طرف تھا۔ "لہٰذا اس نے اسی وقت اپنے وکیل کو اپنے گھر بلا کے کاغذات تیار کروانا شروع کردیے ہیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی ہوں گی جو میرے دفتر کے کاغذات دیکھنے کے بعد درج کی جاسکیں گی۔ یہ کام وہ کل صبح ساڑھے آٹھ بجے سے دس بجے تک کروا لینا چاہتی ہے۔ نکاح نامے پر دستخط کرنے سے پہلے مجھے ان کاغذات پر دستخط کرنا ہوں گے۔"

"کاغذات کیا ہیں؟" فیروز نے بے تابی سے پوچھا۔

"میری انڈسٹری اس کے نام ہوجائے گی۔"

"کیا!" فیروز اچھل پڑا۔

یہی حالت فریال عیسیٰ کی ہوئی تھی۔

"ہاں۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "اسی طرح وہ اپنی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتی ہے۔"

"پھر تو وہ ہمیں فٹ پاتھ تک پہنچا سکتی ہے۔" فیروز نے ہیجانی انداز میں کہا۔ "آپ نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا۔ اب وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر آپ سے اپنی توہین کا انتقام لے سکتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔"

"یہ یقین کیوں ہے آپ کو؟"

"تم میرے بیٹے ہو فیروز......! اور بچے بھی نہیں ہو۔ تم سے یہ کہنا مجھے اچھا نہیں لگے گا لیکن تم لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بات مجھے اپنی زبان پر لانا ہی پڑے گی۔ وہ ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرسکتی فیروز! وہ آج بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔"

فیروز دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" فریال عیسیٰ تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ "جو ہو، سو ہو۔ آپ اس سے شادی تو نہیں کریں گے۔" پھر وہ اٹھیں اور بستر پر جا گریں۔

فیروز لالہ عیسیٰ کا منہ تکنے لگا۔

"تم انہیں سمجھا چکے۔" لالہ عیسیٰ نے اس سے کہا۔ "اب تم جاکے آرام کرو۔"

فیروز اٹھا اور سر جھکائے کمرے سے نکل آیا۔

شاہانہ اس وقت بھی خواب گاہ میں نہیں تھی۔ فیروز کو اسے لینے کے لیے پھر ڈرائنگ روم ہی کا رخ کرنا پڑا۔

"چلو شاہانہ!" فیروز کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"کیا بات نہیں بن سکی؟" زہرہ نے پوچھا۔ اس نے فیروز کے چہرے پر مایوسی دیکھی تھی۔

"اب شاید ڈیڈی خود انہیں سمجھائیں گے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

فیروز شاہانہ کے ساتھ کمرے میں آگیا۔

"تمہاری خالہ ذکیہ اتنی مال دار ہیں؟" اس نے شاہانہ سے پوچھا۔

"مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ بہت آسودہ ہیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی دولت مند ہوں گی۔"

"تمہارے گھر کی پریشانیوں کے لیے تو وہ بہت کچھ کرسکتی تھیں۔"

"ابا نے اسے گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے تو ایک بار یہ کوشش بھی کی تھی کہ ابا ایک اچھی تنخواہ میں ان کے ادارے میں آجائیں لیکن ابا نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔"

فیروز چپ ہوگیا۔ پھر اٹھا اور الماری سے شراب کی بوتل نکالی۔ شاہانہ سے کچھ کہے بغیر خود ہی ایک پیگ بنایا اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ شاہانہ اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ فیروز کا وہیں بیٹھ کر شراب پینا اس کی خوف زدگی کا سبب بنا تھا۔ نشے میں وہ بہک بھی سکتا تھا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ خاموش بیٹھی سوچتی رہی اگر فیروز بہک گیا تو وہ اسے کسی ایسی بات سے نہیں روک سکے گی جس کا وہ مجاز تھا۔

فیروز نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور نہ اس کے چہرے

پر نظر آنے والی پریشانی سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔

ایک پیگ ختم کرنے کے بعد اس نے دوسرا پیگ بنانے کے لیے بوتل اٹھائی ابھی دوسرا پیگ بنا ہی رہا تھا کہ [illegible] کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے موبائل فون نکالا، اس کی اسکرین پر نظر ڈالی اور پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ”جی ڈیڈی!“

”ذرا آؤ تو کمرے میں۔“

”جی، بہتر۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ فیروز کھڑا ہوتا ہوا شاہانہ سے بولا۔ ”ڈیڈی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ معلوم نہیں اب کیا ہوا ہے۔“ وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

فیروز لالہ عیسیٰ کے کمرے میں پہنچا۔ فریال عیسیٰ سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لالہ عیسیٰ بھی بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”اپنی ماں کو سمجھاؤ بیٹے!“ لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ”انہوں نے میری بات سمجھ تو لی ہے اور مان بھی گئی ہیں کہ میں بانو سے شادی کر لوں مگر اس کے بعد مسلسل روئے جا رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ مجھ سے انتقام لے گی اور انڈسٹری وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد ہمیں دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور کر دے گی۔“

”ایسا نہیں ہوگا ممی۔“ فیروز نے فریال عیسیٰ سے کہا۔ ”ڈیڈی آپ کو یقین دلا چکے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرے گی کیونکہ وہ ڈیڈی کو چاہتی ہے۔ ڈیڈی نے دنیا دیکھی ہے، تجربہ ہے انہیں زندگی کا......! اور پھر آپ دوسرا پہلو تو دیکھیں۔ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو بھی ہم کنگال ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی چانس مل رہا ہو تو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔“

فیروز کا اس انداز میں سمجھانا موثر ثابت ہوا اور فریال عیسیٰ کا رونا دھونا تقریباً بند ہو گیا۔ انہوں نے بس خاموشی اختیار کر لی۔ اس وقت لالہ عیسیٰ کے اشارے پر فیروز کمرے سے نکل آیا۔

اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر اس نے شاہانہ کو ساری بات بتائی۔

شاہانہ بولی۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خالہ ذکیہ کا ڈیڈی سے کوئی تعلق ہوگا لیکن یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ ڈیڈی سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ انہوں نے کسی اور سے اب تک شادی نہیں کی۔ ایسی صورت میں ڈیڈی کا یہ خیال ٹھیک ہی نظر آتا ہے کہ خالہ ذکیہ کے دل میں انتقام کی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

فیروز سر ہلا کر بیٹھا۔ اس نے گلاس میں جو تھوڑی سی شراب انڈیلی تھی، وہ پانی ملائے بغیر ہی حلق سے اتار گیا اور پھر بوتل بند کرتے ہوئے بولا۔ ”اب تم آرام کرو، میں زہرہ کے پاس جا رہا ہوں۔“

شاہانہ نے سکون کی سانس لی۔ فیروز بوتل لے کر چلا گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح لالہ عیسیٰ اور فیروز جلد ہی گھر سے چلے گئے تھے۔

شاہانہ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر موبائل پر عزیر سے رابطہ کیا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا کہ عزیر سے ملنے والی خاتون خالہ ذکیہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتیں۔

ان کی باتیں دس بارہ منٹ تک جاری رہیں۔ پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر شاہانہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ آنے والی زہرہ تھی۔ زہرہ کو بھی [illegible] کہ فریال عیسیٰ اپنے شوہر کی دوسری شادی [illegible]

”اب [illegible] میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ [illegible] ذکیہ [illegible] جات [illegible]

”[illegible] طرح؟“

”انہوں نے کیا سوچا ہے، مجھے اس کا علم نہیں۔ انہوں نے کل رات ہی مجھ سے فون پر کہا ہے کہ وہ تمہیں بہت جلد طلاق دلوا دیں گی۔“

”اس وقت کیا ہو رہا ہوگا؟“

”وہی...... انڈسٹری کے کاغذات کی تیاری... پر ڈیڈی کے دستخط ہوں گے۔ اس کے بعد نکاح۔“

”نکاح کہاں ہوگا؟“

”میرا خیال ہے، یہیں گھر پر ہی ہوگا۔“

”تم بتا رہی تھیں کہ ان کی شادی ہو چکی ہے۔“

”سول میرج۔“ زہرہ نے جواب دیا۔ ”اور سول میرج باقاعدہ نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتی۔“

شاہانہ نے سر ہلا دیا۔

سردیوں کی وجہ سے وہ دونوں اس وقت برآمدے میں تھیں جب لالہ عیسیٰ کی کار اور اس کے پیچھے کئی دوسری کاریں بھی آتی دکھائی دیں۔ اگلی کار میں لالہ عیسیٰ اور خالہ ذکیہ تھے۔

پچھلی کار میں آنے والوں کو زہرہ نے پہچانا اور چونک کر بولی۔ ”یہ تو پھوپی ذکیہ کے رشتے دار ہیں۔ انہیں نکاح میں شرکت کے لیے لایا گیا ہوگا۔“

☆☆☆

زہرہ کا خیال درست ہی تھا۔ سب سے پیچھے کی کار میں نکاح خواں اور لالہ عیسیٰ کے چند دوست تھے۔ نکاح میں وہی گواہ و وکیل بنے۔ نکاح کے بعد مہمانوں کی خاطر مدارات ہوئی جس کے بعد وہ چلے گئے۔

فریال عیسیٰ اس نکاح میں شریک نہیں ہوئی تھیں، انہوں نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔

کچھ دیر بعد لالہ عیسیٰ اپنے دفتر چلے گئے۔ فیروز نہیں گیا تھا۔ وہ شاہانہ کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ شاہانہ بے چین تھی کہ موبائل فون پر اپنے گھر والوں [illegible] واقعات سے آگاہ کرے [illegible] فیروز [illegible] سامنے اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ زہرہ اور اعجاز [illegible] اپنے کمرے [illegible] چلے گئے تھے۔

خالہ ذکیہ نے فریال [illegible] کمرے [illegible]

”کیوں؟“ فریال عیسیٰ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کھردرے لہجے میں کہا۔ ”میرے کمرے میں کیوں آئی۔“

”میں نے سوچا، خود آ کر تم سے شادی کی مبارک باد لے لوں!“ خالہ ذکیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم تو نکاح میں بھی شریک نہیں ہوئیں۔“

”یہ میرے لیے خوشی کی کوئی بات نہیں کہ میں تمہیں مبارک باد دوں۔“ فریال عیسیٰ نے اپنی نظریں دوسری طرف کر لیں۔

خالہ ذکیہ دھیرے سے ہنسیں۔ ”شاید تم میرا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔“

فریال عیسیٰ خاموش رہیں۔

”لیکن۔“ خالہ ذکیہ بولیں۔ ”ہمیں ایک ہی گھر میں رہنا ہے۔ آمنا سامنا تو ہوتا رہے گا، یا تم خود کو بس اس کمرے تک قید کر لینا چاہتی ہو؟“

”میں کیوں رہوں کی قید میں!“ فریال عیسیٰ نے تڑخ کر کہا۔ ”میرا گھر ہے یہ، جب چاہوں، باہر نکلوں۔“

”وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ آمنا سامنا تو ہوگا۔“

”تم مجھ سے یہ باتیں کرنے کیوں چلی آئی ہو؟“ فریال عیسیٰ نے اس مرتبہ خالہ ذکیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بس تمہی سے باتیں کرنے کے لیے رکی تھی۔“ خالہ ذکیہ نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”لالہ صاحب تو دفتر چلے گئے ہیں۔ اب مجھے بھی جانا ہے۔ اب رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔“

خالہ ذکیہ نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور کمرے سے نکل آئیں۔

پھر ان دونوں کا آمنا سامنا رات کے کھانے پر ہی ہوا تھا۔ اس سے کچھ دیر پہلے لالہ عیسیٰ کمرے میں جا کر فریال عیسیٰ کو سمجھاتے رہے تھے کہ گھر میں کشیدگی کی فضا قائم رکھنا مناسب نہیں رہے گا۔

ان باتوں کے بعد فریال عیسیٰ کھانے میں تو شریک ہو گئی تھیں لیکن کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ خالہ ذکیہ کی طرف تو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس رویے کے باعث کشیدگی میں کوئی کمی آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اس کشیدگی کا نقصان فریال عیسیٰ ہی کو پہنچتا لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

شاہانہ نے کھانے کی میز پر محسوس کیا کہ اعجاز جب بھی خالہ ذکیہ کی طرف دیکھتا تھا، اس کی آنکھوں میں شدید نفرت ہوتی تھی۔

اسی رات [illegible]

[illegible]

[illegible] کی۔

”اب رات کو تو نہ آئیں!“ شاہانہ نے کہا۔ ”بلکہ کل دن میں بھی نہ آئیے گا۔ وہ دونوں ہی دفتر میں ہوں گے۔ شام کو چھ سات بجے آئیے گا۔“

سلطانہ بیگم نے اس کی بات مان لی، پھر کہا۔ ”فرزانہ کا مزاج کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے اپنی باتوں کی معافی مانگ چکی ہے اور تم سے بھی معافی مانگنا چاہتی ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے امی! کل آپ اسے بھی اپنے ساتھ لیتی آئیے گا۔ اب اس کا دماغ ٹھنڈا ہو گیا ہے تو اب میرے سمجھانے بجھانے سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

اس گفتگو کے بعد شاہانہ کو عزیر سے بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ سارے حالات جان کر وہ بھی حیران ہوا۔

شاہانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے پاس ہوں گے۔ خالہ ذکیہ جلد ہی کوئی ایسی تدبیر کریں گی کہ مجھے یہاں سے نجات مل جائے۔“

”میں بے چینی سے اس وقت کا منتظر رہوں گا شاہانہ!“ عزیر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں بھی تم سے کم بے چین تو نہیں ہوں عزیزہ!"

وہ دونوں بہت خوش تھے، اور تقدیر شاید ان دونوں کی خوشی پر مسکرا رہی ہو۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر بھی فریال عیسیٰ سب کے ساتھ تھی لیکن اس کے اکڑے ہوئے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اس کے برخلاف خالہ ذکیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ناشتے کے بعد لالہ عیسیٰ، خالہ ذکیہ اور فیروز، تینوں ہی دفتر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد ہی زہرہ شاہانہ کے کمرے میں چلی آئی۔

وہ ہنس کر بولی۔ "جب تک ممی کا موڈ ٹھیک نہیں ہو جاتا ہم دونوں بے دھڑک ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا۔ وہ تو اپنے کمرے سے باہر نکلنا ہی بھول گئی ہیں۔"

"اس طرح کب تک چل سکے گا زہرہ؟"

"دیکھو کب تک چلتا ہے! فی الحال تو ممی پر آج ایک اور دھماکا ہونے والا ہے۔"

"کیا مطلب!" شاہانہ چونکی۔

"پھوپی ذکیہ سے مجھے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں ان سے بس اتنا ہی جان سکی کہ وہ آج تمہارے بارے میں کوئی بات چھیڑیں گی۔"

"اوہ!" شاہانہ کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

"آج دوپہر کو وہ لنچ کے لیے آئیں گی تو دوبارہ دفتر نہیں جائیں گی۔ آج کا باقی دن انہوں نے اسی مسئلے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وہ ڈیڈی کو بھی نہیں جانے دیں گی، یا شاید وہ ان سے کہہ بھی چکی ہوں۔"

"یہ بھی بتا دیا ہوگا ڈیڈی کو کہ انہیں کیا بات کرنا ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

ان باتوں نے شاہانہ کے جسم میں سنسناہٹ پھیلا دی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ خالہ ذکیہ اتنی تیزی سے اقدامات نہیں کریں گی۔ ورنہ اس گھر میں ایک اور بھونچال آئے گا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فریال عیسیٰ کا کیا ردعمل ہوگا۔

دوپہر کو لالہ عیسیٰ، خالہ ذکیہ اور فیروز لنچ کے لیے گھر آئے۔ اس وقت شاہانہ نے دیکھا کہ خالہ ذکیہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھیں، ان کے ہونٹوں پر مسلسل مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی لیکن اس وقت وہ پہلی مرتبہ اتنی سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بانو!" لالہ عیسیٰ بولے۔ "تم اچانک کچھ فکرمند نظر آنے لگیں؟"

"فکرمند تو نہیں۔" خالہ ذکیہ نے جواب دیا۔ "بس سوچ رہی تھی کہ گفتگو کا آغاز کس طرح ہو۔"

"کوئی خاص بات کرنی ہے؟"

"بہت خاص!"

اس وقت فریال عیسیٰ نے خالہ ذکیہ کو بڑی گہری نظر سے دیکھا تھا۔

"اتنے سوچ بچار میں مت پڑو۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "جو بات بھی ہے، بس کہہ ڈالو۔"

"بچوں کے سامنے نہیں۔" خالہ ذکیہ کا اشارہ فیروز، شاہانہ، زہرہ اور اعجاز ہی کی طرف ہو سکتا تھا۔

فریال عیسیٰ نے پہلو بدلا اور بجائے خالہ ذکیہ کے، لالہ عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ گفتگو میرے سامنے ہونا چاہیے۔"

خالہ ذکیہ بول پڑیں۔ "یقیناً وہ گفتگو تمہارے سامنے ہوگی۔ کھانے کے بعد کمرے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

لالہ عیسیٰ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ فریال عیسیٰ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ سوچ بچار کا تاثر اعجاز کے چہرے پر بھی نظر آیا۔ صرف شاہانہ اور زہرہ کے چہروں پر سنجیدگی رہی۔ زہرہ نے ایک مرتبہ کن انکھیوں سے شاہانہ کی طرف دیکھا تھا۔

کھانے کے بعد لالہ عیسیٰ اور خالہ ذکیہ، فریال عیسیٰ کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچے۔ فریال عیسیٰ اپنے بستر پر جا بیٹھیں۔ لالہ عیسیٰ ایک کرسی پر بیٹھے۔ خالہ ذکیہ کھڑی رہ گئیں۔

"تم بھی بیٹھ جاؤ۔" لالہ عیسیٰ نے خالہ ذکیہ سے کہا۔

"بیٹھ جاؤں گی۔" خالہ ذکیہ نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ فیروز کی دوسری شادی اس کی خوشی سے نہیں، دباؤ سے کروائی گئی تھی۔"

خالہ ذکیہ نے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھا جن نہیں تھا لیکن بھڑک کر جواب میں وہی بولیں۔ "تمہیں ہمارے گھریلو معاملات میں نہیں بولنا چاہیے۔"

"کیوں؟" خالہ ذکیہ کی پیشانی پر سلوٹ پڑ گئی۔ "کیوں فریال؟ کیا میں اب اس گھر کی فرد نہیں؟ اب یہ گھر میرا بھی ہے۔ اس گھر کے ہر غلط یا صحیح معاملے پر نظر رکھنا میری بھی ذمے داری ہے۔"

"فیروز میرا بیٹا ہے۔" فریال عیسیٰ تڑخیں۔

"وہ میرا بیٹا بھی ہے۔" خالہ ذکیہ نے کہا۔ "لالہ صاحب کی سب اولادیں میری اولادیں ہیں۔"

"سوتیلی۔" فریال عیسیٰ نے کہا۔

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ تم مجھے ایک سوال کا جواب دو فریال! مجھ سے لالہ صاحب کی دوسری شادی ہوئی تو پہلی بیوی کی حیثیت سے تم نے کیا محسوس کیا؟ تمہیں جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں محسوس کر چکی ہوں کہ تم بری طرح تڑپ گئی ہو۔"

"یقیناً تڑپ گئی ہوں۔" فریال عیسیٰ کچھ سوچے سمجھے بغیر بول پڑیں۔

"میں یہی سننا چاہتی تھی تم سے!" خالہ ذکیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ "تمہیں ایک عورت کی حیثیت سے زہرہ کے لیے بھی سوچنا چاہیے تھا۔ اس کے دل پر کیا گزر گئی ہوگی؟"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کے دل پر کیا گزری ہوگی!"

"یہ تو سفاکی ہوئی فریال!"

لالہ عیسیٰ جو اس دوران میں خاموش رہے تھے، بول پڑے۔ "میری بات سنو بانو! دوسری شادی فریال نے اس لیے کروائی تھی کہ انہیں دادی بننے کا بہت ارمان ہے۔ زہرہ کا میڈیکل چیک اپ کروایا گیا تھا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ کچھ اس قسم کی گڑبڑ ہے جس کا علاج بھی نہیں ہو سکتا۔"

"کیا شادی سے پہلے شاہانہ کا چیک اپ کروا لیا گیا تھا؟" خالہ ذکیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسی کوئی گڑبڑ اس میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"سیدھا سیدھا مطلب بیان کرو اپنا۔" فریال عیسیٰ بھڑک کر بولی۔

"زہرہ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا ازالہ ہونا چاہیے۔" خالہ ذکیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "فیروز کو چاہیے کہ اسے طلاق دے دے۔"

"بانو!" لالہ عیسیٰ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تم اپنی بھانجی کو مطلقہ بنانا چاہتی ہو؟"

"زیادتی زہرہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ میں اسی کا ساتھ دوں گی۔"

یہ بات فریال عیسیٰ پر آشکارا نہیں ہوئی تھی کہ خالہ ذکیہ کا کچھ رشتہ زہرہ سے بھی تھا۔

فریال عیسیٰ غصے میں بستر سے کھڑی ہو گئیں۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ فیروز!" خالہ ذکیہ نے بلند آواز میں کہا۔

فیروز دروازہ کھول کر اندر آیا۔

"تم کیوں آئے ہو؟" فریال عیسیٰ اس پر بگڑ گئیں۔

"چھوٹی ممی نے۔" فیروز کا اشارہ خالہ ذکیہ کی طرف تھا۔ اس نے مزید کہا۔ "کھانے کی میز سے اٹھتے وقت انہوں نے چپکے سے مجھے ایک پرچا دیا تھا۔ اس پر لکھا تھا کہ میں تھوڑی دیر بعد یہاں آ جاؤں۔"

"تو اب تم اپنی سوتیلی ماں کا حکم مانا کرو گے!" فریال عیسیٰ کا لہجہ بہت تیز تھا۔

"میرے لیے اب فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ میں کس کی بات مانوں اور کس کی نہ مانوں!"

فریال عیسیٰ پھر کچھ کہتیں لیکن اس سے پہلے ہی خالہ ذکیہ بول پڑیں۔ "فیروز! کیا تم شاہانہ کو طلاق دینے کے لیے تیار ہو؟"

فیروز چونکا اور پھر جواب دینے کے بجائے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

فریال عیسیٰ نے فیصلہ سنایا۔ "یہ طلاق نہیں دے گا۔"

"دباؤ.....؟" خالہ ذکیہ کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"جو دل چاہے، سمجھو!"

"فیروز!" خالہ ذکیہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "اب تم جاؤ۔"

فیروز اپنے چہرے پر الجھن کے تاثرات کے ساتھ کمرے سے چلا گیا۔

"میں اس گھر میں کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔" خالہ ذکیہ نے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فیروز نے میرا سوال سن کر تمہاری طرف دیکھا تھا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ شاہانہ کو طلاق دینے کے لیے تیار ہے لیکن تمہارے دباؤ کی وجہ سے مجبور ہے۔ تمہیں یہ دباؤ ختم کرنا ہوگا فریال! میں زہرہ کے ساتھ زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"اور مجھ پر زیادتی کر سکتی ہو؟" فریال عیسیٰ نے تیزی سے کہا۔

"کیا مطلب!" خالہ ذکیہ بولیں۔

"تم بھی مجھ پر سوکن بن کر آئی ہو! کیا میرے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی؟"

خالہ ذکیہ نے فوراً جواب نہیں دیا لیکن کچھ توقف کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو فریال! اس کا احساس مجھے یہاں آنے کے بعد ہوا۔ زہرہ ہنستی مسکراتی رہتی ہے لیکن میں نے اس کے دل کی تڑپ محسوس کر لی ہے۔ ا

لیے جب میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ ہو تو مجھے تمہارا خیال بھی آیا تھا۔ میں لالہ صاحب سے محبت کرتی ہوں اس لیے پہلے میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ یقیناً تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔"

"تو پھر اس زیادتی کا ازالہ ہونا چاہیے۔" فریال عیسیٰ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

خالہ ذکیہ کے چہرے پر [illegible] کے تاثرات [illegible] ہو گئے، پھر انہوں نے [illegible] طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے طلاق دیں۔ [illegible] یہ کڑوا گھونٹ پی لوں گی لیکن زہرہ کے ساتھ زیادتی نہیں ہونا چاہیے۔" پھر اس نے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "کل صبح تک شاہانہ کو طلاق ہو جانا چاہیے۔"

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

"ٹھیک ہے۔" فریال نے لالہ عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں شاہانہ کو طلاق دلوا دوں گی۔ آپ بھی [illegible] طلاق دے دیجیے۔"

"شاید تمہارے دماغ نے ٹھیک طور سے کام کرنا [illegible] دیا ہے۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "تم بھول رہی ہو کہ اب ہمارا [illegible] کچھ اس کے نام ہو چکا ہے۔ اگر میں نے اسے طلاق [illegible] وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

"کیوں!" فریال عیسیٰ نے کہا۔ "آپ تو بڑا [illegible] تھا کہ وہ ہمارے ساتھ یہ زیادتی نہیں کرے گی۔"

"مگر اس صورت میں کہ وہ میری بیوی رہے۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "اگر میں نے اسے طلاق دی تو پھر وہ انتقام [illegible] ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر میں بھی شاہانہ کو طلاق نہیں دلواؤں گی۔"

"اس صورت میں وہ کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ہے جو صرف تمہارے لیے تکلیف دہ ثابت ہو۔"

"کیا مطلب!" فریال عیسیٰ چونکی۔ "کیا وہ آپ پر دباؤ ڈال سکتی ہے کہ آپ مجھے طلاق دیں۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھائے گی۔"

"تو پھر وہ کیا کر سکتی ہے؟"

"مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں لیکن وہ شاہانہ کو طلاق دلوانے پر تلی ہوئی ہے۔"

"وہ میرے ساتھ اور کسی قسم کی زیادتی نہیں کر سکتی۔"

لالہ عیسیٰ کچھ نہیں بولے لیکن چہرے پر تشویش کے تاثرات تھے۔

ٹھیک اسی وقت خالہ ذکیہ موبائل فون پر زہرہ کو ان تمام حالات سے آگاہ کر رہی تھیں۔

سب کچھ سننے کے بعد زہرہ نے کہا۔ "کیا لالہ عیسیٰ آپ کو طلاق دے دیں گے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" خالہ ذکیہ نے ہنس کر کہا۔ "تو پھر وہ بھی شاہانہ کو طلاق دلوانے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔"

"اس صورت میں اس پر اذیت کا وہ وقت آ جائے گا کہ وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچنے لگے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"فیروز تم سے چوری چھپے ملتا ہے نا؟"

"جی!"

"گھر کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ فریال نے اسے تم سے دور کر دیا ہے!"

"جی۔"

"میں یہی سزا فریال کے لیے تجویز کروں گی۔ لالہ عیسیٰ پر یہ پابندی لگاؤں گی کہ وہ اب فریال کے کمرے کا رخ نہیں کریں گے اور ان کا وقت اب صرف میرے لیے مختص ہوگا۔"

"او [illegible] ہوگی۔"

"بس اب [illegible] ہے۔"

خالہ ذکیہ نے [illegible] کیا اور مسکرا [illegible] بڑے سکون سے [illegible] پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب [illegible] گی۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ شاہانہ کو طلاق [illegible] وہ فریال عیسیٰ کے ساتھ کوئی اور زیادتی نہیں کریں گی۔ ان کی کوشش یہی ہوتی کہ ان کے ساتھ فریال عیسیٰ بھی لالہ عیسیٰ کے گھر میں ایک پرسکون زندگی گزاریں۔

☆☆☆

خالہ ذکیہ سے ملنے، سلطانہ بیگم کے ساتھ آذر صاحب کو بھی جانا تھا مگر سہ پہر کو انہیں حرارت ہو گئی۔ ان کی ناسازیٔ طبع کے باعث جب سلطانہ بیگم نے جانے کا ارادہ ملتوی کرنا چاہا تو فرزانہ بے چین ہو گئی۔ اس کی موبائل فون پر اعجاز سے بات ہو چکی تھی۔ طے پایا تھا کہ اس رات فرزانہ اپنی بہن کے پاس رکنے کی پوری پوری کوشش کرے گی اور کامیاب ہو جانے کی صورت میں اسے کسی وقت اعجاز سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل سکتا تھا۔

اعجاز نے اس بات چیت میں کہا تھا۔ "ہم ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں گے فرزانہ کہ اب ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے کا ہونے سے نہیں روک سکے گی۔ میرے [illegible] سے [illegible] تو میں بغاوت کر دوں گا۔ میری ماں مجھ کو بہت چاہتی ہیں۔ وہ جب میرے یہ تیور دیکھیں گی تو نرم پڑ جائیں گی اور پھر ڈیڈی کو ان کی بات ماننا ہی پڑے گی۔"

اعجاز کی ان باتوں سے فرزانہ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ اس [illegible] کی زندگی کے خوابوں میں ڈوب گئی تھی جو اعجاز سے [illegible] کر کے ہی حاصل ہو سکتی تھی۔

[illegible] کم وقت میں صرف موبائل فون پر باتیں کرتے [illegible] ایک دوسرے سے [illegible] بے تکلف ہوئے تھے۔ [illegible] سے آگے بڑھنے کی کوشش [illegible] نے کی تھی اور [illegible] ہوتی چلی گئی تھی۔ [illegible] کسی نے [illegible] تھا [illegible] عورت تھی [illegible] اتنی خوب صورت [illegible] دیوانہ ہو گیا ہے [illegible] اس سے [illegible] کرنے کے لیے تیار تھا۔ فرزانہ چاہتی تھی [illegible] نہ ہو لیکن جب اس کی ماں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر [illegible] کی تو یہ اس کے لیے مایوس کن ہونا ہی چاہیے تھا۔

پھر اس وقت اس کی جان میں جان آئی جب آذر صاحب نے [illegible] اپنی بیوی سے کہا [illegible] زیادہ خراب نہیں ہے [illegible] انہوں نے زور دے کر [illegible] جائیں۔ فرزانہ کا [illegible] تو اس کا جب سلطانہ بیگم نے [illegible] سے کہا۔ تیاری کرتے ہوئے فرزانہ ان [illegible] باتیں [illegible] رہی جو اسے اعجاز کی باتوں نے دکھائے تھے۔

ساڑھے چھ بجے وہ اور سلطانہ بیگم کار میں گھر سے روانہ ہوئیں۔ وہ کار آذر صاحب کو دفتر کی طرف سے ملی تھی اور کار کے ساتھ شوفر بھی تھا جس کی تنخواہ عیسیٰ انڈسٹریز کی طرف سے دی جاتی تھی۔

سلطانہ بیگم بہت خوش تھیں کہ ان کے گھریلو حالات سنبھل گئے تھے بلکہ بہت اچھے ہو گئے تھے۔ انہیں کچھ خجالت شاہانہ سے بہرحال تھی جس کی قربانی سے حالات تبدیل ہوئے تھے۔

جب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ وہاں پہنچیں تو خالہ ذکیہ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔

"تم نے آنے کی اطلاع نہیں دی۔" خالہ ذکیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہاری اس اچانک آمد نے مجھے حیران نہیں کیا۔ مجھے یقین تھا کہ شاہانہ نے تمہیں فون پر سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

اس وقت فرزانہ خود ہی شاہانہ کے سینے سے جا لگی اور ایسی جذباتیت کا اظہار کیا جیسے اپنے سابقہ رویے پر بے حد پشیمان ہو۔ شاہانہ محبت سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

وہ چاروں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں کہ زہرہ، فیروز اور لالہ عیسیٰ بھی وہاں آ گئے۔

لالہ عیسیٰ کو جب آذر صاحب کے نہ آنے کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے اسی وقت موبائل فون پر آذر صاحب سے رابطہ کیا اور ان کی مزاج پرسی کے ساتھ تاکید کی کہ اگر ان کی طبیعت پوری طرح بحال نہ ہو تو وہ دوسرے دن دفتر نہ آئیں۔

اسی دوران میں ملازم نے خاطر مدارات کے تمام لوازمات میز پر لگا دیے جس کی ہدایت اس وقت دے دی گئی تھی جب سلطانہ بیگم اور فرزانہ وہاں پہنچی تھیں۔

اعجاز ڈرائنگ روم میں نہیں آیا۔ شاہانہ نے یہ بات [illegible] طور سے محسوس کی۔ [illegible] کے مطابق اعجاز بھی اس [illegible] سے مہمانوں [illegible] آنے کی [illegible] خاصا سب کچھ کہہ چکی [illegible] فرزانہ [illegible] آنے سے گریز کر رہا تھا۔

اصل حقیقت صرف فرزانہ جانتی تھی۔

"جب تم اپنی والدہ کے ساتھ آؤ گی تو میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" اعجاز نے اس سے فون پر کہا تھا۔ "میں سب لوگوں کو اور خصوصاً تمہاری بڑی بہن صاحبہ کو یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے اب کوئی دلچسپی نہیں۔"

اسی لیے فرزانہ کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں آیا جس سے ظاہر ہوتا کہ اعجاز کا سامنے نہ آنا اس کے لیے مایوس کن رہا ہے۔

سلطانہ بیگم نے چائے پینے کے دوران میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہماری سمدھن کیا گھر میں نہیں ہیں؟ یا ہم سے کچھ ناراض ہیں؟"

"ارے نہیں۔" لالہ عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دراصل فریال کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔"

خالہ ذکیہ خاموشی سے مسکراتی رہی تھیں۔

"ارے!" سلطانہ بیگم بولیں۔ "تب تو مجھے خود ان کے کمرے میں جانا چاہیے۔"

"ہاں ہاں، ضرور۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "چائے پی کر چلیے گا۔"

اس وقت فرزانہ نے شاہانہ سے کہا۔ ”آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے آپا!“

فوراً ہی لالہ عیسٰی نے شاہانہ سے کہا۔ ”اپنی بہن کو سارا گھر دکھاؤ شاہانہ بیٹی!“

”جی ڈیڈی! دکھاروں گی۔“

فرزانہ خوش ہو گئی۔ جو بات اسے کہنا تھی، وہ لالہ عیسٰی نے کہہ دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب سلطانہ بیگم، فریال عیسٰی کی مزاج پرسی کے لیے جانے لگیں تو لالہ عیسٰی نے دوبارہ شاہانہ سے کہا۔ ”تم اتنی دیر میں اپنی بہن کو گھر دکھا دو۔“

”جی، بہتر۔“

سلطانہ بیگم، لالہ عیسٰی اور خالہ ذکیہ کے ساتھ فریال عیسٰی کی طرف چلی گئیں۔

”مجھے ایک ضروری کام ہے۔“ فیروز کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ”لیکن میں ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔ آپ اب کھانا کھا کے جایئے گا۔“ اس کی مخاطب سلطانہ بیگم تھیں۔ ”میں اس سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔ میرا مطلب ہے، کھانے کے وقت سے پہلے۔“

سلطانہ بیگم نے اس دعوت سے گریز کرنا چاہا لیکن پھر خالہ ذکیہ نے بھی اصرار کیا تو انہیں چپ ہونا پڑا۔

زہرہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شاہانہ نے فرزانہ کو اپنے ساتھ لیا۔ ”آؤ، تمہیں گھر دکھاؤں۔“

”پہلے تو اپنے کمرے میں چلیے!“ فرزانہ نے کہا۔

”کیوں؟“

”بس چلیے نا!“ فرزانہ نے شاہانہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا۔

”آؤ۔“ شاہانہ نے محبت سے اس کا گال تھپکا۔

شاہانہ کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچتے ہی فرزانہ نے رونا شروع کر دیا اور شاہانہ سے لپٹ کر اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگنے لگی۔

”میں جب سے آئی ہوں، بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا ہے۔“ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

شاہانہ اس کی اداکاری نہیں سمجھ سکی اور پیار کرتے ہوئے بولی۔ ”بھول جاؤ اب وہ سب باتیں!“

”آپ نے اور امی نے مجھے ٹھیک ہی سمجھایا تھا۔“ فرزانہ نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو میں اعجاز کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”وجہ؟“ شاہانہ نے اسے غور سے دیکھا۔

”فون پر وہ مجھ سے بڑی بے ہودہ باتیں کرنے لگا تھا آپا!“ فرزانہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”میں وہ باتیں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر فون بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے امی سے معافی مانگی تھی۔“

”ہوں.....!“ شاہانہ نے طویل سانس لی۔ ”اب میں سمجھی کہ وہ اسی لیے آج سامنے نہیں آیا۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسا ہوگا!“

”شکر ہے کہ تمہیں جلد ہی عقل آگئی۔ چلو اب میں تمہیں گھر دکھاؤں۔“

”چلیے!“

شاہانہ نے اسے کوٹھی کے وہ سب حصے دکھائے جو آرائش کے اعتبار سے واقعی دیدنی تھے۔ لالہ عیسٰی نے ان کی آرائش پر بہت پیسا خرچ کیا تھا۔ اس طرح کوٹھی دیکھنے کے بہانے فرزانہ کو یہ جاننے کا موقع بھی مل گیا کہ اعجاز کا کمرا کہاں تھا۔

”آپ کا گھر بہت اچھا ہے آپا!“ فرزانہ بولی۔ ”کیا میں آج یہاں رک جاؤں؟ کمرے تو یہاں بہت ہیں۔ کہیں بھی سو جاؤں گی۔ پھر کل کا دن بھی آپ کے ساتھ گزاروں گی۔ شام کو چلی جاؤں گی۔“

شاہانہ بولی۔ ”اگر تم رکنا چاہتی ہو تو رک جاؤ لیکن تمہیں امی سے اجازت لینا ہوگی۔“

”ان سے اجازت بھی آپ ہی دلوایئے!“ فرزانہ نے شاہانہ کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میری اچھی آپا!“ اس کے انداز میں محبت بھی تھی اور خوشامد بھی۔

”اچھا میں بات کروں گی امی سے۔“ شاہانہ نے ہنس کر کہا۔

”آپ کی بات وہ نہیں ٹالیں گی۔“ فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ شاہانہ کے کہنے کی وجہ سے فرزانہ کو اگلے روز شام تک کے لیے وہاں رہنے کی اجازت مل گئی۔

رات کے کھانے کے بعد سلطانہ بیگم چلی گئیں۔

فرزانہ نے شاہانہ سے کہا۔ ”میں کچھ دیر تو آپ سے اور فیروز بھائی سے گپ شپ کروں گی، پھر سونے کے لیے چلی جاؤں گی۔ بس یہ بتا دیجیے گا کہ مجھے کس کمرے میں......“

”کسی دوسرے کمرے میں نہیں۔“ شاہانہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”تم میرے ساتھ سونا۔“

”مگر...... فیروز بھائی؟“

”وہ آج کسی دوسرے کمرے میں سو جائیں گے۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔“

شاہانہ یہ بتانا ہی نہیں چاہتی تھی کہ فیروز اس کے کمرے میں سوتا بھی نہیں تھا۔

مگر یہ فرزانہ کے لیے پریشان کن بات تھی لیکن اس نے اصرار نہیں کیا کہ وہ کسی اور کمرے میں سونا چاہتی ہے۔ اسے خیال تھا کہ اس کی اس بات سے شاہانہ کھٹک سکتی تھی۔

فرزانہ نے شاہانہ سے اپنے کالج کی باتیں چھیڑ دیں۔ وہ خود کو بہت خوش ظاہر کر رہی تھی اور وہ خوش تھی بھی! اس نے سوچ لیا تھا کہ رات گئے تک شاہانہ سو ہی جائے گی۔ اس کے بعد وہ کمرے سے نکل سکتی تھی۔ واپسی تو جلد ہی ہو جائے گی، اس نے سوچا تھا۔ اعجاز سے بس اتنی دیر کی ملاقات تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد و پیمان کر لیتے۔ بعد کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے وہ موبائل فون پر رابطے میں رہتے۔

☆☆☆

اعجاز نے رات کا کھانا بھی اپنے کمرے ہی میں کھایا تھا۔ اس نے دانستہ سب کا سامنا کرنے سے گریز کیا تھا لیکن اس بات سے بے خبر نہیں رہا تھا کہ فرزانہ وہاں رکنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

رات کو گیارہ بجے اسے فرزانہ کا ایس ایم ایس ملا، لکھا تھا۔

”میں آپا کے واش روم سے تمہیں ایس ایم ایس کر رہی ہوں۔ آپا کہہ رہی ہیں کہ وہ بارہ ایک بجے کے دوران میں سو جاتی ہیں لیکن میں اس کے بعد بھی انتظار کروں گی۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ آپا کو گہری نیند آگئی، تبھی میں یہاں سے نکلوں گی۔ اس وقت میں تمہیں صرف ”یس“ کا میسج بھیجوں گی۔ تم اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھنا۔ میں تیزی سے اندر آجاؤں گی۔“

ایس ایم ایس پڑھ کر اعجاز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اب اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آرہی تھی۔ وہ بے چینی سے وقت گزارنے لگا۔ بارہ بجے تھے جب اس نے شراب کی بوتل نکالی۔ پیگ بنا کر پہلا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے سوچا، یہ لڑکی واقعی بے وقوف ہے یا وہ بھی وہی چاہتی ہے جو وہ چاہتا ہے؟

دماغ اس سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ فرزانہ کے دل میں کیا تھا۔

کچھ بھی ہو، اعجاز نے سوچا، ہوگا وہی جو وہ چاہتا ہے۔

اگر فرزانہ نے اس سے بچنے کی کوشش کی تو وہ اسے کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

اس نے ڈیڑھ بجے تک دو پیگ پیے۔ تیسرا پیگ بنا کر اس نے بوتل بند کردی۔ تیسرا پیگ اور بوتل ایسی جگہ رکھ دی کہ اس پر فرزانہ کی نظر فوری طور پر نہ پڑ سکے۔ تیسرا پیگ وہ اس وقت پینا چاہتا تھا جب فرزانہ اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوجاتی۔

ڈیڑھ بج چکا تھا اس لیے اعجاز کو امید تھی کہ اب اسے جلد ہی فرزانہ کا ''یس'' کا میسج ملے گا۔

اس کی یہ توقع دو بجے پوری ہوئی۔ ''یس'' کا ایس ایم ایس ملتے ہی وہ دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا تا کہ فرزانہ فوراً اندر آسکے۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا، اس پر عمل اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ وہ کالج کی کئی لڑکیوں کے ساتھ یہ کھیل، کھیل چکا تھا مگر نہ جانے کیوں اسے احساس تھا کہ فرزانہ اس کے لیے شاید ایک نیا تجربہ ثابت ہوتی۔ ''شاید'' کا لفظ اس کے ذہن میں اس لیے آیا تھا کہ فرزانہ اس کے کمرے میں آنے کے لیے بہت جلد آمادہ ہوگئی تھی۔

جلد ہی دروازہ کھول کر فرزانہ اس کے کمرے میں آگئی۔ وہ دروازہ بولٹ کرکے اس کی طرف مڑا۔

''میں جلدی واپس جاؤں گی اعجاز!'' فرزانہ نے کسی قدر شرمیلے انداز میں کہا۔ ''تمہیں مجھ سے جو قسم لینا ہے، جلدی لے لو!''

''محبت کے عہدو پیماں جلدی نہیں ہوتے فرزانہ!'' اعجاز نے اس کے قریب جا کر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''صرف پیمان وفا باندھنے میں دیر نہیں لگتی لیکن اس کو نبھانے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے۔''

فرزانہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اعجاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ ''میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں اب کبھی نہیں چھوڑوں گا۔''

''میں ...... میں بھی قسم کھاتی ہوں۔'' فرزانہ کی آواز میں لرزش تھی اور اس نے اپنی نظریں جھکالی تھیں۔

''کیا قسم کھاتی ہو؟'' اعجاز نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہو کہ اب تم صرف میرے لیے ہو!''

''ہاں۔'' فرزانہ کے تنفس کی رفتار کچھ بڑھ گئی تھی۔

''صرف ہاں نہیں۔'' اعجاز نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں۔'' فرزانہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ''میں اب تمہارے لیے ہوں۔''

''یہ ہوئی نا بات؟'' اعجاز نے جھٹکے سے اسے اپنے بالکل قریب کرتے ہوئے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

''یہ ...... یہ ...... کیا ...... کیا کر رہے ہو...... اعجاز!'' فرزانہ کچھ گھبرائی۔

''اب تم میرے لیے ہونا!'' اعجاز اسے زیادہ طاقت سے بھینچتے ہوئے بولا۔ ''تو اب اسے ثابت بھی کرنا ہوگا۔ میں نے ابھی کہا تھا نا!...... پیمان وفا نبھانے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ تم اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں میں جذب ہوجانے دو۔''

''یہ ...... یہ ...... تمہارے منہ سے ...... بو......''

اعجاز نے اس کے ہونٹ بند کردیے۔

فرزانہ بڑی شدت سے مچلی۔ اس نے اپنے ہونٹ آزاد کرلیے لیکن اعجاز کی گرفت سے نہیں نکل سکی۔

''نہیں اعجاز!'' وہ ہانپنے لگی۔ ''یہ مت کرو۔ یہ مت کرو۔ تم کو میری قسم!''

''پہلے اپنی قسم یاد کرو۔ تم نے کہا تھا کہ اب تم میرے لیے ہو۔''

''لیکن ...... لیکن ......'' فرزانہ اپنی بات مکمل نہیں کرسکی۔

اس وقت اعجاز نے ایک ایسی حرکت کی کہ فرزانہ نے ایک بار پھر شدت سے مچل کر اس کی گرفت سے نکلنا چاہا مگر نکل نہیں سکی۔

''یہ مت کرو اعجاز!'' وہ کسی حد تک چیخ پڑی۔ ''دیکھو میں بہت زور سے چیخ پڑوں گی۔''

اعجاز نے اسے اس انداز میں زور سے دھکا دیا کہ وہ بستر پر جا گری۔

''اب آواز نکالی تو میں تمہیں گولی ماردوں گا۔'' اعجاز نے کہتے ہوئے اپنے جیب سے پستول نکال لیا۔

فرزانہ بری طرح سہم گئی۔ اسی وقت اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ چھوٹا سا موبائل اس کے بلاؤز میں تھا۔

''خبردار فرزانہ!'' اعجاز نے اس کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا اور اس کے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔ فرزانہ نے اس وقت غیر ارادی طور پر مزاحمت کی تھی اس لیے موبائل پر اعجاز کی گرفت مضبوط نہیں رہ سکی۔ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بستر پر ہی ایک طرف گر گیا۔

''دیکھو فرزانہ!'' اعجاز نے بائیں ہاتھ سے فرزانہ کا

بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اب تم نے میری بات نہیں مانی تو بہت برا ہوگا۔''

''یہ نہ کرو اعجاز!'' فرزانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

لیکن اعجاز پر اب جنون طاری ہوچکا تھا۔ اس نے فرزانہ کا دوپٹا کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ فرزانہ اب اتنی سہمی ہوئی نظر آرہی تھی جیسے کوئی معصوم چڑیا کسی عقاب کے پنجے میں پھنس کر موت کے خوف سے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے۔

بستر پر پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی لیکن اعجاز نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ اس کی ساری توجہ فرزانہ کے سراپا پر مرکوز تھی۔

''تم بہت گداز ہو فرزانہ!'' اعجاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔ پھر جب اس نے فرزانہ کا ہاتھ چھوڑا تو وہ فرزانہ کی گود میں اس طرح گر گیا جیسے کوئی بے جان چیز ہو۔ فرزانہ بری طرح دہشت زدہ ہوچکی تھی کیونکہ اعجاز کے دائیں ہاتھ میں پستول اب بھی موجود تھا۔

اعجاز فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ فرزانہ بالکل مزاحمت نہیں کرے گی اور نہ چیخنا چاہے گی۔

''بس ایک پیگ اور پی لوں۔'' اعجاز نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''پھر تم دیکھو گی کہ......'' اس نے ہنس کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس وقت موبائل کی گھنٹی بجنا بند ہوگئی۔

''شٹ اپ!'' اعجاز نے حقارت سے موبائل کی طرف دیکھا اور آڑ میں رکھا ہوا شراب کا گلاس اٹھالیا۔

فرزانہ سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اعجاز نے آدھا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کردیا اور گلاس ہاتھ میں لیے لیے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز میں بولا۔ ''ابھی تو تم خوف زدہ ہو لیکن ذرا دیر بعد جب ہم ایک ہوجائیں گے تو تم شور مچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤ گی۔''

اسی وقت باہر سے پکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''تم کہاں ہو فرزانہ؟''

وہ آواز شاہانہ کی تھی۔

اعجاز نے بڑی پھرتی سے فرزانہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بھی فرزانہ خاموش ہی رہتی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت رہ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شدید صدمے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور اس کی قوت گویائی ختم کردی ہو۔ بس اس کی سانسیں بہت تیزی سے چلنے لگی تھیں۔

''فرزانہ!'' اس مرتبہ شاہانہ کی پکارتی ہوئی آواز کچھ دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

اس موقعے پر بھی فرزانہ نے کچھ بولنے یا چیخنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''گڈ!'' اعجاز نے اس کے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹاتے

ویٹریات

☆ ویٹر، آج دال بہت اچھی پکی ہے اس میں کیا ڈالا ہے۔

○ کل کی بچی ہوئی دال سر۔

☆ ویٹر، تمہارے ہاں چٹنی کس چیز کی بنتی ہے۔

○ گاہک کی سر۔

☆ ویٹر، آج سالن میں بدبو محسوس ہورہی ہے۔

○ بدبو؟ ہرگز نہیں سر، آج تو باورچی نے گوشت صابن سے دھو کر پکایا ہے۔

☆ ویٹر! کیا میں تمہاری شکایت مالک سے کرسکتا ہوں؟

○ ہرگز نہیں سر! البتہ مالک کی شکایت آپ مجھ سے کرسکتے ہیں۔

☆ ویٹر کیا تم کو پتا ہے کہ تمہارے ہاں کا کھانا کھا کر میں کیا سوچتا ہوں۔

○ بالکل سر! یہی کہ بیوی کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیزوں کی قدر کرنی چاہیے۔

وقت

''اگر میں وقت ہوتا تو لوگ میری کتنی قدر کرتے۔''

''جی نہیں! لوگ تمہیں دیکھ کر ڈر جاتے۔''

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ لوگ کہتے کہ وہ دیکھو، برا وقت آرہا ہے۔''

بابا ایمان، حافظ آباد

ہوئے کہا۔ ”اب مجھے یقین ہے کہ تم خاموش ہی رہو گی۔ تمہاری بہن تمہیں ساری کوٹھی میں ڈھونڈتی پھرے گی اور ہم......“ اس نے دھیرے سے ہنس کر گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ باقی شراب بھی اس نے ایک ہی سانس میں ختم کی اور ہاتھ نیچے کر کے گلاس قالین پر لڑھکا دیا۔

اس کے بعد جس عمل کا آغاز ہوا، اس کے اختتام پر فرزانہ بے ستر ہو چکی ہوتی۔ اس وقت بھی فرزانہ کی حالت اس سہمی ہوئی چڑیا کی سی رہی جسے اپنی موت کا یقین آ چکا ہو۔ اس کی حالت میں صرف اتنا فرق آیا کہ اس کا سارا جسم کانپنے لگا تھا۔

☆☆☆

شاہانہ کی آنکھ کھل جانا ایک اتفاقی امر تھا۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سو جاتی لیکن بستر پر فرزانہ کی عدم موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی تھی۔

کہاں چلی گئی۔ اس نے سوچتے ہوئے باتھ روم کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اٹھ کر باتھ روم کی طرف گئی تھی۔

”فرزانہ!“ اس نے پکارا تھا۔

پھر جواب نہ ملنے پر اس نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ فرزانہ وہاں نہیں تھی۔

کہاں چلی گئی؟ کہاں چلی گئی؟

دماغ میں گونجتے ہوئے اس سوال کے ساتھ ہی شاہانہ نے اپنا موبائل اٹھا کے اس پر فرزانہ کا موبائل نمبر ملایا تھا۔

رابطہ ہو جانے کے بعد دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی تھی۔

پھر جب رابطہ منقطع ہو گیا تو شاہانہ ننگے پیر دوڑتے ہوئے باہر نکلی۔ اس کے دماغ میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ فرزانہ نے وہاں رکنے کی خواہش ہی اس لیے کی تھی کہ اعجاز سے مل سکے۔

وہ دوڑتے ہوئے اعجاز کے کمرے کے قریب پہنچ گئی تھی۔

”تم کہاں ہو فرزانہ!“ اس کی یہی آواز اعجاز اور فرزانہ نے بھی سنی تھی۔

جواب نہیں ملا تو شاہانہ پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ وہ فیروز اور زہرہ کے کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی چیخی۔

”فرزانہ!“

یہ آواز بھی فرزانہ اور اعجاز نے سنی تھی۔

شاہانہ کی دیوانگی کا اس وقت یہ عالم تھا کہ وہ فیروز اور زہرہ کے کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ ڈالتی لیکن زہرہ اور فیروز خود ہی ہڑبڑائے ہوئے انداز میں باہر آ گئے تھے۔

”کیا ہوا شاہانہ؟“ زہرہ نے تیزی سے پوچھا۔

”فرزانہ غائب ہے۔“ شاہانہ ہانپتے ہوئے بولی۔

زہرہ نے چونکتے ہوئے انداز میں فیروز کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا......! میں پہلے ہی شبہے میں پڑ گئی تھی اس کے یہاں رکنے کی وجہ سے!“ پھر اس نے شاہانہ سے کہا۔ ”تم سے کچھ کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگا لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اعجاز کے کمرے میں ہو گی۔“

”میں وہاں آواز دے کر آئی ہوں۔“ کسی اندیشے سے شاہانہ کا چہرہ فق پڑ گیا۔

”وہ جواب تو نہیں دے گی تمہیں۔“ زہرہ نے کہا۔

”میرے ساتھ آؤ!“ فیروز کہتے ہوئے دوڑا۔ اس کا رخ اعجاز کے کمرے کی طرف تھا۔

یہ شور غل اور بھاگ دوڑ کی آواز سن کر کسی طرف سے دو ملازم بھی نکل آئے۔

یہ سب آوازیں اعجاز اور فرزانہ کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ یہ وہ وقت تھا جب فرزانہ تقریباً بے ستر ہو چکی تھی۔

”اعجاز!“ باہر سے فیروز کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

اعجاز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فرزانہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”فرزانہ!“ یہ آواز شاہانہ کی تھی۔

”چیخنے دو ان لوگوں کو!“ اعجاز نے فرزانہ کو اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ ”دو تین آوازیں لگا کے سب چلے جائیں گے۔ میں کبھی کبھی رات کو گھر سے غائب رہتا ہوں۔ سب سمجھ لیں گے کہ میں گھر میں نہیں ہوں اور اپنا کمرا لاک کر گیا ہوں۔“

اس وقت باہر کھڑی ہوئی شاہانہ کو ایک تدبیر سوجھی۔ جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی، اس وقت سے اب تک موبائل اس کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ اس نے جلدی سے فرزانہ کا نمبر ملایا۔

لائن ملتے ہی کمرے میں بستر پر پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور شاہانہ چیخ پڑی۔ ”تم یہیں ہو فرزانہ! مجھے تمہارے موبائل کی گھنٹی سنائی دے رہی ہے۔“

”اعجاز!“ فیروز بڑے غصے سے چیخ پڑا۔

اس وقت اعجاز کو خیال آیا کہ بستر پر پڑے ہوئے موبائل نے اس کی اور فرزانہ کی خاموشی کا راز افشا کر دیا تھا۔ اس نے بڑے غصے سے موبائل اٹھایا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے

موبائل کو کسی دیوار سے دے مارے گا لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ رک گیا اور اس نے موبائل کا سوئچ آف کرنے پر اکتفا کیا۔

”اعجاز!“ فیروز کی غصیلی آواز آئی۔ ”اگر تم نہیں کھولو گے تو مجھے دروازہ توڑنا پڑے گا۔“

”کچھ نہیں ہو گا۔“ اعجاز نے بہت دھیمی آواز میں کہتے ہوئے دانت پیسے۔ اس کا جنون پہلے سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اس نے فرزانہ کو ایک بار پھر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ اپنی سی کر گزرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

”دھکے مار کر توڑ دو دروازہ۔“ فیروز نے ملازموں سے کہا۔

اس شور غل نے کچھ اور ملازموں کے علاوہ لالہ عیسیٰ، خالہ ذکیہ اور فریال کو بھی جگا دیا تھا۔

کئی ملازموں کے بار بار کے دھکوں سے دروازہ شاید نہ ٹوٹتا لیکن اس کے بولٹ اور اس کی چولیں اپنی جگہ چھوڑ سکتی تھیں۔ اس بات کا احساس جب اعجاز کو ہوا تو وہ غصے سے چیخ پڑا۔ ”کسی نے بھی اندر آنے کی کوشش کی تو میں گولیاں برسا دوں گا۔“

”اعجاز!“ لالہ عیسیٰ بڑے غصے سے چیخے۔

خالہ ذکیہ اور فریال عیسیٰ کے چہروں پر سفیدی سی چھانے لگی تھی۔ ان تینوں کو زہرہ ہی نے بتایا تھا کہ بات کیا تھی۔

شراب کے نشے نے اعجاز کا جنون اور بڑھا دیا تھا۔ فرزانہ کے منہ سے اس وقت بھی کوئی آواز نہیں نکلی تھی لیکن آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ اعجاز کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر صورت میں فرزانہ کو روند ڈالنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ خواہش پوری ہونے سے پہلے ہی دروازہ اکھڑ کر زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا۔

”لعنت ہو سب پر!“ اعجاز پاگلوں کی طرح چیخا اور پستول کا رخ دروازے کے خلا کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر دباتا ہی چلا گیا۔

پستول میں چھ گولیاں تھیں......! ان میں سے ایک فریال عیسیٰ کے سینے میں پیوست ہوئی اور وہ کراہ کے ساتھ گرنے لگی۔ ایک گولی نے خالہ ذکیہ کا شانہ زخمی کیا۔ تیسری گولی نے زہرہ کی پیشانی رنگین کر دی تھی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گری تھی۔ چوتھی گولی فیروز کی دائیں گھٹنے پر لگی۔ کراہ کے ساتھ وہ بھی ڈگمگا گیا۔ باقی دو گولیاں ادھر ادھر نکل گئی تھیں۔

”پکڑ لو اس مردود کو!“ ملازموں نے لالہ عیسیٰ کا حکم سنا۔ ملازمین جھپٹے!

عقل مند

ایسا انسان جو غلطی پر ہو اور معافی مانگ لے۔ اسے عقل مند کہتے ہیں اور ایسا انسان جو غلطی پر نہ ہو اور معافی مانگ لے۔ اسے شوہر کہتے ہیں۔

مرسلہ: تقسیر عباس بابر، اوکاڑہ

خالہ ذکیہ نے زخمی ہونے کے باوجود فریال عیسیٰ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور چیخیں۔ ”کوئی اسپتال تو فون کرے!“ انہوں نے زہرہ کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

اعجاز ملازموں کی گرفت میں آ گیا۔

شاہانہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر بستر کی چادر فرزانہ پر الٹ دی۔ فرزانہ نے اب پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

جو کچھ ہوا، وہ رات کے ڈھائی بجے کے قریب ہوا تھا اس لیے دوسرے دن کے اخبارات میں اس کی کوئی خبر نہیں آ سکی لیکن تمام ٹی وی چینلز نے یہ خبر ہر طرف پھیلا دی۔

ناشتا کرتے ہوئے عزیر نے وہ خبر سنی اور اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر گئی۔

خبر کے مطابق فریال عیسیٰ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے زہرہ نے گولی لگتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ خالہ ذکیہ اتنی معمولی زخمی ہوئی تھیں کہ ان کی بس مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ فیروز کی ٹانگ کا آپریشن کیا گیا تھا کیونکہ گولی نے اس کے گھٹنے کی ہڈی توڑ دی تھی۔ لالہ عیسیٰ نے خود پولیس کو فون کر کے بلایا تھا اور اعجاز کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔

ٹی وی چینلز اس وقت تک اس بات سے بے خبر تھے کہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے پس منظر میں کیا بات تھی؟

عزیر نے موبائل پر شاہانہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی تھی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا تھا۔

عزیر کے ساتھ اس کی والدہ بھی پریشان تھیں۔

دوپہر کے قریب شاہانہ سے عزیر کا رابطہ ہو سکا۔ لیکن اس رابطے کے باعث جو کچھ معلوم ہوا، وہ بھی کچھ کم پریشان کن نہیں تھا۔

شام سے پہلے پہلے ٹی وی چینلز نے اس اندوہناک واقعے کے پس منظر سے بھی نقاب اٹھا دیا۔ خود اعجاز نے ہی نشے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ خبر نشر ہوتے ہی

فرزانہ کی شخصیت پوری طرح سامنے آ گئی۔ سلطانہ بیگم اور آذر صاحب کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ جو رسوائی ہوئی تھی، اسے سلطانہ بیگم تو نہ جانے کیسے جھیل گئیں لیکن آذر صاحب پر دل کا دورہ پڑا اور انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔

''سب برباد کر دیا تو نے۔'' شاہانہ نے دونوں ہاتھوں سے فرزانہ کے بال کھینچتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔

جواب میں فرزانہ نے روتے ہوئے اور قسمیں کھاتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ دھوکا کھا گئی تھی اور اعجاز نے اسے پستول دکھا کر اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ اس کے منہ سے ذرا بھی آواز نہیں نکل سکی تھی۔

اس واقعے کے بعد کے دنوں میں جو کچھ ہوتا رہا، اس کے بارے میں عزیر کو موبائل فون پر شاہانہ سے مختصر طور پر معلوم ہوتا رہا۔ شاہانہ کے والد دل کا دورہ پڑنے کے باعث موت کے قریب تو پہنچ گئے تھے مگر ابھی ان کی زندگی باقی تھی۔

فیروز جب اسپتال سے گھر لوٹا تو وہیل چیئر پر تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو چکی تھی۔

''فیروز ولا'' پر ایک ہولناک سکوت طاری تھا۔ وہاں سے دو لاشیں اٹھ چکی تھیں اور اس گھر کا ایک نوجوان پولیس کی تحویل میں تھا۔

اس رات وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے فیروز نے شراب پیتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر شاہانہ سے کہا۔ ''تم کیا محسوس کر رہی ہو شاہانہ؟ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی قبرستان میں ہوں۔''

''جی۔'' شاہانہ نے نظریں جھکا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور یہ سب کچھ میری بہن کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''وجہ۔'' فیروز نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر میری مرحومہ ماں نے تم سے میری شادی نہ کرائی ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر زہرہ ماں بن جاتی تو تم سے میری شادی کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے شاہانہ! بہت کچھ!...... مگر وہ سب کچھ کہنے سننے سے حاصل کیا؟...... سامنے کی بات تو صرف یہ ہے کہ میرا گھر ختم ہو گیا۔ ماں بھی چلی گئی اور میری زندگی کی ساتھی بھی۔''

زہرہ کو یاد کر کے فیروز کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی اور شاہانہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔

فیروز نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ لے کر اپنے امڈتے ہوئے جذبات پر قابو پایا اور بولا۔ ''میری ایک ٹانگ بھی جاتی رہی۔ اگر زہرہ زندہ ہوتی تو شاید وہ مجھے ایک ٹانگ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیتی، یا اس احساس سے دور رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالتی لیکن میرا تو مقدر ہی یہ تھا کہ میں بے سہارا ہو جاؤں اور اس گھر کے سناٹے میں وہیل چیئر پر بیٹھا پاگلوں کی طرح دیواریں تکتا رہوں...... کیسا پاگل کر دینے والا سناٹا ہے یہ شاہانہ......! اور کل اس سناٹے میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔''

شاہانہ چونکی۔ ''کیسے؟''

''میں نے جو عہد کیا تھا، وہ تو پورا کروں گا۔ کل تم شادی کے اس بندھن سے آزاد ہو جاؤ گی جس نے تمہیں میرا قیدی بنا دیا ہے۔ میں فون پر وکیل سے کہہ چکا ہوں کہ وہ طلاق نامہ تیار کر کے لے آئے۔ کل تم بھی یہاں سے چلی جانا۔ میں نے ابھی کہا تھا نا...... میرا مقدر ہی یہ ہے کہ میں تنہا رہ جاؤں۔''

شاہانہ کی نظریں جھک گئیں۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

اسی رات کو نہ جانے کون سا پہر تھا کہ فیروز نے غنودگی میں یوں محسوس کیا جیسے زہرہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا ہو۔

''خوابوں میں آ کر بھی تڑپاتی رہو گی زہرہ!'' وہ بڑے کرب میں بڑبڑایا۔

''زہرہ نہیں، یہ میں ہوں۔''

جواب نے فیروز کو چونکا دیا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ شاہانہ اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ فیروز کے سینے پر اسی کا ہاتھ تھا۔

''میں ہوں نا آپ کا سہارا۔'' وہ فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اور اگلے دن عزیر جب کمپیوٹر پر بیٹھا اپنی ڈاک دیکھ رہا تھا تو اسے شاہانہ کا پیغام بھی نظر آیا۔

''عزیر! کاش تم مجھے معاف کر سکو!...... یہ تم سے میرا آخری رابطہ ہے۔ ہاں عزیر! میں فیروز کو اپنا چکی ہوں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی ماں کھو دی، اپنی محبوب بیوی کو کھو دیا، اپنی ایک ٹانگ کھو دی اور یہ سب کچھ میری بہن کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا ہے عزیر! میری بہن کی عزت بچی ہے تو فیروز کی وجہ سے!...... ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ اس کا جواب کیا میں اس طرح نہ دوں کہ ان کی زندگی کی ویرانی کم کرنے کی کوشش کروں؟''

عزیر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس پیغام کو دیکھتا رہ گیا۔